Planner 18

نانگا پربت

مستنصر حسین تارڑ

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"پاکستانی شمال کے اُن
برف زاروں ، وادیوں ،جھیلوں ،چشموں
اور بلندیوں کے نام
جنھیں مَیں
اِس زندگی میں نہ دیکھ سکوں گا۔"

پہلا سفر

۱ - پریاں اور نسکین چائے
۲ - سدپارہ گولڈ
۳ - سکردو سے خپلو
۴ - وادیٔ خپلو
۵ - جھیل پھورا سے راکاپوشی تک
۶ - وادیٔ ہنزہ کا چراغاں
۷ - چینی شیر ، سندھ کی گہری گونج اور رائے کوٹ پُل
۸ - اُشو فیئری میڈو چلو
۹ - تاتو کے گرم چشمے
۱۰ - فنتوری ایک فینٹسی اور فیئری میڈو ..... کے آسمان سے گرتے ستارے
۱۱ - بیس کیمپ نانگا پربت
۱۲ - فیئری میڈو کا جنگل - مارخور اور برفانی انسان اور آخری الاؤ

دُوسرا سفر

۱ - گلگت گیم
۲ - روڈ ڈاسٹور اور چکور ہی چکور
۳ - ترشنگ ، پاکستان کا خوبصورت ترین گاؤں
۴ - رُوپل گلیشئر کے ہاتھی اور شوکور پر ایک زرد خیمہ اور سردرات
۵ - ٹاپ میدان اور شل کھمی دیامیر (سو چہروں والا پہاڑ)
۶ - لاتوبو ۔ بیس کیمپ نانگا پربت پر تارڑ پرچم
۷ - شکاری یار محمد اور لاتوبو کا آخری ہرن اور داستان نانگا پربت
۸ - کوہ پیماؤں کا قبرستان جہاں ہوا تیز چلتی تھی
۹ - ٹاپ میدان کی رات میں الاؤ اور اس کے سامنے نانگا پربت پر

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

۱۰ - گھر لوٹنے والے مویشی

۱۱ - وادیٔ رُوپل دیکھنے والے آوارہ گردوں کی مُسکراہٹ میں فرق ہوتا ہے

۱۲ - ترشنگ ایک تصویر

۱۳ - پورٹر سُلطان کے کوہستانی گھر میں

۱۴ - خوبصورتی کا خوف اور راما جھیل

۱۵ - دُھندلائی ہُوئی ، ایک خیال میں ...... نانگا پربت

تیسرا سفر

۱-۱ ہوشے - ۴۲ کلومیٹر (جھیل کچورا - جھیل صدپارہ - وادیٔ خپلو - وادیٔ ہوشے)

۱-۲ وادیٔ شگر

۱-۳ دیوسائی اے دیوسائی

پہلا سفر

۱ - پریاں اور نمکین چائے ۱۱

۲ - صدپارہ گولڈ ۲۵

۳ - سکردو سے خپلو ۴۱

۴ - وادیٔ خپلو ۵۶

۵ - جھیل کچورا سے راکاپوشی تک ۷۰

۶ - وادیٔ ہنزہ کا چراغاں ۸۶

۷ - چینی شیر ، سندھ کی گہری گونج اور رائے کوٹ پُل ۹۶

۸ - اُٹھو فیری میڈو چلو ۱۰۳

۹ - تاتو کے گرم چشمے ۱۱۶

۱۰ - فنتوری ایک فینٹسی اور فیری میڈو .... کے آسمان سے گرتے ستارے ۱۲۲

۱۱ - بیس کیمپ نانگا پربت ۱۴۱

۱۲ - فیری میڈو کا جنگل - مارخور اور برفانی انسان اور آخری الاؤ ۱۵۹

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"پریاں اور نمکین چائے"

"خواتین و حضرات آپ کا کیپٹن آپ سے مخاطب ہے۔ اگر آپ جہاز کی دائیں قطار میں تشریف رکھتے ہیں تو ذرا کھڑکی سے باہر نظر کیجئے۔ اس وقت ہم آٹھ ہزار ایک سو پچیس میٹر بلند دنیا کی مشہور چوٹی نانگا پربت پر سے گزر رہے ہیں۔ نانگا پربت کو "قاتل پہاڑ" بھی کہا جاتا ہے۔۔۔ اس کے دامن میں۔۔۔۔"

"نانگا پربت؟" نظامی صاحب اپنی توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ "اوئے یہ کہاں سے آ گئی؟"

"یہ ادھر ہی ہوتی ہے نظامی جی۔۔۔۔" میں نے عرض کیا۔

"کدھر ہے؟"

ہماری طرف نہیں ادھر دائیں قطار کی کھڑکیوں میں سے نظر آ رہی ہے۔"

"ادھر تو میمیں بیٹھیں ہوئی ہیں نیکریں پہن کر۔۔۔۔" مطیع نے اپنی عینک کا زاویہ درست کرتے ہوئے کہا "ہمالین مراتھن میں دوڑنے والی"

"اندازہ کرو۔۔۔۔" نظامی صاحب خوش تھے اور بہت خوش تھے۔ "ادھر نانگا پربت گزرتی جا رہی ہے اور یہ میموں کی نیکریں دیکھ رہا ہے۔۔۔" یہ کہہ کر وہ نشست سے اٹھے اور دوسری قطار کی آخری نشست پر براجمان' ایک ادھیڑ عمر' تھل تھل کرتی' کھڑکی کے ساتھ ناک چپکائے' نانگا پربت کو تلاش کرتی' میم پر جا جھکے۔ "ایکسکیوزمی۔۔۔۔" وہ مسکرائے۔ میم نے ناک ہٹا کر انہیں دیکھا اور نظر بھر کر دیکھا کہ یہ گٹھے ہوئے جسم اور سفید بالوں والا شخص کیسی آزادی سے ایکسکیوزمی کہتا ہے اور مسکراتا جاتا ہے۔ اور پھر وہ بھی رہ نہ سکی اور مسکرانے لگی۔

"کیا میں نانگا پربت دیکھ لوں؟" نظامی صاحب کی نظریں کھڑکی پر نہیں تھیں بلکہ میم کے فراخ ان ڈھکے بوڑھے سینے پر تھیں۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"کیوں نہیں..." وہ ذرا پیچھے ہٹی۔ اور اسی لمحے اپنی نشست پر بیٹھے ہوئے مجھے بھی جہاز کی اس کھڑکی میں سے جو دوسری قطار کے آخر میں تھی' اس میم کے ذرا پیچھے ہٹنے سے' ایک برفیلی سفیدی نظر آئی اور گم ہو گئی۔

نانگا پربت!

وردستان یا دیامیر کو پریوں کی سرزمین کہا جاتا ہے۔ مقامی آبادی کا عقیدہ ہے کہ نانگا پربت کی چوٹی پریوں کی ملکہ کی رہائش گاہ ہے۔ داستانوں میں آیا ہے کہ وہ ایک ایسے برفانی قلعے میں رہتی ہے جو شفاف اور دبیز برف کا بنا ہوا ہے' اور برف کے بڑے بڑے مینڈک اور برف کے ایسے سانپ جو کئی کلومیٹر لمبے ہیں اس ملکہ کی حفاظت پر مامور ہیں اور ان علاقوں میں رہنے والی عورتیں رنگین کپڑوں اور شوخ زیوروں سے اجتناب کرتی ہیں کیونکہ انہیں پہننے سے پریاں ان سے حسد کر سکتی ہیں اور ان پر جادو کر سکتی ہیں...

نظامی صاحب کھڑکی سے پیچھے ہٹے۔ "آپ بھی دیکھ لو تارڑ صاحب ... نانگا پربت" اور وہ ابھی تک شرارت کے موسم میں تھے۔

"نہیں جناب میں نہیں دیکھنا چاہتا۔ میں نے سنا ہے کہ نانگا پربت بھی روم کے تریوی فوارے کی طرح ہے کہ یہ دوبارہ اپنے پاس بلا لیتی ہے اور میں فی الحال دیوسائی میدان جا رہا ہوں' نانگا پربت کے پاس جانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔"

اور اسی لمحے شاید یہ آواز اور لفظ کہ' نانگا پربت کے پاس جانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں' پیچھے ہوئے' جہاز سے نیچے گئے' نانگا پربت تک پہنچے اور پھر ادھر ایک اور سرگوشی اور سرسراہٹ پھیلی جو کہتی تھی کہ تم آؤ گے۔ اور نیچے نانگا پربت کے دامن میں' برچ کے سفید درختوں کا جو جنگل تھا' اور اس جنگل کے نیچے فرش پر سٹرابیری کے سفید پھول بچھے تھے اور چشمے جو ان میں چلتے تھے' ان چھوٹی لڑکیوں کے لرزتے بدنوں کی طرح' اور جڑی بوٹیوں کی تیز خوشبو' جو انسانوں کو اور جانوروں کو دیوانگی تک لے جاتی تھی' اور رائے کوٹ گلیشیئر کے نیچے چلنے والے دریا کا شور' اور اسے روک دینے والی برف کی دیوار' اور گلیشیئر کے کنارے کھڑی چٹانوں سے نکلتے جامنی رنگ کے الپائن پھول جو سرد ہوا میں تھے' اور ان پر روزانہ پچھلے پہر ایک ہلکی پھوار پڑتی تھی' اور کبھی یہ پھوار برف میں بدلتی اور پھر نانگا پربت کے سفید سینے سے اترنے والے دھند آلود برف کے تودے ... اور برچ کے سفید درختوں کے پاس پریوں کی چراگاہ میں بلند ترین جگہ کی گھاس یہ کہتی تھی کہ تم آؤ گے اور میں تمہارے خیمے اور بوجھ سے دبوں گی۔

لیکن میں نے یہ سرگوشی اور یہ سرسراہٹ نہ سنی کہ میں تو دیوسائی کے پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر پھیلے میدانوں کو عبور کرنے کے لیے سکردو کی جانب پرواز میں تھا اور نانگا پربت کے پاس جانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اور اس سفر پر میرے ساتھی نظامی صاحب اور مطیع الرحمٰن خان تھے۔

مطیع ان مولوی صاحب کا بیٹا تھا' جنہوں نے مجھے مسجد میں پہلا لفظ الف سکھایا اور اسی الف کے سہارے میں یہاں تک پہنچا۔ مطیع ایک بے چین اور گم شدہ روح ہے۔ وہ ہر چیز' ہر شے' ہر شخص' ہر کتاب اور ہر مشغلے میں دلچسپی لیتا ہے' ان کے راستے پر چلتا ہے اور پھر اکتا جاتا ہے۔ وہ ایک منتشر شخص ہے جو عبور حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن گہرائی تک پہنچنے سے پہلے ہمت ہار جاتا ہے' چنانچہ اس کے پاس دنیا جہان کے موضوعات کے بارے میں سرسری علم موجود ہے۔ وہ بہت اچھی رفاقت ہے اور اسی لئے میں نے اسے اس سفر دیوسائی پر مائل کیا۔ اور ہاں وہ ایک کامیاب انشورنس مین ہے۔

نظامی صاحب سے میری آشنائی مطیع اور اپنے ایک مشترک دوست نذیر کے حوالے سے ہے۔ وہ گجرات کے ایک کالج میں بقول کسے نوجوان نسل کو خراب کرتے ہیں' انہیں صراط مستقیم سے بھٹکاتے ہیں' طبقاتی کشمکش پر لیکچر دینے کے بعد وہ دریائے چناب میں ڈبکیاں لگاتے ہیں اور گرمیوں میں تربوز ان کا پسندیدہ پھل ہے' "اندازہ کرو" ان کا تکیہ کلام۔ ان کی بیویوں کے بارے میں خلق خدا نے بڑی کہانیاں بیان کی ہیں' ان دنوں پھر فارغ ہیں' لیکن شنید ہے کہ تین چار خواتین "ہنٹرا" چکے ہیں۔ مکروہات دنیا کے بہت قریب ہیں اور بیوقوفی سے اتنی ہی دور ہیں.... جہاں مطیع مجھ سے کچھ برس چھوٹا ہے اتنے ہی برس نظامی صاحب مجھ سے سینئر ہیں۔ قد میں نظامی صاحب بس نکلتے ہوئے رہ گئے ہیں۔

"اندازہ کرو" نظامی صاحب مجھے کہنی مار کر بولے "میم نانگا پربت دیکھنے کو کہہ رہی تھی"

"نظامی صاحب آپ نے ایک شادی انگلستان میں بھی تو کی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"آہم ...." نظامی صاحب فوراً سنجیدہ ہو گئے۔ "یہ میرا پرائیویٹ معاملہ ہے تارڑ صاحب...."

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"سوری۔" میں نے فوراً معذرت کر دی۔

"اندازہ کرو' ابھی سفر شروع ہوا ہے اور یہ ذاتی معاملات پر ...." وہ بڑبڑائے۔

میں نے ایک مرتبہ پھر ایک اور معذرت بھری "سوری" پیش کی اور تب وہ ہلکے سے مسکرائے اور کہنے لگے "آپ تو وہاں ولایت میں عاشقی معشوقی کرتے رہے لیکن کی تھی شادی ہم نے .... پوچھو کیا پوچھتا ہے"۔

"کچھ نہیں...." میں نے جھلا کر کہا۔

"اندازہ کرو" وہ پھر بولے۔

"کیا اندازہ کروں؟"

"ایئرہوسٹس کی عمر کتنی ہو گی؟" .... اور ایئرہوسٹس ناشتے کی ٹرے ہر مسافر کے آگے رکھتی چلی آتی تھی۔ ناشتے میں سینڈوچز اور کافی شامل تھے۔

مطیع اور نظامی نے میری جانب دیکھا۔

"میں نے تو عرض کیا تھا"۔ میں نے کندھے سکیڑ کر فرانسیسی انداز میں کہا اور گرم کافی کی ایک چسکی لی۔

اور عرض میں نے ان دونوں کی خدمت میں آج صبح راولپنڈی میں کیا تھا۔

سکردو کے لیے فلائٹ کا وقت ساڑھے چھ بجے صبح تھا۔ ہمیں پانچ بجے ایئرپورٹ پر حاضر ہونا تھا۔ ساڑھے چار بجے جب ہم بیدار ہو کر تیار ہوئے اور عازم ایئرپورٹ ہونے کو تھے کہ نظامی صاحب نے پوائنٹ آف آرڈر اٹھایا۔ "میں نے کہا تارڑ صاحب" انہوں نے اپنے پیٹ پر بھوکے فقیر کی طرح ہتھیلی تھپ تھپ کرتے ہوئے کہا "باؤشاہو' ناشتے کے بغیر سکردو لے جاتے ہو۔ ادھر خیر سے راجہ بازار میں حلوہ پوڑی بڑی اعلیٰ ملتی ہے' وہ ذرا پہلے نوش کر لیں"

میں نے سراسیمہ ہو کر گھڑی پر نگاہ ڈالی "ہمیں پانچ بجے ایئرپورٹ پہنچنا ہے اور ...."

"ناشتے کے بغیر؟ .... نہ جی .... یہ نہیں ہو سکتا"

"ناشتہ شاید ہمیں جہاز پر بھی دیا جائے اور ...."

"شاید والی بات ہے ناں" نظامی صاحب نے فیصلہ دے دیا۔ "مجھے تو آپ یہیں پنڈی میں چھوڑ جائیں' اگر آپ نے بعد میں بھی کھانے پینے پر اعتراض کرنا ہے تو۔ آپ چلے جاؤ سکردو"

چنانچہ ہم اپنے اصل راستے سے الگ ہو کر پوڑیاں کھانے کے لیے چلے گئے اور تمام عرصہ میری نظریں گھڑی پر لگی رہیں۔ ہم نے آج صبح کی نشستیں بڑی مشکل اور بڑی سفارشوں سے حاصل کی تھیں اور میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ یہ شخص سکردو فلائٹ کے مقابلے میں تین پوڑیوں اور حلوے کی پلیٹ کو زیادہ اہمیت دے رہا ہے۔ بہرحال ناشتے سے فارغ ہوئے تو مطیع نے پوائنٹ آف آرڈر اٹھا دیا "سکردو میں تربوز ہوتے ہیں؟"

"پتا نہیں۔" میں نے بے صبری سے کہا۔ "ہمیں اب ایئرپورٹ ...."

"یہ تربوزوں والا آئیڈیا بھی اچھا ہے" نظامی صاحب فوراً بولے "مطیع ٹھیک کہتا ہے"

"حرج ہی کیا ہے" نظامی صاحب لاپروائی سے بولے۔

"ویسے بلتستان کی خوبانیاں اور سیب بہت مشہور ہیں اور ...."

"تربوز' تربوز ہوتا ہے باؤشاہو' اور خوبانی کے ساتھ اس کا کیا مقابلہ ... تربوز ہو درمیانے سائز کا' مدینے والا' اور چناب دریا میں صرف دس منٹ تک اسے ڈبوئے رکھو اور پھر کھاؤ تو باؤشاہو جنت کا میوہ ہے۔"

"آپ تو جنت پر یقین نہیں رکھتے"

"پر میں جنت کے میووں پر تو یقین رکھتا ہوں تارڑ صاحب"

میں نے سوچا اگر یہی حالات رہے تو ہمارا ویو سائی ایڈونچر یہیں پنڈی کی صبح میں ساڑھے پانچ بجے ہی فزل آؤٹ ہو جائے گا' اس لیے اب یا کبھی نہیں والا فیصلہ کر لینا چاہیے۔

"حضرات چونکہ میں نے اپنے آپ کو اس مہم کا لیڈر مقرر کر لیا ہے۔ اس لیے میرا فیصلہ یہ ہے کہ فی الحال نو تربوز.... اور فی الحال ایئرپورٹ"

"سکردو میں آم ہوتے ہیں؟" مطیع پھر بولا۔

"بالکل ہوتے ہیں تم چلو تو سہی" میں نے اسے تسلی دی اور یوں ہم عین وقت پر ایئرپورٹ پہنچے اور سکردو فلائٹ کے مسافر ہوئے۔

"میں نے تو عرض کیا تھا"۔ میں نے کندھے سکیڑ کر فرانسیسی انداز میں کہا اور گرم کافی کی ایک چسکی لی "کہ ناشتہ ہمیں شاید جہاز پر بھی دیا جائے"۔

یہ ایک عجیب کیف آور احساس تھا جو سرایت کرتا تھا بدن کے پوروں میں اور ان حصوں میں جو خاص کیفیتوں میں زندہ ہوتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ زندگی کی پھونک

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

کتنی بڑی نعمت ہے' اور خاص طور پر اس لمحے جب .... نیچے ایک برف کدہ ہو .... ایک ویرانی ہو اور وہ بلندیوں پر ہو اور ان سے بلند وہ جہاز ہو جس میں آپ کندھے سکیڑ کر کافی کی ایک چسکی لیتے ہوں۔ نیچے وادیاں تھیں' برف کی ایک خاموش دنیا تھی جو گزرتی جاتی تھی' اور ان میں ایک بلند چوٹی تھی اور وہاں تھوڑی سی جگہ تھی' اور مجھے خیال آیا کہ شاید یہاں کوئی نہ آیا ہو' کبھی بھی وہاں کسی نے قدم نہ رکھا ہو اور میں نے خواہش کی کہ آئندہ بھی وہاں کوئی بشر نہ پہنچے.... کچھ چوٹیاں انسانوں کے قدموں کے بغیر رہنی چاہئیں .... اس زمانے میں دنیا کا مشہور کوہ پیما میسنر ہے جس کا تعلق اطالیہ سے ہے۔ یہ شخص کوہ پیمائی کا ایک معجزہ ہے' ایک عجوبہ ہے۔ ایک تو وہ تن تنہا چوٹی تک پہنچتا ہے یعنی وہ خود ہی پوری مہم ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ بلند ترین چوٹی ایورسٹ پر بھی وہ آکسیجن کے بغیر جاتا ہے کیونکہ اس کے پھیپھڑوں میں قدرت کی طرف سے ایسی گنجائش رکھی گئی ہے کہ وہ بلندی پر بھی کام کرتے رہتے ہیں اور عام لوگوں کی طرح منہدم ہو کر موت کا باعث نہیں بنتے۔ میسنر نے دنیا کی تقریباً تمام بلند ترین چوٹیوں کو اپنے قدموں تلے روندا ہے۔ پچھلے دنوں یہ مہم جو چین کے ہولناک صحرا تکلا مکان میں تنہا چلا گیا تھا۔ اسی میسنر کو میں نے پاکستان ٹیلی ویژن پر دیکھا اور وہ کہہ رہا تھا کہ میں ایک بہادر کوہ پیما نہیں ہوں کیونکہ پہاڑوں میں بہادری دکھانے والا کوہ پیما ایک مردہ کوہ پیما ہو سکتا ہے' اسے ایک احتیاط پسند شخص ہونا چاہئے اور اس نے یہ بیان دیا کہ پاکستان کے شمالی علاقے میرے پسندیدہ ترین ہیں اگر میرے بس میں ہوتا تو میں ان تمام علاقوں کو محفوظ شدہ علاقے قرار دے دیتا' اور ان کے اندر جدید طرز زندگی کو سرایت نہ کرنے دیتا' صرف اس لئے کہ اگر آج سے سینکڑوں برس بعد جب دنیا فیکٹریوں کے دھوئیں کی لپیٹ میں ہوگی اور انسان مکمل طور پر مشینیں بن چکے ہوں گے' تب اگر کوئی بچہ اپنے باپ سے یہ کہے کہ ابو جب اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا تخلیق کی تھی تو یہ کیسی تھی؟ تو وہ باپ بیٹے کی انگلی تھام کر اسے پاکستان کے ان شاندار علاقوں میں لے آئے اور کہے "بیٹا جب اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا بنائی تو ایسی تھی"

اور جہاز کے نیچے جو ویران برف زار تھے' اور ان میں جو خاموشی تھی وہ بھی یہی کہتی تھی کہ ہاں ہم ابھی تخلیق ہوئے ہیں....

اور ہم دیوسائی میدان کو ہی عبور کرنے کے ارادے سے کیوں گھر سے نکلے

تھے' اور سکردو جا رہے تھے؟

اس میدان کے بارے میں مجھے پہلی بار ثروت علی نے بتایا اور اس نے اسے جیپ میں عبور کیا تھا' پھر اس میدان کے حیرت انگیز قصے کئی کوہ پیماؤں نے سنائے۔ راجہ چنگیز سلطان نے مجھے اس کی بلندی پر واقع ایک جھیل کی تصویر دکھائی جس کے پانیوں پر "اللہ" کا لفظ لکھا دکھائی دے رہا تھا' یقیناً یہ اس کے گہرے پانیوں کی سیاہی کا کرشمہ تھا لیکن دل میں خواہش تو اٹھتی ہے اسے دیکھنے کے لیے' پندرہ سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر دیوسائی میدان میں پھول ہیں جو کم لوگوں نے دیکھے ہوں گے' اور ریچھ ہیں جو مچھلیوں کا شکار کرتے ہیں اور وہاں تیز اور سرد ہوائیں چلتی ہیں' اور گرمیوں میں بھی رات کو درجہ حرارت نقطۂ انجماد تک گر جاتا ہے' البتہ اسے عبور کرنے کے لیے مشقت اور دل پر جبر لازمی تھا کیونکہ راستے میں مشکلیں بہت تھیں' اور وہ آسان نہیں ہو سکتی تھیں۔ یہ میدان ہمیشہ برف سے ڈھکا رہتا ہے' اور سال میں صرف دو ڈھائی مہینے ایسے ہوتے ہیں جن میں اسے عبور کیا جا سکتا ہے اور کیسے پتا چلتا ہے کہ دیوسائی کی برفیں پگھل چکی ہیں اور اسے عبور کیا جا سکتا ہے.... اس کے بارے میں بڑی خوبصورت حکایت ہے۔ صدیوں سے بکروال یا چرواہے اس میدان میں نشوونما پانے والی لمبی گھاس اور ہریاول کے لیے اپنے جانوروں کے ہمراہ ادھر آتے ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ آگے برف ہے تو وہ برف کی حد پر قیام کرتے ہیں پھر جوں جوں برف پگھلتی ہے اور پیچھے ہٹتی ہے وہ اس کے ساتھ ساتھ حرکت کرتے رہتے ہیں اور پھر ایک روز وہ جھیل صد پارہ کے قریب اتر کر سکردو میں پہنچ جاتے ہیں' اور ان کو دیکھتے ہی لوگ جان جاتے ہیں کہ دیوسائی میدان میں برف پگھل چکی ہے۔

ہمارے جہاز کی زیادہ تر آبادی غیر ملکی تھی بلکہ یہ جہاز تقریباً ان لوگوں نے ریزرو کروا رکھا تھا اور ہم تین سکیٹیرز کو تو صرف سفارش کی وجہ سے جگہ مل سکی تھی۔ کسی سفری ادارے نے "ہمالین مراتھن" کے نام سے ایک دوڑ کا انتظام کر رکھا تھا جو سکردو سے شروع ہو کر "کے ٹو" جانے والے راستے پر واقع کسی قصبے تک اختتام کو پہنچتی تھی' اور اسی سلسلے میں سولہ سے ستر سال تک کی میمیں اور صاحب نیکریں اور بنیانیں زیب تن کئے تیار بیٹھے تھے اور ان کی بنیانوں پر "ہمالین مراتھن" سرخ روشنائی سے لکھا تھا اور چمکتا تھا۔ یہ کوئی بچ مچ سنجیدہ قسم کی دوڑ نہیں تھی بلکہ ذرا شغل میلہ تھا تاکہ ان علاقوں کی جانب دنیا کی توجہ مبذول کرائی جائے۔ میں نے

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ میں اپنے بے ہنگم جسم اور بے ربط سانس سمیت اس دوڑ میں شامل ہوں گا اور ایک عدد تصویر کے اترنے کے بعد دوڑ سے ریٹائر ہو جاؤں گا' بعد میں یہ تصویر میری خودنوشت میں چھپے گی' اور اس کے نیچے لکھی ہوئی عبارت کچھ یوں ہو گی "مصنف دنیا کی دشوار ترین دوڑ ہمالین مراتھن میں پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے' دائیں جانب بی بی سی لنڈن کا کیمرہ مین ان کے فاتحانہ انداز کو قلم بند کر رہا ہے۔" اور یہ تھا بھی درست کہ بی بی سی ٹیلیویژن کی ٹیم اس دوڑ کو کور کرنے کے لیے سکردو پہنچ رہی تھی۔ چنانچہ یہ طے تھا کہ میں اس دوڑ میں بہرصورت شامل ہو رہا تھا۔ اگر نانگا پربت والی ستر سالہ مائی اس میں حصہ لے سکتی تھی تو اس کی نسبت ابھی تو میں جوان تھا۔

سکردو اور بلتستان کو میں بہت اچھی طرح نہیں جانتا تھا کیونکہ اس علاقے کے بارے میں کوئی داستان یا متھ نہ تھی۔ کتابیں کم تھیں۔ جو کوئی بھی شمال کی بات کرتا' صرف ہنزہ اور گلگت کا تذکرہ کرتا۔ سکردو کو ایک غریب رشتے دار کی طرح بھلا دیا جاتا۔ اس میں کچھ قصور یہاں کے باشندوں کا بھی تھا کہ وہ اتنے دھیمے اور شریف الطبع ہیں کہ اپنے علاقے کے بارے میں کچھ کہنے سے جھجکتے ہیں ذرا شرمیلے ہیں کہ اپنے وطن کی اپنے منہ سے کوئی کیا تعریف کرے۔

سکردو میں میں قیام کے دوران ایک بلتی دوست کہنے لگا۔ "تارڑ صاحب ہماری غلطی صرف یہ ہے کہ ہم نے ہنزہ کے باشندوں کی طرح اپنے علاقے کے بارے میں غیر حقیقی داستانیں نہیں بنائیں۔۔۔ ہمیں اشتہار بازی کا فن نہیں آتا۔ ہم نے غیر ملکیوں سے تعلقات اچھے نہیں رکھے اور ہم مار کھا گئے۔ آپ یہ بتایئے ہنزہ میں ہے کیا؟ کیا ہنزہ ایک متھ نہیں ہے۔۔۔؟ کیا وہاں غیر ملکیوں کے علاوہ مقامی سیاحوں کو اچھوت نہیں سمجھا جاتا؟ ہنزہ میں سے کریم آباد کے پرانے قلعے کے ایک منظر کو نکال دیجئے تو باقی کیا بچتا ہے۔ راکاپوشی بھی ریاست نگر میں ہے۔ شمال تو بلتستان ہے۔ کے ٹو کی چوٹی کدھر ہے اور مشہ برم کہاں ہے اور سیاچین کس علاقے میں ہے۔ آپ نے بھی کتاب لکھی تو ہنزہ کے بارے میں ہی لکھی"

میرا خیال ہے کہ بلتی دوست قدرے جذباتی ہو رہا تھا لیکن اس کے جذبات کی گرمی کو منفی کرنے کے بعد بھی بہرطور کچھ حقائق باقی رہ جاتے تھے۔ بلتستان بے توجہی کا شکار ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قراقرم ہائی وے' اُدھر گلگت سے اُدھر

ہنزہ اور اُدھر ہی سے درہ خنجراب' اِدھر نہیں آتی اور اگر کوئی آئے تو خاص طور پر آئے۔ اور آئے تب اگر اسے کوئی بتائے کہ بلتستان بھی ہے عالم میں انتخاب۔۔۔ اور کوئی اسے بتاتا نہیں' سب لوگ ہنزہ اور خنجراب کا ہی تذکرہ کرتے ہیں۔

ایک زمانے میں جب میں اپنی بچوں کی دکان پر بیٹھا کرتا تھا تو بریگیڈیئر اسلم خان ہمارے ہاں آیا کرتے تھے' وہ بتایا کرتے تھے سکردو میں' میں نے ایک جھیل کنارا خریدا ہے اور میں وہاں پھول اگانا چاہتا ہوں اور اگر ہو سکے تو جھیل میں سنگھاڑے کاشت کرنا چاہتا ہوں اور جھیل کے کنارے میں نے ایک ڈکوٹا جہاز کا ڈھانچہ ایستادہ کر رکھا ہے اور وہاں میری رہائش ہوتی ہے۔ بہت بعد میں جب میں شمال میں گیا تو معلوم ہوا کہ بریگیڈیئر اسلم خان ان علاقوں میں بہت جانے جاتے ہیں' اور وہ ایک ایسی شخصیت ہیں' جن کے بارے میں ہر قسم کی گفتگو ہوتی ہے۔ سکردو کا شنگریلا ٹورسٹ ریسارٹ ان ہی کی ملکیت ہے۔ بلتستان سے ہی عبدالکریم بلغاری آیا کرتے تھے' اور ہمیشہ کہتے تھے تارڑ صاحب آپ دنیا دیکھ آئے' سکردو کیوں نہیں دیکھتے' میرا خیال تھا کہ لغاری کی طرح بلغاری بھی کوئی ذات ہے لیکن بعد میں کھلا کہ وادی خپلو کے راستے میں ایک کوہستانی گاؤں بلغار نام کا ہے اور وہاں کے باشندے اپنے آپ کو بلغاری لکھتے ہیں۔

کسی سے پوچھا کہ بلتستان ہے کیا؟ جواب ملا' پانچ وادیاں'۔۔۔ شگر' سکردو' روندو' خپلو اور خرمنگ۔

کسی نے کہا کہ بلتستان تو دراصل تین چیزوں کا نام ہے۔ کے ٹو کا پہاڑ' سیاچین کا گلیشیئر اور دریائے سندھ کا راستہ۔

اور ایک صاحب مسکرائے اور کہنے لگے کہ پریاں اور نمکین چائے بلتستان ہے۔

جہاز کو ایک دھچکا سا لگا۔۔۔

"جل تو جلال تو۔۔۔" نظامی صاحب جو اس دوران اونگھ چکے تھے فوراً بیدار ہو گئے "اندازہ کرو' یہ جہاز چلانے کا طریقہ ہے"

"میرا خیال ہے کہ ہم اترنے والے ہیں اور پائلٹ نے پہیئے نکالے ہیں"

برف کدہ اب وہاں نہیں تھا۔ اب وہاں ایک وسیع وادی دکھائی دیتی تھی' ویران اور ریتلی۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

ایک واقف کار نے سکردو سے واپسی پر بتایا کہ گورنمنٹ کالج سکردو کے پرنسپل خواجہ مرداد نے لائبریری میں تمہاری کتابوں کا ایک خصوصی سیکشن بنا رکھا ہے۔ تمہارا ذکر بہت کرتے ہیں چنانچہ میں نے ایک سرسری سا نامہ ان کے نام لاہور سے بھیج دیا کہ شاید یہ خاکسار ان تاریخوں کے آس پاس سکردو آئے تو آپ سے ملاقات کرے۔

جہاز کو ایک اور دھچکا لگا۔

"اس پائلٹ کو سمجھاؤ یار یہ کیا کر رہا ہے؟" نظامی صاحب نے مجھے ڈانٹا۔

"پائلٹ اس وقت لینڈ کر رہا ہے' میں اسے اس وقت نہیں سمجھا سکتا"

کھڑکی میں سے نیلگوں پہاڑوں کا ایک سلسلہ گزرتا تھا' اور ان کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔

جہاز رکا اور مسافر اترنے لگے۔

باہر ایک وسیع وادی تھی' اور دور اس کے ریتلے اور ویران میدانوں سے پرے پہاڑ بلند ہوتے تھے اور ان پر سفیدی تھی جو آسمان کی نیلاہٹ میں گھلتی جاتی تھی' اور ہوا تیز تھی اور جب میں نے اسے اپنے بدن میں اتارا تو یہ بہت مختلف تھی' یہ سرد اور فرش پر گرنے والے خالی کٹورے کی طرح کھنکتی تھی۔ اس میں ایک دھلی ہوئی ٹھنڈک تھی' یا شاید خنک ٹھنڈک تھی' بس ایسے تھی جیسے صحرا کی سرد رات کا آغاز ہوتا ہے۔ سکردو آتے ہوئے لامحالہ گلگت ذہن میں تھا لیکن یہ جگہ اور تھی' اس کی آب و ہوا اور اس کی بناوٹ اور اس کا پھیلاؤ مختلف تھا۔ گلگت تنگ تھا' چٹانوں میں گھرا ہوا اور اس کے موسم سخت تھے' اور سکردو میں وسعت تھی اور اس کی ہوا کسی برفانی ندی میں نہائے ہوئے بدن کے لمس کی طرح زندگی دیتی تھی۔ میں نے منہ کھول کر ایک گہرا سانس لیا۔

نظامی صاحب میرے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے' انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا' "آپ کو دمے کی تکلیف ہے تارڑ صاحب؟"

"نہیں تو ۔۔۔"

"تو پھر منہ کھول کر ہانپتے ہوئے سانس کیوں لے رہے ہو' نیچے اترو سیڑھی سے' پیچھے میمیں آ رہی ہیں۔"

"اور مطیع کہاں ہے؟"

مطیع کا ایک شوق دست شناسی بھی ہے اور اس نے باقاعدہ اس کی تعلیم حاصل کی تھی' اس کا اپنا بیان ہے کہ اسے دست شناسی میں بہت بلند مقام حاصل ہے۔ کل کلاں اگر انشورنس کا کاروبار ٹھپ ہو جائے تو وہ پروفیسر مطیع الرحمٰن خان عامل نجومی کا بورڈ لگا کر باآسانی اپنی روزی کما سکتا ہے۔ اس کا یہ شوق اتنا شدید ہے کہ وہ کہیں بھی کسی بھی جگہ صرف اپنے ہاتھوں کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتا اور اسے ان ہاتھوں میں کسی اور کا ہاتھ چاہئے ۔۔۔ چنانچہ وہ زبردستی ہاتھ دیکھنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔

اور مطیع جہاز کی سیڑھی سے یوں اترتا آ رہا تھا کہ اس کے ایک ہاتھ میں ایک موٹی جرمن خاتون کا ہاتھ تھا جو وہ شاید چھڑانا چاہتی تھی اور وہ اپنی عینک درست کرتا اس پر جھکا مسکرا رہا تھا۔

"اندازہ کرو" نظامی صاحب نے سر ہلایا۔

سکردو ایئرپورٹ کی عمارت اتنی مختصر تھی کہ اگر آپ اپنے دھیان میں جہاز کی سیڑھی سے اتریں اور میری طرح بوتھی اٹھائے لمبے لمبے سانس لینے لگیں تو اتنی دیر میں آپ ایئرپورٹ سے باہر سڑک پر نظر آ جائیں گے۔ کسی برانچ لائن پر پڑے ہوئے ایک چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن کی طرح فلائٹ آ جانے پر یہ ایئرپورٹ وقتی طور پر آباد ہوتا تھا اور پھر اس پر تیز ریتلی ہوائیں چلنے لگتی تھی۔ ایئرپورٹ کے ہال کمرے میں مسافر اپنا اپنا سامان تلاش کر رہے تھے۔ ایک تیز اور تیکھے نین نقش والے گورے چٹے اور قد میں نکلتے ہوئے نوجوان نے مجھے غور سے دیکھا اور کہنے لگا۔ "تارڑ صاحب۔۔۔ آیئے۔۔۔"

میں اس نوجوان کو بالکل نہیں جانتا تھا۔ "کہاں آیئے؟"

"خواجہ مرداد۔۔۔" اس نے کہا۔

"اچھا اچھا۔" میں نے اس کے کندھے پر ایک بزرگی سے بھرپور تھپکی دی۔ "آپ کو خواجہ صاحب نے بھیجا ہے۔"

"میں اپنے آپ کو خود کیسے بھیج سکتا ہوں۔" نوجوان مسکرایا۔ "میرا نام خواجہ مرداد ہے۔"

میں نے فوری طور پر اپنے بے تکلفانہ رویے کی معذرت کی اور پھر مطیع اور نظامی صاحب کا تعارف کروایا۔

ہم ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر آ گئے۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"خواجہ صاحب ہم بنیادی طور پر دیوسائی میدان دیکھنے کے لیے گھر سے نکلے ہیں فی الحال کسی مناسب ہوٹل کا پتا بتا دیجئے' اور یہ فرمائیں کہ ملاقات کب ہو گی؟"

"تارڑ صاحب ہم ایک دوسرے سے بچھڑیں گے تو ملاقات ہو گی ناں" انہوں نے میرا بازو پکڑ کر کہا۔ "اب آپ ہمارے قبضہ قدرت میں ہیں' آیئے۔"

مجھ میں ایک جھجک تھی "لیکن... میرا مطلب ہے...."

"تکلف بعد میں کر لیجئے گا فی الحال اس جیپ میں تشریف رکھیے تاکہ ہم سکردو جا سکیں۔"

"تو کیا ہم سکردو میں نہیں ہیں"؟ نظامی صاحب نے ذرا فکرمند ہو کر پوچھا۔ "کہیں اور تو نہیں اتر گئے؟"

"شہر یہاں سے کچھ فاصلے پر ہے۔" خواجہ صاحب نے ڈرائیور کو اشارہ کیا' اور ہم ایئرپورٹ سے نکل کر ایک ہموار راستے پر آ گئے' جس کے ایک جانب وہی نیلگوں بلندیاں تھیں جو ہم نے جہاز سے دیکھی تھیں اور دوسری جانب ایک نیم صحرائی لینڈ سکیپ سے بہت پرے دریائے سندھ پھیلا ہوا تھا' اور اس منظر کا پھیلاؤ مجھے حیران کرتا تھا۔ یہاں ایک ایسی بیابان وحشت تھی جو کہتی تھی کہ میں آبادی کے لیے نہیں ہوں اور اس کے باوجود یہاں انسان آباد تھا لیکن ذرا جھک کر رہتا تھا' ان پہاڑوں کی رفعت و عظمت کے سامنے۔ شاید اسی لیے بیشتر عمارتیں یک منزلہ تھیں زمین کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ وہ قدرت کے اس وسیع منظر میں مخل نہیں ہو رہی تھیں' دستک نہیں دیتی تھیں بلکہ اس کی خاموشی میں شامل ہوتی تھیں۔

ایک خنک اور درختوں سے گھری چار دیواری کے اندر جیپ داخل ہوئی۔ ایک صاف ستھرے برآمدے میں بہت سارے لوگ کھڑے ہوئے تھے۔

"میرا سٹاف آپ سے ملاقات کی خواہش رکھتا ہے۔" خواجہ صاحب نے لاپروائی سے کہا "پہلے آپ ہمارے ساتھ چائے پئیں گے پھر آپ وہاں جائیں گے' جہاں آپ کی رہائش کا بندوبست ہے۔"

نظامی صاحب میرے قریب ہوئے "تارڑ صاحب میری ایک عادت ہے اور میں آپ جو کچھ کر لیں اس عادت سے باز نہیں آ سکتا"

اب میں ذرا ہراساں ہو گیا کہ نظامی صاحب کی وہ عادت پتا نہیں کس نوعیت کی ہے....

"عادت میری یہ ہے" وہ اپنے پیٹ پر ہاتھ سے تھپ تھپ کرتے ہوئے بولے۔ "کہ میں بادشاہو نہانے کا بڑا شوقین ہوں اور نہانے کے بغیر رہ نہیں سکتا اس لئے..." انہوں نے دونوں ہاتھ ہوا میں پرندوں کی طرح پھڑپھڑائے.... "میں تاری لگانا چاہتا ہوں"۔

"بعد میں نہیں لگ سکتی؟"

"بالکل نہیں"

میں نے شرمندہ ہو کر خواجہ صاحب سے بات کی۔ انہوں نے کندھے سکیڑ کر کہا' "نو پرابلم" اور اپنے ایک جونیئر لیکچرر کو اشارہ کیا کہ نظامی صاحب کو نہلا لاؤ۔ نظامی صاحب نے اس نوجوان کو غور سے دیکھا اور کہنے لگے۔ "برخوردار تم یہاں لیکچرر ہو ناں؟" نوجوان نے اثبات میں سرہلایا تو نظامی صاحب بولے' "میں اسسٹنٹ پروفیسر ہوں' چلو کدھر ہے غسل خانہ"

خواجہ صاحب ہمیں لائبریری میں لے گئے اور ایک کونے کی طرف اشارہ کر کے بولے۔ "وہ چند کتابیں دیکھ رہے ہیں آپ۔ بس ان کی وجہ سے ہم آپ کی عزت کرتے ہیں ورنہ آپ ہیں کیا؟"

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے بے اختیار مسکراتے ہوئے کہا۔ "ویسے آپ کیسے جان گئے تھے کہ میں آج ہی سکردو آ رہا ہوں' میرے خط میں تاریخ تو درج نہیں تھی۔"

"بس میں روزانہ ایئرپورٹ جا کر جہاز میں سے اترنے والوں کو دیکھ لیتا تھا کہ ان میں کوئی اندلس میں اجنبی یا خانہ بدوش ہے' تو ہمارے ساتھ آ جائے"

خواجہ مہرداد کچھ زیادہ ہی مہربان تھے۔ اس دوران نظامی صاحب تاری لگا کر واپس آ چکے تھے' انہوں نے میز پر سجے چائے کے تکلفات کو ایک نظر دیکھا اور کہنے لگے۔ "یار اندازہ کرو۔ کیسی عجیب بات ہے کہ ابھی صبح پانچ بجے ہم راولپنڈی میں حلوہ پوڑی کا ناشتہ کر رہے تھے۔ پھر چھبیس ہزار فٹ کی بلندی پر ناشتہ کر رہے تھے ساڑھے چھ بجے' اور اب ساڑھے آٹھ بجے یہاں سکردو میں تیسرا ناشتہ"

اس تیسرے ناشتے کے بعد ہمیں کالج کا میوزیم دکھایا گیا جس میں بلتستان کے تاریخی ہتھیار' ظروف' زیور اور ملبوسات سجے تھے۔ خواجہ صاحب نے بتایا کہ دور دراز کی وادیوں سے آنے والے طالب علم اس میوزیم کے قیام میں بے حد معاون ثابت

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

ہوئے کیونکہ وہ پہاڑی قصبوں اور دور افتادہ آبادیوں سے ایسی چیزیں لے آتے ہیں جو بلتستان کے ثقافتی ورثے کی نمائندگی کرتی ہیں۔

"یہ کیا ہے؟" نظامی صاحب نے بڑے بڑے سفید پھندنوں والی ایک سرخ ٹوپی سر پر جماتے ہوئے دریافت کیا۔

"بلتی دولہا اسے دلہن کے گھر جاتے وقت پہنتے ہیں۔۔۔" ترشنگ کے رہنے والے کریم صاحب نے بتایا۔ "اور یہ ٹوپی جو چاندی کی جھانجھروں سے سجی ہوئی ہے دلہن پہنتی ہے۔"

"اچھا؟" نظامی صاحب بے حد محظوظ ہوئے۔ "ہماری بھی تو کوئی دلہن شلمن ہونی چاہیے۔۔۔ مطیع الرحمن ذرا ادھر آ کر یہ ٹوپی تو پہن کر دکھاؤ"

مطیع جو ایک کونے میں کھڑا ایک قدیم بندوق کو غور سے دیکھ رہا تھا ہماری جانب آ گیا اور نظامی صاحب نے جھانجھروں والی ٹوپی اسے پہنا دی۔ اسے کچھ علم نہ تھا کہ اس ٹوپی کی نوعیت کیا ہے چنانچہ وہ ٹوپی پہن کر مسکرانے لگا۔

"تارڑ صاحب" نظامی صاحب نے سر ہلایا تو ان کی ٹوپی کے سفید پھندنے ٹیبل ٹینس کی گیندوں کی طرح اچھلے۔ "ذرا میری دلہن تو ملاحظہ کریں عینک والی اور مونچھوں والی۔ تصویر اتارو جی"

اور یہ تصویر آج بھی اس لمحے کی یاد دلاتی ہے۔ نظامی صاحب دولہا کی ٹوپی اوڑھے ہوئے اور مطیع دلہن کی ٹوپی میں اپنی مونچھوں سمیت۔

"اب آپ دونوں اپنے ہنی مون پر جائیں گے"۔ خواجہ صاحب ہنستے ہوئے کہنے لگے۔۔۔ "گیسٹ ہاؤس میں آپ کے لیے بکنگ ہو چکی ہے۔ آپ آرام کیجئے اور ٹھیک بارہ بجے ہم آپ کو پک کر لیں گے اور پھر لے چلیں گے۔"

"کہاں؟"

"جہاں ہماری مرضی ہوگی"

صد پارہ گولڈ

دھوپ میں تیزی تھی۔ کالج کے کمپاؤنڈ میں سفیدے کے چند درخت ابھی حال ہی میں لگائے گئے تھے اور ان کے سوا ہر سو ریت تھی جو اب تپنے لگی تھی۔ سکردو بازار خاصا طویل تھا۔ بائیں ہاتھ پر ایک بنجر پہاڑی کے اوپر سکردو کے قلعے کی دیوار دکھائی دے رہی تھی۔ بازار میں ہمیں ہمالین مراتھن میں حصہ لینے والی چند میمیں دکھائی دیں تو نظامی صاحب نے جیپ ڈرائیور کی طرف دیکھ کر کہا "اندازہ کرو" اور وہ غریب کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی اخلاقاً مسکرا دیا۔

سکردو کے سٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں ایک پر فضا اور رشک چمن قسم کا کمرہ ہمارا منتظر تھا۔ رشک چمن اس لیے کہ اس کے چھوٹے سے باغ میں سیبوں اور خوبانیوں کے درخت تھے اور ان میں سے سیب کے درخت کی ایک ٹہنی کھڑکی کھولنے سے کمرے کے اندر آ جاتی تھی۔

"واہ جی تارڑ صاحب سبحان اللہ کیا پر بہار جگہ ہے۔ کمرے کے اندر سیب کی شاخ الجھی ہوئی لٹ کی طرح پریشان ہوتی ہے" مطیع کا موڈ شاعرانہ ہو گیا۔

"اندازہ کرو تارڑ صاحب خوبانی کی شاخ کو سیب کی شاخ کہہ رہا ہے" ایک چوڑی مسکراہٹ نظامی صاحب کی چہرے پر سجی تھی۔

"خوبانی؟" مطیع کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے عینک اتار کر شیشے صاف کیے اور پھر غور سے شاخ کو دیکھا "نہیں جی' سیب ہے"

"میں شرط لگانے کو تیار ہوں کہ خوبانی ہے" نظامی صاحب نے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے قدرے سنجیدگی سے کہا "یہ دیکھو خوبانیاں ساتھ لگی ہیں"

"یہ سیب ہیں جو ابھی کچے ہیں" مطیع نے ایک مصنوعی حقارت سے کہا "آپ تربوز کھانے والے ہیں آپ کو کیا پتا کہ سیب کی ٹہنی کیسی ہوتی ہے۔ ہم مانسہرہ کے

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

رہنے والوں سے پوچھیے۔۔۔"

اس تبادلۂ خیال کے بعد ہمارے سفر کا پہلا جھگڑا ہوا۔۔۔ اور یہ آخری نہیں تھا ۔۔۔ سفر ایک ایسی چھلنی ہوتی ہے جس پر انسان کی تمام ترکیبنگی اوپر آجاتی ہے۔ اس کے تمام خول اتر جاتے ہیں اور وہ قدرے اوریجنل ہو جاتا ہے۔۔۔ اس سفر کے دوران ہم تینوں ایک دوسرے کے ساتھ کسی نہ کسی فضول اور بے مقصد مسئلے پر الجھ جاتے۔۔۔

مطیع اور نظامی صاحب تقریباً پانچ منٹ تک ایک دوسرے کو گھورتے رہے اور لگتا تھا کہ ان کے نتھنوں سے دھواں نکل رہا ہے اور پھر نظامی صاحب مسکرا کر کہنے لگے "یار تو ٹھیک کہتا ہے یہ سیب کی ٹہنی ہے"

مطیع نے اٹھ کر نظامی صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ہنستے ہوئے کہنے لگا "نہیں میرا خیال ہے یہ خوبانی ہی ہے"

"نظامی صاحب اٹھے اور پہلی بار کمرے کا تفصیلی معائنہ کیا۔ غسل خانے کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو خوش ہو گئے" "میں ایک اور تاری نہ لگا لوں؟"

"نہیں!"

"چلو نہ سہی" نظامی صاحب فوراً مان گئے حالانکہ میرا خیال تھا وہ کہیں گے "میں مر جاؤں گا لیکن ایک اور تاری ضرور لگاؤں گا۔"

"تارڑ صاحب یہ تو ہو گیا سکردو۔" نظامی صاحب اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر کسی بانکی نار کی طرح کھڑے ہو گئے۔۔۔ ایک ایسی بانکی نار جو قدرے فربہ ہو چکی ہو "اب کدھر لے کر جانا ہے ہمیں؟"

"ہاں جی سفر کی منصوبہ بندی ہونی چاہئے۔۔۔" مطیع بھی قریب آ گیا "پہلے ہم جائیں گے دیوسائی میدان ۔۔۔ اسے عبور کر کے استور اور وہاں سے وادیٔ روپل کے راستے نانگا پربت کے بیس کیمپ' کیوں تارڑ صاحب؟"

"منصوبہ تو یہی ہے۔۔۔ ابھی خواجہ صاحب تشریف لائیں گے تو ان سے درخواست کریں گے کہ ہمیں کل صبح جھیل صدپارہ کے پہلو میں سے اٹھتے ہوئے اس کچے راستے پر چھوڑ آئیں جو دیوسائی کو جاتا ہے۔۔۔"

"ویسے کیا واقعی وہاں ریچھ ہوتے ہیں؟" نظامی نے پوچھا۔

"نظامی صاحب" مطیع نے ان کے کندھے پر ایک زوردار دھپ لگائی "آپ کے ہوتے ہوئے ریچھوں کی مجال ہے کہ ہمارے قریب بھی آئیں"

نظامی صاحب نے سر ہلایا۔ "اندازہ کرو بزرگوں سے مذاق کرتا ہے۔۔۔"

پورے بارہ بجے خواجہ صاحب جیپ کے ساتھ نازل ہو گئے۔ "چلیں جی؟"

"کہاں؟"

"جہاں ہم لے چلیں"

سکردو کی دھوپ اثر کرتی تھی۔ جیپ پاپلر کے درختوں کے نیچے سے گزرتی تو ہوا خنک ہو جاتی اور کپکپی سی آتی۔ مجھے سکردو کے پھیلاؤ نے متاثر کیا۔ سندھ شہر سے ذرا ہٹ کر تھا اور کتنے اطمینان اور ٹھہراؤ سے ایک وسیع رقبے میں پھیلتا تھا۔ تیز ہوا اس کے کناروں کی ریت پر سرسراتی تھی اور اس کے پانیوں پر تیزی سے تیرتی تھی۔ ایک چھوٹا سا راستہ الگ ہو کر اوپر جاتا تھا اور اس کے آغاز پر "کے ٹو موٹل" کا بورڈ آویزاں تھا۔ میرا چھوٹا بھائی لیفٹیننٹ کرنل مبشر بھی ایک آوارہ گرد اور کوہ پیما ہے' وہ اب تک ایک امریکی اور ایک اطالوی کوہ پیما ٹیم کے ساتھ رابطہ افسر کے طور پر کے ٹو اور تریچ میر کے بیس کیمپ تک جا چکا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ بھائی جان سکردو میں کے ٹو موٹل کی فضا آوارہ گرد لوگوں کے لیے باقاعدہ ہیجان خیز ہے۔ کوہ پیمائی اور مہم جوئی کے جو کردار اس موٹل میں ملتے ہیں' کہیں اور نہیں ملتے' وہاں کی ہوا میں ایڈونچر ہے' وہاں جھانک ضرور لیجئے گا۔

"کیا ہم تھوڑی دیر کے لیے کے ٹو موٹل میں جھانک سکتے ہیں؟" میں نے خواجہ صاحب کے کان میں سرگوشی کی۔

"کیوں کیا وہاں حسینائیں رہتی ہیں؟" انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔۔۔ "کیوں نہیں جھانک سکتے ۔۔۔" انہوں نے ڈرائیور کو اوپر جانے کا اشارہ کیا۔

کچھ برس پیشتر ایک واقف کار رات کے وقت سکردو کے "کے ٹو موٹل" میں پہنچے۔ معلوم ہوا کہ موٹل کے برآمدوں میں بھی جگہ نہیں ہے۔ اب اس وقت کہاں مارے مارے پھرتے اور اگر پھرتے بھی تو سکردو جیسے شہر میں قیام گاہیں ذرا کم ہی ہیں۔ ان کے پاس خیمہ تھا' منیجر سے پوچھا کہ کیا موٹل کے مختصر باغیچے میں خیمہ لگایا جا سکتا ہے۔ انہیں اس شرط پر اجازت ملی کہ وہ موٹل کے غسل خانے استعمال نہیں کریں گے کیونکہ ان کے سامنے پیٹ پر ہاتھ رکھے ان کوہ پیماؤں کی قطاریں لگی رہتی تھیں جنہیں سکردو پہنچتے ہی ڈائریا لاحق ہو چکا تھا۔ ان واقف کار کو بتایا گیا تھا کہ دریائے سندھ "کے ٹو موٹل" کے ساتھ ہی بہتا ہے۔ انہوں نے سوچا ٹھیک ہے' کوئی غسل خانہ نہ سہی' دریائے سندھ جو ساتھ ہے اور جس کی آواز انہیں تاریکی میں آ رہی تھی

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

چنانچہ وہ خیمہ زن ہو گئے۔ اگلی سویر بیدار ہوئے' منہ ہاتھ دھونے اور دیگر ضروریات سے فارغ ہونے کے لیے کندھے پر تولیہ ڈالے ہاتھ میں دانتوں کا برش تھامے خیمے سے باہر نکلے اور پوچھا دریائے سندھ کہاں ہے؟ بتایا گیا کہ ذرا ادھر جھانک کر دیکھیے انہوں نے جھانکا تو ایک گہری کھڈ کے نیچے بہت نیچے دریائے سندھ اطمینان سے بہتا تھا۔ اور وہاں تک پہنچنے کے لیے نائیلون کا ایک رسہ' چٹانوں میں گاڑنے والی میخیں اور ایک بہت بڑا حوصلہ درکار تھا۔ چنانچہ انہوں نے دانت صاف کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

کے ٹو موٹل واقعی وہی کچھ تھا جو بشیر نے بتایا تھا۔ وہاں جتنے مسافر تھے وہ آس پاس نہیں دیکھ رہے تھے بلکہ ان کی نگاہیں ان چوٹیوں پر تھیں جنہیں سر کرنے کی خواہش میں وہ گھروں سے نکلے تھے۔ ان کے لباس اور حلیے مختلف تھے' جیسے وہ کسی اور سیارے کی مخلوق ہوں' زمین کے نہ ہوں' اور یہ حقیقت ہے کہ آوارہ گرد اور کوہ پیما اس سیارے کی مخلوق نہیں ہوتے۔ کیونکہ زمینی مخلوق کی طرح ان کی زندگی کا جواز مالی منفعت کے پیمانے میں تولا نہیں جا سکتا ... ان کے پاس اپنی اس "بے مصرف" زندگی کا کوئی جواز نہیں ہوتا۔ موٹل کے باغیچے میں بھی خیمے لگے ہوئے تھے اور دریائے سندھ واقعی نیچے تھا' بہت نیچے اور وہاں جھانکنا بھی خطرناک تھا۔ مہم جوئی کی اس رونق میں سب سے زیادہ بھاگ دوڑ وہ پورٹر اور گائیڈ کر رہے تھے جو کسی نہ کسی مہم کے ساتھ وابستہ ہونے کی خواہش میں یہاں آئے تھے۔ سردیوں میں شمال سرد ہوتا ہے اور یہاں کے باشندے سر نیچا کر کے وہ موسم گزارتے ہیں۔ ٹیلیویژن پر ایک ڈرائیور نے ایک روز مجھ سے کہا کہ میں اس کے صاحب سے سفارش کر دوں کہ اسے دس روز کی چھٹی دے دی جائے کیونکہ اسے سکردو کے قریب ایک پہاڑی قصبے میں جا کر اپنے گھر والوں کے ہمراہ سردیوں کے لیے لکڑیوں کا بندوبست کرنا ہے اور اگر وہ بروقت پورے موسم کے لیے لکڑیاں جمع نہ کر سکا تو یقیناً اس کے خاندان کا کوئی نہ کوئی فرد شدید موسم کا شکار ہو جائے گا... سردیوں کے بعد جب موسم کھلتا ہے تو ان علاقوں میں کوہ پیمائی اور ٹریکنگ کے لیے سیاح آنے لگتے ہیں اور انہیں سامان اٹھانے کے لیے پورٹر اور راستہ دکھانے کے لیے گائیڈ' اور کھانا پکانے کے لیے باورچی درکار ہوتے ہیں اور اکثر بلتی ان تینوں کاموں کے ایکسپرٹ ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ گائیڈ کا کام صرف چند لوگ ہی سرانجام دیں بلکہ بے شمار طالب علم اور اساتذہ بھی بڑی خوشی سے اور بڑی چاہت سے اس قسم کے کام تلاش کرتے ہیں'

ہنزہ کی سیر اور مناسب روزی کا بھی بندوبست ... ہاتھ سے جنت نہ گئی۔ چونکہ ہنزہ اور نگر کی نسبت بلند ترین پہاڑ اور گلیشیئر بلتستان میں زیادہ ہیں اس لیے کوہ پیماؤں کا رخ بھی ادھر ہی کو ہوتا ہے۔ یوں ہنزہ اور نگر کے پورٹر اور گائیڈ بھی موسم کے آغاز میں سکردو پر نظر رکھنے لگتے ہیں۔ موٹل کے باغیچے میں چند کوہ پیما ایک ایسے شخص سے محو گفتگو تھے جس کی شکل مجھے جانی پہچانی لگی... دو برس پیشتر گلگت سے ہنزہ جاتے ہوئے ویگن میں اس کے ساتھ ملاقات ہوئی تھی اور پھر اس نے مجھے اور سلجوق کو پتو کے گاؤں میں ایک شب اپنے گھر چائے کے لیے مدعو کیا تھا اور اس شب پتو گلیشیئر سے آتی ہوئی ہوا میں ایک وحشت ناک تندی تھی جو دل کو ڈراتی تھی اور ہم گیس کی روشنی میں اس کے کوہ پیمائی کے تجربوں کے بارے میں گفتگو کرتے رہے تھے۔ وہ ایک پورٹر اور گنگ تھا اور اس کا نام ہنر بیگ تھا۔

"ہنر بیگ" میں نے ایک پرمسرت آواز میں اسے پکارا۔ وہ چونکا' میری جانب آیا اور اس کے لکڑی ایسے بے تاثر چہرے پر کچھ نہ تھا اور پھر یکدم جیسے وہ چہرہ اس کی مسکراہٹ سے موم ہونے لگا۔ "صاحب ... آپ؟ آپ سکردو میں" وہ بے یقینی سے سر جھٹکتا تھا اور کہتا تھا "صاحب آپ یہاں سکردو میں..."

"جس طرح تم یہاں سکردو میں اس طرح ہم یہاں سکردو میں ..." میں نے کہا۔

"میں تو صاحب روزگار کی تلاش میں آیا ہوں۔ اس ایکسپیڈیشن والوں سے بات ہو رہی ہے شاید روزی کا کوئی بندوبست ہو جائے... ہاں سلجوق کہاں ہے؟" اس نے یکدم چونک کر کہا۔

"وہ نہیں آیا ———"

"صاحب اس کو میرا سلام بولنا ... اور ادھر ہماری طرف پتو میں آؤ تو ضرور ملنا صاحب..."

ہنر بیگ مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہنے لگا۔ "اور صاحب شمشال کب چلنا ہے؟ آپ میرے ساتھ جاؤ گے؟"

"شمشال بہت مشکل ہے ہنر بیگ اور صاحب ذرا اب بوڑھا ہو رہا ہے"

"نہیں صاحب" اس نے پھر سر جھٹکا۔

"ہاں صاحب" میں نے کہا اور پھر اس سے اجازت چاہی' اس وعدے کے ساتھ کہ کبھی نہ کبھی ہم دونوں وادیٔ شمشال کو جائیں گے۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

مطیع نے اس دوران ایک کوہ پیما کو قابو کر لیا تھا اور اس کا ہاتھ دیکھ رہا تھا' کوہ پیما نہایت انہماک سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

چند کوہ پیما خواتین قدرے مختصر لباس میں موٹل کے اندر سے آئیں۔ نظامی صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور خواجہ صاحب سے کہنے لگے۔ "بادشاہو ہمیں کہاں ٹھہرا دیا ہے سٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں وہاں تو کمرے کے اندر صرف سیبوں کی ایک ٹہنی آتی ہے یہاں تو پورے کے پورے درخت ہیں ——"

"اندازہ کرو" خواجہ صاحب نے نہایت سرسری انداز میں کہا۔ اس پر نظامی صاحب نے انہیں گھورا کیونکہ ان کا تکیہ کلام انہی پر استعمال ہو گیا تھا۔

موٹل کے ڈائننگ روم میں بھی وہی کیفیت تھی۔ کونوں میں رک سیک اور کوہ پیمائی کا سامان رکھا ہوا تھا اور سیاح میزوں پر نقشے پھیلائے ان پر جھکے ہوئے تھے۔ اور ان کی خوراک ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ مطیع ہمیں تلاش کرتا ہوا اندر آ گیا' وہ پریشان دکھائی دیتا تھا۔

"خواجہ صاحب ڈرائیور سے کہئے کہ مجھے تھوڑی دیر کے لیے گیسٹ ہاؤس لے چلے...."

"کیوں خیریت ؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے آج صبح شوگر کا انجکشن نہیں لگایا تھا اس لیے طبیعت بے حد خراب ہو رہی ہے۔ "شوگر کا انجکشن ؟" نظامی صاحب فکر مند ہو گئے "خود لگاتے ہو ؟"

"ہاں...." مطیع کہنے لگا۔ "آج صبح سکردو آنے کی ایکسائٹ منٹ میں بھول گیا اور اب طبیعت کچھ خراب ہے"

خواجہ صاحب نے ڈرائیور کو ہدایات دیں اور مطیع گیسٹ ہاؤس چلا گیا۔

"اندازہ کرو۔ اسے شوگر کا مرض ہے۔ روز ٹیکا لگا کر چلتا پھرتا ہے اور ہمارے ساتھ کوہ پیمائی کرنے آ گیا ہے"

"نظامی صاحب .... یہ تو سارا پروگرام اپ سیٹ ہو جائے گا۔ پہاڑوں کی بلندیوں کے لیے صحت مند ہونا شرط اول ہے۔ یہ اگر لاہور سے روانگی کے وقت بتا دیتا تو ہم اسے ساتھ ہی نہ لاتے...."

مطیع جب واپس آیا تو وہ ہشاش بشاش تھا۔ "لاہور سے روانگی کے وقت بتا دیتا کہ میں انجکشن کے بغیر ایک دن نہیں نکال سکتا تو آپ مجھے ساتھ ہی نہ لاتے' اس لیے میں نے اپنے مرض کو ذرا خفیہ رکھا.... ویسے فکرمندی کی کوئی بات نہیں مجھے

میرے پاس ہیں اور سرنجیں بھی' ان کی موجودگی میں' میں آپ کی طرح صحت مند ہوں۔"

"تو آئیے اب چلتے ہیں" خواجہ صاحب بولے۔

"کدھر؟"

"جدھر ہماری مرضی"

ہم ایک مرتبہ پھر سکردو سے باہر نکل کر ائیرپورٹ کی جانب رواں تھے... پھر ایک سنگ میل پر "گلگت" لکھا نظر آیا۔

"ہم گلگت جا رہے ہیں؟ میں نے پوچھا۔

"اسی طرف جا رہے ہیں" خواجہ صاحب نے پھر خفیہ انداز میں کہا۔

راستہ دور تک ہموار تھا اور آس پاس سفیدے کے درخت اس جہاں سے اٹھتے تھے۔ دائیں جانب درختوں کے بیچ میں سے ریت کے ٹیلے اور خشک پہاڑ نظر آتے تھے اور بائیں طرف کہیں کہیں مکان تھے اور برفلی چوٹیوں پر تھے۔ ان مکانوں کے قریب مجھے ایک خستہ حویلی نظر آئی جس کے چوبی اور منقش دروازے گرنے کو تھے اور کچی دیواریں ڈھے رہی تھیں۔ پھر راستہ ذرا اوپر ہونے لگا۔ ہم پکی سڑک چھوڑ کر ایک ذیلی راستے پر مڑ گئے۔ ایک چھوٹی سی ندی نیچے آ رہی تھی۔ ایک چینی طرز کا آرائشی دروازہ نظر آیا جس پر "شنگریلا" لکھا تھا اور اس کے اندر جھیل کچورا قید تھی۔ ہم خصوصی اجازت سے اندر گئے کیونکہ ادھر صرف ان لوگوں کا داخلہ ہو سکتا تھا جو جھیل کچورا کے کنارے آباد اس چھوٹے سے قصبے میں قیام کرتے تھے جسے شنگریلا ٹورسٹ ریسارٹ کہا جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ شنگریلا والوں نے اس جھیل کو پورے پاکستان میں روشناس کیا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے اس جھیل کو صرف اپنے گاہکوں کے لیے قید کر لیا۔ چنانچہ ہم اپنے ہی وطن کے اس حصے میں قدرے خوفزدہ اور مجرم ہو کر چلتے تھے کیونکہ ہماری جانب ہوٹل کے ملازمین شک کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور گاہک حضرات ذرا ایک بلند سطح سے ہماری جانب حقارت سے نظر کرتے تھے کہ یہ کون ہیں جو ہماری اس جنت میں یوں دندناتے پھرتے ہیں۔ میں جب اسی روز جھیل صد پارہ گیا تو میں نے بہت بہتر اور آزاد محسوس کیا۔ خدا کرے وہ جھیل ہمیشہ آزاد رہے۔

جھیل کچورا نے مجھے ذرا حیران بھی کیا۔ میں نے اس کی جو تصاویر دیکھی تھیں

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

ان میں وہ کچھ تو دکھائی نہ دیا جو یہاں میرے سامنے آیا۔ ایک تو یہاں کا موسم تھا اور کیا گل و گلزار موسم تھا۔ اور دوسرے اس کے پانی تھے جو اتنے صاف تھے کہ کنارے سے اندر تک' بہت دور تک جھیل کی تہہ نظر آتی تھی۔ کئی بڑے پتھر جھیل میں یوں دکھائی دیتے تھے جیسے ان کے آس پاس شیشہ منجمد ہو گیا ہو۔ اور یہ پانی یوں شفاف تھے کہ جھیل کچورا تازہ پانیوں کی جھیل ہے۔ اس کی تہہ سے چشمے پھوٹتے ہیں اور یہ بارش یا گلیشیئر کے پانی کی محتاج نہیں۔ اور ذرا غور سے دیکھئے تو جھیل کے اندر وہ چشمے چلتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

"چلیں ؟" خواجہ صاحب نے پھر پوچھا

"کہاں؟"

"جہاں ہم لے چلیں"

وہ ہمیں جھیل کچورا کے دوسرے کنارے پر لے گئے۔ یہاں "تبت موٹل" کی عمارت تھی۔ ڈائننگ روم میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ بے شمار نوجوان چہرے ہماری طرف دیکھتے تھے۔ ان میں سے ایک باریش صاحب آگے آئے۔ "میرا نام یوسف حسین آبادی ہے۔ محکمہ تعلیم میں ہوں اور یہ میرے اساتذہ اور طالب علم ہیں"

یوسف صاحب کے نام سے میں اچھی طرح آگاہ تھا۔ وہ بلتستان کے معروف دانشور اور ماہر تعلیم ہیں۔ انہوں نے ہمارے لیے لنچ کا انتظام کر رکھا تھا۔ یہیں پر عباس کاظمی سے بھی ملاقات ہوئی۔ کاظمی "بلتستان کاز" کے بہت بڑے مبلغ ہیں۔ اپنے خطے کی تاریخ اور جغرافیائی اہمیت کو دوسروں تک پہنچانا ان کا مقصد حیات ہے۔ ان کے بلتی لوک گیتوں کا اردو ترجمہ کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔

"تبت موٹل" کے لان سے جھیل اور دوسرے کنارے پر واقع "شنگریلا" بے حد دیدہ زیب لگتے ہیں اور یہاں جو گلاب تھے اگرچہ پنجاب سے گئے تھے لیکن ان کا سائز اتنا بڑا تھا کہ شاخوں سے وہ سنبھلتے نہ تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم جھیل کچورا کے کناروں سے اوپر کو جانے والے کچے راستے پر چلنے لگے۔ ایک پر شور اور وحشت ناک پانیوں والی ندی کے پار' بلندی پر کچورا کا گاؤں تھا اور کچورا جھیل کا منظر یہاں سے بھی دل فریب تھا اور اس کے پس منظر میں وادی سکردو کی وسعت اور برف پوش پہاڑ تھے۔ ایک مکان کے برآمدے میں دو بوڑھے رسے بن رہے تھے۔ مجھے دیکھ

کر وہ مسکرائے اور میں رک گیا۔ وہ اردو بہت کم سمجھتے تھے۔

"آپ اوپر جھیل جاتا صاحب۔۔۔" ان میں سے ایک جو بالکل بے دانت تھا پوپلے منہ سے سوال کرتا تھا۔

"اوپر بھی جھیل ہے؟"

"ہاں ۔۔۔" دوسرے نے سر ہلایا "چھوٹا کچورا اوپر ۔۔۔۔۔۔"

"اور ادھر سے دیوسائی کو بھی راستہ جاتا ہے؟"

"ہاں۔۔۔دیوسائی بہت سردی ۔۔۔ برف ۔۔۔ ریچھ ۔۔۔ آپ جاتا؟"

"ہاں ۔۔۔ میں اور یہ۔۔۔" میں نے نظامی اور مطیع کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "میرا دوست جاتا"

وہ دونوں ہنسنے لگے اور نظامی کو دیکھ دیکھ کر ہنسنے لگے "یہ نہیں جاتا یہ ۔۔۔" انہوں نے بازو پھیلا کر بتایا کہ یہ بہت موٹا ہے

ہم واپس نیچے آئے تو میں نے دیکھا کہ تبت موٹل کے ساتھ چند خیمے ایستادہ ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ خیمے بھی کرائے پر اٹھائے جاتے ہیں اور بہت جی چاہا کہ ہم بھی انہی میں اٹھ جائیں۔

"آپ تو بتا دیجئے کہ ہم کدھر جائیں گے وارڈن صاحب؟" میں نے خواجہ صاحب سے پوچھا۔

"جھیل صدپارہ ۔۔۔ سکردو کے دوسری جانب ۔۔۔ آپ کے دیوسائی کے دامن میں"

اور اسی لمحے سامنے وادیٔ سکردو میں بگولے اٹھے اور تیز ہوا چلنے لگی اور یہ ہوا ہم تک دیکھتے دیکھتے آ گئی اور اس کی ریت آلود شدت ہماری آنکھوں میں چبھنے لگی۔ خواجہ صاحب نے اپنا لمبا بازو اٹھا کر انگلی سیدھی کی۔ "آپ دریائے سندھ کے بیچ ابھرنے والے ریتلے ٹاپوؤں کو دیکھ رہے ہیں"۔

"جی ہاں۔۔۔۔" میں نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔

"دوپہر کے وقت گرمی کی شدت سے ریت تپتی ہے۔ ہوا کا دباؤ کم ہو جاتا ہے اور پھر آپ کے دیوسائی سے خنک ہوا اترتی ہے اور یوں بگولے اٹھنے لگتے ہیں"

خواجہ صاحب نے جب بھی دیوسائی کہا تو "آپ کا دیوسائی" کہا اور واقعی اس ریتلی ہوا میں ٹھنڈک گھلی ہوئی تھی۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

ہم کچورا گاؤں سے نیچے اترے' جھیل کنارے ایک نیم دائرے کی صورت ہماری جیپ دھول اڑاتی چلی اور پھر سکردو جانے والی سڑک پر ہموار ہو گئی۔ دور سے سفیدے کے درختوں کے سائے میں وہ خستہ حویلی پھر نظر آئی جس کی کچی دیواریں ڈھے جانے کو تھیں۔ خواجہ صاحب نے اشارہ کیا اور جیپ رک گئی۔

ایک کچے بلند پلیٹ فارم پر ایک خستہ حال عمارت اپنے آخری دنوں میں تھی۔ اس کا عالی شان منقش دروازہ مقفل تھا۔ اس دروازے کے نقش اور اوپر کی پر پیچ جالیاں کسی قدیم ہاتھ نے عقیدت سے تراشی تھیں۔ کھڑکیاں ٹوٹ کر گرنے کو تھیں اور کھلی تھیں۔ مقفل دروازے کو دیکھنے سے اندر کا منظر ایک لکیر کی صورت دکھائی دیا۔ وہاں نیم تاریکی تھی اور جہاں جہاں سے کھڑکیاں اور روشندان ٹوٹ چکے تھے' وہاں سے دھوپ کی تیزی اندر آ کر اس عبادت گاہ کے آخری لمحوں میں مخل ہوتی تھی۔ گیلریاں اور ساری چھت لکڑی کی تھی۔ درجنوں بلند ستون اس خانقاہ کی چھت کے بوجھ تلے جھکے جاتے تھے۔ فرش پر چند چٹائیاں تھیں اور طاقوں میں بجھے ہوئے دیئے اور ان کی سیاہی تھی۔ یہ ایک عظیم اور شاندار ورثہ تھا جو مٹی ہو رہا تھا۔ بلتستان کے مختلف قصبوں میں بے شمار ایسی خانقاہیں ہیں جو بے توجگی کا شکار ہیں۔ ان کا طرز تعمیر اور خصوصی طور پر لکڑی کا کام بے مثال ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کی اندر ایک ایسا ماحول ہے' روشنی کے ایسے زاویے ہیں جو بنائے نہ بنیں۔ "ایسی پرکشش اور شاندار یادگار کو تباہ ہونے کے لیے کیوں چھوڑ دیا گیا ہے.... اس کی مرمت کیوں نہیں کی جاتی؟"

"یہی باتیں غور کرنے کی ہیں" ریڈیو کے کشفی صاحب بولے "یہاں کوئی ادارہ کوئی محکمہ ایسا نہیں جو ان عمارتوں کو بحال کرے اور ان کی عظمت رفتہ کی جھلک واپس لے آئے.... یہ بلتستان کے طرز تعمیر اور ثقافت کی نمائندہ ہیں اور ان کے خاتمے پر ہمارے ہاں کچھ بھی باقی نہ بچے گا"

"کبھی کبھار خانقاہ کا دروازہ ہوا کے زور سے پھولتا تھا' اس کے کواڑ جدا ہوتے تھے اور اندر کی ٹھنڈک باہر کو آتی تھی۔

جب ہماری جیپ سکردو کے بازار میں سے گزری تو دھوپ صرف قلعے کی خشک پہاڑی کو روشن کرتی تھی اور شہر سائے میں تھا اور کسی دور کی وادی سے آیا ہوا ایک لداخی خدوخال کا خاندان ایک دوکان سے اشیائے خوردنی خریدنے کے دوران اس

جیپ کو دیکھتا تھا جو بازار میں سے گزر رہی تھی اور جس میں تین سیاح اور ان کے دوست جھیل صدپارہ کو جاتے تھے۔

سکردو کی آبادی یک لخت ختم ہو گئی اور سڑک نے پہاڑوں کے اندر جانے کا قصد کیا۔ دور ایک نالہ بہتا تھا اور خواجہ صاحب نے اس طرف اشارہ کر کے بتایا کہ ادھر وہ مشہور چٹان ہے جس پر درجنوں مہاتما بدھ کندہ ہیں اور ہم ان کی زیارت واپسی پر کریں گے۔ تھوڑی دیر بعد ہم پہاڑوں کے اندر تھے اور اب اس نالے کے ساتھ اوپر جاتے تھے جو اتنا تیز اور اتنا سفید اور پر شور اور چھینٹے اڑانے والا تھا جیسے شیگر کے اندر ملک ٹھیک تیز اور چھینٹے اڑانے والا ہوتا ہے۔ اور شور میں بات بھی سنائی کم ہی دیتی تھی اور اسی لیے خواجہ صاحب نے قدرے بلند آواز میں کہا اور مجھے چھیڑتے ہوئے کہا کہ یہ نالہ آپ کے دیوسائی سے آ رہا ہے۔

اور جب انہوں نے یہ کہا کہ یہ نالہ آپ کے دیوسائی سے آ رہا ہے تب میں نے اس کے بے چین' نیلے اور سفید پانیوں میں پورے دیوسائی کو نیچے اترتے دیکھا' ان میں گھلتے دیکھا اور وہ بلندی اور ٹھنڈک میرے اندر گئی' جہاں سے یہ آتا تھا اور کہتا تھا کہ اے گندمی رنگ والے درمیانی عمر کے ست پڑتے اور جسمانی طور پر بدنما ہوتے سیاح' میں ادھر سے آیا ہوں جدھر تو جانے کی خواہش رکھتا ہے۔ تجھ میں لالچ بہت ہے' تو اپنے اختیار سے باہر ہو کر وہ کچھ دیکھنا چاہتا ہے جو تو دیکھ نہیں سکتا۔ تیری آنکھوں میں پہاڑوں جھیلوں اور بلند میدانوں کی ہوس ہے جو پوری نہیں ہو گی اور تو اس دنیا سے چلا جائے گا اور یہ ہوس باقی رہ جائے گی.... میں اسی دیوسائی سے آ رہا ہوں' جہاں تو جانے کی خواہش رکھتا ہے۔

پتہ نہیں کب نالہ ذرا پرے ہوا اور ہم اور ہماری جیپ اس خاموشی میں آ گئے جو صدپارہ کے آس پاس ٹھہری ہوئی تھی۔ جیپ رکی تو ہمارے بدن اور سوچ کا تسلسل سب کچھ ایک دھچکے کے ساتھ ختم ہو گیا اور خاموشی کی سائیں سائیں کانوں میں چلنے لگی۔

"پہلے ادھر..." خواجہ صاحب نے راستے سے نیچے اترتے ہوئے کہا۔ وہاں پتھروں کے نیچے سے پانی آ رہا تھا اور گھنی گھاس اور ریت میں سے بہتا ہوا ایک پتھر میں روپوش ہو جاتا تھا....

خواجہ صاحب نے پہلے آسمان کو دیکھا پھر پانی کو دیکھا پھر کھڑے ہو گئے' پھر

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

بیٹھ گئے اور بالآخر کبڑے سے ہو کر کہنے لگے۔ "اس زاویے سے ادھر دیکھیں ہم بھی اسی طرح ذرا کبڑے ہو کر جھکے تو چشمے کے پانی کے نیچے کی ریت ایک کیمش والے دوپٹے کی طرح چم چم چمک رہی تھی۔

"صد پارہ گولڈ" خواجہ صاحب نے ڈرامائی انداز میں کہا "اس پانی میں سونے کی آمیزش ہے۔ جی بھر کے پیجئے کیونکہ یہ اپنے اندر بہت ساری سنہری خصوصیات رکھتا ہے ... ہر شے کو ہضم کر دیتا ہے اور بے شک سات آٹھ گلاس پی جایئے۔ طبیعت بوجھل نہیں ہو گی... اور یہ لیجئے گلاس "انہوں نے اپنے تھیلے میں سے ایک گلاس نکال کر مجھے تھما دیا جو وہ خصوصی طور پر ساتھ لائے تھے۔

سونے کا طلسم اور لالچ ہم سب میں موجود ہے اور ہمارے دل کی دھڑکن کچھ تیز ہوئی اور ہم جھک جھک کر اس ریت کو مختلف زاویوں سے دیکھتے تھے جو کبھی تو ایسے لگتی جیسے کسی مزار کی چادر ور موم بتیوں کی جھلملاہٹ میں رہ رہ کر چمکتی ہو اور کبھی دھوپ کی آخری کرنیں ان ذروں میں منتقل ہوتی جاتیں جو لالچ اور طلسم تھے۔ ہم نے یہ گولڈ واٹر پیا اور جی بھر کر اور گلاس بھر بھر کے پیا اور یہ حقیقت ہے کہ اس میں کچھ سنہری تاثیر تھی۔

نظامی صاحب کمر پر ہاتھ رکھ کر پانی کو ملاحظہ کر رہے تھے۔ وہ پانچ چھ گلاس پی چکے تھے اور اب مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔ "میں تاں اس میں تاری لگانا چاہتا ہوں لیکن پانی کم ہے... بادشاہو ___ اندازہ کرو سونے کے پانی میں نہانا بڑی بات ہے...."

جیپ سے اترتے ہوئے مطیع ذرا ایک پتھر کی طرف گیا تھا اور ہم سے الگ ہو گیا تھا اور اب پتلون کی بیلٹ پر ہاتھ رکھے خوش و خرم واپس آ رہا تھا "ہاں جی السلام علیکم! کیا ہو رہا ہے؟ آپ کیسے ہیں؟ بال بچوں کا کیا حال ہے؟..." مطیع کی یہ عادت ہے کہ وہ کسی بھی محفل میں یا گھر میں داخل ہو تو مسکراتا ہوا یہ فقرے سبق کی طرح فر فر سنا دیتا ہے۔

"وعلیکم السلام ..." نظامی صاحب نے اپنی سفید مونچھوں کو تاؤ دیا۔ "ہو یہ رہا ہے بادشاہو کہ اس پانی میں سونا ہے سونا ... ابھی ابھی تارڑ صاحب کو ایک ڈلی ملی ہے کوئی پانچ تولے اور چھ ماشے کی ..."

"نہیں..." مطیع کی بے یقینی کی مسکراہٹ پھیلی اور پھیلتی گئی۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں اور اس کے ہاتھ پاؤں کچھ عجیب طریقے سے ہلنے لگے۔ مجھے شائبہ ہوا کہ

اس پر شوگر کا حملہ ہو گیا ہے لیکن یہ سونے کا حملہ تھا۔

"ہاں جی..." خواجہ صاحب مطیع کے ردعمل سے لطف اندوز ہوتے ہوئے شرارت سے بولے۔ "یہ صد پارہ گولڈ ہے اور ذرا پانی تو دیکھئے"

مطیع نے جب جھک کر پانی کی تہہ کو دیکھا۔ پھر چلو میں پانی لے کر اس میں تیرتے سنہری ذروں کو دیکھا تو وہ ہمارے ہاتھوں سے نکل گیا۔ وہ ہم سے الگ ہو کر اب ایک ایسی وادی میں تھا' جہاں سنہری ندیاں تھیں اور سونے کی ڈلیاں پانی میں بہتی ہوئی اس کے قدموں میں آ کر ڈھیر ہوتی تھیں۔ "خواجہ صاحب یہ پانی کہاں سے آتا ہے؟ ادھر چٹان کے نیچے سے؟ تو یقیناً چٹان کے اندر کہیں سونے کی کوئی بہت بڑی کان ہو گی۔ شاید پورا پہاڑ ہو۔ ادھر اگر کھدائی کی جائے یا پانی جدھر سے آ رہا ہے ادھر کسی شخص کو بھیجا جائے جو رینگتا ہوا ..."

"یہ اب فضول ہو گیا ہے ہمارے کام کا نہیں رہا۔" نظامی صاحب افسوسناک لہجے میں سر جھٹک کر بولے۔

مطیع کو کچھ پرواہ نہ تھی کہ کون کیا کہہ رہا ہے' وہ اپنی سنہری دنیا میں گم تھا۔ "اس پانی کا تجزیہ ہونا چاہئے کہ اس میں کتنا سونا ہے۔ کسی کے پاس بوتل ہے؟ میں اس پانی کو ساتھ لے جاؤں گا... نہیں تو کوئی پلاسٹک کا لفافہ ہے یہ ریت تو ضرور لے جاؤں گا..."

"جھیل دیکھ لیں؟" میں نے پوچھا۔

"آپ لوگ چلیں میں آتا ہوں" اس کی آنکھیں سونے کے پانی پر رکھی ہوئی تھیں۔ ہم چشمے سے واپس سڑک پر آئے اور پھر جھیل کی جانب اترنے لگے۔ ٹورزم والوں کا ہوٹل ابھی ویران پڑا تھا۔ کمروں میں قالین بچھے تھے لیکن بستر ناپید تھے۔

اور جب ہم نے صد پارہ کو دیکھا تو دھوپ اٹھ کر ان چوٹیوں پر ٹھہرتی تھی جن کے اوپر دیوسائی کا میدان تھا۔ جھیل کے کنارے کے ساتھ وہ راستہ دکھائی دے رہا تھا جو ادھر کو جاتا تھا جدھر ہم نے جانا تھا۔ شام کی ٹھنڈک اب بدن میں اترتی تھی اور پوری جھیل سائے میں تھی۔ اس جھیل میں ایک خوف تھا' کسی اور دنیا کی جھلک تھی۔ اس کے پانی وحشی ایسے تھے کہ جیسے بندھے ہوئے ہوں لیکن پھنکارتے ہوں۔

جھیل کنارے ایک چوکیدار نے ایک خیمہ نصب کر کے سیاحوں کے لیے مناسب چائے پانی کا بندوبست کر رکھا تھا۔ ہم چائے پینے کے لیے گھاس پر بیٹھ گئے۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

مطیع آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی تھی۔

"چائے پیو۔" نظامی نے کہا۔

"میں پانی پی کر آیا ہوں۔ سونے کا پانی" مطیع نے دیکھا کہ ہم زیر لب مسکرا رہے ہیں۔ "مجھے معلوم ہے کہ آپ میری حرکات سے لطف اندوز ہو رہے ہیں لیکن میں کیا کروں۔۔۔ میں نے زندگی میں پہلی بار سونا دیکھا ہے۔۔۔ اور جناب ایک مرتبہ آسٹریلیا میں ایک شخص اپنی بگھی پر جارہا تھا اور گھوڑے کے پاؤں کے نیچے سونے کی ڈلی ۔۔۔" اس کے بعد مطیع نے ہمیں متعدد سنہری کہانیاں سنائیں کہ کس طرح ہم جیسے سیاحوں کو بے دھیانی میں یونہی بیٹھے بٹھائے سونا مل گیا اور وہ دولت مند ہو گئے۔ مطیع کا سنہری موڈ ہم پر بھی اثرانداز ہوا اور ہم بھی جھیل صدپارہ کے کنارے سنہری خواب دیکھنے لگے۔ میری سامنے جو پتھر ہیں شاید ان کے نیچے وہی چٹان ہو ـــــ سونے کی چٹان ـــــ

جھیل کے پانیوں کی چھپاک چھپاک کے ساتھ ٹھنڈک بڑھتی گئی اور سایہ گہرا ہونے لگا۔۔۔ دھوپ چوٹیوں سے رخصت ہو رہی تھی۔ خنکی نے ہمیں سنہری خوابوں سے بیدار کر دیا۔

صد پارہ کے اوپر دیوسائی کو چڑھتے راستے کے ساتھ پتھروں کے کچھ ڈھیر اور ایک دیوار نظر آتی تھی۔ صد پارہ سے مراد فصیل یا حفاظتی دیوار ہے اور یہاں قدیم راجے اپنی ریاست کی سرحد کی نشاندہی کے لیے دیوار یا فصیل بنواتے تھے۔ ۱۸۷۶ء میں راجاؤں نے آب پاشی کے لیے ایک چھوٹا سا بند تعمیر کروایا تھا جو ایک کہاوت کی مطابق انڈے کی سفیدی اور خاص قسم کی چکنی مٹی کو گوندھ کر بنایا گیا تھا اور اب تک قائم ہے۔

صد پارہ میں ہمیں شام ہو رہی تھی اور اس کے پانیوں کے اندر جیسے بے شمار قدیم واہمے اور خوف تھے جو کہتے تھے کہ کسی مسافر کو صدپارہ میں شام نہیں ہونی چاہئے ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بہتر یہی ہے کہ آپ ہمیں یہیں چھوڑ جائیں تاکہ ہم کل سویرے سویرے جھیل کے اوپر اس راستے پر چلنے لگیں جو دیوسائی کو جا رہا ہے۔" میں نے جیپ میں سوار ہوتے ہوئے خواجہ صاحب سے کہا اور اس امید سے کہا کہ وہ ہمیں یہاں ہرگز نہیں چھوڑیں گے۔ چوکیدار جیپ تک ہمارے ساتھ آیا تھا اور وہ دیوسائی کا نام سن کر میرے قریب آگیا۔ "صاحب دیوسائی تو بند ہے آپ تو وہاں نہیں جاسکتے۔"

"کیوں؟"

"ابھی برف نہیں پگھلی اور سردی بہت ہے۔ آج صبح تین لڑکے اوپر گئے تھے لیکن وہ واپس آئیں گے۔۔۔"

"خواجہ صاحب ۔۔۔" میرا حلق سوکھنے لگا۔۔۔ "کیا واقعی برف نہیں پگھلی؟ اب تو جولائی کے آخری دن ہیں۔"

خواجہ صاحب کے چہرے پر پہلی بار میں نے شرمندگی کے آثار دیکھے۔ "میں آپ کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ واقعی آپ دیوسائی نہیں جاسکتے"

میں نے صدپارہ کی طرف دیکھا جیسے یہ ان تاریک پانیوں کا قصور ہو اور پھر اس راستے کی طرف دیکھا جو دیوسائی کو اٹھ رہا تھا۔ "لیکن کیوں نہیں جاسکتے؟"

"وہاں ابھی گہری دلدل ہے، کچھ ندیاں ناقابل عبور ہیں اور موسم بھی خراب ہے۔۔۔"

"آپ مجھے اطلاع کر دیتے تو میں سکردو نہ آتا"

"اسی لیے تو اطلاع نہیں کی"

نیچے سے ایک تیز رفتار جیپ اوپر آئی۔ ہمارے قریب آکر رکی۔ اس میں سے حسن صدپارہ باہر آگئے اور ہم سب کو نظرانداز کرتے ہوئے خواجہ صاحب سے بغل گیر ہو گئے۔۔۔ خواجہ صاحب نے انہیں میری جانب متوجہ کیا اور اپنی زبان میں کچھ کہا۔

"نہ جی آپ دیوسائی نہیں جاسکتے۔" وہ فوراً بولے۔ "میں اس سڑک کو تعمیر کر رہا ہوں جو اوپر دیوسائی تک جا رہی ہے۔ اور ادھر سخت سردی ہے اور برف ہے"

"کیا یہ ممکن ہے کہ ہم ٹاپ تک چلے جائیں اور اس میدان کو ایک نظر دیکھ کر واپس آجائیں؟"

"ممکن تو ہے جناب۔ میں کوشش کر سکتا ہوں لیکن ۔۔۔ وہاں جاکر آپ کو شدید سردرد ہو گا کیونکہ بلندی ہے اور پھر اسی وقت واپسی ۔۔۔ اور وہاں دیکھنے کے لیے کچھ بھی نہیں۔ تین چار ہفتوں تک برف پگھل جائے گی۔ پھر۔۔۔"

"پھر میں یہاں نہیں ہوں گا۔۔۔" میں نے حسن صدپارہ کا شکریہ ادا کیا اور پھر اس راستے کو دیکھا۔۔۔ اوپر دیوسائی کا میدان تھا اور میں اس کی خواہش لے کر آیا

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

تھا۔

"نارڑ صاحب آپ فکر نہ کریں" خواجہ صاحب نے مجھے تسلی دی اور مجھے اس لمحے کی تسلی کی شدید ضرورت تھی" ہم آپ کو ایک ایسی وادی میں بھجوا رہے ہیں جو دیوسائی سے زیادہ خوبصورت ہو گی۔ کل صبح کی ویگن میں آپ کی نشستیں بک ہو چکی ہیں اور وہاں آپ کی رہائش کا بندوبست بھی ہو چکا ہے"

"آپ کس وادی کی بات کر رہے ہیں؟" میں نے بجھے ہوئے دل سے پوچھا

"وادی خپلو...."

ہم سکردو واپسی پر اس مقام سے گزرے جس کے قریب نالے کے کنارے وہ قدیم چٹان تھی جس پر گندھارا عہد کے بدھ مجسمے تراشے ہوئے تھے.... تاریکی جیسے دیوسائی کی بلندیوں سے نیچے آئی' ہمارے پیچھے پیچھے آئی اور پھر ہم سے آگے نکل کر وادی سکردو میں پھیل گئی۔

"آپ فکر نہ کریں تارڑ صاحب" خواجہ صاحب نے پھر تسلی دی۔ "آپ خپلو دیکھ آیئے۔ ہم آپ کی واپسی پر آپ کو دیوسائی بھجوانے کی کوشش پھر کر دیکھیں گے۔"

"نہیں خواجہ صاحب...." میں نے سر ہلایا "دیو سائی کی برف اس برس نہیں پگھلے گی"

سکردو سے خپلو

.... اور ویگن جو سکردو سے ایک سو تین کلومیٹر کے فاصلے پر واقع وادی خپلو کی جانب رواں ہے' اور سفر کرتی ہے اندر پہاڑوں کے اندر جہاں ایک وسیع اور عظیم تنہائی ہے اور ہم تینوں اس تنہائی میں مخل ہونے کے لیے جا رہے ہیں۔ وادی خپلو کو جو لداخ کی قربت میں ہے اور جہاں مشہ بروم کی چوٹی ہے' دریائے شیوک اور اس کے معاون دریا سلتورو اور ہوشے کے کنارے پھیلی ہوئی ہے.... تو ہم تینوں ویگن میں سوار وادی خپلو کی جانب سفر کرتے تھے.... اور خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں....

"نہیں خواجہ صاحب".... میں نے سر ہلا کر خواجہ مہرداد سے کہا تھا "دیوسائی کی برف اس برس نہیں پگھلے گی.... اگلے برس پھر آئیں گے"

اور خواجہ صاحب نے فوری طور پر خپلو کے اسسٹنٹ کمشنر سے فون پر رابطہ قائم کیا تھا اور ریسٹ ہاؤس میں جو وی آئی پی کمرہ تھا ہمارے لیے بک کروا دیا تھا اور کہا تھا "اگر ایک در بند ہو تو واپس نہیں چلے جایا کرتے بلکہ کسی اور در پر جا کر دستک دیتے ہیں...." خپلو کا دروازہ کھلے گا تو اس کے اندر جھانکئے گا اور وہاں وہ سب کچھ ہو گا جس کی تلاش میں آپ گھر سے نکلتے ہیں"

ویگن سکردو سے نکل کر حسین آباد کے قریب ہوئی تو قصبے کے باہر ایک بورڈ نظر آیا۔ "حسین آباد کی حدود میں خلاف شرع افعال خصوصاً موسیقی بجانا منع ہے"

"نظامی صاحب...." میں نے اگلی نشست سے مڑ کر ویگن کے پچھلے حصے میں ٹھن بند اور ایئر ٹائٹ مسافروں کی جانب دیکھا اور ان میں کہیں میرے ہم سفر نظامی اور مطیع براجمان تھے.... بلکہ مدغم تھے....

"اندازہ کرو...." نظامی صاحب کہیں سے بولے "بزرگوں کو ڈربے میں بند کر

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

دیا ہے.... اوئے مطیع تم کدھر ہو یار؟"

"میں ادھر ہوں" مطیع نے کہیں سے سر نکال کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور ادھر تم کیا کر رہے ہو؟" نظامی صاحب نے پوچھا۔

"ایک گورا قابو آگیا ہے اس کا ہاتھ دیکھ رہا ہوں"

"بادشاہو اس کا ہاتھ ہی دیکھ رہے ہو نا.... اندازہ کرو۔"

"نظامی صاحب ' حسین آباد کی حدود میں داخل ہوتے ہوئے آپ نے وہ بورڈ نہیں پڑھا جس پر غیر شرعی افعال کی ممانعت کی گئی ہے...." میں نے انہیں بورڈ کی عبارت سے آگاہ کیا....

"بادشاہو یہ ہمیں کہاں لے آئے ہو؟" نظامی صاحب کا قہقہہ پوری ویگن میں انجن کے شور سے بلند ہو کر گونجا "شکر ہے حسین آباد میں ویگن روک کر ہماری چیکنگ نہیں کی گئی ورنہ ہمیں بھی غیر شرعی قرار دے کر روک دیا جاتا"

حسین آباد سے آگے ایک راستہ الگ ہو کر وادیٔ شگر کو چلا گیا۔ کے ٹو اور کنکورڈیا کو جانے والی کوہ پیما ٹیمیں اسی راستے پر جاتی ہیں.... داسو' اشکولے' دریائے برالڈو اور للی گو کے راستے دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے ٹو کی جانب جو یہاں سے چودہ روز کی پیدل مسافت پر واقع ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مسافر حضرات کی شکلیں واضح ہونے لگیں اور حلیے دکھائی دینے لگے' میرے پیچھے سعودی عرب میں ملازم ایک ایسا بلتی تھا جو اپنی بوڑھی اماں جان کی آنکھوں کا چیک اپ کرانے کے لیے سکردو گیا تھا اور اب اپنے قصبے کو لوٹ رہا تھا۔ اماں جان کی شکل لداخی تھی اور وہ اپنے روایتی چوغے اور ٹوپی میں ملبوس تھیں۔ ان کی درجنوں مینڈھیاں کندھوں پر لٹکتی تھیں۔ چاندی کا زیور اور بھاری جھمکے جن کی وجہ سے ان کے کان مہاتما بدھ کی طرح لانبے ہو چکے تھے.... ان کے چہرے پر پہاڑوں کی زندگی کی تمام تر مشقت کھدی ہوئی تھی اور ان کی آنکھیں خالی تھیں.... وہ بالکل نہیں دیکھ سکتی تھیں.... سکردو کی ٹاؤن کمیٹی کا ایک کلرک بھی اس ویگن میں سوار اپنے گاؤں کو جا رہا تھا۔ اس کی انتہائی کوشش تھی کہ وہ ہمارے ساتھ کسی نہ کسی طرح گفتگو شروع کر دے....

ویگن "گول" کے قصبے میں پہلی بار رکی اور چائے کے لیے رکی۔

باہر نکلے تو تیز ہوا سے سفیدے کے درخت دوہرے ہوئے جاتے تھے اور راستے کی ریت بلند ہو کر ہر شے کو دھندلاتی تھی۔ قریب ہی ایک دیدہ زیب پرانی مسجد تھی اور اس کے صحن میں ایک چشمہ بہتا تھا۔ ہم نے وہاں منہ ہاتھ دھویا اور پھر گول کے واحد ہوٹل کے اندر چلے گئے اور اندر ایک سکون اور خاموشی تھی جو باہر کے شور کے بعد قدرے حیران کرتی تھی۔ گرم چائے کے ساتھ زرکون نے بہت لطف دیا۔ یہاں دو کمرے تھے۔ ایک میں گاہک بیٹھ کر چائے اور زرکون نوش کرتے اور دوسرے کمرے کا کچا فرش ذرا اونچا تھا اور اس پر درجن بھر بستر لپٹے پڑے تھے جو یہاں رات گزارنے والے مسافروں کو کرائے پر دیئے جاتے تھے۔

یہاں اُس گورے سے بھی ملاقات ہوئی جو ہماری ہی ویگن میں کہیں روپوش تھا اور جس کا ہاتھ مطیع صاحب کے ہاتھ میں بتایا جاتا تھا۔

"بادشاہو اس کا نام کرس ہے".... نظامی صاحب نے متعارف کروایا "بڑا سمجھ دار اور نیک قسم کا گورا ہے.... اور حیرت کی بات ہے کہ پڑھا لکھا ہے ابھی ابھی میں نے ذرا رعب ڈالنے کے لیے شیکسپیئر کے ڈرامے "ٹو تھ نائٹ" کا ذکر کیا تو اس نے آدھا ڈرامہ سنا دیا.... شاعر بھی ہے...."

میں نے کرس سے ایک عدد ہاؤ ڈو یو ڈو کیا اور ہاتھ ملایا .... اور تب مجھے ایک شدید دھچکا لگا.... اس شخص کو میں جانتا تھا میری پسندیدہ فلم "چلڈرن آف اے لیسر گاڈ" اور "کس آف دی سپائیڈر وومن" کا باکمال اداکار ولیم ہرٹ۔

"کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ تم کرس ہو؟"

"میں انگلینڈ سے چلا تھا تو کرس تھا اب بھی اصولی طور پر مجھے کرس ہی ہونا چاہیے...." اس نے اپنے سنہرے بالوں کو فراخ پیشانی سے لپیٹا اور ہنسنے لگا....

یقیناً وہ اپنی شہرت کو چھپا رہا تھا اور سب کی نظروں سے دور ہو کر الگ ہو کر سفر کر رہا تھا....

"اور تم کہاں جا رہے ہو کرس؟"

"فی الحال خپلو.... اور پھر واپس سکردو۔ گلگت' خنجراب اور چین.... میری منزل ماؤنٹ ایورسٹ کا وہ بیس کیمپ ہے جو چین میں ہے.... مجھے وہاں پہنچنے کے لیے ایک وسیع صحرا عبور کرنا ہو گا"

مطیع میرے قریب ہوا۔ "میں نے اس سے پوچھا ہے کہ یہ خپلو میں کہاں قیام کرے گا اور اس کے فرشتوں کو بھی علم نہیں کہ کہاں ٹھہرے گا تو اسے اپنے کمرے میں سلا لیں گے"

"پتا نہیں کیسا شخص ہے.... اور یہ بھی پتا نہیں کہ وہاں جو کمرہ ملے گا اتنا بڑا ہو

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

گا کہ ہم چاروں اس میں سما جائیں ۔۔۔۔"

"بادشاہو وی آئی پی روم بک کروایا ہے خواجہ صاحب نے ۔۔۔ یہ سنگل روم میں سو جائے گا صوفے پر ۔۔۔ ویسے کھچڑ گورا ہے اس کے حوصلہ افزائی کرنی چاہئے۔۔۔" جب ہم اس کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے تو وہ ماتھے پر ایک سلوٹ ڈالے ایک شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ ہمیں دیکھتا جارہا تھا۔

کول کے بعد وادی وسیع ہوتی گئی دریا کے پار بلندی پر سرسبز قطعات دکھائی دیتے تھے جو چھوٹے چھوٹے دیہات تھے' یہ نارتھاں کا علاقہ تھا۔ ڈرائیور نے بتایا کہ ابھی پچھلے دنوں یہاں کے باسیوں نے ایک سنو ٹائیگر کو پکڑا تھا۔۔۔ اور یہ سنو ٹائیگر یا برفانی شیر بھی ایک عجیب مخمہ ہے۔ ایک پرکشش جانور ۔۔۔۔ ایسا ہے کہ کئی غیر ملکی سیاح مقامی گائیڈز کے ہمراہ مہینوں قراقرم کی بلندیوں اور برفوں میں دھکے کھاتے پھرتے ہیں تاکہ اس سفید شیر کا صرف دیدار کر سکیں یا ایک عدد تصویر اتار سکیں۔ ایک ایسی میم صاحب سے بھی ملاقات ہوئی جنہوں نے عمر عزیز کا بیشتر حصہ سنو ٹائیگر دیکھنے کی آرزو میں پہاڑوں میں بسر کیا اور وہ اس بات پر نازاں تھیں کہ انہوں نے ایک مرتبہ اس کی دم دیکھی تھی ۔۔۔۔ بقیہ شیر چٹان کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔

ویگن ایک ہموار' کچے اور قدرے پتھریلے راستے پر چلی جا رہی تھی لیکن یہ راستہ بلند پہاڑوں کے بیچ میں ایک میدان نما علاقے میں واقع تھا۔

"وہ جو بڑا پتھر دکھائی دیتا ہے۔ صاحب تو اس پر پرانا تصویر ہے۔۔۔ ٹورسٹ لوگ دیکھتا ہے" ڈرائیور نے لحہ بہ لحہ قریب آتے ایک جہازی سائز کے پتھر کی جانب اشارہ کیا جو راستے کے کنارے پر ایک عظیم کھنڈر کی طرح پڑا تھا۔

"ہم بھی دیکھتا ہے ۔۔۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "ویگن روکنا"

"دفع کرو صاحب کافر لوگ کا تصویر ہے آپ تو ماشاء اللہ مسلمان ہو" اس نے ویگن اور تیز کر دی۔

"اندازہ کرو" نظامی صاحب کی ہنسی کی آواز مجھ تک آئی۔

ایک چٹان دکھائی دی تو ڈرائیور نے پھر اطلاع کی کہ صاحب ادھر بھی کافر لوگ کی تصویر بنی ہے اور ٹورسٹ دیکھتا ہے۔ اس بار میں نے اس کا بازو پکڑ کر ذرا رعب سے کہا کہ بھائی جان آپ ویگن روک لو اور میری مسلمانی کو اتنا کمزور نہ جانو کہ چند تصویر بتاں دیکھنے سے خطرہ میں پڑ جائے گی۔

یہ ایک بہت بڑی سرخ چٹان تھی جس پر زمانہ قبل از تاریخ کے انسانوں نے اپنی خواہشوں کا اظہار کیا تھا۔ بارہ سنگھے۔ تیر کمان ۔۔۔ درخت۔ شکاری اور ان کے علاوہ اس زمانے کے بعد بدھ کے پجاریوں کے بنائے ہوئے پگوڈے اور بدھ کی شکلیں۔۔۔ ایک عظیم اور کھلی وسعت میں ایک ویگن جس کے مسافر ادھر ادھر بکھر چکے تھے۔ ایک چٹان اور اس پر ان مصوروں کا اظہار فن جو کبھی ان خطوں میں آباد تھے۔ شاید انہوں نے بھی کبھی اپنی بستی کے باہر حسین آباد کی طرح کوئی بورڈ لگایا ہو گا کہ خبردار اس بستی میں خلاف بدھ تعلیمات ۔۔۔

سفر دوبارہ شروع ہوا تو ویگن میں پریاں آ گئیں ۔۔۔ بلتستان اور ہمارے بقیہ شمال میں پری ایک خیال نہیں بلکہ حقیقت کے آس پاس ہے۔ ان میں مکھل پیری پریاں یعنی چڑیلیں بھی ہوتی ہیں ۔ بوڑھی اماں جان کے لبوں پر بھی مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور ویگن کے مقامی مسافر ہمیں پریوں کے قصے سنا رہے تھے ۔ ان میں ایک مولوی صاحب البتہ قدرے خشمگیں ہوتے تھے لیکن وہ بھی کھل کر پریوں کے خلاف کچھ نہیں کہتے تھے ۔۔۔۔۔

سکردو ٹاؤن کمیٹی کا کلرک تو پری سپیشلسٹ تھا اور بقیہ مسافر سر ہلا ہلا کر اس کی باتوں کی تائید کرتے جاتے تھے ۔

" پری سے ملاقات کرنے کا کوئی آسان طریقہ تو بتا دیجئے" مطیع نے عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے نہایت بردباری سے دریافت کیا۔

" صاحب بہت اچھا لباس پہنو خوشبو لگاؤ اور آدھی رات کے وقت گاؤں سے باہر کسی بلند مقام پر چلے جاؤ"

" آدھی رات سے پہلے نہیں آ سکتی پری" نظامی صاحب نے نہایت دلچسپی سے دریافت کیا۔

"نہیں صاحب ۔۔۔ اندھیرا ہونا چاہئے"

"تو آپ پری کے چاؤ میں وہاں جاؤ اور اندھیرے میں آ جائے چڑیل تو پھر۔۔۔" نظامی صاحب پھر بولے۔

"تو یہ چڑیل کی بدقسمتی ہوگی ناں" مطیع نے فقرہ کسا اور نظامی صاحب نے صرف "اندازہ کرو" کہنے پر اکتفا کیا۔

" تو جناب بلند مقام پر چلے جاؤ آدھی رات کے وقت ۔۔۔ اور پھر ہلکی سی خوشبو پہلے آئے گی پھر ہوا چلے گی اور پری آجائے گی اور اگر وہ آپ کو پسند کرلے تو آپ کو

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

اس سے شادی کرنی پڑے گی"

"سبحان اللہ" نظامی صاحب نے جھوم کر کہا۔

"پری سے شادی کس طرح ہو سکتی ہے؟"

"صاحب ہمارے گاؤں میں ایسے لوگ ہیں جن کی بیویاں پریاں ہیں ـــــــ اور وہ دوسرے لوگوں کو نظر تو نہیں آتیں لیکن میں آپ کو پریوں کے بچے دکھا سکتا ہوں"

"پریاں نہ سہی پریوں کے بچے ہی سہی"

"یار نظامی آپ ذرا بات سننے دو" مطیع نے جھنجلا کر کہا... "جی تو پریوں کے بچوں کے بارے میں بات ہو رہی تھی"

"جی صاحب۔ ہمارے گاؤں میں ہیں"

"صاحب یہ بالکل ٹھیک کہتا ہے..." بڑی اماں جان کے بیٹے نے سر ہلایا "ہمارے گاؤں میں بھی پریوں کے بچے ہیں"

جو بات ایک ہلکے پھلکے اور نیم سنجیدہ انداز میں شروع ہوئی تھی۔ ان لوگوں کے مکمل یقین کی وجہ سے ہم پر اثر کرنے لگی... کیا پتہ یہ سچ کہتے ہوں اور ہم ہی لا علم ہوں...

"میری شادی پری سے ہو سکتی ہے ـــــ" مطیع نے پوچھا۔

"اندازہ کرو تارڑ صاحب..." نظامی صاحب ہنسنے لگے۔

"اس میں ہنسنے کی کونسی بات ہے۔ اگر پریاں ان لوگوں کے ساتھ شادی کر سکتی ہیں تو میرے ساتھ کیوں نہیں کر سکتیں" مطیع مسکراتے ہوئے بولا

"اس لیے کہ پری آخر پری ہوتی ہے اس کا کچھ تو ذوق ہوگا ـــــ" جواب آیا

وادی کی وسعت سکڑنے لگی۔ پہاڑ قریب ہوئے۔ ہم ایک ایسے مقام تک آ گئے جہاں سندھ ہم سے جدا ہو رہا تھا۔ دریائے سندھ ادھر لداخ کی جانب سے آ رہا تھا اور ہم اسے عبور کر کے دریائے شیوک کے کنارے سفر کرنے لگے۔ یہ وہ مقام تھا جہاں سندھ اور شیوک آپس میں ملتے تھے۔ یہاں شیوک ایک عظیم پانیوں والا دریا تھا اور سندھ نسبتاً چھوٹا تھا لیکن ملاپ کے بعد یہ شیوک کی قسمت کہ اس کا نام سندھ ہو جاتا تھا... اور یہیں سے گندم اور جو کے سنہرے تختے دھوپ میں ایسے چمکتے تھے جیسے ایک ایک بوٹے اور خوشے کو سونے کے پانی سے پینٹ کیا گیا ہو۔ کٹائیاں شروع تھیں اور ان علاقوں کے کسان کھیتوں میں تھے۔ ان کی عورتیں اور بچے بھی ان کے

کام میں برابر کے شریک تھے... یہاں یاک اور گائے کے اختلاط سے پیدا کردہ جانور زوہ کھیتوں میں چلتا نظر آیا۔ سیاہ لمبے لمبے بالوں اور موٹی دم والا زوہ جو یاک اور گائے کے درمیان ایک سمجھوتہ ہے... یاک کے لیے یہ بلندی کم ہے اور گائے یا بیل کے لیے اتنی بلندی بہت زیادہ ہے... دونوں اس موسم میں زندہ نہیں رہ سکتے بلکہ کام نہیں کر سکتے... اس لیے دونوں کا آدھا آدھا... یعنی زوہ...

"صاحب دیکھیں ادھر یوگو کے قصبے میں کٹائی ہو رہی ہے" ڈرائیور نے ویگن ذرا آہستہ کی۔ یوگو کے باشندے جو اور گندم کے گٹھے سنبھال رہے تھے اور ان میں سے بیشتر کے کانوں میں یا ٹوپیوں پر پھول سجے تھے۔ بلتی پھولوں کے بے حد شوقین ہیں۔ ہر کچی کوٹھڑی کی چھت پر ٹین کے گملوں میں پھول اور بیلیں بہار دیتی ہیں

"براہ" میں سعودی عرب میں کام کرنے والا شخص اپنی نابینا اماں کے ساتھ اترا اور اس نے ہمیں ایک ایسی دعوت دی جو اگر میں اکیلا ہوتا تو ضرور قبول کر لیتا... کشمیری طرز کا لکڑی کا بنا ہوا مکان ایک درے کے پتھروں کے قریب ایک سرسبز کھیت کے سامنے اور وہ اس کا گھر تھا اور وہ چاہتا تھا کہ ہم ایک شب کے لیے اس کے مہمان بن جائیں۔ وہ بہت دیر ویگن کے باہر اپنی اندھی اماں جان کے ساتھ کھڑا ہمارے جواب کا انتظار کرتا رہا لیکن یہ بہت بوجھ ہوتا اور ہم نے بوجھل دل سے انکار کر دیا۔

نپلو کے راستے میں ایک ایسا ٹھہراؤ بھی تھا جہاں خوبانیوں کے باغوں میں چشمے بہتے تھے۔ ایک نہایت سویٹ قسم کا بوڑھا بلتی بابا آٹا پیسنے والی چکی کے اندر آٹے کی سفیدی میں نظر ہی نہیں آتا تھا اور مجھے دیکھ کر وہ آٹے سے بنے ہوئے ایک پیارے بھوت کی طرح نمودار ہوا اور پوپلے منہ سے مسکرانے لگا۔ میں اسے چکی کے اندھیرے سے باہر لایا تاکہ ایک تصویر اتار سکوں تو وہ سورج کی روشنی سے جیسے اور چھوٹا ہو گیا۔

تصویر کھنچوانے کے بعد وہ فوراً چکی کے اندر گھس گیا... شاید وہ وہیں اس کچی کوٹھڑی کے اندر آٹے سے بنے ہوئے اندھیرے میں پیدا ہو کر جوان ہوا تھا اور بوڑھا ہوا تھا۔ اس ٹھہراؤ کے بعد ہماری ویگن ایک ایسے راستے پر سے گزری جس کے دونوں جانب خوبانیوں کے باغ تھے اور انکی شاخیں راستے پر جھکی، سورج کو روکتی تھیں اور یہ راستہ تمام کا تمام زرد رنگ کا تھا اور روشن تھا کہ اس پر درختوں سے

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

گرنے والی بے انت خوبانیاں تہہ در تہہ بچھی ہوئی تھیں اور ان پر ہماری ویگن کے ٹائر کچر کچر کی آوازیں نکالتے چلتے تھے ...... اور ہم پیچھے دیکھتے تھے تو زرد راستے میں دو سیاہ لکیریں نظر آتیں تھیں جو ہمارے ٹائروں کے نشان تھے۔

شام ہو رہی تھی اور کھیت مزید سنہرے ہو رہے تھے۔

ویگن کچھ دیر کے لیے غواڑی کے خوبصورت قصبے میں بھی رکی....

اب ہم دریائے شیوک کے اوپر معلق چٹان میں بنی ہوئی تنگ اور نیم پختہ سڑک پر تھے اور چٹان کا سایہ دریا کے پار تک پھیلتا جاتا تھا اور اترتی شام کے ان خاموش لمحوں میں اور اس لینڈ سکیپ میں جو لاہور سے بہت دور لداخ کی بلندیوں کے آس پاس دریائے شیوک کے کنارے پر تھی، میں نے ویگن کی کھڑکی سے باہر دیکھا جہاں تک صرف ایک عقاب پرواز کر سکتا ہے اور وہاں ایک وادی تھی کوئی درہ تھا اور ایک چھوٹی سی سفیدی تھی جو ایک خوابناک اور دھیمی آبشار تھی جو بہت بلندی سے نیچے گر رہی تھی۔ فاصلے کی وجہ سے آبشار ایک تصویر کی طرح ساکت تھی اور کبھی واہمہ ہوتا کہ نہیں یہ پانی ہے اور تب یہ تصویر آہستہ سے حرکت میں آ جاتی ...... یہ ایک اور خواہش تھی ..... جو بہت فاصلے پر تھی اور بس سے باہر تھی۔

شام گہری ہو چکی تھی جب ہم دریائے شیوک کے کنارے پہنچے جہاں اوپر بلندی پر وادیٔ خپلو کو راستہ جاتا تھا۔ نیم تاریکی میں ایک تیز نالے کا شور ابھرا۔ ویگن رکی اور پھر گیئر بدل کر اس ندی میں اتر گئی جو کہیں اوپر سے آ رہی تھی اور دریائے شیوک میں شامل ہوتی تھی۔ ہم سڑک چھوڑ کر ندی میں اس لیے اترے کہ ندی کے پانیوں نے اس جگہ کو چھوڑ دیا تھا جہاں پل بنایا گیا تھا اور اب ایک نئے راستے پر چلتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ پانیوں کی تیزی ہمیں شیوک میں لے جائے گی اور میں پہلی دفعہ خوفزدہ ہوا۔ ندی سے نکلے تو سڑک پر پانی بہتا تھا جس میں ہم بلکہ ویگن تیرتی چلی گئی ..... اور پھر ایک درخت کے قریب رک گئی۔

"ریسٹ ہاؤس آگیا ہے صاحب ..." ڈرائیور اپنی نشست سے اٹھ کر اتر گیا۔ کنڈکٹر ہمارے رک سیک اتارنے لگا ..... تاریکی پہلے سے کم ہو چکی تھی کیونکہ کہیں پہاڑ کی اوٹ میں چاند اونچا ہو رہا تھا۔ ہم نے سامان اٹھایا اور ریسٹ ہاؤس کی جانب چلنے لگے ..... انگریز سیاح کرس اس تاریکی میں دریائے شیوک کے کنارے اپنا رک سیک اٹھائے کھڑا تھا اور ہمیں ریسٹ ہاؤس کی آسائش کی جانب بڑھتا ہوا حسرت سے

دیکھتا تھا۔

"کم آن کرس ..." میں نے اندھیرے میں پکارا۔

"تھینک یو ..." وہ ہمارے پیچھے چلنے لگا۔

خپلو کی رات میں اس مختصر ریسٹ ہاؤس میں وہی پراسراریت تھی جو ہر تھکے ہوئے مسافر کو ایک اجنبی مقام میں اور رات کے اندھیرے میں پہنچنے پر کسی نامعلوم رہائش گاہ کو دیکھ کر بدن میں پھیلتی ہے۔ ہم نے اپنا سامان برآمدے میں رکھا اور ادھر ادھر تانک جھانک کرنے لگے۔ ایک کمرے میں ڈائننگ ٹیبل پر دو سفید فام سیاح سر جھکائے بیٹھے تھے اور کچھ کھا رہے تھے۔ ان کے سامنے ایک دروازہ کھلا اور ایک جھکا ہوا شخص ایک چپاتی کو چنگی میں دبائے ہوئے باہر آیا۔ اس نے ہماری طرف دیکھا اور صرف دیکھا اور پھر چپاتی سیاح جوڑے کے سامنے رکھ کر چلا گیا۔

"ایکسکیوز می ..." نظامی صاحب نے مجھے دھکیل کر پیچھے کیا اور ان سے براہ راست مخاطب ہو گئے۔

"چوکیدار کہاں ہے؟"

وہ جوڑا اتنا بوڑھا نہیں تھا جتنا بے زار تھا۔ ہم تینوں کو دیکھ کر وہ کچھ خوش نہ تھے ... شاید ہم انکی مکمل تنہائی میں مخل ہوئے تھے۔ مرد نے سر اٹھایا۔ اس کے سامنے اس کا ہاتھ تھا جس میں ایک کانٹا تھا جس پر چنے کی دال کے چند دانے لرز رہے تھے۔ "چاپاتی" اس نے کہا اور پھر دال نوش کرنے لگا۔ چوکیدار پانچ منٹ بعد چپاتی لے کر آیا تو ہم نے کھانس کر اسے اپنی موجودگی کی اطلاع دی اور پھر ریزرویشن سلپ اس کے سامنے پیش کی جس پر وی آئی پی روم ہمارے نام بک تھا۔ اس نے سلپ دیکھی اور سر ہلایا۔

" آؤ صاحب ....." وہ باہر آیا اور برآمدے میں رکھے ہمارے سامان پر ایک نظر ڈال کر ایک دروازہ کھول دیا۔ خپلو کے مطابق یہ یقیناً نہایت آرام دہ رہائش تھی لیکن نظامی صاحب قدرے مایوس ہوئے "بادشاہو یہ وی آئی پی روم ہے تو عام روم کا کیا حال ہو گا..... "

"عام روم میں کرسی نہیں ہے صاحب" چوکیدار بولا۔ "اور قالین بھی نہیں ہے"

تب ہم نے غور کیا کہ واقعی وہاں دو کرسیاں بھی تھیں اور فرش پر کچھ بچھا ہوا

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

بھی تھا۔

"کھانا ملے گا؟" مطیع نے دریافت کیا۔

"کھانا ختم ہے صاحب ..." چوکیدار نے جواب دیا

"نہ نہ بزرگو ..." نظامی صاحب نے آگے بڑھ کر چوکیدار کی ٹھوڑی کو ہاتھ لگا کر منت سماجت شروع کر دی "پردیسی آدمی ہیں۔ مسافر ہیں ... کچھ بندوبست کر دو ... بازار سے کچھ لے آؤ"

"بازار تو اوپر ہے صاحب اور بند ہو چکا ہوگا۔ ویسے بھی اس وقت نالہ زور پر ہوتا ہے ہم اس کے پار نہیں جا سکتے"

"یعنی رات کے وقت ریسٹ ہاؤس اور خپلو کے درمیان ندی نالے منہ زور ہو جاتے ہیں؟"

"جی صاحب ... اچھا صاحب میں انڈا دیکھتا ہوں ..."

"اللہ تیرا بھلا کرے ..." نظامی صاحب نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔ "جا، جا کر انڈا دیکھ۔ ایک نہیں جتنے دیکھ سکتا ہے دیکھ اور پھر ان کا بنا آملیٹ اور کھلا مسافروں کو ..."

چوکیدار نے نظامی صاحب کو شک کی نگاہ سے دیکھا اور پھر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر واپس آیا "صاحب خپلو کے اے۔ سی صاحب کا فون آیا تھا کہ مہمانوں کو بتا دو کہ وہ صبح نو بجے آئیں گے اور پھر آپ کو خپلو کی سیر کرائیں گے اور صاحب انڈا نہیں ملا"

"او تیرا بیڑا غرق ..." نظامی صاحب نے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر کہا "اب کیا ہوگا؟"

"صاحب انڈا نہیں ملا لیکن مرغی مل گئی ہے۔ وہ بنا لوں؟"

"تیرے بچے جئیں ..." نظامی صاحب بستر سے اٹھے اور چوکیدار کے گال پر ایک واجبی سا بوسہ دیا۔ چوکیدار نے اب ذرا زیادہ شک کی نظروں سے نظامی صاحب کو دیکھا اور چلا گیا۔ کرس نے اپنا سلیپنگ بیگ نکالا اور فرش پر بچھا کر اس میں گھس گیا۔ مطیع کے حصے میں قالین والا حصہ آیا اور وہ اپنا سلیپنگ بیگ اس پر بچھا کر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ میں اور نظامی صاحب دونوں بستروں پر قابض ہو گئے۔

"اوہ مجھے خپلو پسند آ گیا" کرس نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔

"تم نے خپلو میں دیکھا کیا ہے برخوردار جو ابھی سے پسند آ گیا ہے" نظامی صاحب نے کمبل میں سے سر نکال کر پوچھا۔

"یہ ہرگز ضروری نہیں کہ انسان کچھ دیکھ کر ہی اسے پسند کرے ... یہ سب کچھ ہوا میں ہوتا ہے، ماحول میں ہوتا ہے۔ میں نے ایک گہرا سانس اس کمرے میں لیا ہے تو میں جان گیا ہوں کہ خپلو مجھے پسند آئے گا" کرس نے متانت سے تقریر کی۔

"بادشاہو ہے ناں دانشور گورا ... کیسی الٹ پلٹ باتیں کرتا ہے جو سمجھ میں نہیں آتیں" نظامی صاحب بھی کمبل سے باہر ہو گئے۔

"میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے اتنے پڑھے لکھے پاکستانیوں کے ساتھ سفر کرنے اور رات گزارنے کا موقع مل رہا ہے"

اس بیان پر سب حضرات نے سینے پھلا کر کرس کی تائید کی۔

میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ دنیا کی قومیں اگر ..." کرس اپنی ہتھیلی پھیلا کر پھر تقریر شروع کرنے کو تھا کہ مطیع نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا "آہا ... واہ ... کیا ہاتھ ہے" مطیع نے جھوم کر کہا۔

"یہ میرا ہاتھ ہے" کرس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی لیکن مطیع دست شناس کم اور دست گیر زیادہ تھا۔ اس پر کرس نے اسے شک کی انہی نظروں سے دیکھا جن نظروں سے چوکیدار نے چومے جانے پر نظامی صاحب کو دیکھا تھا کہ یہ مشکوک انشورنس والا میرا ہاتھ کیوں اتنی محبت سے تھامے ہوئے ہے۔

"واہ ..." مطیع نے زبان سے ایک پٹاخہ سا چلایا "یہ تو نپولین کا ہاتھ ہے۔"

"نپولین کا ..." کرس چوکنا ہو گیا اور پھر خوشدلی سے بولا "اس کا مطلب ہے کہ گھر سے چلتے ہوئے میں اپنے ہاتھ کی بجائے نپولین کا ہاتھ ساتھ لے آیا ہوں"

"میں جھوٹ نہیں کہہ رہا" مطیع نے باقاعدہ وجد میں آ کر کہا۔ "تمہارے ہاتھ کی یہ انگلی ..." اس نے کرس کی چھنگلی کو ایک بھنڈی توری کی طرح چٹکی میں لیتے ہوئے سر ہلایا۔ "سو فیصد نپولین کی ہے اور تمہاری شادی ایک ایسی خاتون کے ساتھ ہو گی جو ایک جگہ گھر بنا کر نہیں رہے گی"

کرس کی مسکراہٹ یکدم سمٹ گئی "کرائسٹ ... میری منگیتر وزارت خارجہ میں کام کرتی ہے اور ان دنوں ہالینڈ میں پوسٹڈ ہے ... گاڈ ... تم نے یہ کیسے

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

جان لیا ؟"

"میں ہاتھ پڑھ سکتا ہوں ---" مطیع نے عینک اتار کر اس کے شیشے چمکائے اور اسے دوبارہ پہنتے ہوئے دانت نکال دیئے۔

"مجھے کچھ اور بتاؤ ---" کرس نے انتہائی لجاجت سے درخواست کی اور اپنی ہتھیلی مطیع کی عینک کے نیچے کھول دی۔

"اندازہ کرو -------" نظامی صاحب نے بیزار ہو کر میری طرف دیکھا "یہ یہاں خپلو دیکھنے آیا ہے کہ ہاتھ دیکھنے"

ادھر کرس مطیع کے ہر فقرے پر بڑی سعادت مندی سے سر ہلا رہا تھا اور اس کے کان صرف اس کی آواز پر لگے ہوئے تھے "بچپن میں تم ایک بار مرتے مرتے بچے تھے! تمہارے دل میں محبت کے لیے بہت جگہ ہے لیکن لوگ تمہاری محبت کا جواب نفرت سے دیتے ہیں۔ تم بے حد حساس ہو۔ تم دل کے بہت سادہ ہو اس لیے دوست دھوکا دے جاتے ہیں۔ تم لوگوں پر آسانی سے اعتماد کر لیتے ہو لیکن دل کے امیر ہو۔ اگلے سے اگلے برس تمہاری زندگی میں ایک بہت بڑی تبدیلی آئے گی۔ تم دولتمند بن جاؤ گے--- تم ایک ملنسار شخص ہو لیکن ....." اور کرس مطیع کے ہر فقرے پر سعادت مندی سے سر ہلا رہا تھا۔

"کرس جب تم اپنے مستقبل کی خبروں سے فارغ ہو جاؤ گے تو میں تمہیں چار برطانوی خواتین کے بارے میں چار نہایت ناقابل بیان لطیفے سناؤں گا---" نظامی نے اپنے گھٹنے اور سفید بالوں میں ہاتھ پھیرا اور شرارت ان کے چہرے پر جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی تھی۔

"کیا واقعی ؟" کرس فوراً متوجہ ہو گیا "میں ہمہ تن گوش ہوں۔ سنائیے"

"میں نے کہا تھا ناں کہ لطیفے ناقابل بیان ہیں تو میں ایک شریف آدمی کی حیثیت سے ایسے لطیفے کیسے سنا سکتا ہوں ---" نظامی نے ایک پر شور قہقہہ لگایا .... اور اسی لمحے ہمیں احساس ہوا کہ ہم ایک دور دراز کی وادی میں ایک چھوٹے سے ریسٹ ہاؤس کے کمرے میں بیٹھے ہیں اور باہر رات ہے اور خاموشی ہے اور اس خاموشی میں صرف ہماری باتیں ہیں اور نظامی کا قہقہہ ہے جو ابھی ابھی گونجا ہے۔

"باہر چلیں ------"

"لیٹے رہو بادشاہو۔ آرام کرو۔ بہت سفر کیا ہے اور باہر جانا کدھر ہے ؟ دریائے شیوک میں ؟" نظامی کہنے لگے۔

"ہم پرسوں واپس سکردو چلے جائیں گے --- آج کی رات اور کل کی رات --- تو آج کی رات -------" میں نے ابھی فقرہ مکمل نہیں کیا تھا کہ نظامی صاحب نے ایک دلدوز "ہائے ہائے" کی اور بستر پر کھڑے ہو کر کہنے لگے "ہائے ہائے آج کی رات ساز دل پر درد نہ چھیڑ.... ظالمو نوری نے کیا گانا گایا تھا"

"عرض میں یہ کر رہا تھا کہ ذرا باہر چل کر دیکھتے ہیں کہ وادی خپلو کی رات کیسی ہوتی ہے---"

"ہائے ہائے آج کی رات ---" نظامی صاحب سرہلاتے ہوئے بستر سے نیچے آ گئے۔ کرس کو معلوم نہیں تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہے اور کیوں ہے لیکن وہ بے حد خوش نظر آ رہا تھا۔

کمرے سے نکلے۔ برآمدے سے پرے صرف اندھیرا تھا اور اس اندھیرے میں سے کہیں کہیں ہلکی روشنی آتی تھی۔

"ہاں جی کدھر چلیں.... دائیں کہ بائیں ؟" نظامی صاحب نے پوچھا۔

"آپ تو ہمیشہ بائیں چلتے ہیں۔ اس لیے بائیں"

ایک راستہ نیچے جاتا تھا جس پر ہم چل کر آئے تھے۔ یہ اب دکھائی تو نہیں دیتا تھا لیکن ہم جانتے تھے کہ یہ وہاں ہے پھر اس پر شور نالے کی موجودگی کا احساس ہوا اور وہ قریب آ گیا۔ ہم سب ایک ہی لمحے میں ایک کیفیت سے دوچار ہوئے کہ ہمارے شوز بھیگ چکے ہیں' اور ہم پانی میں چل رہے ہیں۔ ہم نے اپنے آپ کو بچانے کی خاطر ادھر ادھر پاؤں رکھنے کی کوشش کی لیکن اندھیرے میں صرف پانی تھا اور پاؤں پانی ہی میں پڑتے۔ یہ وہ راستہ تھا جس پر نالے کا پانی کناروں سے نکل کر بہہ رہا تھا۔ اس راستے کے اختتام پر ہمیں روشنی دکھائی دی اور یہاں وہ نالہ دریائے شیوک میں شامل ہو رہا تھا۔ جہاں سے ہم آئے تھے وہاں گھنے درخت تھے اور اس لیے تاریکی تھی اور یہاں دریائے شیوک کے کنارے اور پورے دریا پر اور دوسرے کنارے پر جو بہت دور تھا اور جہاں چٹانیں بلند ہوتی تھیں وہاں ہر جگہ روشنی تھی' ہلکی چاندنی تھی۔ ہم اب دیکھ کر چل سکتے تھے اور ہم پھدکتے ہوئے' چھوٹی چھوٹی نالیوں کو پھلانگتے ہوئے دریا کے کنارے تک چلے گئے جہاں پانی کی سفید چادر بے چینی سے ایک گرم بدن کی طرح کسمساتی تھی۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"اندازہ کرو" نظامی صاحب نے کہا۔ "باہر یہ عالم ہے اور ہم کمرے میں بند بیٹھے تھے"

اور واقعی باہر وادیٔ خپلو کی چاندنی رات میں ایک عجیب عالم تھا ـــــ اور اس عالم میں صرف ہم تھے جو غیر ضروری تھے۔ دریائے شیوک ایک وسیع ریگستان کی طرح چاندنی میں لو دیتا تھا۔ ہم پتھروں پر بیٹھ گئے۔ ہمیں مہتاب کا انتظار نہیں کرنا پڑا تھا لیکن ـــــ ہر سائے تلے اس کا عکس جھلکتا تھا ـــــ اس کا عکس جس کا وجود دور ہو جاتا ہے لیکن وہ موجود رہتا ہے۔ ساتھ ساتھ چلتا ہے اور آپ اس سے باتیں کرتے ہیں اور جب کبھی کوئی ایسا منظر سامنے آتا ہے۔ جب کبھی آپ کسی عالم میں جاتے ہیں تو پھر اس کی کسک اٹھتی ہے کہ وہ یہاں ہو اور تب اس کا عکس ہر سائے تلے جھلکتا ہے .... ہر شخص کے پاس اپنا ایک عکس ہوتا ہے اور جس کے پاس نہ ہو اس کی زندگی رائیگاں گئی۔

"کرس اگر تم زیادہ خاموش رہے تو میں چار انگریز خواتین کے بارے میں بہت ہی نازیبا قسم کے لطیفے سناؤں گا"

کرس نے جواب نہیں دیا۔ ماتھے پر آئے بالوں کو ایک جھٹکے سے پیچھے کیا اور چپ رہا۔

"کرس ہم تمھاری شاعری سنیں گے" مطیع نے فرمائش کی۔

"نہیں" کرس لڑکیوں کی طرح شرما گیا۔

"تمہیں اس سے بہتر سامعین تو مل سکتے ہیں لیکن اس سے زیادہ خوبصورت ماحول نہیں ملے گا۔ سنا دو"

"میرے پاس کتاب نہیں ہے۔" وہ ابھی شرما رہا تھا "لیکن میں کچھ پاکستانی شاعری سننا پسند کروں گا"

"چل بھئی مطیع شروع ہو جا" نظامی صاحب نے اس کے کندھے پر تھپکی دی "ہمارا یہ شیر اسکول کے مباحثے میں ہمیشہ اول آیا کرتا تھا۔ اور اسے بڑا بڑا شعر یاد ہے...."

"بہت ہی دلچسپ" کرس نے سر ہلایا "تو آپ لوگوں کو شعر پڑھنے کے لیے کتاب کی ضرورت نہیں پڑتی"

"چل بھئی اسے سنا وہ والا .... کہ لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری" نظامی صاحب شاید دریا کی قربت کی وجہ سے موج میں تھے۔

"غالب کا شعر سنا دوں؟" مطیع نے کھانس کر پوچھا۔

"مسٹر کرس اب آپ کو مطیع صاحب ہمارے ایک گریٹ پوئٹ غالب کا شعر سنائیں گے۔ سناؤ بھئی...."

مطیع نے کھانس کر شروع کیا "دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے۔"

نظامی صاحب فوراً دخل انداز ہو گئے۔ "اوئے انگریزی میں ترجمہ کر کے سناؤ"

چنانچہ مطیع صاحب نے پٹڑی بدل لی۔ "دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے ـــــ او سٹوپڈ ہارٹ وہاٹ ہیز ہیپنڈ ٹو یو۔ اور آخر اس درد کی دوا کیا ہے۔ ایٹ لاسٹ وہاٹ از دی میڈیسن آف دس پین"

کرس یہ شعر سن کر بہت دیر تک عالمِ استغراق میں رہا۔ پھر باہر آیا تو سر اٹھایا اور کہنے لگا "کیا واقعی یہ کسی گریٹ پوئٹ کا شعر ہے.... اگر ہے تو وہ گریٹ نہیں سٹوپڈ پوئٹ ہے"

"مروا دیا ہے ناں غالب کو" نظامی صاحب مطیع پر برس پڑے "یہ ترجمہ ہے؟"

"چلیے نظامی صاحب آپ انگریزی پڑھاتے ہیں تو آپ اس سے بہتر ترجمہ کر دیں" مطیع ناراض ہو کر کہنے لگا۔

"ہماری شاعری کا ترجمہ نہیں ہو سکتا کرس .... اور شاید کسی بھی زبان کی شاعری کا ترجمہ نہیں ہو سکتا اس لیے ہم تمہیں تمھاری شاعری سناتے ہیں"

پہلے نظامی صاحب نے پیراڈائز لاسٹ کے کچھ حصے سنائے۔ پھر میں نے بائرن اور ایلیٹ کی چند سطریں دہرائیں اور آخر میں مطیع نے انگریزی کے چند ایسے شعر سنائے جو بہت اچھے تھے لیکن کسی نامعلوم شاعر کے تھے۔ بعد میں اس نے ہمیں بتایا کہ وہ نامعلوم شاعر وہ خود تھا اور اگر وہ اس وقت یہ بتا دیتا تو نظامی صاحب ہرگز اتنی داد نہ دیتے جتنی کہ انہوں نے دی۔

خنکی زیادہ ہو کر سردی ہو گئی تھی۔ ہمارے آس پاس چھوٹی چھوٹی نالیاں بہتی تھیں اور ان میں کہیں کہیں وہ چاند بہتا تھا جو دریائے شیوک کے پھیلاؤ کو روشن کرتا تھا اور اس لمحے ہم ایک دوسرے سے الگ ہو گئے اپنی اپنی دنیاؤں میں چلے گئے۔ ہم خاموش تھے کیونکہ ہمارے پاس کہنے کو کوئی ایسی چیز نہ تھی جو خاموشی سے زیادہ خوبصورت ہوتی۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

وادی خپلو

میں سانس سنبھالتا ہوا سر جھکائے ہولے ہولے قدم اٹھا رہا تھا اور میں خاصا تھک چکا تھا۔ میرا شہری بے ڈول جسم اس چڑھائی کے قابل نہ تھا لیکن اس میں جو خانہ بدوشوں والی ڈھٹائی تھی اس کے سہارے وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ چونکہ میں سامنے دیکھ نہیں رہا تھا۔ سر جھکائے ہوئے تھا' اس لیے صرف سن رہا تھا یا محسوس کر رہا تھا اور مجھے پانی کے چلنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ بہت دور کہیں چند خوش نوا پرندے چہکتے تھے اور ان میں سے ایک پرندہ ساتھیوں کے چپ ہو جانے کے بعد ایک لمبی "ہو ہو" کرتا تھا۔ ہوا جو پسینے سے بھیگتے چہرے کو چھوتی تھی سرد تھی۔ اور آس پاس جنگلی پھولوں کی مہک تیرتی پھرتی تھی۔

چند قدم آگے مطیع اکرس اور فدا حسین تھے۔

مجھ سے پیچھے نظامی صاحب کمر پر ہاتھ رکھے نظارے دیکھنے کے بہانے بار بار رکتے تھے اور ہونکتے تھے "کتنی دور رہ گئی ہے یہ چن جی مسجد؟"

"چن جی نہیں" میں بھی بہانہ پر کر رک گیا "چقچن مسجد .... بلکہ خانقاہ صوفیہ چقچن۔ انگریز مورخ جان بارلے کے مطابق یہ اپنے منفرد طرز تعمیر کی وجہ سے ایشیا کی سب سے خوبصورت خانقاہ ہے۔ اس کی بنیاد حضرت میر سید علی ہمدانی نے رکھی اور اسے میر شمس الدین محمد عراقی نے پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ تقریباً" چھ سو برس قدیم ہے...."

"چن جی میں نے صرف یہ پوچھا ہے کہ یہاں سے یہ مسجد کتنی دور رہ گئی ہے اس کی وہ تاریخ نہیں پوچھی جو آپ نے کسی گائیڈ بک میں پڑھ کر رٹ لی ہے"

"ابھی بہت دور ہے" میں نے بیزار ہو کر کہا

"یار ضروری ہے اس مسجد کو دیکھنا؟" نظامی صاحب بمشکل مجھ تک آئے۔

"بہت ضروری ہے"

نظامی صاحب نے اوپر دیکھا جہاں کچھ دھند تھی اور کچھ برف تھی اور ہمیں وہاں تک جانا تھا۔

آج پورے نو بجے جب ہم ناشتے سے فارغ ہو کر ریسٹ ہاؤس کے چھوٹے سے لان میں واقع ایک بہت بڑے اخروٹ کے درخت کے نیچے بیٹھے وادی خپلو کی ہوا میں لمبے لمبے سانس لے رہے تھے تو فدا حسین صاحب آگئے .... دونوں بازو سینے پر رکھے شلوار قمیض اور جرسی میں ملبوس دبلے اور لداخی نین نقش والے فدا صاحب خپلو کے اسسٹنٹ کمشنر تھے اور ظاہر ہے مرداد صاحب کے شاگرد تھے اور اپنے استاد کی ہدایت کے مطابق ہم مسافروں کو خپلو دکھانے اور ہمارے آرام و آسائش کا ذاتی جائزہ لینے کے لیے بنفس نفیس پہنچ چکے تھے۔

"کمال ہے بھئی ..." نظامی نے میرے کان میں کہا "بندہ اے سی ہے اور کوئی پھوں پھاں اور پھنکار وغیرہ نہیں ہے۔ کتنا سادہ آدمی ہے"

فدا صاحب نے خپلو کی سیر کا لائحہ عمل تیار کر رکھا تھا اور اب ہم پروگرام کے پہلے مرحلے میں تھے یعنی خانقاہ چقچن کی جانب رواں تھے بلکہ رواں تو خیر کیا تھے اٹک اٹک کر چڑھتے جاتے تھے۔ آس پاس کھیت بہت تھے۔ ان میں جو کی فصل سنہری ہو رہی تھی۔ یہاں بھی ہل کے آگے بیلوں کی بجائے سیاہ زوہ زور لگا رہے تھے۔ ہم جیسے جیسے دریائے شیوک سے بلند ہوتے تھے آس پاس کا منظر وسیع ہوتا چلا جاتا تھا۔ ہمارا راستہ ایک کچے گھروندے کے جنگلی باغ کے اوپر سے گزرا تو بہت ساری تیز مہک نے مجھے رکنے پر مجبور کر دیا۔ یہ چھوٹا سا باغ کسی کے شوق نظر اور حسن جمال کی ایک صد رنگ تصویر تھا کچے گھروندے کے اندر سے ایک بیچارگی کی مسکراہٹ والا شخص باہر آیا .... اس نے بڑے فخر سے مجھے پھولوں کے نام بتائے۔

"یہ پھول یقیناً وادی خپلو میں ہی پائے جاتے ہوں گے؟" میں نے پوچھا۔

"صاحب میں تو ان کا بیج لاہور سے لایا ہوں۔ ادھر ہم ایک باورچی ہے صاحب...." وہ میری جانب منہ اٹھائے کھڑا تھا۔ "آپ گھر میں آؤ صاحب چائے پیو"

میں اس چھوٹی سی ارضی جنت میں کچھ دیر ٹھہرنا چاہتا تھا لیکن میرے ساتھی بہت آگے جا چکے تھے۔ یہاں تک کہ نظامی صاحب بھی ابھی ابھی مٹکتے ہوئے گزر گئے تھے۔ میں نے لاہور کے باورچی سے معذرت کی اور چڑھائی چڑھنے لگا... پانی کی آواز اب زیادہ گونجتی تھی۔ بلندی پر ایک وسیع تالاب میں چھوٹے چھوٹے بچے نہا رہے

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

تھے۔ انھیں اس یخ پانی میں نہاتے دیکھ کر کپکپی سی چڑھتی تھی۔ تالاب کے پس منظر میں برف پوش پہاڑوں کی خاموشی تھی۔۔۔ اور ہاں مجھے یہ کہنے دیجئے کہ وادی خپلو اور آس پاس کے خطے شدید خاموشی میں ہوتے ہیں۔ یہاں سوائے پانی کی آواز کے اور کچھ سنائی نہیں دیتا اور اس کے پہاڑوں میں گہری موت ایسی اداسی جیسے کہیں سے آکر اترتی رہتی ہے۔۔۔ اور منظر میں جذب ہوتی رہتی ہے۔

اب راستے کے آس پاس آبادی نظر آنے لگی۔۔۔ لیکن بہت کم۔۔۔ پانی کی نالیاں گھروں میں سے گزر کر کھیتوں میں جا رہی تھیں۔ یہاں بھی آب پاشی کا وہی نظام رائج تھا جو وادی ہنزہ کی ہریالی کا باعث ہے۔ گلیشیئر میں سے آنے والے پانیوں کو چھوٹی چھوٹی نہروں میں تقسیم کرکے گھریلو اور زرعی ضرورت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔۔۔ بس یہی راستہ تھا اور پانی کے تسلسل کی یہی موسیقی تھی اور اوپر جہاں چقچن مسجد تھی ابھی دھند تیرتی تھی اور ہوا میں تیز سردی گھلی ہوئی تھی اور میں ایک چھوٹی نہر کے کنارے چلتا تھا جب مجھے اس بات کا ثبوت ملا کہ ان علاقوں میں واقعی پریاں ہوتی ہیں۔ وہ چہرے جن پر وادی خپلو کے باغوں اور چناروں کی سرخی تھی اور ان کا حسن زمین کا نہ تھا کسی بلندی کا تھا تو ایسے چہرے مٹی کی دیواروں کے اوپر سے کبھی کبھار ظاہر ہوتے اور پھر چھپ جاتے۔ میں ان کی جانب دیکھتا نہ تھا کہ یہ معیوب بات ہوتی لیکن ان کی موجودگی میں ایسی شدت تھی کہ میں پھر بھی انھیں دیکھتا تھا۔۔۔ ان میں سے ایک نے دونوں کانوں میں جنگلی پھول اڑس رکھے تھے۔ ایک کی صرف آنکھیں کچی دیوار پر جیسے دو نیلی دنیاؤں کی طرح رکھی تھیں اور مجھے دیکھتی تھیں۔۔۔ میں اپنے ساتھیوں سے بہت پیچھے رہ گیا تھا اور پیچھے رہنے والے ہمیشہ گم ہو جاتے ہیں۔۔۔ میں بھی گم تھا ان آبی گزر گاہوں کے شور میں اور اس لداخ کے آس پاس کے موسم میں' اس بلندی میں جہاں آسمان نیچے آتا جاتا تھا اور ان شکلوں میں جنھیں میں پہلی اور آخری مرتبہ دیکھتا تھا اور صرف ایک ناکافی جھلک دیکھتا تھا۔

وہ سب ایک پن چکی کے شور کے قریب میرے منتظر تھے۔۔۔ ہم اکٹھے اوپر چڑھنے لگے۔ دھند کے اندر ایک دروازہ آیا جس کے ماتھے پر مندرجہ ذیل عبارت درج تھی۔

خانقاہ چقچن

معماران میر سید علی ہمدانی ۷۸۳ھ: میر سید محمد نور بخش۔ میر شمس الدین عراقی

ہم جوتے اتار کر اندر داخل ہوئے تو سامنے دو بوڑھے چلے آرہے تھے جو ہمیں دیکھ کر رک گئے۔ انھوں نے سلام میں پہل کی۔ "آپ کہاں سے آئے ہو صاحب؟"

اس کا جواب فدا صاحب نے اپنی زبان میں دیا اور جب بھی لاہور کا ذکر آتا تو ہم سب مسکرا کر سر ہلا دیتے۔ یہ بوڑھے انتہائی مزیدار تھے۔ یوں تو بوڑھے بہت کچھ ہو سکتے ہیں۔ یعنی سنکی' بد مزاج' خوش مزاج' پیارے یا خوفناک لیکن ان دو بابوں کے لیے میرے پاس صرف مزیدار کا لفظ ہی ہے۔ وہ ان چھوٹے بچوں کی طرح تھے جو اسکول کے فینسی ڈریس کے لیے بابے بن کر آگئے تھے اور اب ان کی مسکراہٹ ان کے قابو میں نہ تھی۔ وہ ہمارے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ پہلی منزل پر اعتکاف کے لئے کوٹھڑیاں تھیں۔ ان میں بمشکل داخل ہوا جا سکتا تھا' اور اندر سے ان کی چھت نیچی تھی اور کل رقبہ اتنا تھا کہ عبادت گزار اگر انگڑائی لینا چاہے تو ہاتھ چھت یا دیوار سے جا لگیں۔ فرش پر ایک خاص قسم کی گھاس بچھی تھی جو اتنی نرم اور لچکیلی تھی کہ اس کی موجودگی میں کسی بستر یا بچھونے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اس گھاس میں بھی ایک مخصوص مہک تھی۔ ان کوٹھڑیوں میں پچھلے کئی سو برسوں کی عبادت کی پاکیزگی محسوس ہوتی تھی۔ لکڑی کی سیڑھیوں پر احتیاط سے قدم رکھتے ہوئے ہم اوپر گئے۔

خانقاہ چقچن تمام کی تمام لکڑی سے بنی تھی۔ یہ اتنی بڑی نہ تھی کہ لاہور کی شاہی مسجد دیکھنے والی آنکھ کو بڑی لگے لیکن یہ اتنی بڑی ضرور تھی کسی گلیشیئر کے دامن میں واقع دس جھونپڑوں پر مشتمل گاؤں کے کسی باسی کو حیرت زدہ کر دے۔ اس کی وسیع بالکونی اندرون لاہور کے کسی قدیم مکان کی بالکونی سے مشابہ تھی۔ فرش پر دریاں بچھی تھیں۔ ہم سب ان پر بیٹھ گئے۔

"گاڈ از گریٹ" نظامی صاحب نے دعا کے انداز میں ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"ہی از" کرس نے خانقاہ کے ماحول سے متاثر ہو کر ہم سب کی طرف دیکھا۔

"چقچن کے معنی کیا ہیں؟" کسی نے پوچھا۔

"اگر اجازت ہو تو میں بتاؤں؟" فدا صاحب جو مجسم شرافت کا نمونہ تھے کھانس کر بولے "کہا جاتا ہے کہ چقچن کا مطلب ہے لوہے کی چیز۔ یہاں ایک ستون ہے جس کے ساتھ ایک زنجیر ہوتی تھی اور مقامی آبادی کا یقین تھا کہ یہ زنجیر ایک زمانے میں

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

آسمان سے ملی ہوئی تھی جس کے ساتھ زیادتی ہوتی تھی تو وہ اس زنجیر کو ہلا دیتا تھا۔"

"واہ" مطیع نے سرہلایا "یہ تو ڈائریکٹ ڈائلنگ والی بات ہے"

"یقیناً" فدا صاحب مسکرائے "اس کے علاوہ اس مسجد کو شیاخ چن بھی کہتے ہیں اور اس کا مطلب ہے انصاف کی مسجد اور ہمارا عقیدہ یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص اس مسجد کے اندر بیٹھ کر جھوٹی قسم کھائے تو وہ مرجاتا ہے"

"خیریت اسی میں ہے کہ یہاں سے جلد از جلد روانگی کر لی جائے" نظامی صاحب دھیرے دھیرے لیٹ گئے اور اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرنے لگے "ورنہ فوتیدگی کا خطرہ ہے"

بالکونی سے دھند اندر آتی تھی اور اوپر کہیں دھند دھوپ میں آتی تھی تو اتنا منظر چمکنے لگتا تھا۔ خانقاہ چقچن ان دنوں پینٹ کی جا رہی تھی اور اس کے سینکڑوں برس پرانے نقش و نگار پر سبز رنگ تھوپا جا رہا تھا۔ اور جہاں جہاں رنگ کیا گیا تھا وہ حصہ کیمیائی اجزا کی کاٹ کی وجہ سے اپنی نشست چھوڑنے پر آمادہ تھا۔ میں نے فدا صاحب سے گزارش کی کہ وہ اپنی افسری دکھائیں اور اس خانقاہ کو سبز رنگ کے پینٹ سے بچائیں۔

ہم خانقاہ سے باہر آئے تو کچھ اور دھند چٹانوں کے آس پاس سے اتری اور اس کی بالکونیوں کے راستے اندر جانے لگی۔ شاید اس دھند میں کچھ پانی بھی تھا جو ٹپکنے لگا اور ہم بھیگتے ہوئے نیچے اترنے لگے۔

دوپہر کے کھانے کا بندوبست فدا صاحب کی رہائش گاہ پر تھا۔ ہم ایک مختصر سی بیٹھک میں دبکے بیٹھے تھے کیونکہ باہر تیز جھکڑ چل رہے تھے جن سے وادی خپلو کی ڈھلوانوں پر کھڑے پاپلو کے درخت دوہرے ہوئے جاتے تھے۔ کھڑکیاں بند تھیں لیکن ہوا ان کے کواڑوں کو دھکیلتی تھی۔ بیٹھک بالکل سادہ اور بنیادی ضرورتوں سے مزین تھی۔

"تنخواہ میں آپ کا گزارہ ہو جاتا ہے فدا صاحب؟" نظامی صاحب نے پوچھا۔

فدا صاحب کہنے لگے "میری تو آدھی تنخواہ بچ جاتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنے پیسوں کا کروں کیا؟ گھر سرکاری ہے۔ صرف کھانے کا خرچ ہے تو وہ اس وادی میں کتنا ہو جائے گا"

یہ ذرا قابل حیرت بات تھی کہ اسلام آباد کے قیام کے دوران میں نے وہاں ایک بھی مطمئن سرکاری افسر نہیں دیکھا تھا۔ ہر افسر کے پاس کم پلاٹ تھے کم بیڈ روم

آپریشن فلاں امریکی سرجن کی بجائے فلاں برطانوی ڈاکٹر سے کروا رہا تھا۔ کیونکہ وہ بے چارہ فلاں امریکی سرجن کو افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔

اس دوپہر کا کھانا ان خطوں کی وہ مخصوص خوراک تھی جو اہل خپلو اپنے معزز مہمانوں کو پیش کرتے ہیں۔ چاہے یہ مہمان ہم جیسے ہی کیوں نہ ہوں۔۔۔ ابلے ہوئے چاول۔ گوشت اور مقامی ساگ۔۔۔ ہم نے جی بھر کر کھایا اور غنودگی ایک خوبصورت پسندیدگی کی صورت ہمارے بدن پر حاوی ہونے لگی۔ نظامی صاحب قریبی پلنگ پوش تک رینگتے ہوئے گئے اور دراز ہو گئے' مطیع عینک اتار کر آنکھیں جھپکنے لگا۔ میرے لبوں پر بھی ایک احمقانہ سوئی سوئی سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اور کرس ہم سب کی طرف دیکھتا تھا' اور اپنے سنہری بالوں کو اپنے ماتھے سے ہٹاتا تھا۔

"آپ غالباً کچھ دیر کے لیے ستانا پسند فرمائیں گے" فدا صاحب کچھ سرکاری کام نپٹا کر واپس آ گئے۔

"اگر ہم ستانا پسند نہ کریں تو کیا ہو سکتا ہے؟"

"آج چار بجے خپلو کے راجہ کے محل میں آپ چائے پر مدعو ہیں۔۔۔ ابھی ڈیڑھ بجا ہے۔ ہم اس دوران سورمو کے پل تک جا سکتے ہیں جو سیاچن گلیشیئر کے راستے میں ہے اور مشہ بروم کی چوٹی بھی دیکھ سکتے ہیں"

"مشہ بروم کی چوٹی تو دیکھنا چاہیے" میں نے ذرا بیدار ہو کر کہا "نظامی صاحب دیکھی ہے مشہ بروم کی چوٹی؟"

"بادشاہو سو جاؤ" وہ بمشکل بولے۔ "چوٹیاں ساری ایک جیسی ہوتی ہیں اور یہ تجربے کی بات بتا رہا ہوں۔ کل دیکھ لیں گے"

"لیکن کل تو ہم چلے جائیں گے"

"ضرور دیکھنی ہے مشہ بروم کی چوٹی؟"

"ہاں ضرور دیکھنی ہے"

فدا صاحب کی سرکاری جیپ بڑی آہستگی سے نیچے آنے لگی اور اس کا انجن بند تھا۔ انجن کے شور کے بغیر اس میں سواری ایک اڑن کھٹولے کی طرح تھی۔ نیچے دریائے شیوک کے کنارے پہنچ کر ڈرائیور نے انجن سٹارٹ کیا اور ہم سورمو کی جانب سفر کرنے لگے۔ ریسٹ ہاؤس کے قریب سے گزر کر جب ہم ذرا آگے گئے تو جہاں دریا کا پاٹ چوڑا تھا وہاں پھولے ہوئے مشکیزوں سے بنی ہوئی ایک کشتی مسافروں کی

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

تھے اس کے بچے اتنی بڑی یونیورسٹی میں نہیں پڑھتے تھے۔ وہ اپنے دل کا بائی پاس منتظر تھی۔ کشتی کا مالک ہاتھ میں ایک لمبا سا بانس لیے کھڑا تھا۔ وہ اسسٹنٹ کمشنر کی جیپ دیکھ کر کمر تک جھک گیا۔ شکیروں کی یہ کشتی ازمنہ قدیم سے ان علاقوں میں دریا عبور کرنے کے لیے استعمال کی جاتی رہی ہے۔ اور اب بھی اگر آپ کو خپلو کے نواح میں دریا کے پار جانا ہے تو بس یہی طریقہ ہے۔ مقامی مسافر کے لیے دو روپے اور "انگریز" یعنی سیاح حضرات کے لیے بیس روپے... اس کشتی کو "انڈس رافٹ" بھی کہا جاتا ہے۔ حالانکہ اسے یہاں تو شیوک رافٹ کہنا چاہیے۔

خپلو سے آگے سڑک چٹان کے ساتھ چٹ گئی اور چٹان بلند ہوتی چلی گئی اور یہاں سڑک کے ساتھ عمودی گہرائی تھی۔ نیچے بہت نیچے شیوک کا پاٹ تھا اور اس میں پانی کہیں دور تھا۔ بلکہ پانی تو کہیں نظر ہی نہیں آتا تھا۔ ایک وسیع اور ویران صحرا نظر آتا تھا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی ریت ہی ریت تھی اور یہ صحرا تقریباً ایک کلومیٹر نیچے تھا۔

نظامی صاحب چپ بیٹھے تھے۔

مطیع، کرس کا ہاتھ دیکھ رہا تھا۔ فدا صاحب کے ساتھ ان کا گول مٹول بچہ کرامت حسین تھا، جو ان کی گود میں بیٹھا ہمیں حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ ہم سورمو کے چھوٹے سے گاؤں کی خاموشی میں سے گزر کر آگے چلے گئے۔ گاؤں کے داخلے پر ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ اسے ایک لداخی سرائے کہا جائے تو شاید اس کی تصویر زیادہ واضح طور پر سامنے آئے۔ راستے کے ایک جانب ایک چھوٹا سا کچا کمرہ جہاں چائے اور خوراک تیار کی جاتی ہے، اس کمرہ میں چند بستر اور راستے کے پار ذرا بلندی پر انگور کی بیلوں کے نیچے چند چارپائیاں جہاں آپ آرام سے چائے پی سکتے ہیں۔ ان علاقوں میں بہت کم لوگ آتے ہیں اور اسی لیے یہ سرائیں مسافروں کی راہ تکتی رہتی ہیں۔ یہاں مقامی لوگ بھی آتے ہیں جو پیدل راستوں سے کسی دور کی وادی سے خپلو پہنچتے ہیں اور پھر وہ سکردو تک چلے جاتے ہیں اور سکردو ان کے لیے تہذیب کی آخری چوکی ہوتی ہے۔

ڈرائیور نے جیپ روک دی اور یکدم اس کے ساتھ ہی شیشے کی طرح نازک لیکن بالکل ٹھہری ہوئی و منجمد خاموشی میں ہم سب کان لگائے کچھ نہ سنتے تھے۔ فدا صاحب جیپ سے اترے۔ "یہ سامنے دریائے شیوک کے صحرا کے پار ان پہاڑوں میں جو چوٹی جھانکتی ہے وہ مشہ برم ہے"

میں ذرا آگے ہوا تو فدا صاحب نے میرا کاندھا پکڑ لیا "احتیاط... آگے کچھ نہیں ہے"

نظامی صاحب نے مایوسی سے سر جھٹکا۔ "بادشاہو یہ تو بڑی شرمیلی چوٹی ہے... سامنے ہی نہیں آتی اور اس کے لیے آپ نے ہمیں سونے ہی نہیں دیا"

مشہ برم کی اس جھلک کے بعد ہم سورمو کے پل تک گئے۔ پل کے پار ایک ویران راستہ اوپر سیاچن گلیشیر تک جاتا تھا جو ان دنوں دنیا کا بلند ترین محاذ جنگ تھا۔ واپسی پر سورمو کے گاؤں کے آغاز پر ایک مقامی شاعر تہور علی خاں اور ایک مقامی مولانا ہمارے منتظر تھے۔

"آپ ہمارے ساتھ چائے ضرور پیجئے..." انہوں نے ہمیں دعوت دی۔

اخروٹ کے ایک تناور درخت کی چھاؤں میں ایک ہی قالین بچھا تھا، گھاس میں خنکی تھی۔ ہم سب ایک دائرے کی صورت میں بیٹھ گئے۔ مولانا صاحب سیاہ پگڑی اور سیاہ کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ نہایت پڑھے لکھے اور خوشگوار طبیعت کے تھے اور پریوں پر یقین رکھتے تھے۔ بلکہ انہوں نے ہمیں متعدد ایسے قصے سنائے جن میں انہوں نے پریوں کو مار بھگایا تھا۔ شاعر جو، کاچو تہور حسین کہلاتے تھے ذرا شرمیلے اور ذرا گہرے تھے۔ وہ سنتے زیادہ تھے اور بولتے کم تھے۔ پہلے ہمارے سامنے شہتوتوں سے لبریز تھال رکھے گئے۔ میں پھل زیادہ شوق سے نہیں کھاتا لیکن سورمو کے شہتوت ایسے تھے کہ آپ آخری شہتوت تک تھال اور منہ کے درمیان ایک تانتا باندھے رکھیں گے۔ یہ اتنے شہد میٹھے اور منہ میں گھل کر فرحت دینے والے تھے کہ ہم اپنے میزبانوں سے غافل ہو گئے۔ اس دوران میٹھے کیک اور کسیر روٹی کے ہمراہ چائے آ گئی.... ہوا آہستہ تھی مگر شہتوت اور خوبانیوں کے درختوں میں سے آتی تھی اور اس میں مشہ برم کی قربت کی ٹھنڈک تھی۔ ہم اس تناور اخروٹ کے سائے میں بیٹھے تھے اور یہ ایک عجیب سرقندی قسم کا ماحول تھا جس میں ہم سانس لیتے تھے۔

یہاں سے لداخ تک کا فاصلہ تیس میل کے قریب تھا۔

چند عورتیں اور بچے شہتوت اتار کر گھروں کو لوٹ رہے تھے اور عورتوں کے کانوں میں پھول اڑسے ہوئے تھے۔

"کیا یہاں اس زمانے کی کوئی عمارت یا یادگار بھی موجود ہے جب ان خطوں میں مہاتما بدھ کے پیرو کار بستے تھے؟"

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

ہمارے میزبان سوچ میں پڑ گئے پھر مولانا نے سر اٹھا کر کہا "یہاں کچھ گھر ایسے ہیں جن میں چبوترے سے بنے ہوئے ہیں اور ان پر بیٹھ کر بدھ راہب شراب پیا کرتے تھے"

"سبحان اللہ" نظامی صاحب چہکے۔

"کیا مطلب" مولانا نے انہیں گھورا۔

"میرا مطلب ہے لاحول ولا۔۔۔" نظامی صاحب مسکرائے۔

سورمو ہمارے سفر کی آخری حد تھا‘یہاں سکردو بہت دور لگتا تھا اور لاہور تو تب دور لگے جب انسان سکردو میں ہو۔ ہمیں اب واپس جانا تھا۔

سورمو سے باہر میں نے اس سورمو سرائے کو حسرت سے دیکھا‘ جس میں قیام ایک خواہش تھا اور سرائے میں کون ہے جو زیادہ ٹھہرنا نہیں چاہتا لیکن ٹھہر نہیں سکتا اور میں بھی ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ ہم خپلو واپس آئے تو سنگریزوں کی کشتی شیوک کے عین درمیان میں تھی اور پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کدھر کو جا رہی ہے یا شاید ادھر کو آرہی ہے۔ یہاں سے سڑک اوپر اٹھی اور ہم تھوڑی دیر کے بعد پہلی بار خپلو کے بازار میں سے گزر رہے تھے۔

"کمال ہے اصل خپلو تو یہاں ہے اور ہم اس کے دامن میں ہی گھومتے رہے" مطیع کہنے لگا۔ یہاں ایک بڑے قصبے کی تمام تر سہولتیں دکھائی دے رہی تھیں اور بازار خاصا بارونق تھا۔ راجہ کے محل کے راستے میں ہمیں دو تین نہایت عالی شان اور قدیم مکان نظر آئے جو غالباً راجہ کے خاندان کے تھے۔ ایک تنگ سی گلی میں گھس کر جیپ رک گئی۔ ایک پھاٹک کے قریب جا کر فدا صاحب کہنے لگے "یہ وہ حصہ ہے جہاں اصطبل ہوا کرتا تھا۔ یہی محل میں داخل ہونے کا راستہ ہے۔"

ہم اس راستے سے اندر گئے تو ہمارے سامنے ایک وسیع چبوترے پر ایک ایسی عمارت کھڑی تھی جو یہاں کی نہیں لگتی تھی۔ شاید تبت یا منگولیا میں کہیں تھی اور اسے جوں کا توں اٹھا کر یہاں رکھ دیا گیا تھا۔ ایک سفید دیوار میں سالخوردہ لکڑی کی محرابیں اور ان کے آگے چوبی جالیاں ایک بہت بڑا جھروکا جو چھت سے شروع ہو کر زمین تک آتا تھا اور جس میں برآمدے کھڑکیاں اور محرابیں تھیں اور اس دلفریب رہائش گاہ کے پس منظر میں قراقرم کی بلندی اور شاندار دہشت تھی۔ میں اس عمارت تک گیا اور پیچھے مڑ کر دیکھا تو صدر دروازے میں سے کرس داخل ہو رہا تھا۔ اور اس

کے دونوں جانب دو عظیم چنار کھڑے تھے۔ سیڑھیاں طے کر کے ہم چبوترے تک آگئے۔

"داخلے کا دروازہ کہاں ہے؟"

میں نے ایک بند دروازے کو دھکیلنے کی کوشش کی۔

"یہ محل تو بند پڑا ہے" فدا صاحب نے بتایا "راجہ صاحب کی رہائش ادھر ہے"

ادھر محل کے پہلو میں ایک نیا مکان تھا۔ دروازے پر مارخور کے سینگ آویزاں تھے۔ یہ ایک عجیب‘ ہر شے سے کٹا ہوا اور ہر آب و ہوا سے مختلف اور ہر آبادی سے جدا اور کسی اور تاریخ اور وقت کا ایک جزیرہ تھا اور یہاں بھی ان خطوں کی خاموشی گہری ہو رہی تھی اور اس چپ میں ہوا کی دھیمی چال تھی یا کہیں زیر زمین چلنے والے پانی کی آواز تھی۔ اور یہاں ایک خوبصورت ٹھہراؤ تھا جو بالکل الگ اور تنہا تھا اور اس ماحول میں ہم چونکے ہو کر ادھر ادھر دیکھتے تھے کہ ہم کہاں آگئے ہیں اور اس ٹھہرے ہوئے طلسم میں ہم جان نہ سکے کہ کب راجہ صاحب آئے ہیں اور ہم سے ہاتھ ملا رہے ہیں۔ سرخ و سفید نیلی آنکھوں والے ناصر علی خان جو مرحوم راجہ صاحب کے بڑے بیٹے ہیں۔ ان کے جانشین تو ہیں لیکن راجاؤں کا عہد چونکہ اختتام پذیر ہو چکا ہے اس لیے وہ بڑے مزے سے پولیس میں سب انسپکٹری کرتے ہیں۔ اور ان کے چھوٹے بھائی محبوب علی خان بچوں کو پڑھاتے ہیں۔۔۔۔ یعنی دونوں نے حکمرانی کے محکمے ہی پسند کیے ہیں۔

ایک طویل برآمدے میں سے گزر کر ہم دالان کے اوپر کھلنے والے ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوئے۔ برآمدے میں بھی مارخوروں کے سر اور سینگ آویزاں تھے۔ راجہ صاحب اردو نہیں جانتے تھے اور ہم مقامی بلتی زبان سے ناواقف تھے اس لیے زیادہ تر گفتگو مسکراہٹوں کے ذریعے ہوئی اور کچھ ترجمانی فدا صاحب نے کی۔ ہم بے حد تھک چکے تھے اور بس یہی وہ جگہ تھی جس کے لیے ہم ساری زندگی مارے مارے پھرتے رہے تھے۔ اور یہی وہ آخری آرامگاہ تھی جس کے بعد انسان کہیں نہیں جاتا اور اپنے بدن کی تھکاوٹ کے ساتھ مٹی میں مل جاتا ہے۔ اس مختصر کمرے میں راجہ صاحب کی چند پرانی تصاویر آویزاں تھیں۔ اور ان کے اوپر ایک تختے پر آرائش کی مختلف اشیاء قرینے سے سجی تھیں اور ان میں سے کسی ایئر فریشنر کا خالی ڈبہ بھی تھا۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

جھروکا نما کھڑکی وادی نیلو کی وسعت پر کھلتی تھی۔۔۔ ایک ملازم کے ہاتھوں میں ایک بڑا سا تھال تھا اور وہ کمرے میں داخل ہوا اور اس تھال کو ہمارے سامنے میز پر رکھ دیا۔۔۔ اس میں سرخ چمکتی ہوئی سیب نما چیری کا ڈھیر تھا۔

"ہمارے دادا جان چیری کے تین پودے سرینگر سے لائے تھے۔۔۔ یہ ان کا پھل ہے جو ہم اپنے خاص مہمانوں کی خدمت میں پیش کرتے ہیں" راجہ صاحب نے چیری کا ایک گچھا اٹھا کر میری پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ چیریوں کو دیکھ کر نظامی صاحب بھی ہوشیار ہو گئے۔ کرس کو یقین نہیں آتا تھا کہ کہیں کسی میز پر اتنی زیادہ چیری بھی ہو سکتی ہے۔۔۔ چنانچہ ہم اگرچہ بڑی متانت اور دانش مندی سے گفتگو کرتے جا رہے تھے لیکن ہماری آنکھوں میں ندیدے بچوں والی چمک تھی اور ہم چیریوں کے تھال پر ہمہ وقت نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ اس کے بعد چائے آئی اور عنروق آیا۔۔۔ یہ بھی مقامی خوراک تھی اور بے حد لذیذ تھی۔ میں راجہ صاحب سے ان کے خاندان اور وادی نیلو کے بارے میں پوچھتا رہا۔۔۔ "لیکن آپ کی آنکھیں نیلی کیوں ہیں؟"

"یہ میری والدہ کی جانب سے ہیں" وہ مسکرائے۔

اس دوران ان کے چھوٹے بھائی محبوب علی خان بھی آ گئے اور وہ ہمیں محل دکھانے کے لیے لے گئے۔۔۔ مخدوش سیڑھیاں ۔ بے شمار کمرے۔ کچی چھتیں۔ یہاں درمیان میں خراج کے طور پر وصول شدہ گندم کا ذخیرہ ہوتا تھا۔ پہلے بہت عرصہ پیشتر یہ محل اوپر ان بلندیوں پر ہوتا تھا اور پھر اسی نقشے کے مطابق اسے یہاں تعمیر کیا گیا۔ اور وہاں بلندی پر کچھ آثار تھے جو دکھائی دیتے تھے ۔ چند دیواریں۔۔۔۔ قلعہ نما برج۔۔۔۔ اس بلندی سے آس پاس کا منظر کتنا عظیم الشان ہوگا۔ محل کے مختلف کمروں میں محراب نما کھڑکیاں تھیں جو وادی نیلو اور محل کے باغ پر کھلتی تھیں اور ان کھڑکیوں میں کیا شاندار جلال کے منظر تصویر ہو چکے تھے' آپ دیکھتے رہئے اور پھر بھی بے یقینی ساتھ نہ چھوڑے۔ قراقرم کا رعب اور شیوک کا بہاؤ اور ان کے اوپر دور تک چوٹیاں' ننگی اور برف سے ڈھکی ہوئی۔۔۔۔

میں ایک ایسے ہی کمرے کی لکڑی کے فرش پر دیر تک لیٹا رہا جب کہ میرے ساتھی محل کے کسی اور حصے میں محو گفتگو تھے اور وہاں سے جو منظر دکھائی دیتے تھے۔ جو تصویریں سامنے تھیں' محرابوں کی گولائی میں اور بالکونی کی جالی میں انہیں میں دیکھتا رہا۔ اس کیمرے کی طرح میرا لینز کھلا رہا جس کے اندر ایک ایسی فلم ہے جس پر دیر

سے نقش ثبت ہوتا ہے۔۔۔ اور پھر دھیرے دھیرے ہوتا ہے۔ مجھے غرناطہ کے قصر الحمرا کا وہ برج یاد آیا جس میں میں نے کچھ وقت گزارا تھا۔۔۔ یہاں غرناطہ کی نسبت منظر زیادہ شاندار تھا۔ محل کی کچی چھت پر ہوا تیز تھی اور اس میں ایک خطرے سے خبردار کرنے والی گونج تھی۔ چھت پر بھی ایک کچا کمرہ تھا جس کے پہلو میں لکڑی کی ایک منقش محراب بس نیچے گرا ہی چاہتی تھی۔ چھت سے اوپر قراقرم کی چٹانیں دھوپ میں تھیں مگر نیچے پوری وادی اور دریائے شیوک سائے میں آ چکے تھے۔

اور جب ہم نیچے محل کے باغ میں آئے' ایک ایسے باغ میں جو کچھ بے ترتیب تھا کچھ بے آباد مگر سرسبز تھا تو وہ بھی سائے میں تھا اور اس کی گھاس میں سے ٹھنڈک پھوٹتی تھی اور ہمارے جوگرز میں سرایت کر کے پاؤں کو سرد کرتی تھی' اوپر سے چشموں کا پانی رکتا' اٹکتا اور ایک خاص سُر میں بہتا نیچے آ رہا تھا اور اسے مختلف نالیوں کے ذریعے پورے باغ میں پھیلا دیا گیا تھا۔ یوں یہ ایک چھوٹا سا شالیمار تھا جو قراقرم کے پھولوں اور مہکار میں بسا ہوا تھا۔ یہاں خاص طور پر گلاب بہت بڑا اور اتنا زیادہ تھا کہ پودے دوہرے ہو رہے تھے اور چٹانوں کے سائے میں اس کا رنگ بہت شوخ اور گہرا تھا۔ اور ایک جانب چیری کے دو شاندار درخت کھڑے تھے اور حیرت ہوتی تھی کہ اتنے بڑے درخت کا پھل اتنا چھوٹا اور منی ایچر کیوں ہے۔

اس باغ میں بھی ان خطوں کی تنہائی اور اداسی تھی۔۔۔ یہ آپ کو خوبصورتی کے اس رخ سے آشنا کرتا تھا جس رخ کا انجام فنا ہے۔ فنا تو ہر شے کو ہے لیکن اس باغ کو دیکھئے تو لگتا ہے کہ ابھی یہ آخری لمحہ ہے۔ آخری دم ہے اور پھر فنا بلند قراقرم سے جھانکے گی' اترے گی اور اسے اپنی لپیٹ میں لے کر دنیا سے اوجھل کر دے گی۔۔۔ یا پھر یہ فنا میرے اندر تھی اور اب قریب آ رہی تھی ورنہ اس باغ کے حسن کو تو دوام تھا۔۔۔ فنا میرے اندر تھی۔ یہاں ایک اور احساس بھی جی کو تنگ کرنے والا تھا کہ قراقرم کی چٹانوں میں اس بے ترتیب گلشن کی گھنی ٹھنڈک اور پانی کی سرسراہٹ میں اور اس کے بے مثل گل بوٹوں میں اور چیری کے درختوں کے آس پاس کوئی اور بھی ہو۔ کوئی اور جو حسن کی آزردگی میں شریک ہو' وہ ان چپ بوٹوں کی مانند بے شک چپ رہے' پر شریک ہو۔۔۔ صرف شراکت سے اس کی آزردگی ختم ہو سکتی ہے ورنہ یہی اداسی اور فنا کی قربت کی کیفیت۔

میں اس باغ سے نکلا تو میرے دل میں ایسا ملال تھا جو دنیا چھوڑنے پر دل میں

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

ہوتا ہوگا۔ خپلو کے بازار کی دکانیں بند ہو چکی تھیں جب ہم محل سے نیچے آئے۔

اگلی صبح میں ذرا سویرے بیدار ہوا اور چپکے سے باہر نکل گیا۔ ریسٹ ہاؤس سے نیچے سورمو جانے والی سڑک دریا کے ساتھ ساتھ تھی۔ اس کے اوپر چٹانیں معلق تھیں اور اسی لیے یہاں ابھی نیم تاریکی تھی۔ ایک صاف پانی کے تالاب کی تہ میں بڑے بڑے پتھر دکھائی دیتے تھے اور دائیں طرف کسی باغ میں بلبل بولے چلی جاتی تھی۔ یہاں امان کلینک تھا جہاں ایک معروف غیر ملکی ڈاکٹر اپنی مہنگی پریکٹس چھوڑ کر ہر برس دو ماہ کے لیے آتا تھا اور اہل خپلو کے زخموں پر مرہم رکھتا تھا اور اس کے بیماروں کو شفا دیتا تھا۔ میں ذرا آگے گیا تو بوڑھا ملاح ایک مشکیزے کو منہ لگائے اس میں ہوا بھرنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کا چہرہ لال گلال ہو رہا تھا۔ مشکیزوں کی کشتی ریت پر پڑی تھی۔ جہاں چٹان کا سایہ ختم ہوا اور میں صبح کی دھوپ میں آیا وہاں سے میں واپس لوٹ آیا۔

سکردو واپسی کے لئے ہم اسی ویگن میں سوار تھے جو ہمیں خپلو لائی تھی۔ اور اب خواجہ صاحب کی ہدایت کے مطابق ڈرائیور ہمیں دریا پار کے راستے سے واپس لے جا رہا تھا تاکہ ہم مختلف علاقوں کو دیکھ سکیں۔ دوسری جانب جانے کے لیے ہم نے کھرفک کے پل کو عبور کیا جہاں "ہوشے ۶۵ کلومیٹر" کا سنگ آویزاں تھا۔ ہوشے وہ معروف گاؤں ہے جس پر مشہ بروم کی چوٹی جھکی ہوئی ہے اور یہ بیس کیمپ کے طور پر جانا جاتا ہے۔ کھرفک کا پل ہماری ویگن کے بوجھ سے جھولتا تھا۔

یہ راستہ بھی انتہائی خوبصورت تھا۔ راستے میں جو گاؤں پڑتے تھے وہاں کٹائی ہو رہی تھی اور مرد، عورتیں، بچے کھیتوں میں اپنے جانوروں کے ساتھ جتے ہوئے تھے۔ ہاں اس مشقت کے دوران بھی وہ کانوں میں پھول ضرور لگاتے تھے اور ان کے کچے گھروں کی چھتوں پر پھولوں کے گملے بھی سجے تھے۔

دوپہر کو ہم کیرس پہنچ گئے۔

سجادیہ ہوٹل میں زرچون کھانے کے بعد ہم کیرس کی مشہور خانقاہ دیکھنے کے لیے گاؤں کے اندر گئے۔ وادی خپلو کے قدیم باشندے بدھ مت کے پیروکار تھے۔ ۷۸۶ھ میں سید علی ہمدانی کشمیر سے دعوت اسلام کے لیے بلتستان آئے اور خپلو کے راجہ اور رعایا نے انہی کے ہاتھوں اسلام قبول کیا۔ ان کے بعد میر شمس الدین محمد عراقی بت شکن آئے۔۔۔ مسجد چقچن پر انہی کے نام درج ہیں۔ بلتستان کے مشہور بزرگ میر مختار اخیار انہیں کی اولاد میں سے تھے۔ وادی خپلو میں بھی بہت سے علماء پیدا ہوئے جنہوں نے اس خطے کو علم و ہنر سے آراستہ کیا۔ ان میں میر محمد نور بخش سرفہرست ہیں وہ ایک بلند پایہ ادیب اور شاعر تھے اور ان کی لکھی ہوئی قرآن پاک کی تفسیر کا قلمی نسخہ کا نفیہ لائبریری تلیس میں موجود ہے۔

میر مختار ایک بلند پایہ شاعر اور ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک فلسفی بھی تھے۔ انہوں نے اسلامی فقہ پر ایک کتاب تحریر کی اور دیوان مختاریہ کے نام سے ان کا شعری مجموعہ بھی موجود ہے۔ وہ ایک فنکار بھی تھے اور بلتستان کی کئی عظیم الشان خانقاہیں ان کی تعمیر کردہ ہیں۔

خانقاہ کے راستے میں پیر سید مختار اور ان کے بیٹے کے مزار ہیں جو بے حد خستہ حالت میں ہیں۔ ان کے چوبی دروازے اور جالیاں کھلے آسمان تلے پڑے ختم ہو رہے ہیں۔ ان مزاروں پر مختلف رنگوں کے پرچم لہرا رہے تھے۔۔۔ کیرس کی معروف خانقاہ یہاں سے قریب ہی تھی اور یہ خانقاہ بے حد شاندار اور عظیم تھی۔ اس کا اندرون لکڑی کے اتنے اونچے ستونوں پر قائم ہے کہ وہاں تک نگاہ دیر سے جاتی ہے۔ خانقاہ کے ایک جانب اعتکاف کے لیے کوٹھریاں ہیں جہاں خواتین بیٹھتی ہیں۔ یہاں پر دو منبر تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس مسجد میں شیعہ اور سنی مسلک کے لوگ اکٹھے نماز پڑھتے ہیں۔۔۔۔ بلتستان کے لوگوں میں مذہبی رواداری، اخلاقیات کا ایک حصہ ہے۔۔۔ کیرس کی یہ خانقاہ ہمارا عظیم ورثہ ہے اور اس کی دیکھ بھال مناسب طریقے سے ہونی چاہئے۔۔۔۔

دھوپ تیز تھی لیکن تمام سائے بے حد سرد تھے۔

ایک مقام پر ویگن دریا کے ریتلے پاٹ پر چلنے لگی۔۔۔۔ ریت کے ایک سمندر میں ریت اڑاتے۔۔۔۔ ایک بادبانی کشتی کی طرح اس سمندر کو چیرتے۔

دن کے دو بجے تھے جب ہم سکردو کے بازار میں داخل ہوئے۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"جیل کچورا سے راکاپوشی تک"

"وہ..... اس چٹیل پہاڑ کی چوٹی پر کھرفوچے ہے۔"
"کھرفوچے؟"
"ہاں اس کے معنی عظیم قلعے ہیں۔"

تیز دھوپ میں ایک ایسا پھیلاؤ جو پھیلتا چلا جاتا ہے اور ایک ایسی وسعت جو ہر لمحہ وسیع تر ہوتی چلی جاتی ہے اور اس وادی میں وہ چٹیل پہاڑ جس کی سلیٹی چٹانوں کے اوپر دیوار چین سے مشابہ ایک قلعے کی دیوار، بلندی سے خوفزدہ ان سلیٹی چٹانوں کے ساتھ چمٹی ہوئی دکھائی دیتی تھی،.... میں اس سے نسبتاً کم بلندی پر ایک سینٹرل ایشین باغیچے کی کچی دیوار سے ٹیک لگائے اسے دیکھ رہا تھا اور میں بھی دھوپ میں تھا۔

درمیان میں کہیں نیچے سکردو کا بازار سنسان پڑا تھا۔

ہم ابھی ابھی کاظمی کی اس بلند اور دھوپ میں چمکتی اور سائے میں ٹھٹھرتی آماجگاہ میں دوپہر کا کھانا کھا کر فارغ ہوئے تھے۔ ہم نے چونکہ خصوصی بلتی سوپ "بالے" پیا تھا اور اخروٹ سے بنا ہوا مزیدار پراپو کھایا تھا اس لئے ہماری روحیں بہت بلند تھیں یعنی ہم ہائی سپرٹس میں تھے۔ آج دوپہر جب ہم وادی خپلو سے سکردو بازار میں پہنچے تھے تو کاظمی ہینڈی کرافٹ کی ایک دوکان پر ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ اس ہینڈی کرافٹ شاپ پر ہم نے مہاتما بدھ، کے چند سر دیکھے جو میڈ ان ٹیکسلا تھے..... اور دوکان دار کا کہنا تھا کہ وہ پرانے ہیں اور سکردو کے کسی کھنڈر میں سے دستیاب ہوئے ہیں۔ دوپہر کا کھانا کاظمی کے ہاں تھا اور ان کے ہاں بہت سارے دوست جمع تھے جو ہمیں ملنے آئے تھے۔ نیچے سکردو بازار میں نظامی صاحب نے کہا تھا کہ انہیں تو بالکل بھوک نہیں ہے لیکن جب ہم باقاعدہ کوہ پیمائی کر کے کاظمی صاحب کی رہائش گاہ پر ہانپتے ہوئے پہنچے اور وہاں ایک سینٹرل ایشین طرز کا باغیچہ ہمارا منتظر تھا اور اس میں تبت کے جنگلی پھول اور سلاد ساتھ ساتھ تھے تو نظامی صاحب کہنے لگے۔ "مجھے بالکل بھوک ہے۔"

جب ان کا سانس بحال ہوا تو کہنے لگے "اندازہ کرو۔"

میں نے ہانپتے ہوئے پوچھا "کیا اندازہ کریں؟"

"یہ جو کاظمی صاحب نے ماؤنٹ اولمپس پر گھر بنا لیا ہے"..... میں نے کہا "بادشاہو ادھر مہمان شمان تو کم ہی آتے ہوں گے۔"

"تو کیا آپ اب کھرفوچے دیکھنا پسند کریں گے؟" کاظمی نے پوچھا۔

"دیکھ تو لیا ہے یارا..... یہ سامنے جو نظر آ رہا ہے۔ پہاڑی پر۔" نظامی صاحب نے اپنے آسودہ پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک گہرا سانس لیا۔

"نظامی صاحب۔ کسی انگریز نے لکھا ہے کہ اس قلعے کی چوٹی سے دنیا کا بہترین منظر دکھائی دیتا ہے۔"

"کس انگریز نے لکھا ہے؟ ذرا حوالہ تو دو"

"کسی نہ کسی انگریز نے تو لکھا ہی ہو گا نظامی صاحب" میں نے جھینپتے ہوئے کہا "بہر حال قلعہ دیکھنا ضرور ہے"

جتنی دیر میں اور جتنی مشقت سے ہم کاظمی کے مکان سے اتر کر نیچے بازار میں آئے، پھر گراؤنڈ کے قریب سے گزر کر اس مقام پر آئے جہاں سے قلعے کا راستہ دکھائی دیتا تھا، اتنی دیر میں ہم خلاص ہو چکے تھے۔ کاظمی کے کاندھے پر ایک فلاسک تھی۔

"قلعے تک جانے کے لیے پانی بہت ضروری ہے۔ چڑھائی اتنی شدید ہے اور سورج اتنا تیز کہ انسان خشک ہو جاتا ہے..... کچھ واقعات ایسے ہوئے ہیں کہ پانی کے بغیر....."

"ہوئے ہیں ناں واقعات....." نظامی صاحب فوری طور پر فکر مند ہو گئے "ویسے اوپر ہے کیا کاظمی صاحب؟"

"اوپر کھرفوچے ہے جسے تقریباً تیرہویں صدی میں مقپون بوخا نے تعمیر کیا تھا"

"تو بادشاہو ہم کونسا کہتے ہیں کہ نہیں تعمیر کروایا تھا..... ہمیں یقین ہے پورا پورا ..... اور جسے یقین نہیں وہ بے شک اوپر جا کر دیکھ لے، کیوں بھئی مطیع؟"

"بالکل جناب..... مجھے تو ویسے بھی تھوڑی بہت شوگر ہے اور آج صبح خپلو سے روانگی کے وقت جلدی میں ٹیکہ بھی نہیں لگا سکا اس لیے ..... آپ ہو آؤ تارڑ

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

صاحب"

میں نے مرداد صاحب کی جانب نگاہ کی تو وہ ٹھوڑی کو مسلسل کھجلائے چلے جاتے تھے' کہنے لگے "میں بہت دفعہ دیکھ چکا ہوں آپ دیکھ آئیں"

اور جب کاظمی میرے آگے آگے دھوپ میں تپتی چٹان میں چڑھتے' بلند ہوتے پتھریلے راستے پر چلتا تھا۔۔۔۔ اور میں اس کے پیچھے اور بہت پیچھے منہ کھولے پسینے میں شرابور ہوا اور زندگی سے خالی جسم کے ساتھ اپنے پتھر پاؤں بمشکل اٹھاتا تھا۔ تب میں نے جانا کہ نظامی' مطیع اور مرداد مجھ سے سیانے نکلے تھے اور کاظمی نے میرے ساتھ ایک تاریخی فریب کیا تھا' مجھے یقین تھا کہ میں قلعے تک زندہ نہیں پہنچ سکتا۔ کاظمی مجھے ہر موڑ پر پانی پلا دیتا اور پھر میری حالت زار بلکہ حالت زار زار کا اندازہ کئے بغیر قلعے کی تاریخ دہرانے لگتا۔

"تو جناب مقپون بوخا اسے بنانے والا تھا اور اس کے اندر سنگ مرمر کا استعمال ہمارے عظیم ہیرو علی شیر خان انچن نے کرایا"

"پانی ۔۔۔۔۔"

"جس راستے پر ہم چل رہے ہیں تارڑ صاحب اسے انچن کی مغل ملکہ گل خاتون نے بنوایا تھا"

"پانی ۔۔۔۔۔"

"اور تارڑ صاحب اس کے نیچے جہاں سے ہم چلے تھے وہاں بھی ایک محل تھا جسے اسی گل خاتون نے بنوایا تھا اور اس کے نام کی مناسبت سے وہ محل مینڈوق کھر یعنی پھول محل کہلاتا تھا۔۔۔۔"

"پانی۔۔۔۔۔"

"تارڑ صاحب پانی بھی پیو اور تاریخ بھی سنو۔۔۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ یہ کھرفوچے۔۔۔یعنی عظیم قلعہ عالم میں انتخاب تھا اس کے بیچ میں ایک پانچ منزلہ محل تھا' جسے ۱۸۴۲ء میں ڈوگرہ فوج نے جلا کر راکھ کر دیا۔۔۔۔ اور ۔۔۔"

مجھے یقین تھا کہ اگر میں اس وقت شدید کمزوری اور پیاس کے باعث انتقال کر جاتا تو کاظمی مجھ پر جھک کر کہتا۔۔۔۔ بڑے افسوس کی بات ہے تارڑ صاحب آپ کو سکردو کی تاریخ میں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے۔۔۔ ویسے جاتے جاتے انچن کی ملکہ گل خاتون کا ایک قصہ تو سن لیں۔۔۔

سکردو بہت نیچے رہ گیا تھا اور اس کے ساتھ' وہ تمام آوازیں جو زمین کے ساتھ متعلق ہوتی ہیں اور یہاں صرف ہوا تھی اور تیز دھوپ تھی۔۔۔ اور اس لمحے مجھے پتھریلی فصیل میں ایک محرابی دروازہ منہ کھولے نظر آیا۔۔۔ ہم قلعے کی چھت پر پہنچ گئے۔۔۔ میں کچی دیوار کے سائے میں بہت دیر تک بیٹھا ہونکتا رہا اور پھر ہوا نے پسینے کو ٹھنڈک دی اور میں بہتر محسوس کرنے لگا۔۔۔ میں نے کھڑے ہو کر آس پاس نگاہ کی تو میری ٹانگوں میں کپکپاہٹ سی ہوئی ویسی کپکپاہٹ جو کسی بلند چوٹی پر کھڑے ہونے کی کوشش سے ہوتی ہے یا کسی بلند مٹی پر چڑھ کر بدن کو سیدھا کرنے سے ہوتی ہے۔ چاروں جانب ناقابل یقین مناظر تھے۔۔۔

ایک وسیع ریگزار کے درمیان میں دریائے سندھ کی گزرگاہ اور پس منظر میں وہ پہاڑی سلسلے جہاں وادی شگر تھی۔

ہم اس سطح پر تھے جس سطح پر وادی سکردو کے پہاڑوں کی چوٹیاں تھیں۔

قلعہ تو ایک کھنڈر تھا۔ ایک مسجد کے آثار۔ چند کمرے اور حفاظتی فصیل ۔۔ لیکن اس کے علاوہ یہاں وہ کچھ تھا جو اور کہیں نہیں تھا' ایک مکمل تنہائی تھی۔۔۔ سرسراتی ہوا میں اس بلندی پر ایک الگ دنیا تھی جس میں مکمل خاموشی تھی اور ایک وسیع لینڈ سکیپ تھی۔ نیچے جہاں ہم نے پہلی شب بسر کی تھی' اس کے نواح میں ایک ہیلی کاپٹر بلند ہو کر کہیں جا رہا تھا۔ اور وہ بمشکل نظر آتا تھا۔

قلعے کی اس دیوار پر جس کے نیچے ریت' چٹانیں اور سندھ کم از کم ایک کلومیٹر کی عمودی گہرائی میں تھے وہاں اس دیوار پر ایک سیاح ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔۔۔ پتا نہیں کب سے بیٹھا تھا اور اس نے مجھے بتایا کہ یہ اس قلعے کی دیوار سے یہ منظر جو نظر آتا ہے یہ دنیا بھر میں میرا دوسرا پسندیدہ ترین منظر ہے۔۔۔ جب میں نے پوچھا کہ پہلا کونسا ہے تو کہنے لگا۔۔۔ بس یہ دوسرا ہے پہلا میں نہیں بتا سکتا۔۔۔ پتا نہیں کیا چیز تھی' ہم اسے اس کے حال پر چھوڑ کر آگے چلے گئے۔

سکردو کی جانب ہریاول تھی اور وہ برف پوش پہاڑ تھے جن میں ایک راستہ دیوسائی میدان کو جاتا تھا۔ میرا دل اس میدان کے لیے شاید ایک لمحے کے لئے رکا۔۔۔ صرف یہ پوچھنے کے لیے کہ تمہاری برفیں کب پگھلیں گی؟ وادی خپلو سے واپسی پر مرداد صاحب سے پہلا سوال میں نے دیوسائی کے بارے میں ہی پوچھا تھا کہ تازہ ترین صورت حال کیا ہے؟ اور انہوں نے کہا تھا کہ ابھی چند روز اور مری جان ابھی چند روز اور ۔۔۔ اور میں چند روز اور ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ اس لئے فیصلہ یہ ہوا تھا کہ ہم اگلے روز یہاں سے گلگت جائیں گے اور وہاں پہنچ کر جی ایم بیگ سے مشورہ

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

کیا جائے گا کہ اے مردوانا ہم تین مسافر کس وادی کو جائیں' کس اجنبی مقام کے لیے سفر اختیار کریں کہ ہماری بے چین روحوں کو سکون ملے..... تو ہم اگلی صبح گلگت جا رہے تھے۔

ہم قلعے سے اترے..... اور اب میرے دل میں کاظمی کے لیے صرف محبت کے جذبات تھے کہ اس کی وجہ سے میں نے وادی سکردو کا ایک ناقابل بیان منظر دیکھا۔

ہم قلعے سے اترے تو شام ہو رہی تھی ...... اور ایک شام سکردو کی میونسپل لائبریری میں ہمارے اعزاز میں تھی... لائبریری ایک کمرے پر مشتمل تھی اور مکالے کی میز کے ارد گرد مقامی شاعر' ادیب اور دانشور جمع تھے۔ ہم کچھ شرمندہ تھے کہ پاکستان کے ایک اہم علاقے کے بارے میں ہم بہت کم جانتے تھے ـــــ لیکن اس شام ہم نے اہل سکردو سے بہت کچھ سیکھا اور بہت کچھ جانا۔

ہم نے پہلی بار بلتستان کے ہیرو علی شیر خان انچن کے بارے میں جانا۔

انچن کی رسائی مغل دربار تک اس وقت ہوئی جب اکبر نے ۱۵۸۶ء میں کشمیر فتح کیا۔ مغل تاریخ دانوں نے انچن کا ذکر علی رائے کے نام سے کیا ہے۔ انچن نے ایک مغل شہزادی کے ساتھ شادی کی جو کہ گل خاتون تھی۔ بلتی عوام نے اس مغل شہزادی کو مینڈوق گیالمو کا خطاب دیا۔ علی شیر خان نے نہ صرف یہ کہ ایک مغل شہزادی سے شادی کی بلکہ اس نے اپنی ایک بیٹی شہزادہ سلیم سے بیاہ دی۔ گل خاتون سکردو آئی تو اپنے ہمراہ موسیقار' انجینیر' ملاح اور دیگر ہنرمند لے کر آئی۔ جن زمانوں میں انچن اپنی سلطنت کی توسیع کے لئے تقریباً چار برس کے لیے سکردو سے باہر رہا' ان زمانوں میں گل خاتون نے مغل ثقافت اور طرز تعمیر کو فروغ دیا اور مینڈوق کھر' ہلال باغ' چہار باغ اور گنگوپی نہر تعمیر کروائے اور ..... وہ راستہ جس پر چل کر ہم قلعے تک پہنچے تھے۔

ہمیں بتایا گیا کہ بلتی ادب کی ایک قدیم اور توانا روایت ہے۔ بلتی زبان پہلے تبتی سکرپٹ میں لکھی جاتی تھی لیکن مذہبی تنگ نظری نے اسے کاغذ سے سینوں میں منتقل کر دیا۔ قدیم لوک ادب کی بنیاد تاریخی اور رومانوی داستانیں ہیں۔ بلتستان میں اسلام ایرانی مبلغین کی کوششوں سے پھیلا..... ہم لائبریری سے باہر آئے تو شام' رات میں جاتی تھی۔ اور رات دھیرے دھیرے اس چھوٹے سے بازار میں اترتی تھی جس میں ہم چہل قدمی کر رہے تھے..... سکردو میں ابھی دو منزلہ عمارتیں ذرا کم ہیں اور بازار کھلے اور ایک منزلہ ہیں۔ یوں آسمان زیادہ نظر آتا ہے اور اسی لیے رات بھی

پوری طرح نیچے آتی ہے۔ اس بازار میں ایک اطمینان ایسا تھا جس نے مجھے بہت سکھ دیا۔ بجلی بند تھی اس لیے دوکانداروں نے لالٹینیں روشن کر کے چوکھٹوں سے لٹکا رکھی تھیں۔ ہمارے چہرے نیم تاریکی میں تھے اور ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر بولنے کی بجائے ایک دوسرے کو سن کر بولتے تھے' ہمیں منہ زور ٹریفک سے بچنے کے لیے صرف ایک بار تردد کرنا پڑا جب ایک بوڑھا بلتی اپنے گدھے کو فل سپیڈ سے ہانکتا ہوا ہمارے قریب سے گزر گیا۔ بلتستان اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ یہاں جرم نہ ہونے کے برابر ہے' قتل ڈاکے اور چوری سے خالی یہ سرزمین ابھی ان سولائزڈ کہلاتی ہے..... تو پھر سویلائزیشن کیا ہے....؟

کاظمی میرے ساتھیوں کو قلعے تک جاتے ہوئے میری حالت زار زار کے بارے میں بتا چکا تھا اور نظامی صاحب چہک رہے تھے۔ "ہاں جی تارڑ صاحب پھر کیا دیکھا اس قلعے میں۔ کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ کچھ دیکھنے گئے تھے؟"

"بالکل دیکھنے گیا تھا اور وہاں سے دنیا کا دوسرا بہترین نظارہ دکھائی دیتا ہے"

"اس نظارے نے کہیں جانا تو نہیں ہے ناں ابھی ؟ تو پھر دیکھ لیں گے" نظامی صاحب مسکرائے......

"آپ کیا کرتے رہے اس دوران؟"

"ہم؟ ......" نظامی صاحب نے مکمل آسودگی سے اپنے دونوں بازو پرندوں کی طرح پھڑپھڑائے "ہم بادشاہو ادھر خواجہ صاحب کے کالج جا کر ایک تاری لگا آئے .... مطبخ نے ہمالین مراتھن میں حصہ لینے والے چند گورے گھیر لئے اور ان کے ہاتھ دیکھ ڈالے..... کریں بازار میں بیٹھا دھوپ سینکتا رہا"

"ہمالین مراتھن؟ میں چونک گیا۔ "یار وہ تو کل ہے اور کل صبح ہم گلگت جا رہے ہیں ـــــ"

"اور خواجہ صاحب نے بکنگ بھی کروا دی ہے ہماری ـــــ" نظامی صاحب نے فوراً کہا۔

"نظامی صاحب.....ہمالین مراتھن میں حصہ لینے کو جی چاہتا ہے۔ یہ موقع پھر کبھی نہیں آئے گا"

"بادشاہو یہ ذرا اوپر قلعے تک تو جا نہیں سکتے آپ' ہمالین مراتھن میں حصہ لے کر کیوں ہماری اور ملک کی بدنامی کراؤ گے۔ دس قدم کے بعد آپ جناب اور اس جانور میں کوئی فرق نہیں رہتا جس کی زبان ہمہ وقت باہر لٹکی رہتی ہے۔"

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"نظامی صاحب۔۔۔۔" میں نے احتجاج کیا۔

"اندازہ کرو" نظامی صاحب نے میرے کندھے کو تھپکا "میں تو مذاق کر رہا تھا۔۔۔ ضرور حصہ لو ہمالین مراتھن میں لیکن میں اور مطیع کل گلگت ہی جائیں گے"

چنانچہ ہمالین مراتھن میں حصہ لینے کی آرزو یہیں تمام ہو گئی۔

مجھ سے فارغ ہو کر نظامی صاحب نے کرس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا "کرس اولڈ بوائے کیا میں نے تمہیں چار انگریز عورتوں کے بارے میں وہ لطیفہ سنایا ہے جو سنایا نہیں جا سکتا"

کرس فراخ دلی سے ہنسا۔ "یہ چار انگریز خواتین کے بارے میں ایک لطیفہ ہے یا الگ الگ چار لطیفے ہیں جو سنانے کے قابل نہیں ہیں۔"

"جس طرح تم پسند کرو" نظامی صاحب بھی ہنسنے لگے۔

"میں تو یہ پسند کروں گا کہ چار پاکستانی خواتین کے بارے میں ایک ایسا لطیفہ ....."

"آہم ۔۔۔۔۔۔" نظامی صاحب زور سے کھانسے اور ان کا چہرہ سرخ ہو گیا "خبردار یہ گورا اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟"

"مذاق صرف کرتا نہیں بلکہ سنتا بھی سیکھو بادشاہو۔" میں نے ان کے کندھے پر ایک دھپ رسید کی۔

"اندازہ کرو۔ ہماری خواتین کے بارے میں لطیفے سناتا ہے۔ باندر کا بچہ"....

رات کے کھانے کے لیے ہم شہ برم سروس کے مالک بابو رضا صاحب کی جانب سے کشمیر ان میں مدعو تھے۔ کشمیر ان میں اندھیرا تھا۔ بجلی یہاں بھی نہیں تھی۔ ویٹر نے ایک تیزی سے پگھلتی ہوئی موم بتی میز پر جما دی۔ کھانا لگنے میں کچھ دیر تھی۔ میں اٹھ کر ٹیرس پر چلا گیا۔ سکردو بازار سنسان پڑا تھا۔ بہت دور کوئی جیپ ڈرائیور لائٹوں کو بار بار آن اینڈ آف کرتا تھا اور ان کی روشنی میں بازار کی چند دوکانیں اور قلعے کی پہاڑی کا کچھ حصہ تھوڑی دیر کے لیے نظر آ جاتا تھا وادی میں کہیں کہیں چراغوں کی جھلمل روشنی تیرتی تھی۔ یہاں ٹیرس پر کچھ مانوس لہجے میرے کانوں میں آئے اور ان مسافروں کی جانب سے آئے جو ایک بڑی میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ان کے چہرے نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن وہ خالص لاہوری النسل تھے۔ میں نے سلام دعا کی تو وہ مجھ سے ایسے اٹھ اٹھ کر بغلگیر ہوئے جیسے پرانی دوستی ہو۔ وہ سیرو سیاحت کی غرض سے سکردو آئے ہوئے تھے اور اب اس لمحے کشمیر ان کے ٹیرس پر بیٹھے ہوئے سالن کے ڈونگے سامنے رکھے ان روٹیوں کا انتظار کر رہے تھے جو ویٹر کسی قریبی تنور سے لینے گیا ہوا تھا اور پچھلے پندرہ منٹ سے لینے گیا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک لیڈر ٹائپ تھا۔ وہ کہنے لگا "دیکھو جی تارڑ صاحب۔ ان بلتیوں نے کیسا خانہ خراب ہوٹل بنایا ہے۔ پچھلے آدھے گھنٹے سے سالن رکھ کر بیٹھے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔۔"

"اوئے یار صدر صاحب۔۔۔۔" ان میں کسی نے اسے کہا اور پھر میری جانب مخاطب ہوا۔ "یہ جی ہمارا صدر ہے یونین کا۔ اس خانہ تنگ نے کہا تھا کہ سکردو چلو وہاں پہاڑی بکرے کھانے کو ملیں گے۔ لو جی یہاں پہنچتے ہی ہم نے ان لوگوں سے پوچھا کہ پہاڑی بکرے ہیں؟ یہ کہنے لگے کہ بالکل ہیں۔۔۔۔ ہم نے پوچھا کہاں ہیں؟ کہنے لگے پہاڑوں پر ....."

"آپ کا کس محکمے سے تعلق ہے؟"

اندھیرے میں 'وہ سب ہنسے اور پھر کسی نے کہا "محکمہ ڈیکوریشن سے۔۔۔۔۔"

لیڈر ٹائپ کی آواز آئی "جناب کیپٹ روڈ نہیں ہے لاہور میں ؟ کاغذ کی مارکیٹ ہے جہاں پر ۔ تو وہاں ہماری دوکانیں ہیں ڈیکوریشن کی .....کاروں کو اور پارٹیوں میں سجانے کے لیے جو چمکیلے کاغذ بناوٹی پھول' اور رنگین گلدستے وغیرہ ہوتے ہیں ناں تو یہ ہمارا کاروبار ہے۔۔۔۔۔۔"

"یہ صدر ہے ہماری یونین کا۔۔۔۔۔" پہاڑی بکروں کے شوقین صاحب کی آواز آئی۔ "ہر سال ہم سب اکٹھے نکلتے ہیں موج میلہ کرنے کے لیے۔ ہر سال مری جاتے تھے۔ اور وہاں تو آپ جانتے ہیں کہ کھانے پینے کی کوئی پرابلم نہیں۔ اس مرتبہ صدر صاحب کہنے لگے کہ سکردو چلتے ہیں.... اور یہاں کچھ کھانے پینے کا رواج ہی نہیں 'دو دن ہو گئے ہیں مونگی کی دال اور آلو شوربہ کھاتے ہوئے....."

"اوئے تم کھانے کو آئے ہو یا سیر کرنے" ایک اور صاحب بولے اور پہلی بار بولے "ذرا یہاں کے نظارے تو دیکھو۔ ایسے پہاڑ دیکھے ہیں کبھی .....؟ اوئے صد پارہ جھیل اور کچوڑا جھیل کی کیا بات ہے.....؟"

میں نے انہیں خپلو جانے کا مشورہ دیا۔ اس دوران ان کی روٹیاں آ گئیں اور میری جانب ایک "آؤ جی بسم اللہ کرو" کے بعد وہ کھانے میں مصروف ہو گئے۔

میں واپس اندر آیا تو ہمارا کھانا بھی لگ چکا تھا۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

رات گیارہ بجے ہم سکردو سے جھیل کچورا جانے والے راستے پر سفر کرتے تھے۔ تاریکی اور خاموشی میں جیپ کی روشنیاں جیسے ہم سے باتیں کرتی تھیں، ہمیں بہت کچھ دکھاتی تھیں۔ اور ہاں سردی تھی جو ہڈیوں میں اثر کرتی تھی۔

ہم جھیل کچورا پر واقع تبت موٹل کے خیموں میں رات گزارنے کے لیے آئے تھے۔

صبح ساڑھے آٹھ بجے گلگت روڈ پر ویگن ہماری منتظر ہو گی۔ لیکن اس سے پیشتر ہم نے کچورا گاؤں سے پرے بالائی کچورا ابھی دیکھنا تھی۔

ہم دیر تک سونے کی کوشش کرتے رہے لیکن سردی بہت تھی..... جھیل کنارے سردی تو ہو گی۔

"ہمیں بلتستان آئے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا ہے نظامی صاحب؟"

"پتا نہیں 'مدتیں ہو گئی ہیں گھر سے نکلے " نظامی صاحب رضائی کے اندر سے کہتے تھے "سو جاؤ بادشاہو سو جاؤ"

کچورا گاؤں کے کچے مکان ابھی خوابیدہ تھے اور ان کی دیواریں اور چھتیں شب کی سیاہی میں لگتی تھیں جب ہم کچورا نالہ پار کر کے اوپر پہنچے۔ جھیل کچورا کا بہترین منظر یہاں سے نظر آتا ہے، شنگریلا کی سرخ چھتیں ابھی واضح نہیں تھیں، البتہ پوری جھیل صبح کی سفیدی کو جذب کر کے اپنے کناروں سے الگ ہو چکی تھی، جیسے کسی سیاہ آئینے پر پارے کا قطرہ ساکت ہو۔ ہم تیزی سے چلنے لگے۔ ہمیں بہر صورت اپنا سامان اٹھا کر ساڑھے آٹھ بجے سے پیشتر گلگت روڈ پر پہنچنا تھا اور ہم اپر کچورا کو بھی بہر صورت دیکھنا چاہتے تھے اور اسی لیے اتنی سویرے بیدار ہو کر ٹھٹھرتے ہوئے اپنے خیموں سے باہر آ گئے تھے۔

جھیل، گاؤں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔

درختوں اور چٹانوں میں گھری ہوئی اپر کچورا ایک بڑے تالاب کی طرح پھیلی ہوئی تھی، اس پر ہلکی ہلکی دھند کے آثار تھے جو تیزی سے تحلیل ہو رہی تھی۔ میں اور کرس نیچے کنارے تک جانے کے لیے آہستہ آہستہ اترنے لگے۔ یہاں بھی کنارے کے درخت اور چٹانیں غیر واضح تھیں لیکن پانی شیشہ ہو رہے تھے اور یہ شیشہ صرف اس لمحے ٹوٹ کر جڑتا تھا جب کوئی مچھلی اچھل کر باہر آتی تھی اور پھر پانی پر گر کر پانی ہو جاتی تھی۔ چٹانوں کے اوپر سے چند برف پوش چوٹیاں جھانکتی تھیں اور یہ سب پانی میں بھی تھیں کہ ان کا عکس شیشے پر ایسا تھا کہ دھوکہ ہوتا تھا کہ اصل اوپر ہے یا پانی پر ہے..... کرس نے تصویر لینے کے لیے جب کیمرے کو آنکھ سے لگایا تو وہ بھی ایک لمحے کے لیے جھجکا کہ اصل منظر کہاں ہے، اوپر جھیل کے پس منظر میں یا جھیل کے پانی پر...... پانیوں پر اس منظر کو صبح کی روشنی تیزی سے پھیکا کر رہی تھی۔

ایک لمحہ ایسا آیا کہ درجنوں مچھلیاں اس منظر کا طلسم توڑ کر اچھلیں اور میں نے سب کو الگ الگ دیکھا کہ وہ اتنی دیر تک ہوا میں معلق رہیں اور پھر یکدم گریں اور جھیل کا آئینہ برابر ہو گیا۔

ہم تبت موٹل واپس پہنچے تو سورج خاصا بلند ہو چکا تھا۔ ناشتے کے بعد ہم نے اپنا سامان باندھا اور سفر کے دوران پہلی بار اسے اپنے کاندھوں پر اٹھایا۔ اٹھانا کیا تھا مطیع نے میرا رک سیک مجھے پہنایا کہ سٹریپس کو بازوؤں میں پہنا ہی تو جاتا ہے۔ جونہی مطیع نے رک سیک کو چھوڑا میں اس کے بوجھ سے نیچے بیٹھ گیا۔ پھر دوستوں نے بغلوں میں ہاتھ دے کر بڑی مشکل سے اٹھایا اور میں بڑی مشکل سے اٹھا۔

گلگت روڈ پر ہمیں ویگن کے لیے زیادہ دیر تک انتظار نہ کرنا پڑا۔

وادی سکردو میں جتنی وسعت تھی اس میں سے باہر جانے کا راستہ اتنا ہی تنگ تھا۔

مسلسل بل کھاتی ایک سڑک اونچائی پر اور نیچے شیر دریا سندھ اور دوسرے کنارے کی چٹانیں اور پہاڑی سلسلے آپ پر جھکے ہوئے۔ یہاں شاہراہ قراقرم کے شاندار مناظر دیکھنے میں نہیں آتے تھے...... جیسے ایک وسیع غار ہو اور اس میں ایک سڑک، ایک دریا اور چٹانیں ہوں.... تقریباً چھ گھنٹے کے سفر کے بعد روشنی تیز ہو گئی اور ہم کھلی فضا میں آ گئے۔ ایک وسیع لینڈ سکیپ میں دریائے سندھ بہتا تھا اور سڑک کے برابر میں ایک چھوٹا سا صحرا تھا اور اس سے پرے ناگا پربت نظر آ رہی تھی۔

سکردو روڈ، فرہاد پل کے پار ہوئی اور شاہراہ قراقرم میں جا ملی ...... یوں محسوس ہوا جیسے جی ٹی روڈ پر آ نکلے ہیں.... پچھلی نشست پر مطیع ایک مقامی نوجوان سے گفتگو کر رہا تھا اور اس سے وعدہ کر رہا تھا کہ گلگت پہنچتے ہی وہ اپنے سامان میں سے صد پارہ گولڈ کی پوٹلی نکال کر اسے سونا دکھائے گا.... اس نوجوان نے مجھے مخاطب کیا "جناب آپ دیوسائی جانا چاہتے ہیں؟"

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"ہاں۔۔۔۔" میں نے فوراً پلٹ کر پیچھے دیکھا۔

"تو پھر آپ جگلوٹ اتر جائیے وہاں سے جیپ کے ذریعے استور جائیں گے اور وہاں سے شاید چلم چوکی کے لیے کوئی سواری مل جائے۔۔۔۔"

"لو جی تارڑ صاحب یہ آپ کے حقے پانی کا بندوبست کر رہا ہے۔۔۔۔ چلم چوکی۔" نظامی صاحب جو اس سفر کے دوران غیر معمولی سنجیدگی اختیار کئے بیٹھے رہے تھے اب ہنس کر بولے۔

"چلم چوکی؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں میں چلم چوکی کا رہنے والا ہوں اور وہاں سے میں آپ کو ٹٹوؤں کا بندوبست کرا دوں گا اور آپ ان پر سوار ہو کر بڑی آسانی سے دیوسائی عبور کر کے سکردو پہنچ جائیں گے"

"بڑی آسانی سے؟"

"راستے میں دلدل تو ہو گی۔۔۔ برف بھی پوری طرح نہیں پگھلی۔۔۔ ٹٹو پھنس بھی سکتے ہیں لیکن پھر بھی آپ آسانی سے دوسری جانب چلے جائیں گے۔۔۔"

"کیوں نظامی صاحب۔۔۔۔ تجویز تو اچھی ہے"

"نہ! اس عمر میں آپ ہمیں ٹٹو پر بٹھاؤ گے" نظامی صاحب چہکنے لگے۔ "میں ایک مدبر قسم کا پروفیسر ہوں ٹٹو پر بیٹھا اچھا لگوں گا؟"

پیچھے سے مطیع نے فقرہ پھینکا "ٹٹو بھی تو یہی سوال پوچھ سکتا ہے کہ میں ایک مدبر قسم کا ٹٹو ہوں نظامی صاحب کو بٹھا تا اچھا لگوں گا"

"آخر انشورنس ایجنٹ ہو ناں۔۔۔ کتنی گھٹیا حس مزاح ہے۔۔۔۔" نظامی صاحب نے بڑی مشکل سے تیوری چڑھا کر متانت اختیار کرنے کی کوشش کی۔

"میں نے تو صرف ٹٹو کے خیالات کی ترجمانی کی ہے۔۔۔" مطیع نے بھی بڑی متانت سے کہا۔

"پھر بھی سہی۔۔۔۔" میں نے اس نوجوان سے کہا "میرے ساتھی اس بارے میں سنجیدہ نہیں۔۔۔"

"نظامی صاحب آپ فی الحال کرس کو ان تین یا چار انگریز خواتین کے بارے میں وہ لطیفہ سنائیں جو سنایا نہیں جا سکتا" مطیع پھر بولا۔

"دفع کرو جی۔۔۔" نظامی صاحب فوراً کہنے لگے "باندر کا بچہ آگے سے جواب دیتا ہے"

کرس جانتا تھا کہ ہم اس کے بارے میں بات کر رہے ہیں اور کوئی اچھی بات نہیں کر رہے۔

دریائے گلگت کے پار جلی ہوئی چٹانوں کا سلسلہ ختم ہوا اور ہریاول شروع ہو گئی۔۔۔

گلگت پہنچتے ہی ویگنوں کے اڈے سے میں نے ریاض صاحب کو فون کیا تاکہ ہم چنار ان میں قیام کر سکیں۔ معلوم ہوا کہ سیاحوں کے ہجوم کی وجہ سے نہ صرف چنار ان اور ہنزہ ان بلکہ ہر قسم کے ان' ان دنوں آؤٹ ہے۔۔۔ البتہ دور سائڈ ٹورسٹ لاج میں ایک کمرہ مل سکتا ہے۔۔۔ لاج کے نوجوان مالک اپنی ذاتی جیپ پر ہمیں ویگنوں کے اڈے پر لینے آ گئے۔

یہ ٹورسٹ لاج دریائے گلگت کے قریب تھا اور بقیہ شہر کی نسبت قدرے خنک آب و ہوا رکھتا تھا۔ نظامی صاحب نے کمرے میں داخل ہوتے ہی غسل خانے کا رخ کیا اور تیاری لگانے لگے۔ مطیع کا شوگر لیول گر رہا تھا اس لیے وہ لیٹ گیا۔

دریائے گلگت کے پانیوں کا منہ زور شور کمرے کے اندر ایک ہلکی گونج کی طرح داخل ہو رہا تھا۔۔۔

میں ایک مرتبہ پھر گلگت میں تھا۔ چٹانوں سے گھرا ہوا ایک نامہرباں جزیرہ جس میں ایک نامعلوم کشش تھی۔ یہاں نامعلوم کو جاننے کی کشش تھی۔ پچھلے پہر ہم تینوں گلگت کے بازار میں تھے۔۔۔ اب ہمیں آئندہ سفر کی منصوبہ بندی کرنا تھی۔۔۔ اور اس کے لیے ہم گلگت کے مردِ دانا جی ایم بیگ کی بک شاپ کی جانب رواں تھے۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ بیگ صاحب کسی کام کے سلسلے میں اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔ ان کی جگہ ان کے بیٹے اکرام بیگ دوکان میں براجمان تھے۔۔۔ اکرام نے فوراً قہوہ منگایا اور میں نے فوراً اپنا مسئلہ بیان کر دیا۔ "ہم تینوں کو کہیں بھیج دو"

"کہاں بھیج دوں تارڑ صاحب" اکرام کے تیکھے نقش و نگار پر حیرت پھیلی۔

"ہمارے پاس دس بارہ دن ہیں' ہمیں کسی دور افتادہ قراقری وادی میں بھیج دو جو اس دنیا سے باہر کی جگہ لگے"

"آپ کیسے جا سکتے ہیں؟" اکرام نے ایک نظر میرے بھدے سراپے پر ڈالی

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"آپ اس جسم کے ساتھ دشوار گزار پہاڑی راستوں پر کیسے چلیں گے.... راستے کی سختیاں کیسے برداشت کریں گے....."

"میں ؟" میں نے فوج میں بھرتی ہونے کے لیے آنے والی کسی نوجوان کی طرح سینہ پھلا کر پیٹ اندر کرنے کی کوشش کی "میں بالکل فٹ ہوں۔ سو فیصد۔ سو فیصد نہ سہی پچاس فیصد تو ہوں کیونکہ قوت نہ سہی میرے پاس ارادہ تو ہے"

"میں ان کو سہارا دے کرلے جاؤں گا بادشاہو" نظامی صاحب نے گردن ٹیڑھی کر کے بیان دیا۔

"ہیں؟" اکرام کے ہاتھ سے قہوے کی پیالی گرتے گرتے بچی "آپ بھی جائیں گے؟"

"کیوں میں نہیں جا سکتا ؟" نظامی صاحب نے ذرا بے عزتی محسوس کی "بادشاہو ہم پنڈی کی پہاڑیوں میں اکثر ماؤنٹینرنگ وغیرہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ کے ٹو اور نانگا پربت وغیرہ تو ہمارے سامنے معمولی بات ہے"

"یہ بھی جائیں گے...." میں نے ذرا جھینپتے ہوئے مطیع کی جانب اشارہ کیا جس نے فوراً دانت نکال دیئے کہ مجھے نہ بھول جانا۔

"میں بالکل فٹ ہوں" مطیع نے فوراً کہا "صرف ٹیکہ لگانا پڑتا ہے ہر روز"

"ٹیکہ .... یعنی انجکشن؟" اکرام کا منہ کھل گیا۔

"جی ہاں میرا شوگر لیول بہت گر جاتا ہے"

"اور آپ تینوں ٹریکنگ یا کوہ پیمائی کے لیے گھر سے نکلے ہیں؟" اکرام حیرت اور اچنبھے سے مسکراہٹ کی طرف آگیا۔

ہم تینوں نے اچھے بچوں کی طرح سر ہلا کر کہا "ہاں"

اکرام سوچ میں پڑ گیا۔ ہم اس کی جانب سالانہ امتحان کا نتیجہ سننے والے طالب علموں کی طرح دیکھنے لگے جنہیں یقین ہوتا ہے کہ وہ اس برس بھی پاس نہیں ہو سکیں گے۔

"دو ٹریک ہیں جو آپ کے معیار پر پورے اترتے ہیں لیکن آپ تینوں کی جسمانی صحت ان کے معیار پر پوری نہیں اترتی"

اکرام نے بالآخر سر اٹھایا "ایک تو وادیٔ شمشال کا ٹریک ہے۔ اگر آپ صرف شمشال گاؤں تک جائیں گے تو تین چار دن کا راستہ ہے' دشوار ہے.... اگر شمشال پامیر تک جائیں گے تو اتنے ہی دن مزید لگ جائیں گے .... آپ فیئری میڈو بھی جا سکتے ہیں ۔ نانگا پربت کے بیس کیمپ کے قریب.... دو دن جانے میں لگیں گے' راستہ پہلے دن کا بہت سخت ہے......"

"یہ پریوں والی چراگاہ ٹھیک ہے جی۔ شائد وہاں کوئی پریاں شریاں ہی مل جائیں" نظامی صاحب نے سر ہلایا اور میں تو ایک عرصے سے فیئری میڈو کے بارے میں پڑھ رہا تھا اور اسے دیکھنے کی خواہش میں تھا۔ میرے ذہن میں فیئری میڈو تک ٹریکنگ کے بارے میں جتنے سوالات تھے وہ میں نے پوچھ ڈالے.... ہمارے پاس کس قسم کا سامان ہونا چاہئے؟ خوراک کا کیا بندوبست ہو گا؟ کونسی دوائیاں ہمراہ لے جانا ضروری ہیں؟ راستہ کیسا ہے؟ سامان اٹھانے کے لیے پورٹرز کا بندوبست کیسے ہو گا؟

"آسٹریا کے ٹریکرز کا ایک گروپ دو تین روز تک فیئری میڈو جا رہا ہے اور میرا سفری ادارہ اس کا بندوبست کر رہا ہے۔ میں آج شام تاتو گاؤں کو پیغام رساں روانہ کر رہا ہوں ۔ اسے یہ بھی کہہ دوں گا کہ ...... کل؟ نہیں دو دن بعد دو پورٹر نیچے رائے کوٹ پل پر بھیج دے.... آپ کے پاس سامان کیا کیا ہے؟ اس کا بندوبست میں کر دوں گا.... آپ خوراک کا بندوبست کیجئے"

اکرام نے ایک طویل فہرست ان اشیاء کی بنا دی جن کی ضرورت فیئری میڈو تک کے سفر میں پڑ سکتی تھی۔

"لیجئے نظامی صاحب بازار میں گھوم پھر کر یہ اشیاء خرید لائیے" میں نے فہرست ان کے حوالے کی اور انہوں نے اسے بلند آواز میں پڑھنا شروع کر دیا۔ "چاول' دال' بسکٹ' لالٹین' چینی' چائے' خشک دودھ.... بادشاہو یہ گھریلو کام کاج مجھ سے نہیں ہوتے.... ساتھ لائے ہو تو اس قسم کی ڈیوٹی بھی آپ ہی دو" انہوں نے فہرست واپس کر دی۔

ہم اٹھنے لگے تو اکرام کہنے لگا "میں کل صبح اپنی کار پر ہنزہ کریم آباد جا رہا ہوں۔ پرسوں صبح واپس آجاؤں گا۔ آپ کا جی چاہے تو میرے ساتھ چلئے......"

"لیکن مجھے تو فیئری میڈو کے لیے تیاری کرنا ہے بلکہ خریداری کرنا ہے....."

"وہ آپ پرسوں کر سکتے ہیں۔ پچھلے پہر دو بجے ویگن چلاس کے لیے چلتی ہے اس پر بیٹھ جائیے گا اور رائے کوٹ پل پر اتر جائیے گا۔ رات وہاں بسر کیجئے اور اگلی صبح فیئری میڈو" یہ ساری گفتگو چونکہ اکرام نے صرف مجھ سے مخاطب ہو کر کی۔ اس

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

لیے نظامی صاحب قدرے بے آرام ہو کر کہنے لگے "میں نے کہا بادشاہو ہمیں اکیلا چھوڑ کر ہنزہ جا رہے ہو؟"

"آپ اس دوران گلگت دیکھ لیں نظامی صاحب"

"وہ تو ہم نے دیکھ لیا ہے۔ اب ذرا ہمیں بھی ہنزہ شنزہ کی سیر کرا دو.... کیوں بھئی مطیع چلنا ہے اکرام صاحب کی کار پر بیٹھ کر ہنزہ؟"

"کیوں نہیں؟" مطیع صاحب فوراً مان گئے۔

"جی ہاں بالکل آپ حضرات بھی چلیے...." اکرام نے مسکرا کر کہا۔

اس شام گلگت کے بازار میں گھومتے ہوئے میں نے ایک ایسی بے چینی بدن میں محسوس کی جو اس سے پیشتر میرے تجربے میں نہ آئی تھی۔ میں پرسوں اپنی زندگی کے پہلے باقاعدہ ٹریک پر جا رہا تھا۔ نامعلوم میں سفر کر رہا تھا۔ اس سفر کے لیے مجھے زندگی کی تمام ضرورتیں اپنے ساتھ لے جانا تھیں۔ اور ظاہر ہے وہاں خطرہ بھی تھا....

ہنزہ روڈ پر اکرام کی سفید سوزوکی چلی جاتی تھی اور ڈرائیور کی نشست پر' میں براجمان تھا۔ خوبصورتی اور پہاڑوں کے جلال کے منظر ہمارے ساتھ ساتھ چلے جاتے تھے۔

ہنزہ روڈ شائد پاکستان کا سب سے خوبصورت راستہ ہے۔

میں خاموشی سے بیٹھا ڈرائیور کر رہا تھا۔ کیونکہ مجھے راکا پوشی کا انتظار تھا.... پچھلی نشست پر نظامی اور مطیع اطمینان سے ٹانگیں پسارے بیٹھے تھے۔

"اپنی آنکھیں راکا پوشی کی پہلی جھلک کے لیے کھلی رکھنا کیونکہ اس سفید برفانی معبد کا نظارہ ایک پوری زندگی کے برابر ہے" میں نے ان سے کہا۔

خوبانیوں کے باغوں میں بچے اور خواتین درختوں سے پھل اتار کر بڑے بڑے تھالوں میں رکھ رہے تھے۔ گلگت کی گرمی رخصت ہو چکی تھی اور ہنزہ کی ٹھنڈک بدن کو چھوتی تھی...... کار میں خاموشی تھی۔

بھوری چٹانوں کے پیچھے اور آسمان کی نیلاہٹ میں راکا پوشی کی سفیدی نمودار ہونے لگی۔ جیسے وہ میری منتظر تھی۔ اور پھر دھیرے دھیرے اپنا آپ ظاہر کرنے لگی۔ جیسے وہ میری منتظر تھی اور میں اسے اس شخص کی طرح دیکھتا رہا جس کے اندر صرف جدائی ہوتی ہے' اور وہ اپنے محبوب چہرے کو سامنے پا کر نم آنکھوں سے اسے دیکھتا چلا جاتا ہے' اسے اپنے اندر جذب کر کے جدائی کے کانٹے کو نکالنے کے لیے.... میں مشکل سے بولا۔ "تو راکا پوشی کیسی ہے؟"

پیچھے سے کوئی جواب نہ آیا۔ میرے دونوں ساتھی منہ کھولے خراٹے لے رہے تھے....

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"وادی ہنزہ کا چراغاں"

"راکا پوشی ان" کے کمرے میں بھی باہر کی شام تھی۔

کریم آباد پہنچنے کے بعد کھانا تناول کیا گیا اور پھر فوری طور پر نظامی صاحب نے فیصلہ دے دیا کہ "بادشاہو اب آرام کرو کیا بھاگ دوڑ لگا رکھی ہے کہ ابھی کچورا چلو اٹھ کر اور وہاں سے گلگت اور وہاں سے ہنزہ ..... تو اب ذرا ریسٹ ہو جائے" تو اب ذرا ریسٹ ہو رہا تھا اور دونوں حضرات کمبل اوڑھے نیند میں گم تھے۔ اس سے پیشتر تھوڑی سی بد مزگی بھی ہو چکی تھی جب راکاپوشی نظر آنے پر میں نے پیچھے دیکھا تو دونوں صاحبان خراٹے لے رہے تھے۔

"عجیب کور ذوقی ہے کہ راکا پوشی جیسی شاندار برف پوش چوٹی گزرتی جا رہی ہے اور آپ لوگ خراٹے لے رہے ہیں" میں نے گرم ہو کر کہا تھا۔

اس پر نظامی صاحب نے ایک آنکھ کھول کر کہا تھا "گزرتی کہاں جا رہی ہے یہ سامنے تو دیکھ رہے ہیں۔ ٹھیک پانچ منٹ پہلے نہ دیکھی اب دیکھ لی...... آپ دنیا کو اپنی نظر سے ہمیں کیوں دکھانے پر مصر ہیں؟"

ان کا کہنا شاید درست تھا۔ اور مطیع کا کہنا تھا کہ ضروری تو نہیں راکا پوشی نیند خراب کر کے دیکھی جائے۔ اسے واپسی پر بھی تو دیکھا جا سکتا تھا' یہی والی راکا پوشی رہے گی بدل تو نہیں جائے گی۔

اکرام ہمیں ہوٹل میں چھوڑتے ہوئے کہہ گیا تھا کہ اگلی صبح ساڑھے آٹھ بجے ہم گلگت واپس چلے جائیں گے۔ بارہ بجے کے قریب گلگت۔ پھر فیری میڈو کے لیے خریداری اور دو بجے چلاس جانے والی ویگن پر اس مہم کے تینوں ممبر..... چنانچہ ہنزہ دیکھنے کے لیے بس یہی ایک شام تھی..... میں نے باتھ روم میں جا کر اپنے آپ کو ہنزہ کے برفیلے پانی سے تروتازہ اور یخ بستہ کیا اور کمرے میں واپس آ کر اپنے پھیپھڑوں میں پوری ہوا بھر کر ایک دلدوز قسم کا بلند ..... ہاہاہا..... قسم کا قہقہہ لگایا' ایسا قہقہہ جو فلم کا ولن ہیروئن کو تن تنہا کسی تالاب میں نہاتے ہوئے دیکھ کر لگاتا ہے' حالانکہ ایسے موقعوں پر خاموشی زیادہ سود مند ثابت ہو سکتی ہے..... قہقہہ سن کر نظامی صاحب باقاعدہ پلنگ سے اچھل پڑے "بادشاہو کیا ہو گیا ہے! انجرات آ گیا ہے؟"

"نظامی جی ہنزہ آ گیا ہے۔ آپ زندگی میں پہلی بار یہاں آئے ہو۔ ذرا باہر نکل کر تو دیکھو کہ سارا جہان اس وادی کے حسن کی تعریف کیوں کرتا ہے"

"لیکن ....." وہ آنکھیں ملتے ہوئے بولے "تم یہ کسی بھوکے لکڑبگڑ کی طرح ہنس کیوں رہے تھے"

"بس میرا جی چاہا تھا....." میں نے لاپرواہی سے کہا۔

"اٹھ بیٹھ مطیع الرحمٰن ...." انہوں نے مطیع کے کمبل کو ہلاتے ہوئے کہا "یہ تارڑ صاحب کے پیچ ڈھیلے ہو گئے ہیں سفر کرتے کرتے۔ مجھے تو اب ان سے ڈر لگتا ہے..... چل دیکھ ہی لیں ہنزہ شنزہ"

میں دو برس پیشتر اپنے بڑے بیٹے سلجوق کے ہمراہ پہلی مرتبہ ہنزہ آیا تھا..... اور ہم "ہنزہ ان" کے اس چھوٹے سے کمرے میں ٹھہرے تھے جس کے برآمدے سے راکا پوشی اور گھر ہالے کا منظر ایسے نظر آتا ہے جیسے ایک وسیع تصویر ہو۔ کریم آباد بدل چکا تھا۔ اس کی بازار والی سڑک اب پکی ہو چکی تھی اور اس پر ایک لڑکا موٹر سائیکل چلا رہا تھا۔ غیر ملکی سیاح گمشدہ بھیڑوں کی طرح ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ یہاں ہم تینوں نے کرس کی غیر موجودگی کو بری طرح محسوس کیا..... وہ گلگت پہنچنے پر چین جانے والی بس پر سوار ہو گیا تھا کیونکہ اس کی منزل ایک صحرا کے پار دنیا کی بلند ترین چوٹی ایورسٹ کے دامن میں تھی..... سفر کی دوستیوں میں یہی فائدہ ہے۔ جتنی دیر میں ہماری خوبیاں اختتام کو پہنچتی ہیں اور خامیاں شروع ہونے لگتی ہیں. تو راستے جدا ہو جاتے ہیں ....اور ہم صرف ایک دوسرے کے بہتر پہلو کو یاد رکھتے ہیں ....یہ بات صرف سفری دوستیوں کی حد تک درست ہے اس کا اطلاق سفری ساتھیوں پر نہیں ہوتا۔

بازار کے بعد آسمان کو اٹھتا ہوا وہ راستہ نظر آیا جو پولو گراؤنڈ سے ہوتا ہوا' ہنزہ کے ڈرائنگ روم اور پن چکی کے قریب سے گزر کر قدیم قلعے کی بلندی تک جا رہا تھا۔

"بادشاہو اس وقت کیا کرنا ہے قلعہ دیکھ کر" نظامی صاحب ایک دیوار کا سہارا

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

لے کر کھڑے ہو گئے۔

"رات ہونے کو ہے۔ اندھیرے میں کیا نظر آئے گا..... رہنے دو"

"میں تو بہر صورت جا رہا ہوں....."

"نہ تو آپ نے دو برس پہلے بھی اپنے بیٹے کے ساتھ اسے دیکھا نہیں تھا؟"

"دیکھا تھا....."

"تو پھر دوبارہ کیا کرنا ہے دیکھ کر؟"

میں نے اس کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا' یا شاید میرے پاس اس کا کوئی مناسب جواز نہیں تھا.....میں اگر کریم آباد میں تھا تو مجھے بہر طور قلعے تک تو جانا تھا۔ بس اتنی سی بات تھی.....میں نے راستے پر چڑھنا شروع کر دیا۔

"بادشاہو اب بھی واپس آ جاؤ ابھی ہونکنے لگو گے زبان نکال کر....." یہ نظامی صاحب کی آواز تھی۔

"ہم ہوٹل چلتے ہیں" یہ مطیع کی آواز تھی۔

اور واقعی میرا سانس پھولنے لگا..... اور میں فکر مند ہونے لگا۔ آج کے لیے نہیں بلکہ پرسوں کے لیے جب مجھے فیری میڈو کے سفر کے لیے ایک دشوار پہاڑی سلسلے پر پیدل چلنا تھا..... کریم آباد آج رات کچھ مختلف سا لگ رہا تھا۔ جیسے کوئی پر مسرت تہوار ہو اور وہ اندر مکانوں اور دالانوں میں پوشیدہ ہو لیکن اس کی خوشی ابل ابل کر کے پتھریلی گلیوں میں بہتی ہو..... خواتین ہنزہ کے روایتی لباس میں تھیں اور آپس میں چہلیں کر رہی تھیں۔ ان کی خوبصورت پر کشش ٹوپیاں نئی تھیں۔ ایک جوڑا گزرا جو سر جوڑے کھسر پھسر کر رہا تھا..... کچھ نوجوان ہنستے ہوئے اور کچھ زیادہ ہی ہنستے ہوئے گزرے۔

جب میں پن چکی کے قریب پہنچا تو مجھے سانس درست کرنے کے لیے رکنا پڑا..... آپ نے ہمارا پانی پیا؟ راستے کے اوپر وہ منقش کمرہ تھا جس کے نیچے سے گزر کر قلعے کو جایا جاتا تھا.....اوپر تاریکی کچھ زیادہ تھی اور دھند تھی اور سردی بھی تھی۔ میں دھند میں آہستہ آہستہ چلنے لگا.....اور یہ ایک خواب میں چلنے کی طرح تھا.....دھند قلعے کی دیوار تک پہنچنے پر ختم ہو گئی ..... کسی تبتی لاما سرائے کیطرح بلتت کا قلعہ تھا' کسی بدھ بھکشو کی طرح اپنے گیان میں اپنے دھیان میں گم تھا.....میں ایک بلند جگہ پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اور اب میرے نیچے وادی ہنزہ دھند میں تھی اور اس سے پرے راکا پوشی کی سفیدی مبہم خیال کی طرح تھی۔ کہیں کہیں چراغ جلتے تھے..... کچھ گھروں میں چراغاں تھا..... کہیں ہلکی روشنی تھی۔

میں بہت دیر تک وہیں اکیلا بیٹھا رہا..... میرے آس پاس صرف تاریکی تھی۔ تحلیل ہوتی ہوئی دھند تھی' الترگلیشیئر سے اترنے والی خنکی تھی' التر کے درے سے گزرنے والی تیز ہوا کا مدہم شور تھا اور سر کے اوپر سینکڑوں برس پرانا لکڑی کا ایک بوسیدہ کمرہ تھا جسے شہتیروں کے سہارے قائم رکھا گیا تھا۔ اور یہی وہ قلعہ تھا جو دنیا کے شاندار ترین مناظر میں سے ایک کے پہلو میں نظر آتا ہے۔

میں بالکل خالی الذہن تھا جب سامنے کی پہاڑی کے اندھیرے میں ایک پھلجڑی سی چھوٹی' روشنی سے ہوئی.....پھر وادی کے اندھیرے گوشے منور ہونے لگے..... اور اس چکا چوند کے بیچ ہزاروں چراغ تھے یا لالٹینیں تھیں یا مشعلیں تھیں جو میرے چاروں جانب وادی ہنزہ کے گرد کھڑے پہاڑوں کی بلندیوں پر جلتی تھیں..... کچھ نوجوان نیچے سے اوپر آئے اور قلعے کی دیوار پر موبل آئل سے بھگوئے ہوئے کپڑے رکھ کر انہیں آگ لگا دی۔ چھوٹے چھوٹے خالی ڈبوں میں بھی تیل تھا جو روشن ہو رہا تھا۔

وادی ہنزہ میرے سامنے روشن ہو رہی تھی اور اس میں وہ زرد جھلملاہٹ تھی جو چراغوں میں ہوتی ہے..... مجھے اب یاد آیا کہ گلگت میں اکرام نے کہا تھا کہ کل پرنس کریم آغا خان کی تاج پوشی کی سالگرہ ہے..... اور یہ چراغاں میرے لیے انعام تھا .....ہر سیاح کو قدرت اس کی سفری صعوبتوں کے بدلے میں کہیں نہ کہیں انعام دیتی ہے..... .....کبھی وہ جھیل جنیوا کے کنارے والز رقص کی تیرتی ہوئی دھن ہوتی ہے ..... کبھی وہ تھسالیہ کے ویرانوں میں ثوریا کی شام ہوتی ہے ..... دریائے ماسکو کے کنارے سفیدے کے جنگل میں ایک پکنک ..... قادر آباد بیراج کے پانیوں پر سردیوں کی دھوپ میں تیرتی ہوئی ہزاروں مرغابیاں ..... گھاس کے سنہری میدانوں کے پس منظر میں زرد چہرہ.....رتی گلی کی جڑواں جھیلیں..... کہیں نہ کہیں قدرت انعام ضرور دیتی ہے اور اس شب کریم آباد کے قدیم قلعے کی دیوار پر بیٹھے ہوئے میرے آس پاس پوری وادی میں جو چراغاں ہو رہا تھا وہ میرا انعام تھا.....وہ چراغاں صرف میرے لیے ہو رہا تھا۔

میں اس وقت اپنی پتھریلی آماجگاہ سے نیچے اترا جب الاؤ مدہم ہو کر بجھنے لگے اور اندھیرا ایک سیاہ دھند کی طرح رینگتا ہوا واپس آنے لگا۔

میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا نیچے اترنے لگا۔ بازار میں ابھی کچھ لوگ تھے

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

..... راستہ ایک ہوٹل کے باورچی خانے کے روشن دان کی سطح پر تھا۔ باورچی خانے میں سفید ایپرن باندھے ایک باورچی نما صاحب میز پر پڑے ایک سالم بکرے کی ٹانگ پکڑے اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ سامنے سے تین نوجوان چلے آ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ رک گئے اور پھر ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ وہ ملتان میڈیکل کالج کے طالب علم تھے۔ انہیں سفرناموں کا اور سیاحت کا خبط تھا اور ان کے پاس بہت سوال تھے اور میرے پاس کم جواب تھے۔ اندھیرے میں آہستہ آہستہ چلتا ایک غیر ملکی شخص کاندھے پر ایک رک سیک گلے میں ہار کی طرح تسموں میں بندھے ہوئے فل بوٹ، سر پر ہیٹ اور چپٹے فریم کی عینک لگائے۔ وہ ہمارے قریب سے گزرا تو اس نے بلند آواز میں "السلام و علیکم" کہا۔

"وعلیکم السلام" ہم رک گئے۔ وہ رکنے کے موڈ میں نہیں تھا لیکن رک گیا

"آپ اردو بولتے ہیں؟"

"جی ہاں" اس نے سر ہلایا۔

"کہاں سے آئے ہیں؟" ایک نوجوان نے دریافت کیا۔

"اوپر اونچے پہاڑوں سے....." اندھیرے میں اس کی عینک کے شیشوں میں کچھ روشنی سی تھی۔

"آپ بہت اچھی اردو بولتے ہیں" میں نے کہا۔

"جی شکریہ"

اور یہ زبان آپ نے کہاں سے سیکھی؟"

"کراچی سے....."

"بہت خوب..... کون سے ملک کے ہیں؟"

"پاکستان....."

ہم تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو گئے.....وہ جان گیا کہ ہم شرمندگی سے چپ ہیں۔ اس لیے بولنے لگا "میرا نام عبدالحق ہے اور میں کراچی کے ایک سکول میں ٹیچر ہوں..... گرمیوں کی چھٹیاں ہوتی ہیں تو میں اپنا رک سیک اور سلیپنگ بیگ اٹھا کر ادھر شمال میں آجاتا ہوں....."

"آپ ایک پیالی چائے ہمارے ساتھ پئیں....."

وہ ہمارے قبیلے کا آدمی تھا اور میں اسے بہتر طور پر جاننا چاہتا تھا۔ ہم نزدیکی ہوٹل میں چلے گئے۔

"آپ نے جوتوں کا ہار پہن رکھا ہے....." ایک نوجوان نے اسے چھیڑا۔

"ہاں خود پہنا ہے کسی نے پہنایا نہیں" اس نے سر ہلا کر کہا "یہ میرے رفیق ہیں" وہ انہیں تھپکنے لگا "مجھے بہت دور اور بہت بلندی پر لے جاتے ہیں....."

"آپ اس وقت کہاں سے آ رہے ہیں؟" میں نے دریافت کیا

"اوپر سے.....بہت بلندی سے.....وہاں ایک گلیشیئر پر میں مرنے لگا تھا.....بچ گیا.....ان جوتوں کی وجہ سے.....یہ میرے دوست ہیں"

"آپ اکیلے جاتے ہیں پہاڑوں میں؟" ایک نوجوان جو بے حد مرعوب نظر آتا تھا پوچھنے لگا۔

"میں اکثر کسی مہم کے ساتھ شامل ہو جاتا ہوں ان سے کہتا ہوں کہ خیمہ میرا اپنا ہے۔ خوارک میں خود پکاؤں گا۔ صرف آپ کے ساتھ سفر کرنا چاہتا ہوں اور اکثر اوقات وہ مان جاتے ہیں۔ پھر ایسا ہوتا ہے کہ پہاڑوں میں مجھے کوئی وادی نظر آجاتی ہے۔ مجھے کہیں کوئی جنگل دکھائی دے جاتا ہے' کوئی آبشار نظر آتی ہے تو میں مہم سے الگ ہو کر ادھر چلا جاتا ہوں..... اور اکثر اوقات مرتے مرتے بچتا ہوں..... شمال میں اب بھی ایسے علاقے ہیں جہاں مار خور انسان کے قریب آ جاتے ہیں بغیر کسی خوف کے اور وہ اسے سونگھتے ہیں کہ یہ کیا چیز ہے..... کیونکہ انہوں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہوتا....."

"واہ....." ایک نوجوان نے بے اختیار ہو کر کہا۔

"اور آپ باقی سارا سال کیا کرتے ہیں؟"

"بتایا تو ہے کہ ٹیچر ہوں بچوں کو اپنے سفر کے قصے سناتا ہوں اور قدرت کے قریب لے جانے کی کوشش کرتا ہوں..... انسان نیچر کا ایک حصہ ہے اسے اسی کے پاس واپس جانا چاہیے..... اور انسان کبھی نہیں مرتا..... انسان اور اس کا جذبہ..... مٹی سے کسی نے پوچھا تم میں خوشبو کہاں سے آئی؟ کہنے لگی میں گلاب کے پاس رہی ہوں..... مجھ میں پورے کائنات کی خوشبو ہے..... میں اس کا ایک حصہ بن چکی ہوں....."

آپ کے بال بچے آپ کی آوارہ گردیوں پر معترض نہیں ہوتے؟"

"میں نے شادی نہیں کی....." اس نے چائے پینے سے پیشتر اپنے جوتوں کا ہار میز پر رکھ دیا "کیونکہ میں بچے پیدا کرنا نہیں چاہتا"

"کیوں....." ایک نوجوان نے فورا پوچھا۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"وہ دوسرے بچوں کو بھوکا مار دیں گے۔۔۔ دنیا میں روزانہ لاکھوں بچے بھوک کا شکار ہو کر مر جاتے ہیں۔ اگر میں دو بچے اور پیدا کر دوں تو اس کا مطلب ہے کہ دو بچوں کی خوارک اور کم ہو گی۔۔ میں چاہتا ہوں کہ دنیا بھر کے بھوکے بچوں کو خوارک مہیا کروں۔۔۔ وہ سب بھی تو میرے بچے ہیں۔ میں مزید بچے پیدا کرنا نہیں چاہتا۔۔۔ مجھے اجازت دیجیے میں تھکا ہوا ہوں"

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے جوتوں کو پھر سے گلے میں ڈال لیا "ابھی مجھے شب بسری کے لیے کوئی سستا کمرہ تلاش کرنا ہے"

"ہمارا ہوٹل بے حد سستا ہے۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔۔" میڈیکل کے طالب علموں نے بڑے اشتیاق سے اسے دعوت دی۔

"چلیں۔۔۔" وہ اٹھا "جب تک انسان گلے میں جوتوں کا ہار نہ پہنے وہ اپنے آپ کو نہیں پہچانتا تارڑ صاحب۔۔۔۔ مٹی میں خوشبو کہاں سے آئی۔۔۔۔؟" وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر چلا گیا اور میں بہت دیر تک اس کی شخصیت کے الجھاؤ میں گم وہاں بیٹھا رہا۔

واپس "راکا پوشی ان" میں اپنے کمرے میں آیا تو وہاں ایک اور الجھاؤ میرا منتظر تھا۔ نظامی صاحب بستر پر دراز تھے اور مطیع آلتی پالتی مارے اپنے بستر پر بیٹھا عینک اتارے تیزی سے آنکھیں جھپک رہا تھا۔

"نظامی صاحب نے ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔۔"

"کیا ہوا؟"

"آپ کو یاد ہے بازار کے بعد جب وہ بلند راستہ آیا تھا تو نظامی صاحب ایک دیوار کا سہارا لے کر کھڑے ہو گئے تھے اور آپ سے کہا تھا کہ کیا کرنا ہے قلعہ دیکھ کر؟"

"ہاں۔۔۔۔"

"آپ کے جانے کے بعد میں نے غور کیا تو نظامی صاحب کا چہرہ زرد ہو چکا تھا اور یہ کھڑے بھی نہیں ہو سکتے تھے۔۔۔۔ وہیں بیٹھ گئے۔۔ میں نے پوچھا کہ کیا ہوا ہے تو پہلے چپ رہے پھر کہنے لگے کہ یار مجھے وہ ہارٹ شارٹ کی تھوڑی سی پرابلم ہے"

"ہارٹ۔۔۔۔" میں نے نظامی صاحب کی جانب دیکھا وہ کمبل اوڑھے ہوئے تھے اور یقیناً اس وقت ہماری باتیں سن رہے تھے۔ میرے سامنے وہ تمام بلندیاں اور چڑھائیاں گھوم گئیں جہاں ہم نظامی صاحب کو لے کر گئے تھے۔۔۔۔ ان میں خپلو کی چقچن مسجد کی چڑھائی بھی شامل تھی۔۔۔ انہیں وہاں کچھ ہو جاتا تو؟ اور اب ہم انہیں نانگا پربت کے بیس کیمپ کی جانب لے جانے لگے تھے۔۔۔ اچھی ٹیم بنائی ہے میں نے' مجھے ایک دم غصہ آ گیا ایک صاحب روزانہ شوگر کا ٹیکہ خود لگاتے ہیں اور دوسرے دل کے مریض ہیں۔۔۔ "نظامی صاحب آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟"

"بادشاہو ہمیں کوئی نہیں ہارٹ شارٹ کی پرابلم۔۔۔" کمبل کے اندر سے ان کی آواز آئی۔۔۔

"ذرا چہرہ کرائیں اور اٹھ کر بیٹھیں۔۔۔" میں نے انہیں باقاعدہ ڈانٹا اور وہ اچھے بچوں کی طرح فوراً اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"آپ کو اس سفر کے دوران کچھ ہو جاتا تو کون ذمہ دار ہوتا؟ میں۔۔۔ آپ نے بتایا کیوں نہیں؟"

"بادشاہو بتا دیتا تو آپ مجھے اپنے ساتھ لاتے؟"

"نہیں ہرگز نہیں۔۔۔۔"

"اسی لیے نہیں بتایا تھا۔۔۔۔۔"

میں بہت دیر تک کڑھتا رہا۔ مطیع بھی چپ بیٹھا آنکھیں جھپکتا رہا۔ پھر نظامی صاحب بڑی نرمی سے کہنے لگے "یار یہ ڈاکٹرز جو ہوتے ہیں ان پڑھ ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ کہتے ہیں کہ انجائنا ہے۔ اندازہ کرو گولیاں شولیاں بھی دے رکھی ہیں لیکن میں نہیں کھاتا۔۔۔۔"

"بڑی عقلمندی کرتے ہیں ناں کہ گولیاں نہیں کھاتے۔۔۔۔"

"میں دل کے درد کو برداشت کرنا چاہتا ہوں، دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ مجھے کہاں تک لے جاتا ہے"

وادی کی ڈھلوانوں پر کھڑے پاپلر کے درخت نگر گلیشیر سے آنے والی ہوا کے زور سے اندھیرے میں شور کرتے تھے اور جب ہم چپ ہو جاتے تھے تو ان کا شور کمرے میں بولتا تھا۔

"آپ ہمارے ساتھ نانگا پربت کے بیس کیمپ تک نہیں جا رہے۔۔۔" میں نے ہمت کر کے کہا کیونکہ نظامی صاحب کو بھی اسی فقرے کا انتظار تھا اور اسی لیے وہ فوراً بولے "نہیں کیوں نہیں جا رہے۔۔۔ میں کیا سمجھتا ہوں دل کی بیماری کو۔۔۔ آپ فکر ہی نہ کرو۔۔۔۔"

www.urdufans.com or www.allurdu.com[rfi]

"آپ نہیں جا سکتے" مطیع نے بھی فیصلہ دے دیا اور نظامی صاحب کے چہرے پر وہ زردی پھیلی جو لاعلاج مریض کے چہرے پر اس لمحے پھیلتی ہے جب ڈاکٹر اسے آخری انکار کرتا ہے......

"کیوں نہیں جا سکتے" نظامی صاحب نے ہمت کر کے پھر کہا' ان کی آواز شدت جذبات سے بیٹھ چکی تھی۔ "تم نے کوئی مجھے اٹھا کر لے جانا ہے.... خود چل کر جاؤں گا اپنے پاؤں پر.... مجھے تم روک لو گے.... میں خود آ جاؤں گا تمہارے پیچھے پیچھے......"

"نہیں......" میں نے اس شخص کے لئے بے پناہ ہمدردی محسوس کرتے ہوئے کہا "نظامی صاحب وہاں اگر آپ کو کچھ ہو جاتا ہے تو... میں آپ کو واپس گجرات نہیں پہنچا سکتا.... یہ میرے بس کی بات نہیں"

"تو بادشاہو وہیں چھوڑ آنا... کیا فرق پڑتا ہے۔ کم از کم جگہ تو خوبصورت ہو گی ناں... پریاں شریاں... مرنا تو بندے نے ہوتا ہی ہے کہیں نہ کہیں...." انہوں نے ہم دونوں کی جانب باری باری دیکھا...... اور ہمارے چہروں پر اپنے لیے دکھ دیکھا اور پھر نظامی صاحب اپنے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ زندگی کے ان گوشوں کے بارے میں جو ہم سے پوشیدہ تھے... ان لمحوں کے بارے میں جو ان پر بھاری گزرے.... اپنی پہلی بیوی کے بارے میں۔

"میں اس سے بے حد محبت کرتا تھا۔ کالج میں دس منٹ کے لیے فارغ ہوتا تو گھر آ کر اسے ایک نظر دیکھ جاتا۔ اس کی ہر خواہش پوری کرتا..... محلے والے کہتے ماسٹر نے تو ہماری بیویوں کو بھی چوڑ کر دیا ہے یہ کہتی ہیں کہ ہمیں بھی اس طرح رکھو جس طرح ماسٹر اپنی بیوی کو رکھتا ہے لاڈ پیار سے اور عزت سے ..... اور پھر وہ مر گئی... لوگوں نے مجھے ذمہ دار ٹھہرایا... میں تو اس سے بے حد محبت کرتا تھا بادشاہو... محلے والے کہتے تھے ماسٹر نے تو ہماری بیویوں کو بھی چوڑ کر دیا ہے..."

وادی کی ڈھلوانوں پر کھڑے پاپلر ہوا کے زور سے شور کرتے تھے اور بہت کرتے تھے۔ ہم تینوں گلگت بازار میں کھڑے تھے اور ہمارے رک سیک اوندھے کچھوؤں کی طرح فٹ پاتھ پر پڑے تھے۔

کریم آباد سے واپسی کا سفر خاموشی میں طے ہوا۔ ابھی ابھی اکرام ہمیں یہاں چھوڑ کر اپنے دفتر گیا تھا۔ ساڑھے گیارہ بجے تھے اور چلاس کے لئے ویگن دو بجے روانہ ہوتی تھی۔ ان ڈھائی گھنٹوں میں ہمیں ویگن کے لیے بکنگ کرانا تھی اور فیری میڈو کے سفر کے لیے تمام ضروری سامان خریدنا تھا اور یہ ایک بہت طویل فہرست تھی اور میں اسے جیب سے نکال کر بار بار دیکھتا تھا۔

"تو پھر میں جاؤں ؟" نظامی صاحب اب بالکل تر و تازہ تھے اور ہمیں چھیڑنے کے موڈ میں تھے "یار ہمیں بھی لے چلو اپنے ساتھ..... ہم بھی دیکھیں ناں پریاں شریاں"

" آج شب تو یہیں گلگت میں بسر کریں اور کل صبح پسو چلے جائیں...... بہت پر سکون اور خوبصورت قصبہ ہے اور وہاں میرے ایک دوست ماسٹر حقیقت بھی ہیں' آپ کی دیکھ بھال کریں گے اور دو ماسٹر اکٹھے ہو جائیں گے......"

"نظامی صاحب یہ بہت اچھا آئیڈیا ہے" مطیع بولا "اتنی دور آ کر گجرات واپس چلے جانا بہت بے وقوفی ہے۔ آپ چند دن ادھر ہی گزاریں......"

"اکیلا ہی گھومتا پھروں؟ یار اکیلے گھومتے مجھے بڑا ڈر لگتا ہے" نظامی صاحب کی تازگی یکدم ماند پڑ گئی" ویسے پسو اچھی جگہ ہے؟"

"بہت......"

"تو پھر ٹھیک ہے میں کل صبح ہی جاتا ہوں...... کتنی دیر میں پہنچ جاؤں گا پانچ چھ گھنٹے میں؟ بس تو جی مجھے کیا پرواہ ہے آپ کی.... آپ جاؤ نانگا پربت.... میں پسو جا کر آرام کرتا ہوں......" نظامی صاحب نے اپنا بیگ اٹھا لیا "روور سائیڈ ٹورسٹ لاج میں رات بسر کرتا ہوں اچھی جگہ تھی..... اچھا بھئی مطیع..... لو جی تارڑ صاحب پھر ملاقاتیں ہوں گی"

"سوری نظامی صاحب...." میں نے کہا لیکن یہ دراصل ہم دونوں نے تہ دل سے کہا کیونکہ ہم بے حد مجرم محسوس کر رہے تھے۔ ہم اپنے ایک ساتھی کو راستے میں چھوڑ رہے تھے لیکن اس کیفیتی کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا۔ نظامی صاحب نے سڑک پار کی۔ دوسری جانب پہنچ کر بیگ کو فٹ پاتھ پر رکھا اور چند گہرے سانس لے کر بیگ پھر اٹھایا اور آہستہ آہستہ چلتے چنار ان کی جانب مڑ گئے۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"دو چینی شیر سندھ کی گہری گونج اور رائے کوٹ پل"

"مطیع ... ہمارے پاس تقریباً دو گھنٹے باقی ہیں۔ ویگن کی بکنگ اور پھر خریداری"

ہم ویگن سٹینڈ پر پہنچے۔ بکنگ کلرک سے گفتگو کی۔ لیکن اس نے ہماری جانب دیکھنا بھی گوارہ نہ کیا۔ ایک نوجوان کوہستانی ہماری مدد کو آیا اور اس نے بتایا کہ بکنگ ویگن سٹارٹ ہونے سے آدھا گھنٹے پہلے ہوگی ...... تب ہم بھاگم بھاگ بازار میں پہنچے ...... "ہم" سے مراد صرف میں تھا کیونکہ مطیع الرحمان بڑے پرسکون انداز میں گلگت بازار میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ پھل کھا رہے تھے۔ پرانے سکے اور زیورات تلاش کر رہے تھے۔ ان کے ذمہ رات کے کھانے کے لیے چپلی کباب اور نانوں کی خریداری تھی۔ میں نے فہرست ہاتھ میں پکڑی اور بازار کی تقریباً ہر دوکان میں جا کر مطلوبہ اشیاء خریدیں اور ان کے پیکٹ بندھوا کر انہیں وہیں رکھوا دیا۔ ہمیں کم از کم ایک ہفتہ کی خوراک اور دیگر اشیائے ضرورت خریدنا تھیں۔ اس روز گلگت بازار کے فٹ پاتھ پر جو شخص پاگلوں کی طرح ادھر ادھر دوڑ رہا تھا اور مخبوط الحواس تھا' وہ میں تھا ... اور جو شخص فٹ پاتھ پر اطمینان سے کھڑا چند سیاحوں کے ساتھ گپ بازی کر رہا تھا وہ مطیع تھا اور جب بھی میں پسینہ پونچھتا اس کے قریب سے گزرتا وہ کہتا "میری مدد کی ضرورت تو نہیں؟" ... ایک مرتبہ جب میں شاید بیسویں مرتبہ اس کے قریب سے گزرا تو اس نے چار پانچ حضرات کو یہ لالچ دے کر روک رکھا تھا کہ ابھی آپ کی ملاقات تارڑ صاحب سے کرائیں گے اور پھر اکٹھے چائے پئیں گے اور یہ جو منہ کھولے پسینہ پونچھتے چلے آ رہے ہیں یہی تو تارڑ صاحب ہیں ... جناب یہ ہیں ... یہ کہہ کر اس نے ان معززین کا تعارف کرانا شروع کر دیا ......

اور ہماری ویگن چلنے میں صرف پندرہ منٹ باقی تھے اور ہمارا سامان گلگت بازار میں ایک کلومیٹر کے علاقے میں واقع مختلف دوکانوں میں بندھا پڑا تھا اور ابھی اسے سمیٹنا تھا ..... میں نے رکے بغیر چلتے چلتے ان حضرات سے ہاتھ ملایا اور پھر سپیڈ پکڑ لی ... بعد میں مطیع بے حد ناراض ہوا کہ ان میں تو ایک کرنل صاحب بھی تھے۔ آپ نے لفٹ ہی نہیں کرائی۔ ان کے ساتھ ایک کپ چائے پی لیتے تو کون سا طوفان آ جاتا ... زیادہ سے زیادہ چلاس جانے والی ویگن مس ہو جاتی تو کل چلے جاتے ... انسان کو اتنا بھی مغرور نہیں ہونا چاہیے۔

اور جب ہم اپنی درجنوں پوٹلیاں سنبھالتے گھسیٹتے ویگن اسٹینڈ پر پہنچے تو چلاس جانے والی آخری ویگن کے لیے تمام نشستیں پر ہو چکی تھیں اور بکنگ کلرک جو پہلے ہماری طرف دیکھتا نہ تھا اب وہ ہماری سنتا بھی نہ تھا ... میں نے بہت شور مچایا کہ میں ڈھائی گھنٹے پیشتر یہاں آیا تھا اور اس نے وعدہ کیا تھا کہ بکنگ ہو جائے گی لیکن بے سود ... تب اس کوہستانی نوجوان نے ویگن کے اندر سے سر نکالا اور باہر تھوکا اور پھر ہنگامہ کر دیا کہ یہ صاحب اس ویگن میں ضرور بیٹھے گا کیونکہ یہ سچ کہتا ہے اس کلرک نے وعدہ کیا تھا ... اگر نہیں بٹھائے گا تو ویگن نہیں چلے گا ... چلے گا تو ہم روک دے گا ... اور اس کے ساتھ اس نے اپنی کمر کو تھپتھپایا یہ بتانے کے لیے کہ ویگن روکنے کے لیے اس کے پاس مناسب بندوبست ہے ... چنانچہ دو حضرات کو اٹھا کر باہر پھینک دیا گیا اور ہمیں جگہ دے دی گئی۔ ان حضرات نے بالکل احتجاج نہ کیا کیونکہ یہ دراصل ہماری نشستوں پر ہی بیٹھے ہوئے تھے اور وہ اطمینان سے کپڑے جھاڑتے ہوئے چلے گئے۔

ڈرائیور اپنی نشست پر بیٹھ گیا اور چابی گھما کر انجن گرم کرنے لگا ... اور تب اس لمحے مجھے اس خیمے کا خیال آیا جو اکرام کے دفتر میں رکھا تھا اور جسے مطیع نے وہاں سے لانا تھا اور جس کے بغیر ظاہر ہے ہم فیری میڈو جانے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے ...

"مطیع صاحب ہمارے پاس خیمہ نہیں ہے"

"ہاں ... وہ تو نہیں ہے" اس نے بڑے اطمینان سے کہا اور برابر بیٹھے ہوئے ایک ڈاکٹر صاحب سے پھر محو گفتگو ہو گیا۔

"اور اس کے بغیر ہم ٹریکنگ پر نہیں جا سکتے ..." وہ بدستور محو گفتگو تھا اس لیے میں نے ذرا گرجدار آواز میں کہا "خاں صاحب ابھی اس وقت جائیں اور رکشے پر

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

سوار ہو کر جائیں اور اگر اکرام کا دفتر بند نہیں ہو گیا تو خیمہ لے کر آئیں ....."

"ایک تو آپ کو جلدی بہت ہوتی ہے ...." وہ بیزار ہو کر بولا "ویگن تو چلنے والی ہے اور ہمارا سامان بھی اوپر بندھ چکا ہے .... خیمے کے بغیر گزارہ کر لیں گے فکر نہ کریں۔"

"خاں صاحب ....." میں نے صرف اتنا کہا اور اور مطیع مسکراتا ہوا ویگن سے اتر گیا "اور وہاں اگر تمہیں دیر ہو جائے تو کل صبح کی ویگن پر بیٹھ کر آ جانا میں رائے کوٹ پل پر تمہارا انتظار کروں گا .... اور ہاں .... خیمہ لگانے کا طریقہ بھی معلوم کر کے آنا ....."

مطیع چلا گیا .... ویگن حرکت میں آ گئی .... اب میں نے ان ڈاکٹر صاحب سے رجوع کیا جن کے ساتھ مطیع گپ لگا رہا تھا۔ ان کا نام قاضی سلیم تھا اور وہ سول ہسپتال دوغانے' بلتستان میں میڈیکل آفیسر تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ اگر یہ ویگن اڈے سے باہر نکل گئی تو میرا ساتھی کبھی بھی خیمے کے ساتھ رائے کوٹ پل پر نہیں پہنچے گا .... وہ دو تین روز گلگت بازار میں پرانے سکے تلاش کرے گا اور پھر ایک ٹھنڈی آہ بھر کر جہاز میں سوار ہو کر راولپنڈی چلا جائے گا اور شاید وہاں جا کر اسے خیال آ جائے کہ تارڑ رائے کوٹ پل پر بیٹھا میرا اور خیمے کا انتظار کر رہا ہے۔ اس آہ و زاری کا مناسب اثر ہوا اور ڈاکٹر صاحب نے ویگن ڈرائیور سے مذاکرات شروع کر دیئے۔ ان میں بار بار مہمان اور مسافر کا ذکر آتا تھا۔ ڈرائیور بھی بار بار کھڑکی سے باہر تھوکتا تھا' شدید غصہ کا اظہار کرتا تھا اور ایکسیلیٹر کو پمپ کرتا چلا جاتا تھا .... دس منٹ کے بعد اس کی بے صبری کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور ویگن اڈے سے باہر جانے کے لیے رینگنے لگی .... میرا دل بھی رینگتا ہوا نیچے ہونے لگا .... لیکن مطیع "ٹھہرو ٹھہرو" کا شور مچاتا' کاندھے پر خیمہ رکھے اسی لمحے وارد ہو گیا۔ وہ ویگن کے اندر داخل ہوا تو دیگر مسافرین نے اسے خوب تھپکیاں دیں۔

ویگن شاہراہ ریشم پر آئی تو اس کی رفتار میں بے پناہ اضافہ ہو گیا .... لیکن ڈرائیور ماہر تھا وہ تیز مگر محتاط چلاتا تھا۔ ہم تھوڑی دیر کے لیے جگلوٹ میں رکے .... شاندار قراقرم اتنے بلند تھے کہ سورج ابھی سے ان کے پیچھے پوشیدہ ہو رہا تھا اور ان کے سائے وادیوں میں پھیلتے جا رہے تھے۔ ویگن کے اندر گرمی تھی۔ ہمارے آس پاس چٹیل پہاڑ تھے جو سارا دن دھوپ سے گرم ہوتے تھے اور پھر شام کے وقت ان میں سے تپش خارج ہوتی ہے۔ یہ علاقہ گرم موسموں کا تھا اور بنجر ویرانوں کا تھا۔

روشنی ابھی تھی جب ویگن رائے کوٹ پل کے پار جا کر رک گئی۔

ویگن چلی گئی تو ہم نے آس پاس دیکھا ....

رائے کوٹ کا خوبصورت پل جس کے بہت نیچے سندھ کا مٹیالا پانی ایک گہری گونج کے ساتھ بہتا تھا۔ پل پر چینی شیروں کے مجسمے اترتی شام اور پہاڑوں کی ویرانی میں .... ایک سناٹا جس میں صرف سندھ کے بہاؤ کی آواز تھی۔ اور سڑک کے کنارے ہم دونوں کے رک سیک اور پوٹلیاں .... جدھر سے ہم آئے تھے ادھر ایک بہت بڑی چٹان تھی جو پل پر سایہ کرتی تھی .... بائیں ہاتھ پر شنگریلا ہوٹل کی چھوٹی سی عمارت بند پڑی تھی' چند گیراج تھے۔ پل کے پہلو میں ایک چھوٹا سا کیبن تھا جس میں دو پولیس والے دبکے بیٹھے تھے۔ کیبن کے ساتھ بڑے بڑے پتھروں کا ایک مجموعہ تھا اور تھوڑی سی ریتلی جگہ تھی۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ فیئری میڈو اور نانگا پربت جانے والے کوہ پیما اسی مقام پر خیمہ نصب کر کے رات گزارتے ہیں ....

لیکن یہاں تنہائی بہت تھی اور شاہراہ ریشم پر سے گزرنے والی اکا دکا بس یا ویگن بھی اس خوف کو کم نہیں کرتی تھی جو اس تنگ درہ نما مقام پر دل میں بیٹھتا جاتا تھا .... پل کے بائیں ہاتھ پر تو پولیس کیبن تھی اور وہ ریتلی جگہ جہاں شب بسری کے لیے ہمیں خیمہ زن ہوتی تھیں اور دائیں جانب شنگریلا کے ساتھ ایک پتھریلا راستہ اوپر جاتا تھا۔ راستے کے نیچے دریا کے قریب بھی ایک چھوٹا سا ویرانہ تھا جو مجھے خیمہ لگانے کے لیے زیادہ موزوں لگ رہا تھا۔ میں جائزہ لینے کے لیے نیچے اترا۔ وہاں چند کچی کوٹھڑیاں تھیں جن کے چھتیں ڈھے چکی تھیں اور ان سے پرے ایک فوجی تمبو تھا جس کے باہر بنیان اور نیکر میں ملبوس ایک فوجی رات کے کھانے کے لیے ہانڈی میں ڈوئی چلا رہا تھا اور اس نے میرے سلام کرنے پر صرف ایک نظر مجھ پر ڈالی اور پھر میرے وجود سے مکمل طور پر غافل ہو گیا .... وہ پل پر تعینات تھا اور شاید اکثر سیاح شام کے وقت جان بوجھ کر ادھر سے گزرتے ہوں گے تاکہ وہ انہیں مروتاً کھانے کی دعوت دے اور وہ اسے فوری طور پر قبول کر لیں .... اس کے علاوہ اس کی سردمہری کا کوئی جواز نہ تھا .... میں کچی کوٹھڑیوں کے آس پاس گھوم رہا تھا کہ اینٹوں کے ایک ڈھیر کے پیچھے سے ایک کتیا نکلی' اس نے مجھے دیکھا اور یہ دیکھنا میرے لیے کافی تھا اور میں شتابی سے پل پر واپس آ گیا .... میرا اندازہ درست تھا' بعد میں پولیس والوں نے بتایا کہ وہ پاگل تھی اور متعدد راہ گیروں کو کاٹ چکی تھی۔

ہم نے اپنے رک سیک اور دیگر سامان اٹھایا اور کیبن کے ساتھ پتھروں کے

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

درمیان ریتلی جگہ پر لے گئے ... مطیع نے خیمہ کھولا۔ یہ اگلو قسم کا خیمہ تھا اور اسے نصب کرنا بے حد آسان تھا۔ یوں بھی مطیع آج صبح اکرام سے اسے نصب کرنے کی ٹریننگ لے کر آیا تھا ... اس نے خیمہ زمین پر بچھایا تو میں اس کی میخیں ٹھونکنے لگا ... پھر یہ گنبد نما خیمہ زمین سے بلند ہو کر ایک چھوٹے سے خوبصورت اور پر آسائش گھر میں بدل گیا ... میں سر جھکا کر رینگتا ہوا اس کے اندر گیا تو جیسے ایک ٹائم ٹنل کے اندر سفر کرنے لگا ... پیچھے بہت پیچھے ... میں آج تک کتنی بار کتنی سرزمینوں' کیسی کیسی جسمانی اور ذہنی حالتوں میں اس طرح رینگتا ہوا ان خیموں میں داخل ہوا تھا جو عمر کے مختلف حصوں میں میرے ساتھی تھے ... سیاحت کا لطف اس لمحے میں ہوتا ہے جب آپ کسی سرزمین پر پہلی بار اپنا خیمہ نصب کر کے اس میں رینگتے ہوئے داخل ہوتے ہیں اور آپ واپس اپنے گھر پہنچ جاتے ہیں ... ہم نے اپنا اپنا سامان اندر رکھا اور پھر باہر ریت پر بیٹھ گئے ... اب شام گہری ہونے لگی تھی اور دریا کا شور پہلے کی نسبت بہت زیادہ بلند ہو چکا تھا۔ ہم جب سے یہاں آئے تھے مطیع کچھ چپ چپ تھا اور وہ حیرت سے آس پاس دیکھتا تھا اور گردن میں بل دے کر عینک سنبھال کر ان پہاڑوں کو دیکھتا تھا جو ہم پر جھکے ہوئے تھے۔

" فیری میڈو کو کون سا راستہ جاتا ہے؟" اس نے پوچھا۔

" وہ شاید ادھر ہے اس پہاڑ کے پیچھے ..."

" اس پہاڑ کے پیچھے ؟ ... لیکن ... اس پر چڑھنا تو مشکل لگتا ہے"

اور میں بھی جب سے رائے کوٹ پل پر اترا تھا ادھر دیکھتا تھا جدھر دو دن کی مسافت پر فیری میڈو ہے اور تین دن کی مسافت پر نانگا پربت کا بیس کیمپ ہے اور ڈرتا تھا کہ کل میں اس خوفناک اور آسمان کے اندر تک جاتے ہوئے پہاڑ پر کیسے چڑھوں گا ... کیبن سے ایک نوجوان پولیس والا باہر نکلا اور ہمارے پاس آ گیا۔ اس کے ہاتھوں میں چائے کی پیالیاں تھیں ... اس نے چائے ہمارے سامنے رکھی اور پھر کیبن میں جا کر دو تازہ روٹیاں لے آیا ...

" میرا نام امیر اعظم ہے صاحب ... یہ کھائیں ... آپ ہمارے مہمان ہیں ... روٹیاں سوکھی ہیں لیکن تازہ ہیں ..."

" بہت بہت شکریہ " میں اس کے حسن سلوک سے بے حد متاثر ہوا ... " لیکن ہم رات کا کھانا ساتھ لائے ہوئے ہیں ......"

" نہیں لائے ہوئے " مطیع چپکے سے بولا ... " وہ چپلی کباب اور نان وغیرہ مجھے

یاد نہیں رہے ... اب میں ان کرنل صاحب کو چھوڑ کر کیسے چلا جاتا ..."

وہاں اگر امیر اعظم نہ ہوتا تو ہمارے سفر کی پہلی رات ایک بھوکی رات ہوتی ... وہ ہمیں ان سیاحوں کے قصے سناتا رہا جو کبھی کبھار کسی بس یا ویگن سے اتر کر یہاں شب بسری کرتے ہیں اور اگلی صبح فیری میڈو کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں ... راولپنڈی کی جانب سے ایک بس آئی اور پل کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اس میں سے دو مسافر اترے۔ ایک چھوٹے قد کا باریش شخص تھا جو پگڑی باندھے ہوئے تھا اور ذرا اکڑ کر چلتا تھا اور دوسرا ایک بارہ تیرہ برس کے بچے کو اٹھائے ہوئے بس میں سے باہر آیا ... وہ ہماری طرف دیکھے بغیر دوسری طرف اس پتھریلے راستے پر چلنے لگے جو پہاڑ کی جانب جاتا تھا۔ تھوڑی دور جا کر وہ اپنا سامان درست کرنے کی غرض سے رکے اور انہوں نے ہماری طرف دیکھا۔ آپس میں کچھ گفتگو کی اور پھر پیچھے مڑ کر ہمارے پاس آئے اور بیٹھ گئے۔

" مسلمان " ؟ باریش شخص نے آتے ہی پہلا سوال کیا۔ میرے سر ہلانے پر اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور کہنے لگا "ہم مسلمان تم مسلمان ... تم ہمارا بھائی"

مطیع سے بھی یہی سوال پوچھا گیا اور پھر اسے بھی "ہم مسلمان تم مسلمان ... تم ہمارا بھائی"

اس نے اپنا نام مولوی عبدالرحمٰن بتایا۔ وہ فیری میڈو کے راستے میں پڑتے گاؤں تاتو کی مسجد کا امام تھا۔ کسی کام کی غرض سے چلاس گیا ہوا تھا اور اب گاؤں لوٹ رہا تھا ... اس کے ساتھی کا نام قدم خان تھا اور وہ اپنے بیمار بیٹے کے علاج کی خاطر چلاس کے ہسپتال تک گیا تھا اور اب اسے اٹھا کر گھر لے جا رہا تھا۔

"آپ کے پاس بوجھ ہے؟" مولوی صاحب نے پوچھا۔

"بوجھ ؟"

"ادھر سامان۔ تم ادھر فیری میڈو جاتا ہے تو ہم بوجھ اٹھاتا ہے ... ہم پورٹر ہے" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

" مولوی صاحب آپ کیسے پورٹر ہے آپ تو مولوی صاحب ہے " میں نے ہنس کر کہا۔

مولوی صاحب فوراً اٹھے اور ایک رک سیک با آسانی اٹھا کر شل کر اپنے پورٹر ہونے کا مظاہرہ کیا "یہ قدم خان ہے۔ یہ بھی پورٹر ہے۔ یہ بھی بوجھ اٹھائے گا"

"یہ بے چارا تو اپنے بیٹے کو اٹھائے گا..." میں نے قدم خان کو دیکھا۔ وہ ایک

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

ناخوش اور ناآسودہ کو ہستانی تھا۔ اس کے چہرے پر بیٹے کی بیماری کی تشویش تھی اور وہ بار بار اپنی داڑھی کرید تا تھا۔

"یہ بیٹا اٹھائے گا ۔۔۔" مولوی صاحب بولے "اور گدھا بوجھ اٹھائے گا"

"کون گدھا؟"

"ادھر سے آئے گا ۔۔۔" اس نے بلند پہاڑ کی جانب اشارہ کیا "ابھی آئے گا"

اور ابھی تاریکی گہری نہیں ہوئی تھی جب مولوی نے آنکھ میچ کر اس بلند پہاڑ کو دیکھا جسے کوہ پیمائی کی کتابوں میں بولڈر ریج کہا جاتا ہے اور میرا کندھا پکڑ کر کہنے لگا "ادھر پورٹر آتا ہے" پہلے تو مجھے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ پھر جیسے بلندی پر چیونٹیاں رینگ رہی ہوں۔ وہاں کچھ تھا۔۔۔

"وہاں کیا ہے؟"

"وہاں گدھا ہے اور پورٹر ہے۔ تاتو سے آتا ہے۔ ٹیم کو لینے"

اکرام نے ہمیں بتایا تھا کہ ایک آسٹرین ٹیم بھی فیری میڈو کے لئے رائے کوٹ پہنچنے والی تھی اور یہ پورٹر شاید اس کے پیغام کے نتیجے میں اس ٹیم کو لینے آ رہے تھے ۔۔۔ میں پہاڑ کو دیکھتا رہا' تاریکی گہری ہو رہی تھی اور وہ آہستہ آہستہ نیچے آ رہے تھے ۔۔۔ جب وہ ہم تک پہنچے تو امیر اعظم اپنی لالٹین جلا کر ہمارے درمیان رکھ رہا تھا اور ہم سب ایک دائرے میں بیٹھے تھے ۔۔۔ انہوں نے درجن بھر گدھوں کو کھلا چھوڑ دیا اور خود ہمارے دائرے میں شامل ہو گئے۔ وہ تقریباً پندرہ مزدور تھے جو تاتو سے ٹیم کو لینے آئے تھے ۔۔۔ اور ٹیم ابھی نہیں پہنچی تھی ۔۔۔ لالٹین کی روشنی میں میں نے سب کے چہروں کو غور سے دیکھا۔ ہر ایک' ایک الگ دنیا' ایک پورا جہان' ہر ایک کی امیدیں اور دکھ سکھ اور محبتیں ۔۔۔ اور زندگی کے بکھیڑے ۔۔۔ روزگار کے لئے وہ تاتو سے نیچے آئے تھے۔ وہ مسلسل ہم دونوں کو دیکھتے رہے اور ہم رائے کوٹ پل کے پہلو میں ایک تاریک رات میں بلند پہاڑوں کے خوف اور سندھ کے مسلسل شور میں لالٹین کی روشنی میں ۔۔۔ انہیں دیکھتے رہے۔ اور سوچتے تھے کہ قدرت کا یہ کیا کھیل ہے کہ وہ وہاں ہیں ہمارے سامنے' اور ہم یہاں ہیں ان کے سامنے ۔۔۔ وہ ہماری جگہ کیوں نہیں اور ہم ان کی جگہ کیوں نہیں ۔۔۔ یا شاید وہ ہماری جگہ ہیں اور ہم ان کی جگہ ہیں۔

رات خیمے میں گری تھی۔ کبھی کبھار گلگت یا راولپنڈی کی جانب سے کوئی ویگن یا بس وغیرہ آتی تو پل کے قریب آ کر اس کی رفتار کم ہو جاتی اور اس کی روشنی خیمے کے پردے پر لمحہ بھر کے لئے رونما ہوتی' ٹھہرتی اور دور ہو جاتی۔ پورٹروں کے گدھے پتھروں کے قریب کھڑے تھے۔ ان کی گردنوں میں بندھی گھنٹیاں خاموشی میں آواز دیتیں تو ایک عجیب خوف خیمے کے اندر آ جاتا جیسے باہر کوئی ہے ۔۔۔ میں کروٹیں بدلتا رہا۔ میری آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ رات کے کسی پہر میں خیمے سے باہر آ گیا ۔۔۔ سندھ کی گونج کے شور کے سوا ہر شے ٹھہری ہوئی تھی ۔۔۔ ہاں اسی ٹھہراؤ میں کبھی کبھی گدھوں کی گھنٹیاں دستک دیتیں ۔۔۔ میں پل پر چلا گیا۔ یہاں قدرے ٹھنڈک تھی۔ پل کے فٹ پاتھ پر تاتو سے آئے ہوئے پورٹر سو رہے تھے کیونکہ یہاں سندھ کی قربت تھی اور جنگلے کے نیچے سے ہوا آتی تھی۔ پل پر چینی شیروں کے چھوٹے چھوٹے مجسمے ننھی منی بلیوں کی طرح چپکے سے بیٹھے ہوئے تھے ۔۔۔ وہ پہاڑ بہت بلند اور بہت تاریک تھا جس پر ہمیں کل چڑھنا تھا۔ کل نہیں بلکہ آج۔ صبح ہونے والی تھی۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"اٹھو فیری میڈو چلو"

خیمے میں واپس جا کر میں ابھی لیٹا ہی تھا کہ مولوی رحمٰن کا باریش چہرہ خیمے کے پردے میں سے نمودار ہو گیا۔ "ہم مسلمان تم مسلمان .... تم ہمارا بھائی .... اٹھو فیری میڈو چلو"

میں نے مطیع کے سلیپنگ بیگ کو گرفت میں لے کر زور سے ہلایا "ہم مسلمان .... تم مسلمان .... تم ہمارا بھائی .... اٹھو فیری میڈو چلو"

مطیع نے کروٹ بدلی اور نیند میں بڑبڑایا "سیکوں ٹھنڈ لگ وسی ...."

میں نے خیمے میں سے سامان باہر نکالنا شروع کر دیا .... باہر ابھی نیم تاریکی تھی .... پولیس کیبن کے باہر امیر اعظم آگ جلائے بیٹھا تھا .... قدم خان کا باپ جو پچھلی شب دوسرے پورٹروں کے ہمراہ نیچے آیا تھا' اپنے گدھے کو تھپک کر دوسرے گدھوں سے الگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رحمٰن اپنے استرہ شدہ سر پر بار بار ایک چپت سی لگاتا تھا اور پھر جانے کیوں بلند آواز میں ایک لمبی "ہو" نکالتا تھا۔ اس قسم کی چوتھی یا پانچویں "ہو" پر مطیع آنکھیں ملتا ہوا خیمے سے باہر آگیا۔

"مطیع صاحب چلیں؟"

"بالکل چلیں چوہدری صاحب" وہ یکدم ہوشیار ہو گیا اور خیمہ کی میخیں اکھاڑ کر اسے سمیٹنے لگا۔

"پانی آگیا مولوی صاحب" میں نے رحمٰن سے دریافت کیا ....

"پانی آگیا؟ کیوں نہیں آگیا" رحمٰن بولا .... اور یہی اس کے بولنے کا انداز تھا کہ آپ جو کچھ پوچھیں گے اسے سوالیہ انداز میں دہرا کر خود ہی جواب مہیا کر دیتا ....

فیری میڈو تک ٹریکنگ کے بارے میں میں نے جتنی کتابیں پڑھی تھیں اور جن تجربہ کار ٹریکرز سے بات کی تھی سب نے یہی بتایا تھا کہ وہاں جانے کے لئے منہ اندھیرے اٹھ کر روانہ ہو جانا ازحد ضروری ہے بلکہ کئی کتابیں تو یہاں تک مشورے دیتی ہیں کہ بے شک ٹارچ کی روشنی میں چل دیں اور آدھی رات کو چل دیں .... صرف اس لئے کہ سورج نکلنے کے ساتھ ہی فیری میڈو کا پتھریلا راستہ جو "بولڈر رج" کہلاتا ہے' گرم ہوتا ہے اور پھر تپنے لگتا ہے۔ دس گیارہ بجے کے بعد وہاں چلنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ کیونکہ آس پاس صرف پتھر ہیں اور وہ گرم ہو کر پگھلنے کو آتے ہیں اور یاد رہے کہ پورے راستے میں چھاؤں بالکل نہیں.... فیری میڈو کے راستے میں ایک بھی درخت یا جھاڑی نہیں جس کے نیچے آپ سستا لیں.... اس کے علاوہ اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ رائے کوٹ پل سے روانہ ہوتے وقت آپ کے پاس پانی ہونا چاہئے .... یہ زندگی بچانے والا نکتہ ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ بہت عرصہ پیشتر کچھ ایسے ٹریکر جو ذرا لاپرواہ تھے "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ راستے میں پانی نہ ہو" یا "دیکھا جائے گا" قسم کے تھے' راستے میں ہی پیاس کی شدت سے جاں بحق ہو گئے .... یعنی فیری میڈو جانے والا راستہ کالاہاری صحرا کا چھوٹا بھائی تھا.... گلگت میں ہماری خریداری فہرست پر سب سے اوپر "پلاسٹک کا بڑا جیری کین" تھا....

رحمٰن اس جیری کین کو نیچے جا کر سندھ سے بھر لایا تھا.... اگرچہ رائے کوٹ پل کے نیچے سندھ کا جو پانی ہے وہ گدلا ہے اور بدذائقہ ہے لیکن بہرحال پانی ہے۔

"چائے صاحب".... امیر اعظم ہمارے لیے کوہستانی میزبان کے طور پر چائے لے کر آگیا.... اور ہمیں یاد دلایا کہ ناشتہ بھی کرنا ہے.... اور ہمارے پاس ناشتے کے لیے پنجاب بیکری گلگت سے خرید کردہ ایک ڈبل روٹی کے سوا اور کچھ نہ تھا اور اس کا کچومر نکل چکا تھا.... بہرحال چائے کے ساتھ اس کے ٹکڑے نگلنے کے بعد ہم دونوں پھر پیکنگ میں جت گئے.... تھوڑی دیر میں ہم دونوں رحمٰن اور گدھا چاروں تیار ہو چکے تھے....

"خاں صاحب چلیں؟"

مطیع الرحمٰن خاں نے اپنی چھڑی ایک پتھر پر رکھی اور بیگ میں سے ایک ماؤ کیپ نکال کر پہن لی "چلیں"

"مولوی صاحب چلیں؟"

"مولوی صاحب کیوں نہیں چلیں...."

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

مولوی نے میرا رک سیک اٹھایا جس کے سٹریپس کے ساتھ سلور کی ایک دیگچی اور پانی کی ایک چھوٹی بوتل لٹک رہی تھی... قدم خان کے گدھے پر مطیع صاحب کا سامان اور پانی کی سپلائی تھی... ہم سب نے بلند آواز میں بسم اللہ پڑھ کر اپنے سفر کا آغاز کر دیا۔

فیری میڈو تک پہنچنے کے لیے دو راستے ہیں... تاتو نالے کے ایک جانب پہاڑ پر بریگیڈیئر اسلم خان کی پکی سڑک زیر تعمیر ہے... راستے میں جہاں جہاں بڑے پتھر ہیں وہاں سے سڑک نہیں بن سکی اور پیدل چلنے والوں کو چند انتہائی خطرناک مقامات سے گزرنا پڑتا ہے جہاں' جہاں سے گزر جانے کے امکانات بھی قوی ہو جاتے ہیں... دوسرا پرانا راستہ ہے یعنی تاتو نالے کے دوسری جانب جو پہاڑی سلسلہ ہے اس کے اوپر... یہ راستہ انتہائی دشوار ہے' اور سورج نکلنے پر تنور بن جاتا ہے... ہمیں اکرام نے بتایا تھا کہ تاتو کا نمبردار شکور شاید اپنی جیپ آپ کے لیے رائے کوٹ پل پر بھیج دے گا اور آپ جہاں تک پکی سڑک ہے وہاں تک اس پر سوار ہو کر جا سکتے ہیں اور باقی راستہ پیدل طے کر لیجیے گا لیکن ایک تو جیپ کی شکل دکھائی نہ دی... شاید شکور کو پیغام نہیں ملا تھا... اور یوں بھی تاتو کے پورٹرز کا یہی خیال تھا کہ پرانا راستہ اگرچہ مشکل اور طویل ہے لیکن یہ سڑک کی نسبت اتنا خطرناک نہیں... چنانچہ ہم نے پرانے راستے کا چناؤ کیا۔

رائے کوٹ پل پر جگی چٹان کے پیچھے کہیں ہلکی سی سفیدی تھی... شنگریلا ہوٹل کے پہلو میں سے جو پتھریلا راستہ اوپر جا رہا تھا ہم اس پر چلنے لگے۔ سب سے آگے قدم خان کا باپ اور اس کا گدھا تھا اس کے پیچھے رحمٰن سر جھکائے چل رہا تھا اور پھر ہم دونوں تھے' جو اونچے اونچے پتھروں کی وجہ سے اور نیم تاریکی کے باعث کہیں کہیں ٹھوکر کھاتے تھے اور چلتے تھے... اس نیم تاریکی میں ہم نے تاتو نالے کا بوسیدہ اور لرزاں پل پار کیا... یہاں تاتو نالہ سندھ کے اندر ٹکر مار کرتا تھا اور شور کرتا اس میں گم ہوتا تھا۔ اور اس کے پانیوں سے گندھک کی گرم بو اٹھتی تھی۔ پل کے بعد ذرا چڑھائی شروع ہوئی... میں ہانپنے لگا... میری عادت ہے کہ میں اپنی برداشت سے تجاوز کی کوشش نہیں کرتا... اگر میں دس قدم کے بعد تھکاوٹ محسوس کرتا ہوں تو وہیں رک کر آرام کر لیتا ہوں... میرا مقصد ایک خاص مقام پر پہنچنا ہوتا ہے' چاہے میں ایک دن کا سفر دو دن میں مکمل کروں... اس چڑھائی کے بعد ایک میدان نما علاقہ آیا... اور یہاں پہنچنے تک سفیدی میں چیزیں واضح ہونے لگیں اور پتھر

اور راستے اور پگڈنڈیاں دکھائی دینے لگے... میں نے اپنے سامنے دیکھا تو بس منہ کھولے دیکھتا ہی رہ گیا... سامنے ایک ناقابل عبور قسم کا انتہائی غیردوستانہ پہاڑ جیسے آسمان تک چلا گیا تھا اور ذرا ترچھا ہو کر چلا گیا تھا...

"ہمیں وہاں جانا ہے؟" میں نے رحمٰن کو آواز دی۔

"ہمیں وہاں جانا ہے؟ کیوں نہیں جانا" وہ بولا "جدھر گدھا جاتا ہے ادھر جانا ہے"۔

اور گدھا کہاں ہے؟... اور یہ کمبخت گدھے کا بچہ کہاں ہے... میں نے اس نیم ضیالے عظیم تودے کو غور سے دیکھا جس کے ان گنت پتھروں میں اور ڈھلوانوں میں کہیں وہ گدھا نظر آنا چاہیے تھا لیکن نظر نہیں آ رہا تھا...

"مطیع گدھا کہاں ہے...؟"

وہ اپنی چھڑی کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا اور آنکھیں بھینچ کر بلندی کی جانب اس گدھے کو تلاش کرنے لگا جس پر اس کا سامان لدا تھا... دراصل پتھر کی وہ دنیا اتنی وسیع تھی کہ اس میں ایک گدھا آہستہ آہستہ بلندی کی جانب بڑھتا ہوا تلاش کرنا ایک ناممکن سا کام تھا... لیکن وہ یکدم نظر آ گیا... بلکہ اس پر لدے سرخ رک سیک کی سرخی نظر آ گئی... میں نے فوراً کیمرہ گلے سے اتار کر تصویر اتار لی... میرے پاس اس وقت جبکہ میں فیری میڈو کا سفرنامہ لکھ رہا ہوں وہ تصویر سامنے میز پر رکھی ہوئی ہے... ایک بلند ضیالے پہاڑ کی تصویر... ایک کونے میں رحمٰن دکھائی دیتا ہے لیکن... گدھا دکھائی نہیں دیتا... ہاں کبھی کبھار میں جب اس تصویر کو بہت غور سے دیکھتا ہوں تو وہ مل جاتا ہے... چنانچہ یہ تصویر "آؤ گدھا تلاش کریں" کہلاتی ہے...

ایک راستے کے نشان تھے جس پر ہم سورج طلوع ہونے سے پیشتر چلے تھے اور چڑھتے تھے... شہری زندگی اور آسائشوں کا عادی بدن تھکاوٹ اور پسینے سے کپکپا رہا تھا... اور پسینہ ایسے بہہ رہا تھا جیسے تیز دھوپ میں کوئی کچا گلیشیئر پگھلتا ہے... اور پیاس... سوکھتی زبان... اور میں نے اپنا پہلا پانی مانگا... "پانی"

"پانی؟" رحمان رک گیا "کیوں نہیں پانی" اس نے جیری کین میں سے تام چینی کے مگ میں پانی انڈیلا اور مجھے دے دیا۔ سندھ کا گدلا اور بدذائقہ پانی کسی معجزے کے اثر سے دنیا کا شیریں ترین پانی بن چکا تھا...

"مولوی صاحب... یہ جو پہاڑ ہے تو جب ہم اس کی چوٹی پر پہنچیں گے تو ادھر سے نانگا پربت نظر آئے گا؟..."

"ہاں کیوں نہیں آئے گا..." اس کی نگاہیں میری گھڑی پر جم گئیں "یہ گھڑی

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

کتنے کی خریدی تھی؟"

"پتہ نہیں..." میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"بیچو گے؟ سو روپیہ دوں گا..."

رحمٰن اس ٹریک کے دوران میری مختلف چیزوں کی قیمتیں پوچھ کر انہیں خریدنے کی کوشش کرتا رہا...

مطیع اپنی چھڑی گھماتا آگے آگے چل رہا تھا... "کیوں جی تارڑ صاحب رہ گئے ہو؟" وہ بار بار مجھے چھیڑتا اور میں جواب نہ دیتا کیونکہ اگر میں جواب دیتا تو ہانپتا کس منہ سے؟ میں نے اپنے آپ کو ایک بڑے پتھر سے سہارا دیا اور پیچھے دیکھا... نیچے اور دور دور تک پوری لینڈ سکیپ سلیٹی رنگ کی تھی' ہم خاصی بلندی پر سے قراقرم کا مشاہدہ کر رہے تھے اور اس بلندیوں کی خاموش دنیا میں دریائے سندھ کے پانی سفید لاوے کی طرح خاموشی سے بہہ رہے تھے۔ چٹانوں اور سلیٹی پہاڑوں کو کاٹ کر پھیلتے ہوئے' بہتے ہوئے... اور ان کے اوپر ایک لکیر تھی جو ظاہر ہے شاہراہ قراقرم ہی ہو سکتی تھی... سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔

ایک خاص بلندی پر پہنچ کر راستے کی واضح علامات معدوم ہو گئیں اور ہم چھڑیوں کے سہارے بڑے بڑے پتھروں کو عبور کرتے ہوئے ان سے اپنے گھٹنے بچاتے ہوئے چلنے لگے... یہاں ہم ان لاتعداد گدھوں کے شکرگزار ہوئے جو اس راستے پر چلے اور مسافت کے دوران اپنی دمیں اٹھا کر فراغت حاصل کرتے رہے اور یوں جانے والے اپنے نشان چھوڑ گئے... اور ان نشانوں کی مدد سے ہی ہم راستہ تلاش کرتے تھے... اور پھر ہم یکدم روشنی میں آ گئے... سورج ہم تک نہیں بلکہ ہم سورج تک آ گئے تھے۔ نیچے دریائے سندھ اور رائے کوٹ پل ابھی اسی نیم تاریکی میں تھے جس میں ہم انہیں چھوڑ کر آئے تھے۔

"پانی" مطیع نے دہائی دی۔

"پانی؟ کیوں نہیں پانی..." رحمٰن فوراً رک گیا۔

مطیع نے چند گھونٹ پانی پیا اور بقیہ سر پر انڈیل لیا "مولوی صاحب ہم دو تین گھنٹے میں تاتو پہنچ جائیں گے؟"۔

"دو تین گھنٹے میں تاتو پہنچ جائیں گے؟ کیوں نہیں پہنچ جائیں گے" مولوی رحمٰن سر ہلا کر بولا...

"اگر ہم دو تین گھنٹے میں تاتو پہنچ جاتے ہیں تو آج ہی فیری میڈو کے لیے روانہ ہو جائیں گے..." مطیع کہنے لگا۔

"پہلے تاتو تو پہنچ لیں..."

"تاتو تو پہنچ گئے..." رحمٰن نے جیری کین اٹھاتے ہوئے ہمیں نوید دی "اس پہاڑ کے دوسری طرف تاتو ہے..."

ہم نے خاصی دیر چلنے اور چڑھنے کے بعد جب بھی مڑ کر دیکھا... وہاں رائے کوٹ کا پل اور دریائے سندھ نظر آتا تھا صرف ان کا سائز چھوٹا ہوتا جاتا تھا اور ہم ان دونوں سے بے حد بیزار ہوئے کیونکہ جانتے تھے کہ یہ ہمارے سفر کے آغاز کی علامتیں ہیں اور جب یہ نظروں سے اوجھل ہوں گی تب دوسری جانب منزل دکھائی دینے کی آس بندھے گی... ویسے یہ ایک شاندار منظر تھا جو صرف ہم جیسے جیالوں اور گدھوں کی قسمت میں ہی لکھا تھا... اس بلندی سے اب شاہراہ ریشم فاصلے کا شکار ہو کر چٹانوں کا ایک حصہ بن چکی تھی اور مشکل سے ہی نظر آتی تھی...

دھوپ میں تیزی کے آثار تیزی سے نمایاں ہونے لگے... اس میں چبھن تھی... نیچے سندھ کے دائیں جانب بلندی پر ایک وسیع میدان تھا جس میں ایک پرپیچ راستہ دور تک جاتا تھا اور یہ استور روڈ تھی... ویسے ہم خوش قسمت تھے کہ آج آسمان بالکل خالی نہ تھا بلکہ کہیں کہیں ہلکے ہلکے بادل تھے... راستہ زیادہ خطرناک تو نہیں تھا لیکن احتیاط سے چلنا پڑتا تھا... ایک پتھر کے ساتھ لگ کر ذرا سستانے لگا تو پیچھے دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی' رائے کوٹ پل نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا... یہاں سے ایک راستہ مٹھاٹھ کے گاؤں کو جاتا تھا... ہم پھر چلنے لگے... لیکن اب ہماری حالت بہت دگرگوں ہو چکی تھی۔ کم از کم میں بے حد تھک چکا تھا۔ میرے گھٹنے بے جان ہو چکے تھے' آنکھیں کھلتی نہ تھیں اور ٹانگیں اٹھتی نہ تھیں تب مطیع نے پھر شیطانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا "تارڑ صاحب بوڑھے ہو گئے ہو..."

"ہاں..." میں نے سر ہلایا۔

"رہ گئے ہو؟"

"نہیں..." میں نے بمشکل اپنے غصے پر قابو پایا "لیکن میں پہاڑوں کے ساتھ مقابلہ کرنے نہیں آیا... میں نے فیری میڈو پہنچنا ہے اور میں انشاء اللہ پہنچ جاؤں گا... چاہے تم سے دو گھنٹے بعد پہنچوں..."

"میں آہستہ چلتا ہوں..." اس نے پیشکش کی۔

"نہیں تم اپنی چال چلو میں اپنے چال چلتا ہوں..."

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

اور بالآخر ہم اس وسیع چٹانی سلسلے کی آخری بلندی تک پہنچ گئے۔۔۔ یہاں مکمل ویرانی تھی' سوائے دھیرے دھیرے گرم ہوتے ہوئے پتھروں' گدھوں کے نشانوں اور تیزی سے اس پتھر سے نکل کر دوسرے پتھر میں پوشیدہ ہوتے ہوئے گرگٹوں اور کرلوں کے اور کچھ نہ تھا۔۔۔ ہاں بلندی تو تھی۔

"تاتو کہاں ہے" مطیع نے پوچھا۔

"تاتو کہاں ہے یہ ادھر ہے۔۔۔" رحمٰن نے ایک چھوٹے سے راستے کی طرف اشارہ کیا۔۔۔ "ادھر تاتو ہے"

ہمارے دائیں جانب نیچے تاتو نالہ تھا جسے ہم عبور کر کے آئے تھے اور جو یہاں سے دکھائی نہ دیتا تھا۔ اور نالے کے پار دوسرے پہاڑ پر بریگیڈیئر اسلم خان کی پکی سڑک دکھائی دیتی تھی۔ اور وہ خطرناک مقام بھی دکھائی دیتے تھے جہاں پہنچ کر سڑک اختتام پذیر ہو جاتی تھی کیونکہ راستے میں اتنا بڑا پتھر ہوتا تھا کہ اسے ہٹانا یا بارود سے توڑنا بھی آسان نہ تھا۔۔۔ انہی مقامات پر سے مسافر حضرات سڑک چھوڑ کر نیچے اترتے تھے اور تاتو نالے میں گرنے کا خطرہ مول لیتے تھے۔۔۔ سڑک پر کہیں کہیں کام ہو رہا تھا۔ اور دو تین مرتبہ بارود کے زوردار دھماکے بھی پہاڑوں میں دیر تک اپنی آواز برقرار رکھے گونجتے رہے۔۔۔

پتھر اب اتنے گرم ہو چکے تھے کہ ہم ان کا سہارا لینے کے لیے ہاتھ رکھتے تو انگلیاں تپش سے جل اٹھتیں۔۔۔ آنکھوں میں پسینہ اور اس آبی پردے کے پار پہاڑ اور سورج اور پتھروں میں چمکتا ابرک۔۔۔ کچھ ایسے پتھر تھے جن پر تیل اور چکناہٹ کے آثار تھے اور یہ تیل بھی دھوپ میں گرم ہو رہا تھا۔ ہماری واٹر سپلائی بھی تیزی سے کم ہو رہی تھی اور جو پانی رہ گیا تھا وہ بے حد گرم ہو چکا تھا اور اس میں پلاسٹک کی بو تھی۔۔۔ ہمیں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ فاصلے اور وقت کے بارے میں ہم رحمٰن کا اعتبار نہیں کر سکتے۔۔۔ اس کے لیے تاتو۔۔۔ "وہ ادھر ہے" تھا اور تاتو ہمیں نظر نہیں آتا تھا۔۔۔ اس راستے کی ویرانی مثالی تھی۔ ہم نے سارے دن کے سفر کے دوران اس ٹریک پر کسی ذی روح کو نہ دیکھا۔۔۔ اور ہریالی کا ایک پتہ تک نہ دیکھا۔۔۔ بعض مقامات پر ہم قدم خان کے گدھے کی چھاؤں میں بیٹھ کر آرام کرتے۔۔۔ اوپر چھدرے بادلوں میں سے ایک شناسا آواز آئی۔۔۔ ہم خشک لبوں پر زبانیں پھیرتے اور پسینہ پونچھتے اوپر دیکھنے لگے۔۔۔ پی آئی اے کا فوکر فرینڈ شپ طیارہ اسلام آباد سے گلگت جا رہا تھا۔۔۔ ہم اس جہاز کو منہ کھولے ہانپتے ہوئے اتنے اشتیاق سے دیکھنے لگے جیسے یہ ابھی بولڈر رج کے ان دہکتے ہوئے پتھروں پر لینڈ کرے گا اور ہمیں اس عذاب سے دور لے جائے گا۔۔۔

"مجھے یقین ہے کہ اس لمحہ پائلٹ بڑے شستہ لہجے میں اعلان کر رہا ہو گا کہ خواتین و حضرات ہم اس وقت نانگا پربت کی وادی کے اوپر سے گزر رہے ہیں ذرا نیچے دائیں دیکھیے ' دریائے سندھ کے ساتھ جو چٹانی سلسلہ ہے۔۔۔ اس کی بلندی پر۔۔۔ اوہو یہ کون بے وقوف کھڑے ہیں۔۔۔"

مطیع ہنسنے لگا۔۔۔ "ویسے میں جہاز میں سوار مسافروں کو بتانا چاہتا ہوں کہ خدا کے لیے کوئی بھی ادھر کو نہ آئے۔۔۔ فیری میڈو کی جانب رخ نہ کرے۔۔۔"

"تو بتا دو۔۔۔" میں نے پسینے سے نچڑتے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

"اوئے بھائی مسافرو۔۔۔" مطیع بیچ بیچ منہ پر ہاتھ رکھ کر گلگت کی جانب رینگتے جہاز کو مخاطب کرتے ہوئے چیخنے لگا "پائلٹ کی باتوں کا اعتبار نہ کرنا۔۔۔ دل دیتا ہے رو رو دہائی کوئی کسی سے پیار نہ کرے اور کوئی تارڑ صاحب کی باتوں میں نہ آئے۔۔۔ اوئے لوگو میں مارا گیا میں لوٹا گیا۔۔۔ فیری میڈو دیکھنے کے چاؤ میں میرا کچومر نکل گیا۔۔۔"

رحمٰن جو ذرا آگے جا چکا تھا مطیع کی چیخ و پکار سن کر واپس آ گیا۔۔۔

"یہ پاگل ہو گیا ہے" میں نے کہا۔

"یہ پاگل ہو گیا ہے؟ اچھا یہ پاگل ہو گیا ہے" رحمٰن حیران بھی ہوا اور میں نے نوٹ کیا کہ اس کے بعد وہ مطیع سے ذرا ایک محفوظ فاصلے پر رہنے لگا۔۔۔

جہاز نظروں سے اوجھل ہوا تو ہم پھر نارمل ہو گئے اور چلنے لگے۔

"ویسے تارڑ صاحب ایک بات بتائیں اور سچ سچ بتائیں۔۔۔"

"جو کہوں گا سچ کہوں گا۔۔۔"

"میرے والد صاحب سے آپ نے مسجد میں دینی تعلیم حاصل کی تو کیا وہ آپ کی پٹائی کیا کرتے تھے ' آپ پر ظلم و ستم کے پہاڑ وغیرہ ڈھاتے تھے۔۔۔"

میں چونک گیا۔ اسے کیسے معلوم ہوا کہ اللہ بخشے مولوی صاحب مجھے بے دریغ زدو کوب کیا کرتے تھے۔ "نہیں بالکل نہیں۔۔۔ بس کبھی کبھار ترنگ میں ہوتے تھے تو دس بیس تھپڑ لگا دیا کرتے تھے لیکن تم کیوں پوچھتے ہو؟"

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"مجھے کافی دیر سے ایک عجیب و غریب خیال تنگ کر رہا ہے... کہ آپ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مجھے یہاں لائے ہیں تاکہ آپ ان پھینٹیوں کا بدلہ لے سکیں جو آج سے چالیس برس پیشتر قبلہ والد صاحب نے آپ کو لگائی تھیں... ورنہ کسی بھی شریف آدمی کو ایسی جگہ لانے کا کوئی جواز نہیں بنتا..." اور مطیع صاحب یہ گفتگو بڑی سنجیدگی سے کر رہے تھے... لگتا تھا کہ تھکاوٹ اس پر بھی اثرانداز ہو رہی ہے۔ اس کی چلبلاہٹ میں کمی واقع ہو چکی تھی اور اس نے کافی دیر سے "تارڑ صاحب رہ گئے ہو؟" کا نعرہ بھی نہیں لگایا تھا... ہم سائے کے لیے پتھروں کے ساتھ ہو کر چلتے تو ان میں سے خارج ہونے والی تپش بے حال کرتی تھی... میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ فیئری میڈو جانے والا یہ راستہ اتنا تکلیف دہ اور جان لیوا ہو گا... ایک فرانسیسی سیاح نے اس کے بارے میں درست کہا تھا کہ یہ راستہ نہیں قتل ہے...

"اوئے رحمٰن تاتو کہاں ہے؟..." مطیع بار بار پوچھتا اور وہ "تاتو کہاں ہے؟ تاتو ادھر ہے" کہہ کر چلتا جاتا...

دوپہر کے کھانے کے لیے ہم ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ گئے... بلکہ ڈھیر ہو گئے... اور دوپہر کے کھانے کے لیے ہمارے پاس ایک کیک کے چند ٹکڑے اور جوس کا ایک ڈبہ تھا... ہماری منصوبہ بندی کے تحت ہمیں دوپہر کے کھانے کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ ہم نے دوپہر کو تاتو پہنچ جانا تھا... اور ہم کہیں بھی نہیں پہنچے تھے... تاتو نالے سے گندھک کی بو باقاعدگی سے آ رہی تھی۔ یہ راستہ جو پہاڑی کے ساتھ بل کھاتا' اٹھتا بیٹھتا چلتا جاتا تھا بس چلتا ہی جاتا تھا۔ اس پر ایک گدھا اور ایک سیاح آگے پیچھے تو چل سکتے تھے البتہ شانہ بہ شانہ چلنے سے دونوں میں سے کوئی ایک' جو نالے اور کھائی کی جانب چلتا ہو' نالے اور کھائی میں بآسانی پہنچ سکتا تھا۔ میری نظریں چند قدم دور راستے کے اس حصے پر تھیں جو بالکل ایک سیڑھی کی طرح اوپر جا رہا تھا اور دوسری جانب سے دکھائی ہی نہیں دیتا تھا... ہمارا لنچ بے حد گرم تھا... جوس نے چائے کا مزا دیا... رحمٰن نے وعدہ کیا تھا کہ یہاں کچھ فاصلے پر ایک پتھر میں بارش کا پانی جمع ہوتا رہتا ہے اور اگر کسی گدھے نے اسے پی نہ لیا ہو تو وہ اسے ہمارے پینے کے لیے لے آئے گا اور یہ پانی بے حد خنک اور شیریں ہو گا... ہمارا پانی یعنی جیری کین کا پانی' تقریباً ابلنے کو تھا اور اس میں پلاسٹک کی بو اب ناقابل برداشت

ہو رہی تھی...

"تارڑ صاحب آپ کیوں اچھی بھلی زندگی چھوڑ کر اس قسم کی جگہوں پر آتے ہیں اور ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی خوار کرتے ہیں؟..." مطیع پسینہ پونچھتے ہوئے کہنے لگا "آج کا تجربہ کیسا ہے؟"

"بہت ہی ہولناک... میرے لیے یہ ٹریک اتنا دشوار ہے' اتنا قاتل ہے کہ... میں دوبارہ تو نہیں آؤں گا..."

"اور اگر فیئری میڈو بہت ہی خوبصورت نکلا پھر بھی نہیں آئیں گے..."

"یہ ممکن نہیں کہ کوئی بھی جگہ اتنی خوبصورت ہو کہ اس کے لیے اس قسم کی خوفناک مسافت طے کی جائے... فیئری میڈو کتنا خوبصورت ہو سکتا ہے..."

ایک ہی مقام پر زیادہ دیر بیٹھنے سے ہمارے بدن ذرا نارمل ہو گئے اور تھکاوٹ ٹھنڈی ہو کر زیادہ دکھ دینے لگی۔

"مولوی صاحب تاتو کتنا دور ہے؟" مطیع نے کپڑے جھاڑتے ہوئے پوچھا۔

"ہم مسلمان... تم مسلمان... تم ہمارا بھائی... تاتو ادھر ہے" رحمٰن نہایت خشوع و خضوع سے بولا...

"بہت بہت شکریہ" ہم دونوں نے جھک کہا اور پھر چلنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہم جیسے کسی دوسرے سیارے میں کسی دوسرے وقت میں سفر کرتے تھے جہاں ہمارے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ ایک وسیع ویرانی' پہاڑی کے ساتھ چپکا ہوا خشک تپتا ہوا راستہ اوپر ہی اوپر... گرگٹ... تاتو نالے کی گندھک کی بو... راستے پر پڑی ہوئی مینگنیاں... اور ہمارا پسینہ بدن پر چلتا ہوا اور رینگتا ہوا... رحمٰن ہم سے چند قدم کے فاصلے پر جا کر رک گیا اور ہمیں آگے آنے کا اشارہ کرنے لگا۔ ہم بمشکل تمام اس کے پاس آئے تو کہنے لگا "ادھر نانگا پربت"

ادھر نانگا پربت تھی... ہم نے اسے بیزاری اور کچھ نفرت سے دیکھا... ٹھیک ہے' ہو گی نانگا پربت' ہم کیا کریں... البتہ اس کی قربت میں کچھ ہریالی سی نظر آئی... لیکن وہ بہت دور تھی...

"ادھر تاتو..." رحمٰن کہنے لگا... "ادھر"

"ہو گا..." میں نے اکتا کر کہا "جب وہاں پہنچیں گے تو پھر کہنا کہ ادھر تاتو..."

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

یہیں کہیں وہ چشمہ تھا جس میں پانی جمع ہو رہا تھا... قطرہ قطرہ... رحمٰن اپنی پشت سے سامان اتار کر اوپر گیا اور آدھا مگ پانی لے آیا "بس اتنا ہے"

اور پانی واقعی ہمارے جیری کین کی نسبت ٹھنڈا تھا۔

اب ہماری آنکھوں میں بھی تھکاوٹ اور اس سے ٹوٹ کر گرنے والا لمحہ تھا... اسی لیے میں صرف سامنے دیکھتا تھا' راستے کی جانب اور قدم اٹھاتا جاتا تھا اور اگر قدموں کی جانب دیکھتا تو یقیناً میرے قدم وہیں ڈھیر ہو جاتے... مکھیاں میرے چہرے پر جھنجھنانے لگیں... اور ان مکھیوں کی جھنجھناہٹ میرے لیے موسیقی سے کم نہ تھی کیونکہ یہ ظاہر کرتی تھی کہ ہم کسی ایسی جگہ کے قریب ہو رہے ہیں جہاں زندگی ہے... ناتگا پربت کی قربت کی ہریاول کا ٹکڑا ذرا بڑا ہوتا دکھائی دیتا تھا... یہاں ہم اس پہاڑی راستے کے چنگل سے آزاد ہوئے... آگے نسبتاً ہموار قسم کی جگہ تھی... اور ہم نے کتنے زمانوں سے یہ دونوں چیزیں نہیں دیکھی تھیں... رحمٰن کا کہنا تھا کہ اب ہم ناتو میں تھے... سامنے سے ایک چھوٹا سا بچہ گدھے پر سوار ناک پونچھتا ہوا آ رہا تھا... اس گدھے کو اور بچے کو دیکھ کر رحمٰن بے حد خوش ہوا کیونکہ یہ دونوں اسی کے تھے۔ مولوی صاحب کی بیگم نے اس کے لیے اپنے آٹھ بچوں میں سے ایک کے ہاتھ کھانا بھیجا تھا... رحمٰن نے چلتے چلتے دسترخوان میں جو کچھ بھی لپیٹا تھا وہ نگلا اور پھر کہنے لگا تم آؤ میں پہنچ کر تمہارے لیے بندوبست کرتا ہوں۔ کیونکہ ہم مسلمان تم مسلمان... میں اور مطیع اب برے حالوں میں تھے۔ ہمیں تو دور دور تک کسی گاؤں کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ بس یہ سہولت تھی کہ چڑھائی ختم ہو چکی تھی... تھکاوٹ کا یہ حال تھا کہ ہماری چھڑیاں بھی زمین پر ٹیکنے سے ٹانگوں کی طرح لرزتی تھیں۔ مطیع نے خشک گھاس کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کے پاس پہنچ کر آس پاس دیکھا اور چھڑی پھینک کر لیٹ گیا "میں آرام کرنا چاہتا ہوں"

میں تو بہانہ تلاش کر رہا تھا۔ میں بھی بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب میں نے مطیع کو اٹھانے کے لیے کندھے سے ہلایا تو وہ تقریباً نیند میں تھا "میں سونا چاہتا ہوں" وہ بڑبڑایا۔

"اٹھو یار..." میں نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں..." وہ غصے سے بولا "مجھے چھوڑ دو... میں اب نہیں اٹھ سکتا... میں آرام کرنا چاہتا ہوں' میں سونا چاہتا ہوں"

"اٹھو یار ناتو اب آنے والا ہے..."

"نہیں نہیں..." وہ نیند میں ڈوبتا ہوا بولا "ناتو کبھی نہیں آئے گا..."

اس کے چہرے پر بچوں جیسا اطمینان تھا' گھاس کا ایک تنکا اس کے نتھنوں میں جاتا تو وہ سر جھٹک کر بڑبڑاتا... میں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا کہ شاید وہ اٹھ کر بیٹھ جائے لیکن وہ مزے میں تھا اور اس کی نیند گہری ہو رہی تھی... یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ میں اسے وہاں سوتا ہوا چھوڑ کر آگے نکل جاتا... پتہ نہیں کیسا ویرانہ تھا' کیسا علاقہ تھا اور یہاں کیسے کیسے جانور رات کو گھومتے تھے۔ میں نے اس کے دونوں شانے پکڑ کر جھنجوڑا تو وہ سر جھٹک کر بڑبڑانے لگا "نہیں جاؤں گا... تم چلے جاؤ..."

"مطیع..." میں نے اس کے رخساروں کو ذرا شدت سے تھپکا... پھر کندھوں سے جھنکا... خاصی مشقت کے بعد وہ بیدار ہوا اور بڑی منت سماجت کے بعد وہ چلنے پر راضی ہوا... لیکن اب وہ تروتازہ ہو چکا تھا... ہموار علاقہ ختم ہونے پر کچھ کھیت دکھائی دیئے اور ہم نیچے اترنے لگے... کھیتوں کے ساتھ ایک تنگ درہ نما علاقے میں چند گھر تھے مٹیالے اور ہموار چھتوں والے... گندھک کی بو بھی قریب آ گئی' یہی ناتو تھا۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"ناتو کے گرم چشمے"

کھیتوں کے درمیان میں ناتو کے گندھک کے چشمے کا تقریباً ابلتا ہوا پانی ایک نالی میں بہہ رہا تھا اور اس پر بھاپ اٹھتی تھی... اسی گرم پانی کی مناسبت سے گاؤں کو ناتو کہا گیا... اور یہی پانی جب نانگا پربت کے رائے کوٹ گلیشیئر سے آنے والے نالے میں شامل ہوتا ہے تو نیچے رائے کوٹ پل تک اس میں گندھک کی بو شامل ہو جاتی ہے...

"یہ گرم ہے..." مطیع نالی کے کنارے بیٹھ گیا۔

"یہ بہت گرم ہے"

"اتنا بھی کیا گرم ہو گا..." اس نے پانی میں انگلی ڈالی اور "ہائے اوئے" کہہ کر کھینچ لی "گرم ہے بھئی"

کھیتوں کی مینڈھوں پر چند بچے ہمیں دور سے آتا دیکھ رہے تھے... یہ بچے خیالات کی پرواز سے آگے تک غلیظ تھے اور ان کے ناک بھرے ہوئے تھے...

گاؤں کا پہلا گھر رحمٰن کا تھا... گھر کی کچی چھت اس پگڈنڈی کی سطح پر تھی جس پر ہم آ رہے تھے۔ چھت پر ایک پرانی دری اور ایک چارپائی ہماری منتظر تھی... شہتوت کا ایک بڑا درخت اس پر جھکا ہوا تھا... رحمٰن ہماری حالت دیکھ کر ہنس رہا تھا اور کہہ رہا تھا آؤ آؤ تم مسلمان... ہم مسلمان... تھکاوٹ تو تھی لیکن اس کے ساتھ میرا دل بیٹھنے لگا... اس گاؤں میں اور اس کے آس پاس بھی ایک وحشت سی تھی' ایک اجاڑ پن اور اس سے آگے کچھ نہیں ہے' والی کیفیت... روکھے سوکھے گھر اور بے آباد چہرے... یہ ہم کہاں آ گئے ہیں... ہمیشہ جب راستے ویران اور مشکل تھے' تب ان کے آخر میں کوئی بستی ایسی آ جاتی تھی جو ساری تھکاوٹ اور مسافت کی اداسی دور کر دیتی تھی۔ لیکن یہاں تو کیفیت کچھ اور تھی۔

رحمٰن چارپائی پر بیٹھا گاؤں والوں کی جانب فاتحانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا کیونکہ ہم اس کے مہمان تھے۔ اس سفر کے دوران وہ بار بار ہمیں اپنی نسلی برتری کے بارے میں معلومات فراہم کرتا رہا... "میں کوہستانی نہیں..." وہ سینہ ٹھونک کر کہتا "میں پختون ہوں اور ادھر روزگار کے لیے آیا ہوں... یہ تو جنگلی لوگ ہیں..."

آپ چائے پیو گے یا لسّی؟" اس نے پوچھا...

"لسّی ؟" میری آنکھیں کھل گئیں... میرے خشک گلے میں اور زبان کی کڑواہٹ پر لسّی کا لفظ ایک ٹھنڈی آبشار کی طرح گرا "کیا واقعی ؟"

اس نے کچے از پچکان کو کچھ کہا اور وہ بچہ سیڑھیاں اتر کر صحن میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بچہ آیا تو اس نے ڈالڈا کا ایک ٹین اٹھا رکھا تھا... "پیو پیو" رحمٰن نے وہ ٹین دونوں ہاتھوں سے تھام کر میرے آگے کر دیا... یہ دراصل لسّی نہیں بلکہ دہی تھا... لیکن یہاں یہ لسّی تھی کیونکہ شمالی علاقوں میں دہی کو لسّی پکارا جاتا ہے... ڈالڈے کا ٹین اسی لسّی سے لبریز تھا اور اسے پینے میں صرف یہ قباحت تھی کہ اس کی سفید سطح پر چند مکھیاں مردہ حالت میں تیرتی ہوئی تھیں..... میں نے جب لسّی پر جھک کر اسے کچھ دیر کے لیے غور سے دیکھا تو رحمٰن جان گیا کہ کیا مسئلہ ہے اور اس نے فوراً اپنی چھوٹی انگلی سے ان کو چن چن کر نکالا اور پھینک دیا..... مجھے معلوم تھا کہ یہ صرف سطحی عمل ہے اور لسّی کے اندر بھی اس قسم کے ذخائر موجود ہوں گے لیکن... میں پیاسا تھا..... میں نے آنکھیں بند کر کے دل میں بسم اللہ پڑھی اور ٹین کو لبوں سے لگا لیا... یقین کیجئے میں نے لاہور کے رائل پارک یا گوالمنڈی میں بھی اتنی شیریں' اتنی زندگی بخش لسّی نہیں پی تھی... اس لسّی نے میرے تھکاوٹ کو ختم کر دیا اور سفر کے دوران جو سر درد شروع ہوا تھا اس کا خاتمہ کر دیا... چند بچے تام چینی کی ایک تھالی میں شہتوت سجا کر لے آئے جو ہم نے رغبت سے کھائے۔ پھر رحمٰن کا بچہ ساگ سے بھری ہوئی ایک پلیٹ اٹھائے نیچے سے آیا... اس کے ساتھ روٹی بھی تھی لیکن نہ ہم یہ ساگ کھا سکتے تھے اور نہ ہی یہ روٹی... ساگ میں پانی تھا اور صرف ابلا ہوا تھا اور روٹی شاید باجرے کی تھی اور ہم بھوک کے باوجود بھی اسے نہ نگل سکے۔

تنگ درے کی جانب سے ایک شخص تیزی سے چلتا ہوا آ رہا تھا اور اس کے پیچھے اس کا ایک ملازم اس کے قریب پہنچنے کی کوشش میں ہانپتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ یہ شخص بریگیڈیئر اسلم کا منشی تھا جو کسی جنگل کی خریداری کے سلسلے میں اوپر گیا ہوا تھا۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"خیمہ لگانے کے لیے کون سی جگہ مناسب رہے گی؟" میں نے رحمٰن سے پوچھا۔

"کون سی جگہ؟... جگہ کیوں نہیں۔ ادھر سکول کے سامنے نالے کے ساتھ..."

تو پھر چلیں... میں بے حد تھکا ہوا ہوں..."

گاؤں کے کھیت یہاں پہنچ کر ختم ہو جاتے تھے۔ یہاں صرف اتنی جگہ تھی کہ ناتو نالہ اوپر سے نیچے آئے اور اس کے سامنے پرائمری سکول کی عمارت ہو اور تھوڑی سی کھلی جگہ ہو... اس کے سوا دونوں جانب پہاڑ آپ پر تنگ ہوتے تھے... رحمٰن اور قدم خان کے والد نے مل کر خیمہ لگایا... اور صبح سویرے واپس آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے... شام ہو رہی تھی... یہاں ناتو نالے کا شور نہ تھا صرف ہلکی سی آواز تھی... مطیع خیمے میں لیٹ گیا اور میں ایک پتھر پر بیٹھ کر ڈائری لکھنے لگا... ایک تنگ درہ نما جگہ میں جہاں گھٹن کا احساس ہوتا تھا... جہاں سے ہم آئے تھے ادھر راکاپوشی کی چوٹی نظر آتی تھی جو یہاں سے سینکڑوں میل دور تھی اور جدھر ہم نے جانا تھا ادھر درے کے ناکے پر نانگا پربت کا ایک حصہ نمایاں ہو رہا تھا... اور ہم ان دو عظیم چوٹیوں کے درمیان ایک ویران گاؤں میں خیمہ زن تھے اور شام ہو رہی تھی...

ابھی اندھیرا مکمل نہیں ہوا تھا جب رحمٰن ایک لالٹین اٹھائے چلا آتا تھا... ہم مسلمان... تم مسلمان... تم ہمارا بھائی... تمہارے لیے لالٹین... اس کے ہمراہ گاؤں کے دیگر معززین بھی تھے جو ہم سے ملنے کے لیے آئے تھے... جیسے پنجاب کے دیہات میں کھانے کے بعد رات کے وقت دوستوں اور بزرگوں کی بیٹھک ہوتی ہے۔ ان میں فریدوں خان بھی تھا جو گاؤں کے نمبردار شکور کا بھائی تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ اس کے بھائی کو اگرچہ اکرام بیگ کا پیغام مل گیا تھا لیکن وہ رائے کوٹ پل پر جیپ لے کر اس لیے نہ آسکا کہ شاہراہ ریشم پر ایک ٹرک انڈس میں گر گیا تھا اور وہ مرنے والوں کی لاشیں جیپ میں ڈال کر چلاس چھوڑنے گیا تھا... یہاں ممتاز خان بھی آیا اور ہمارے لیے چند انڈے تحفے کے طور پر لایا... لالٹین درمیان میں رکھی ہوئی تھی اور ہم سب حلقہ بنائے اس کے گرد بیٹھے ہوئے تھے...

دو سائے درّے کے اندھیرے میں سے الگ ہوئے' ہمارے قریب آئے اور لالٹین کی روشنی کی زد میں آئے تو وہ نوجوان چہرے تھے اور وہ بھی ہمارے قریب بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک اکبر حسین تھا جو کراچی کے کسی کالج میں بی اے میں پڑھتا تھا

اور گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے ناتو آیا تھا... اس لئے کہ ناتو اس کا گھر تھا ورنہ کراچی چھوڑ کر ناتو میں گرمیوں کی چھٹیاں کون گزارتا ہے... دوسرا خوشحال خان تھا جو خنک نہ تھا رائے کوٹی تھا اور خوش مزاج بہت تھا۔

"ہم نے سنا کہ آپ آئے ہوئے ہیں تو ہم آپ سے ملنے آ گئے۔ ہم ادھر جیل میں رہتا ہے..." خوشحال خان بولا۔

"کون سی جیل میں" مطیع ہنسنے لگا۔

"جیل ہمارے گاؤں کا نام ہے... اسے ہم لوگ میل کہتے ہیں... آپ لکھتے ہو ناں؟" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں لکھتا ہوں؟"

"آپ کا پیغام آیا تھا شکور صاحب کے نام... کہ آپ گلگت سے رائے کوٹ آؤ گے... تو میں نے کہا یہ شخص تو وہی ہے لکھنے والا... تو آپ فیری میڈو پر کتاب لکھو گے؟"

"شاید..."

"وہ جگہ بہت خوبصورت ہے اور ہر کوئی اس پر کتاب لکھتا ہے... آپ ناتو کے بارے میں لکھو..."

"کیا لکھوں؟"

"یہ لکھو..." اس نے کمبل میں سے چند کاغذات نکال کر میرے سامنے رکھ دیئے... "یہ میں نے آپ کے لئے لکھا ہے کہ آپ باہر کی دنیا کو بتاؤ کہ ناتو میں لوگوں کو بہت مشکلات ہے..."

"لیکن میں اس قسم کی کتاب نہیں لکھتا..."

"تو کس قسم کی کتاب لکھتا ہے؟ جس میں لوگوں کی مشکلات کا ذکر نہ ہو اور صرف خوبصورت جگہ کا بیان ہو..."

یہ خوشحال اتنا بھولا کوہستانی نہ تھا جتنا میں اسے سمجھا تھا... میں نے کاغذ لئے... لالٹین کی ناکافی روشنی میں ان پر جھکا... یہ ناتو کے محل وقوع' تہذیب و ثقافت اور مشکلات وغیرہ پر ایک تفصیلی رپورٹ تھی اور دلچسپی سے خالی نہ تھی... خوشحال خان رائے کوٹی کی رپورٹ کا عنوان تھا "رائے کوٹ متوہ" اور اس کا خلاصہ کچھ یوں تھا...

"ہمارے گاؤں کا نام متوہ کیوں رکھا گیا یعنی وجہ تسمیہ... ہمارے گاؤں کے

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

شروع میں گرم پانی کا ایک چشمہ واقع ہے۔ مقامی لوگ اس پانی کو تات دیئے کہتے ہیں جس کے معنی گرم پانی کے ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے ہمارے گاؤں کا نام تتو رکھا گیا۔۔۔

گرم پانی کی چند خصوصیات۔۔۔ اس میں نہانے سے بیمار لوگ شفا پاتے ہیں یا جن لوگوں کے جوڑوں میں درد ہوتی ہے یا کمر میں درد ہوتی ہے تو وہ لوگ اس پانی میں ' جو کہ ایک چھوٹی سی تالاب بنی ہوئی ہے ' اس میں چند منٹ کے لئے ڈوبے بیٹھتے ہیں۔ اس کے علاوہ موٹے آدمی اور بانجھ عورتیں شفا پاتی ہیں۔ جہاں سے یہ پانی نکلتا ہے وہاں کی مٹی سرخ اور سفید رنگ کی ہے۔ اس پانی میں جہاں سے پانی باہر نکلتا ہے کوئی سخت چیز اندر ڈالو تو پک کر باہر آتی ہے۔ اس پانی کو لیبارٹری ٹیسٹ کے لئے فرانس لے کر گئے ہیں۔

تعلیمی معیار۔۔۔ تعلیمی معیار صفر کے برابر ہے۔ ہم لوگ جیب سے چندہ کر کے ایک ماسٹر استور سے پکڑ کر لائے تھے۔ علاج معالجہ کا بندوبست۔۔۔ جب ہمارا کوئی آدمی بیمار ہوتا ہے تو اس کو سٹریچر پر لٹا کر کندھوں پر اٹھا کر مین روڈ تک پہنچاتے ہیں۔ وہاں سے گلگت علاج کو لے جاتا ہے۔

قومیت۔ عام طور ہمارے علاقے میں دو بڑی قومیں ہیں (۱) شین (۲) یشکن۔ شین قوم اعلیٰ ذات ہے۔ ہمارے علاقے کا زبان شینا بھی شین قوم کے نام پر منسوب ہے جو ہماری مادری زبان ہے۔

عام پیشے۔ کھیتی باڑی اور مویشی پالنا۔ ایک ایک گھرانے کے پاس تقریباً سو دو سو بھیڑ بکریاں اور گائے بیل ہوتے ہیں۔

شادی بیاہ کی رسومات۔ ہمارے ہاں شادی کی رسوم سادہ ہیں جس میں لڑکے اور لڑکی کی پسند اور ناپسند کو دخل نہیں۔ منگنی کے لئے لڑکی والے لڑکے والوں سے اپنی بیٹی کے عوض ایک کثیر رقم طلب کرتے ہیں جس کو مقامی زبان میں "ژپ" کہتے ہیں۔ یہ رقم پانچ ' چھ ہزار روپے سے لے کر پچاس ہزار تک ہوتی ہے۔ پھر سال دو سال بعد شادی کی تاریخ مقرر ہوتی ہے اور لڑکے والے ژپ کی رقم ادا کرتے ہیں جس کے ساتھ لڑکی والے زیورات اور کپڑے وغیرہ بناتے ہیں۔ شادی کے دن لڑکے والے باجا والوں کو بلاتے ہیں۔ جوشیلے جوان ناچتے ہیں۔ پھر نکاح زبانی ہوتا ہے۔ بعض اوقات تقریباً پچاس فٹ اونچے ایک ڈنڈے پر نشانہ باندھتے ہیں اور شرط رکھتے ہیں کہ جب تک لڑکے والے بندوق سے لکڑی کا ڈنڈا نشانہ نہیں کریں گے۔ نکاح نہیں ہو گا۔۔۔

اس لئے سب لوگ کوشش کرتے ہیں۔

زیورات۔ زیورات چاندی کے ہوتے ہیں۔ یہ زیورات ہماری عورت کی ٹوپی پر استعمال ہوتے ہیں جو پانچ دس ہزار کے ہو سکتے ہیں۔ ان زیورات کے نام ہماری زبان میں یہ ہیں۔

تومر۔ یہ تقریباً بیس تولے سے زیادہ کا ہوتا ہے۔ دو عدد شے ہوتے ہیں ان کے علاوہ سولہ کی تعداد میں مزدنگ ہوتے ہیں۔ گلے کے لئے "مقرے" پہنتے ہیں۔

بیٹا پیدا ہوا تو رسم۔ جب ہمارے ہاں بیٹا پیدا ہوتا ہے تو اپنے قریبی رشتہ داروں کے سب جمع ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب جب بچے کے کان میں اذان پڑھتا ہے تو ہمارے لوگ سب سے پہلے اس بچے کے کان سے گوش گزار بندوق کی فائر کرتے ہیں۔ اور سب مرد آ کر فائر کرتے ہیں اس طرح تقریباً سو ڈیڑھ سو فائر کرتے ہیں۔

پسندیدہ مشغلہ۔ ہمارے لوگوں ' یا مردوں کا پسندیدہ مشغلہ شکار کھیلنا ہے"۔

تاتو کی رات آہستہ آہستہ سرد ہونے لگی اور لوگ اٹھنے لگے۔۔۔ اور وہ رات بے حد سرد تھی۔ یوں محسوس ہوتا جیسے ہم کسی گلیشیئر پر خیمہ زن ہیں۔۔۔ لیکن شدید سردی کے باوجود ہم ہر شے سے بے خبر سوئے جیسے ایک شہتیر جہاں پڑا ہوتا ہے وہاں پڑا رہتا ہے ' ایسے ہم جس کروٹ لیٹے اسی کروٹ پڑے سوتے رہے۔۔۔ ہم نے بولڈر رج کو عبور کیا تھا ایک پتھریلے صحرا کو پار کیا تھا اور ہم فیئری میڈو جا رہے تھے۔۔۔

صبح کی سفیدی پھیلی تو میں جاگ گیا۔۔۔ اور اسی لمحے رحمٰن کا باریش چہرہ خیمے کا پردہ اٹھا کر نمودار ہوا "ہم مسلمان۔۔۔ تم مسلمان۔۔۔ تم ہمارا بھائی۔۔۔ اٹھو فیئری میڈو چلو"

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"فنتوری ایک فینٹسی اور فیئری میڈو کے آسمان سے گرتے ستارے"

تاتو سائے میں تھا اور دھوپ اوپر تھی اور نانگا پربت کا ایک حصہ نیلے آسمان میں نمایاں تھا۔ قدم خان اپنے گدھے پر ہمارا سامان لاد رہا تھا اور رحمٰن ہمارے لئے اپنی پختون روایت کے مطابق پراٹھے پکوا کر لایا تھا جو اس سرد صبح میں تاتو نالے کی قربت میں اور فیئری میڈو جانے کی خوشی میں شاندار ذائقہ لئے ہوئے تھے۔

"مولوی رحمٰن آج تو بتا دو کہ فیئری میڈو یہاں سے کتنی دور ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کتنی دور ہے؟ کیوں کتنی دور ہے؟ فیئری میڈو ادھر ہے..." اس نے نالے کے دوسری جانب کچھ فاصلے پر اٹھتی ہوئی ایک سرسبز پہاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

اسکول سے کچھ دور وہ چھوٹا سا پل تھا جس کے ذریعے ہم نے نالے کو عبور کیا اور دوسری جانب چٹان کے پہلو میں چلنے لگے۔ راستے میں بڑے بڑے پتھر تھے اور کچھ دیر تو تاتو نالہ ہمارے ساتھ چلا... اور پھر ہم اس درے سے پرے ہو گئے اور ہم اس درہ نما تنگی سے پرے ہوئے جس میں تاتو کا گاؤں بھنچا ہوا تھا۔ یہاں زمین تقریباً ہموار تھی اور جنگلی گلاب "سیا" کی بے شمار جھاڑیاں پھولوں سے بھری ہوئی تھیں...... آب و ہوا میں فرق نمایاں تھا اور ہم ایک سرخوشی کی کیفیت میں چلتے تھے۔ کچھ بے پروا سے اور کچھ کھلنڈرے سے کیونکہ یہاں چڑھائی نہ تھی' سامنے نیم سیاہ جنگلوں سے ڈھکی ہوئی دو پہاڑیوں کے درمیان نانگا پربت کی برفیں تھیں' ابھی دور تھیں لیکن ان کی سفید ٹھنڈک ہوا میں ہم تک آتی تھی۔ تاتو سے نکلنے کے بعد ہم "بعل" کے گاؤں

کے قریب سے گزرے اور یہاں پر خوشحال خان ہمارا منتظر تھا۔ اس نے ہمیں چائے کے لئے روکنے کی کوشش کی لیکن ہمارے سامنے فیئری میڈو تھا ہم کہاں رکتے تھے' ہم نے اس سے معذرت کی اور چلتے گئے۔

ہم نے ایک چھوٹی سی ندی کو عبور کیا اور اس دوران اس کے خنک پانیوں میں سے ابھرے ہوئے پتھروں پر بیٹھ کر ہم نے اپنے چہرے تر کیے اور جی بھر کے پانی پیا کہ یہ کئی روز کے بعد تھا کہ ہمارے سامنے صاف شفاف پانی بہتے تھے ورنہ جانے کتنی مدتوں سے ہم ایک پتھریلے صحرا کے مسافر تھے... بدن میں کل کی تھکاوٹ کی تلخی ابھی باقی تھی لیکن شاید اس آب و ہوا میں کچھ تھا جو ہمیں تر و تازہ اور شفاف کر رہا تھا اور ہم کل کے دکھ بھول کر سکھ میں چلتے تھے۔ ایک اور ندی کے پار ایک اور ہموار جنگلی گلابوں کی جھاڑیوں کی جگہ ہم نے تھامس مشائلہ اور گاڈفرے کو اپنا منتظر پایا۔ انہوں نے ہمیں اس راستے پر دیکھا تھا جو فیئری میڈو کو جاتا تھا اور وہ ہم سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے' ان کے ہمراہ دو پورٹر تھے جو بھاری سامان اٹھائے ہوئے تھے۔ مطیع الرحمٰن خان نے جب یکمشت تین غیر ملکی سامنے دیکھے تو باقاعدہ پھڑپھڑانے لگا۔

تھامس اور مشائلہ میاں بیوی تھے اور جرمن تھے اور بہت سادہ طبیعت کے تھے۔

گاڈفرے بھی جرمن تھا لیکن اب آسٹریلیا میں رہتا تھا اور اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی کے بعد دنیا کی سیر کو نکلا ہوا تھا' تن تنہا فیئری میڈو کی جانب رواں تھا کہ راستے میں ہم وطنوں سے ملاقات ہو گئی اور اب ان کا ساتھی تھا۔

مطیع نے فوراً سب سے ہاتھ ملایا اور ان کے ہاتھوں کو غور سے دیکھا۔

"ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ فیئری میڈو یہاں سے کتنی دور ہے؟" تھامس نے گہرے جرمن لہجے کی انگریزی میں دریافت کیا۔

"ہم بھی یہی جاننا چاہتے ہیں..." میں نے جواب دیا "....اور کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ فیئری میڈو کیوں جا رہے ہیں؟"

"اس لئے کہ فیئری میڈو کا نام ایک جرمن نے ہی تو دیا تھا..."

"واقعی" مطیع نے حیرت ناک انداز میں کہا۔

"شاید آپ نے ڈاکٹر ہرلگ کوفر کا نام سن رکھا ہو۔ کوفر کو نانگا پربت سے عشق تھا" تھامس ستانے کے لیے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اس کے پورٹروں نے بھی رک سیک زمین پر رکھ دیئے اور ہم بھی آرام سے بیٹھ گئے کہ نانگا پربت سامنے نظر آ رہی

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

تھی اور اس کی آس پاس فیری میڈو پوشیدہ تھا اور اب ہم اسے دیکھے بغیر واپس جانے والے نہیں تھے۔

"تو کوفر کو نانگا پربت کا خبط تھا۔ ایک مہم کے دوران اس کا ایک عزیز بھائی ایک برفانی تودے تلے دب کر ہلاک ہو گیا۔۔۔۔۔۔۔۔ اور تب کوفر نے کہا تھا کہ وہ اس چوٹی کو ہر قیمت پر سر کرے گا۔ چنانچہ جس مہم نے نانگا پربت کو سر کیا اس کا لیڈر کوفر ہی تھا"۔

"لیکن اسے ہرمن بوہل نے فتح کیا تھا؟"

"ہاں۔۔۔۔۔" مشاکلہ حیرت سے بولی "تم ہرمن بوہل کو جانتے ہو۔۔۔؟"

"تو ڈاکٹر ہرلگ کوفر نے نانگا پربت سے واپسی پر ایک انتہائی حسین چراگاہ دیکھی اور اس نے کہا کہ یہ تو فیری میڈو ہے۔۔۔ بلکہ فیری ٹیل میڈو پریوں کی کہانیوں ایسی چراگاہ۔۔۔۔ جرمنی میں نانگا پربت کو جرمن ماؤنٹین کہا جاتا ہے۔۔۔ تو ہم جرمن ایک جرمن ماؤنٹین دیکھنے جا رہے ہیں"۔

"جو پاکستان میں ہے۔۔۔" میں فوراً بولا

"تو کیا ہم اکٹھے سفر کریں" وہ اپنے پتھر سے اٹھ بیٹھا۔

"جی نہیں کم از کم میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا میں بہت آہستہ چلتا ہوں۔۔۔ آپ چلیں فیری میڈو میں ملاقات ہو گی۔"

گاؤفرے اور وہ اپنے دونوں پورٹروں کے ہمراہ آگے چلنے لگے۔

"ان کے ہاتھوں میں سفر کی لکیریں تھیں میں نے دیکھ لیا تھا" مطیع نے سر ہلا کر کہا۔

"اندازہ کرو۔۔۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"کیا مطلب" مطیع نے ذرا غصے سے کہا۔

"بس یہی کہ اندازہ کرو۔۔۔"

دائیں جانب سیاہ جنگل سے ڈھکی پہاڑی کے قدموں میں قدم خان کا گدھا دکھائی دیا' اور پھر وہ درختوں کی اوٹ میں ہو گیا۔ ہمیں اس پہاڑی پر چڑھنا تھا۔۔۔ لیکن یہاں پتھریلا صحرا نہ تھا چیڑ کے گھنے ہریاول کی خوشبو والے درخت تھے اور درختوں کے نیچے گھاس تھی اور زرد پھول اس میں سے سر نکال کر اپنی زردی کی شوخی سے مسکراتے تھے۔۔۔ لیکن یہاں چڑھائی ایک ایسی سیڑھی کی طرح تھی جس پر پاؤں رکھنے کو جگہ نہ تھی۔۔۔ مجھے یہاں بار بار رکنا پڑا۔۔۔ مطیع قدم خان کے گدھے کے ساتھ آگے جا چکا

تھا اور رحمٰن کی بھی خواہش یہی تھی کہ وہ مجھ سے آگے نکل جائے لیکن میں اسے روکتا "رحمٰن میرے ساتھ رہنا' مجھے پانی کی ضرورت ہے۔۔۔" پر رحمٰن آگے نکل گیا۔۔۔ میں آہستہ آہستہ اپنا سانس بچاتا جمع کرتا اور خوفناک چڑھائی پر جھکا قدم اٹھاتا رہا۔۔۔ کچھ ایسے مقام تھے جہاں آپ کسی درخت کی جڑ یا پتھر کو تھام کر اوپر چڑھتے۔۔۔ چیڑ کے درختوں کی چھاؤں اور خنک آب و ہوا کا کچھ فائدہ نہ تھا۔۔۔ یہاں بھی حلق سوکھتا تھا اور جہاں جہاں دھوپ تھی وہاں وہ بدن کو سکھاتی تھی۔۔۔ شاید میں نے اپنے آپ کو اپنی حدود سے پرے لے جا کر چڑھنے کی کوشش جاری رکھی' اپنی جسمانی برداشت سے تجاوز کیا' کیونکہ یکدم مجھے سہارا لے کر فوری طور پر بیٹھ جانا پڑا۔ میرا حلق خشک ہو چکا تھا اور آنکھوں کے آگے نیم تاریکی پھیلتی تھی۔۔۔ مجھے احساس ہوا کہ شاید بلندی اور دھوپ کی وجہ سے میں ڈی ہائیڈریشن کا شکار ہونے والا ہوں اور مجھے پانی کی اشد ضرورت تھی۔۔۔ اور پانی کی سپلائی مولوی رحمٰن کے پاس تھی اور رحمٰن "تم مسلمان ہم مسلمان" کا ورد کرتا ہوا اوپر جا چکا تھا۔۔۔ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ اگر میں زبردستی چلنے کی کوشش کروں گا تو اس کے نتائج ہولناک ہوں گے چنانچہ میں آرام سے وہیں بیٹھ گیا۔۔۔ تقریباً دس منٹ کے بعد ایک گدھے والا اوپر سے آیا۔۔۔ میں نے پانی کا پوچھا لیکن اس کے پاس پانی نہ تھا۔۔۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ تو پہنچ کر کسی بچے کے ہاتھ پانی روانہ کر دے۔۔۔ میری طبیعت بدستور خراب تھی اور میں اس ساری صورت حال کے لئے رحمٰن کو ذمہ دار ٹھہرا رہا تھا کیونکہ پہاڑوں میں یہ دستور ہے کہ آپ کا پورٹر ہمیشہ آپ کو ساتھ لے کر چلتا ہے اور کبھی آپ کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔۔۔ اور رحمٰن مجھے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔۔۔ اوپر جنگل میں سے کچھ ایسی آوازیں آئیں جیسے جانوروں کا ایک ریوڑ بے قابو ہو کر نیچے آ رہا ہے۔۔۔ اور یہ دراصل صرف ایک جرمن کوہ پیما تھا جو ایک عجیب خلائی قسم کے لباس میں ملبوس' دستانوں اور عینک سمیت ہاتھوں میں ہائکنگ سٹک لئے اپنے بھاری جوتوں سے تقریباً لڑھکتا ہوا دھپ دھپ نیچے آ رہا تھا۔ میں اگر باقاعدہ شور مچا کر اسے نہ روکتا تو وہ یقیناً مجھے روندتا ہوا گزر جاتا۔ اس کے پیچھے اس کا پورٹر تھا جو ایک چھوٹا سا تھیلا اٹھائے ہوئے تھا اور بقیہ سامان اس جرمن بل ڈوزر کی پشت پر تھا۔ اس نے عینک اتار کر مجھے غور سے دیکھا کہ یہ کیا شے ہے۔۔۔ وہ ایک نوجوان سنہری بالوں والا انسان کم اور مشین زیادہ قسم کا جرمن تھا اور اتنے صاف ستھرے اور نئے نکور لباس میں تھا جیسے کسی سٹور کے شوکیس میں سے نکل کر باہر آ رہا ہو۔۔۔ میں نے

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

پانی کا سوال کیا اور اس نے فوراً اپنی بیلٹ کے ساتھ لٹکی ہوئی تھرموس کا ڈھکن کھول کر گتے کے گلاس میں مجھے پانی پیش کر دیا۔ یہ پانی میں نے پیا کم اور اپنے چہرے اور باچھوں پر بہایا زیادہ......

"وانکاشن" میں نے شکریہ ادا کیا اور وہ ایک لمبا سانس اندر کھینچ کر سٹارٹ ہوا اور پوری رفتار سے نیچے لڑھکنے لگا۔

اب میں بہتر محسوس کر رہا تھا۔ میں اٹھا اور چڑھنے لگا..... لیکن ذرا احتیاط سے اتنی مشقت کے بعد اگر سچ مچ کی جنت بھی مل جائے تو مہنگی ہے..... میں یہی سوچتا دل کڑا کر کے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا چڑھتا جا رہا تھا......

"تارڑ صاحب...... تارڑ صاحب......"

میں نے بمشکل اوپر دیکھا تو مجھ سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر مطیع خان ایک شہتیر پر بیٹھا مجھے پکار رہا تھا..... اور جلدی سے اوپر آنے کو کہہ رہا تھا...... اوپر میں آ تو رہا ہوں بیوقوف آدمی' میں غصے سے بڑبڑایا..... اور جب میں اس کے قریب پہنچا ہوں تو اس کے چہرے پر ایک عجیب سرخوشی تھی اور وہ مسرت کے ان لمحوں میں تھا جب انسان مکمل طور پر نوزائیدہ ہو جاتا ہے..... اور جس شہتیر پر وہ بیٹھا تھا اس شہتیر سے چند قدم کے فاصلے پر وہ سب کچھ تھا جو اس کے چہرے پر عکس ہو رہا تھا...... چڑھائی ختم گئی.....ہوا کی شدت میں اضافہ ہو گیا لیکن یہ خالی اور بے روح ہوا نہ تھی اس میں زندگی تھی۔اور یہ زندگی کہاں سے آئی؟ ایک وسیع سرسبز خطے کے ہرے بھرے کھیتوں سے اور جنگلی گلاب کی ان جھاڑیوں سے جن کی شنیاں نظر نہیں آتی تھیں اور گمان ہوتا تھا کہ جہاں جہاں ان کی شنیاں ننگی تھیں وہاں کسی نے کاغذ کے پھول ٹانک دیئے ہیں۔ ان گلاب کے ڈھیروں کے نیچے کہیں پوشیدہ اور کہیں ظاہر پانی چلتا تھا جو نانگا پربت سے آتا تھا اور نانگا پربت کا پھیلاؤ اتنا زیادہ تھا کہ یہاں آپ کے سامنے آسمان کم تھا اور نانگا پربت کا برف پوش حجم زیادہ تھا۔ یہاں آسمان کم تھا اور سبزہ اور گلاب اور پانی کا شور اور تیز خنک ہوا زندگی سے لبریز اور نانگا پربت کی برفیں زیادہ تھیں... میں جانتا ہوں کہ اس وقت جب میں اس منظر کو حیرت سے دیکھتا تھا تو میرے چہرے پر بھی ایک عجیب سی خوشی تھی اور میں مسرت کے ان لمحوں میں تھا جب انسان مکمل طور پر نوزائیدہ ہو جاتا ہے..... اور مجھے معلوم ہوا کہ جب یونانی دیو مالا کا ہیرو جیسن سنہری کھال کی تلاش میں اپنے جہاز آرگو پر نکلا تھا اور جب وہ جادوئی سمندر میں سے کسی طلسمی جزیرے کو ابھرتا ہوا دیکھتا تھا تو اس کے دل کی کیا حالت ہوتی تھی اور مجھے معلوم ہوا کہ اندھا شاعر ہومر کیسے شاندار مناظر "دیکھتا" تھا کہ صرف انہیں محسوس کر کے اس نے کیسی لازوال شاعری کی....

اور پھر ایک زور دار گڑگڑاہٹ ہوئی..... پتا نہیں کیا تھا..... آسمان پر بادل تو نہیں تھے' ہلکی دھوپ تھی..... لیکن آسمان تو کم تھا اور نانگا پربت کے ایک حصے میں سفید دھول اٹھ رہی تھی اور ہولے ہولے پھیل رہی تھی .....جی ہاں وہاں کوئی برفانی تودہ اپنی جگہ سے کھسکا تھا اور اب برفوں کو سمیٹتا نیچے رائے کوٹ گلیشیئر میں گر رہا تھا..... میں اس جنت ارضی کو اب بھی سن سکتا ہوں کیونکہ میں اس کی تیز ہوا کو سنتا ہوں۔ جھاڑیوں اور پگڈنڈیوں کے ساتھ بہنے والے رم جھم پانی کو سنتا ہوں اور نانگا پربت پر گہری گونج کے ساتھ کھسکنے والے تودوں کی آواز سنتا ہوں..... لیکن یہ فیئری میڈو نہ تھا..... اس سارے علاقے کا نام فنتوری تھا اور فیئری میڈو اس کا ایک حصہ تھا جس کا مقامی نام جت ہے..... یہ ایک ایسا علاقہ ہے جو رائے کوٹ گلیشیئر کے ایک جانب بلند ڈھلوان پر پھیلا ہوا ہے..... اس کے آغاز میں ایک بلند ہموار مقام پر ایک چھوٹا سا لکڑی کا کیبن تھا' اسے تالا لگا ہوا تھا..... یہاں چند پتھر تھے جو گھاس میں سے سر نکالتے تھے۔ مقامی آبادی کا خیال ہے کہ یہاں کافروں کا قلعہ تھا۔ یہاں سے نیچے جھانکیں تو گویا آپ ایک بلند دیوار پر کھڑے جھانکتے ہیں اور نیچے تقریباً آدھے کلو میٹر کے فاصلے پر رائے کوٹ گلیشیئر کا وجود ہے اور اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا دریا ہے جو غالباً تاتو نالہ ہے.....

اگر یہاں یہ سماں ہے تو آگے فیئری میڈو میں کیا حالات ہوں گے..... ہم اپنی تمام تکلیفیں' مصیبتیں اور رنج بھول گئے..... اور ایسے آرام سے چلنے لگے جیسے صبح کی سیر کے لیے آئے ہوں ...... کھیتوں میں عورتیں کام کر رہی تھیں اور وہ دور رہتی تھیں۔ ان کے لباس اور زیور کسی ثقافتی عجائب گھر کی طرح تھے۔ جس راستے پر ہم چل رہے تھے اس کے آس پاس بھی کھیتوں کے کنارے گلاب کی جھاڑیاں تھیں اور سرد پانی کی جو نالی ہمارے راستے کے ساتھ تھی وہ کبھی چھوٹا سا تالاب بنتی اور کبھی ننھی منی سی آبشار کا روپ دھار لیتی..... اور میں ہر چند قدم کے بعد رکتا' اپنا چہرہ پانی سے تر کرتا اور چند گھونٹ پی کر پھر آگے چلتا...... میں تو پانی کو ترسا ہوا تھا..... سامنے سے چند خواتین چلی آ رہی تھیں۔ انہوں نے چارے کے گٹھے سر پر بوجھ کیے ہوئے تھے..... ہم دونوں کو دیکھ کر انہوں نے سرگوشی کی..... ایک کہہ رہی تھی۔ انگریز انگریز..... کیونکہ ان خطوں میں صرف غیر ملکی سیاح ہی جاتے ہیں اور دوسری بی بی سر

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

ہلا رہی تھی کہ نہیں مسلمان..... پاکستانی.....

نتھوری ایک ایسا منظر تھا جسے دیکھ کر دکھ بھی دل میں بیٹھتا تھا... اور ایک نہیں بہت سارے دکھ دل میں جگہ بناتے تھے..... لفظوں کے زیاں کا دکھ ہوتا ہے جو ان مناظر پر کیا جو زندگی میں نظروں کے سامنے آئے انہوں نے مبہوت کیا اور متاثر کیا اور آپ نے جتنے لفظ تھے ان کی شان میں بیان کر دیئے اور جب کہ نتھوری کا علاقہ آپ کے سامنے ہے اور خنک ہوا کے ساتھ برفیلے پانی آپ کے پاؤں میں چلتے ہیں آپ کے پاس اسے بیان کرنے کے لئے کوئی نئے لفظ نہیں ہیں اور پرانے لفظ عرصہ ہوا برتے جا چکے ہیں' بوسیدہ ہو چکے ہیں... تو اب کیا کریں؟ قارئین کو کیسے وہاں لے جائیں جہاں ہم تھے..... ایک اور دکھ جو دل میں جگہ بناتا ہے وہ اس منظر کو اکیلے دیکھنے کا دکھ ہے..... وہ جو پیارے ہیں ان کو بھی تو اسے دیکھنا چاہئے..... کیونکہ آپ اپنے پیاروں کے لئے دنیا کی خوبصورت ترین چیزوں کی خواہش کرتے ہیں اور یہ یقیناً ان میں سے ایک ہے..... اور ایک اور دکھ اس منظر کے گم ہو جانے کا ہے..... یہ ہو گا اور آپ نہیں ہوں گے... تو شاید دکھ اپنے گم ہو جانے کا ہوتا ہے.. اس شام میں نے اپنی ڈائری پر جھک کر جو کچھ لکھا وہ بھی ناکافی ہے...

"نتھوری ایک فینٹیسی تھا۔ ایک جنت گم گشتہ۔ میں کبھی بھی اس کے حسن اور نزاکت اور دل کو چھو نہ سکوں گا اور آنکھوں میں نمی لے آنے والے ماحول کی بات نہ کر سکوں گا۔ ایسے پوشیدہ کنج جن میں برفیلے پانی کا شور گرتا تھا۔ جنگلی گلاب سے گھرے راستے اور نانگا پربت آسمان کو بھرتا ہوا..... دوبار تودہ گرنے کی گڑگڑاہٹ..... مجھے اس حسن کے لئے اس حسن کو آپ تک پہنچانے کے لیے کچھ پاگل پن چاہئے' مجھ میں کچھ ہے پر اتنا نہیں جتنا کہ نتھوری کے حسن کے لئے درکار ہے..... سدا نہ باگیں بلبل بولے سدا نہ باغ بہاراں"

آسمان پر ابھی دھوپ تھی اور ابھی کہیں سے جھکے جھکے سے بادل آئے اور ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی..... ہم نے اس بارش سے بچاؤ نہیں کیا بلکہ چلتے رہے.. ہاں ہم نے یہ محسوس کیا کہ جب کوئی بوند گردن پر گرتی ہے تو ذرا برفیلی ہوتی ہے اور بدن کو کپکپاتی ہے جیسے برف بجتی بجتی رہ گئی ہو... پودوں اور کھیتوں کی ہریالی کو مزید شوخ کر کے اور فضاء کو تازگی دے کر وہ بارش تھم گئی اور آسمان پھر سے صاف ہو گیا.....

کچھ پرانے مکانوں میں دھوئیں سے سیاہ ہوتے دروازے کھول کر عورتیں ہمیں دیکھتی تھیں اور بچے ہمارے قریب نہ آتے تھے بلکہ دور سے شور مچاتے تھے" چاکلیٹ چاکلیٹ..... " وہ ہمیں بھی غیر ملکی کوہ پیما سمجھتے تھے جو انہیں چاکلیٹ کا تحفہ دے کر جاتے تھے.....

راستے کے ساتھ ایک نالہ آ رہا تھا اور ایک مقام پر کسی زندہ دل نے اس کے عین اوپر شہتیروں سے ایک چھوٹا سا جھونپڑا بنا رکھا تھا.. رومان اپنی جگہ لیکن ایسے جھونپڑے میں سونا ذرا مشکل ہوتا ہو گا کیونکہ پانی کا بے پناہ شور ہر وقت گونجتا ہے۔ یا پھر یہ جھونپڑا سونے کے لئے نہیں صرف جاگنے کے لئے ہو گا اور ایسے جاگنے کے لئے جس کے پس منظر میں اس قسم کا شور مفید رہتا ہے... یہاں سے راستہ ذرا اوپر اٹھتا تھا اور کھیتوں کی بجائے گھنا جنگل آپ کو ڈھانپنے لگتا تھا لیکن زیادہ دیر تک نہیں کیونکہ آپ لکڑی کے بنائے ہوئے ایک بے ڈھبے پھاٹک کو دیکھتے ہیں..... اور اس پھاٹک کے پار فیئری میڈو ہے۔

اور جب اسی پھاٹک کو پار کیا اور فیئری میڈو میں پہنچے تو دل بیٹھ گیا... کیا یہی فیئری میڈو ہے.. بڑا شور سنتے تھے کہ نانگا پربت کے پہلو میں فیئری میڈو ہے اور جو پہنچے تو یہ نکلا..... خیال تھا کہ ایک دھند آلود ماحول میں داخل ہوں گے اور جوں جوں دھند تحلیل ہو گی اس میں سے پریاں ناچتی ہوئی برآمد ہوں گی اور..... اور یہاں کوہستانی حضرات کلاشنکوفیں لے کر گھوم رہے تھے اور بکریاں ہاں ہاں کر رہی تھیں اور گھاس پر مینگنیاں اور لید کے تودے تھے اور ذرا ہٹ کر مولوی رحمٰن بیٹھا دانت نکال رہا تھا.....

"بس یہی فیئری میڈو ہے یا آگے جانا ہے" میں نے ایک جانب ایک چھوٹے سے خیمے کو دیکھا جو کسی سیاح کا تھا اور سیاح متجسس بکریوں کو خیمے سے دور کرنے کے لئے" ہو ہو" کر رہا تھا اور ان کوہستانیوں کو دیکھا جو داڑھیوں کو سنوارتے ہماری جانب آ رہے تھے۔

"بس یہی فیئری میڈو ہے؟"

" کیوں نہیں ہے' یہی ہے" رحمٰن مجھے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا. "ادھر خیمہ لگائے گا؟"

"کیوں لگائے گا خیمہ؟ یہ کوئی جگہ ہے اور مولوی صاحب آپ مجھے اکیلا چھوڑ کر

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

کہاں دفع ہو گئے تھے۔۔۔؟"

"کہاں دفع ہو گیا تھا؟ یہاں دفع ہو گیا تھا۔۔۔" اس نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"اور اگر میں پیاس سے نڈھال ہو کر وہاں فوت ہو جاتا تو۔۔"

"فوت ہو جاتا؟ کیوں ہو جاتا؟ ہو جاتا تو ہم تمہارے کفن دفن کا بندوبست ادھر کرتا۔۔۔ تم مسلمان ہم مسلمان۔۔۔ ہم تمہارا بھائی۔۔۔ ہم تمہیں نماز جنازہ پڑھا کر دفن کرتا۔۔۔ ادھر کوہستانی جاہل لوگ ہیں۔۔۔ مجھے نماز جنازہ آتا ہے۔۔۔" اور یہ گفتگو رحمن کمال سنجیدگی سے کر رہا تھا۔

"تیرا بیڑا غرق رحمن۔۔۔" میں نے جھلا کر کہا اور دراصل میں فیئری میڈو کی مایوسی کا غصہ رحمن پر اتار رہا تھا۔۔۔ ٹھیک ہے یہ ایک وسیع چراگاہ تھی اور اس کے پس منظر میں نانگا پربت یوں دکھائی دیتی ہے جیسے آپ کے صحن میں آ گئی ہے اور ایک گھنا جنگل ہے لیکن۔۔۔ یہاں بکریاں تھیں اور وحشی قسم کے کوہستانی گھوم رہے تھے۔۔۔ میں اس لمحے اس حقیقت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا کہ جس مقام پر پہنچنے کے لئے میں نے ہزار کشٹ کاٹے ہیں وہاں لوگ تو ہوں گے اور چراگاہ میں ظاہر ہے' گائے اور بکریاں وغیرہ بھی چہل قدمی کرتی ہوں گی۔۔۔۔۔

"یہ ہم ساتھ بندوق بھی لایا۔۔۔" رحمن نے جانے کہاں سے ایک انتہائی دقیانوسی قسم کی بندوق برآمد کر لی "اس کے ساتھ مارخور مارے گا تمہارے لئے۔۔۔۔ کھائے گا؟"

"کھائے گا؟ کیوں نہیں کھائے گا۔۔۔ ہم مسلمان۔۔۔ تم مسلمان۔۔۔ لیکن خیمہ یہاں نہیں لگائے گا ادھر فنتوری واپس چلے گا وہ اچھی جگہ ہے۔۔۔۔۔"

"نہیں۔۔۔۔ سب مسافر لوگ ادھر خیمہ لگاتا ہے۔۔۔۔"

"ہم مسافر لوگ ادھر خیمہ نہیں لگائے گا۔۔۔" میں نے قدرے گھبرا کر کہا کیونکہ چار پانچ کوہستانی ہمارے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ چکے تھے اور جیسا کہ محاورہ ہے وہ دانتوں تک مسلح تھے۔ مطیع اس دوران اس اکلوتے خیمے کا جائزہ لے کر آ گیا جس کے باہر ایک نوجوان بکریوں کو دور رکھنے کا چارہ کر رہا تھا۔

"اس خیمہ میں ایک ہائے ہائے ایک خوبصورت لڑکی بھی ہے۔" مطیع کہنے لگا "یہیں خیمہ لگا لیتے ہیں۔"

"اور یہاں ہائے ہائے خوبصورت کوہستانی اور ہائے ہائے خوبصورت بکریاں بھی ہیں۔" میں نے بھنا کر کہا۔۔۔ اور ہاں میں معذرت خواہ ہوں کہ میں مطیع کی ایک عادت کا تذکرہ کرنا بھول گیا اور وہ یہ ہے کہ وہ "بہت" یا "بے شمار" یا "انتہائی" کے لئے "ہائے ہائے" کا لفظ استعمال کرتا ہے چنانچہ اب تک جہاں کہیں اس کی گفتگو میں یہ تینوں لفظ آئے ہیں انہیں ہائے ہائے کر لیجئے۔۔۔۔

چراگاہ کی ہریالی میں چھوٹے چھوٹے زرد رنگ کے پھول تھے جو مجھے اب نظر آئے اور وہ بے شمار تھے۔۔۔۔ اور درمیان میں ایک چھوٹی سی ندی جو بمشکل ایک میٹر چوڑی ہو گی' جنگل کی جانب سے بہتی آتی تھی اور اس کا پانی بہت شفاف تھا اور یہ بھی اب نظر آئی کیونکہ اس کے پانی کناروں سے ذرا نیچے تھے۔۔۔۔ چراگاہ کے بائیں جانب ایک بڑا جھونپڑا تھا اور اس کے ساتھ ایک پہاڑی تھی جس پر بے شمار درخت تھے۔۔۔ یہ پہاڑی نانگا پربت کے عین سامنے تھی اور رائے کوٹ گلیشیئر پر جھکی ہوئی تھی۔

"رحمن۔۔۔۔ ادھر۔۔۔۔ ہم خیمہ ادھر لگائیں گے پہاڑی پر۔"

"پہاڑی پر؟۔۔۔۔ نہیں لگائیں گے" رحمن گھبرا گیا "ادھر ہوا بہت تیز ہوتی ہے رات کو اور ہاں پانی تو نیچے ہے ادھر۔۔۔۔ اوپر پانی نہیں ہے۔ کیا کرے گا۔۔۔؟ ادھر خیمہ لگاؤ"

"آپ سامان اٹھاؤ۔۔۔۔" میں جان گیا کہ رحمن اب ست پڑ چکا ہے اور سامان اٹھا کر اس پہاڑی پر چڑھنا اسے عذاب لگ رہا ہے۔۔ قدم خان کا گدھا بھی واپس جا چکا تھا۔۔

ویسے رحمن ٹھیک کہتا تھا۔۔۔ اس پہاڑی پر ہوا تیز تھی۔۔۔ یہاں سے پورا فیئری میڈو دکھائی دیتا تھا۔۔۔ نانگا پربت اور ہمارے درمیان کچھ نہ تھا لیکن پانی نیچے بہہ رہا تھا۔۔ بہرحال ہم یہاں فیئری میڈو دیکھنے آئے تھے پانی پینے نہیں آئے تھے۔۔۔ اور یہاں ہمارے لئے ایک خوشگوار حیرت منتظر تھی۔۔۔ تھامس اور مشائلہ کا چھوٹا سا خیمہ بھی یہیں نصب تھا اور وہ ہمیں دیکھ کر بے حد راضی ہوئے۔۔۔ وہ اپنا خیمہ لگا کر ابھی فارغ ہوئے تھے۔۔۔۔ گاڈفرے نیچے اتر کر ایک پتھر پر بیٹھا رائے کوٹ گلیشیئر کا نظارہ کر رہا تھا۔

"ہیلو۔۔۔۔ ہم تمہارا انتظام کر رہے تھے۔۔۔" تھامس آگے آ گیا "یہاں سے منظر

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

بہت شاندار ہے اور بھیڑ بکریاں بھی نہیں ہیں......"

"ہیلو......" مطیع نے ایک بار پھر دونوں کے ساتھ دست پنجہ لیا اور خاص طور پر مشائلہ سے ......اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "بڑی ہائے ہائے میم ہے چوہدری صاحب۔"

رحمٰن نے خیمہ کھول کر گھاس پر بچھا دیا تھا اور اب اس کی میخیں گاڑ رہا تھا...... میں نے نوٹ کیا کہ خیمے کا چوچیڑ کے درختوں کی جانب ہے "اسے اکھاڑ کر اس کا منہ ادھر کرو رحمٰن...... نانگا پربت کی جانب"

"نانگا پربت کی جانب؟ کیوں نہیں نانگا پربت کی جانب...... ادھر سے ایسا ہوا آئے گا برف والا رات کو کہ تم خود برف ہو جائے گا......"

"خیر ہے۔ منہ نانگا پربت کی طرف......"

رحمٰن بڑبڑانے لگا...... "رات کو برف کا ہوا چلے گا تو اس کو پتا چلے گا......" اور میخیں اکھاڑنے لگا...... انگلو طرز کا خیمہ چند لمحوں میں ایستادہ ہو گیا۔

فیئری میڈو کے کوہستانی ہمارا پیچھا کرتے ہوئے یہاں بھی آ گئے تھے اور اب ہمارے خیمے سے ذرا ہٹ کر ہماری جانب بظاہر لاپروا ہو کر گلیشیئر کے دوسری جانب منہ کر کے بیٹھے ہوئے تھے۔ البتہ وہ کبھی کبھار ترچھی نظروں سے ادھر دیکھ لیتے کہ اب کیا ہو رہا ہے۔ ان میں سے ایک بھوری داڑھی والا نوجوان آنکھوں پر دوربین لگائے گلیشیئر کے دوسری جانب بلند ہوتے برزل پاس کو دیکھ رہا تھا۔ یہ دوربین بھی ایک بہانہ تھا۔ وہ ہماری حرکات دلچسپی سے دیکھتے تھے لیکن یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے کہ انہیں ہم سے کسی قسم کی کوئی دلچسپی ہے۔

خیمے میں سامان رکھنے کے بعد رحمٰن نے ایک گرجدار کھنگورا مارا اور کہنے لگا "ہم ادھر سوئے گا نیچے اپنے بھائی کے پاس...... ادھر مکان میں"

جہاں ہم تھے وہاں سے پورا فیئری میڈو پوری تفصیل سے نظر آتا تھا اور چونکہ یہ علاقہ تاتو کے لوگوں کی ملکیت ہے اس لئے گرمیوں میں وہ اپنا مال مویشی لے کر اوپر آ جاتے ہیں۔ فیئری میڈو کے ایک جانب باقاعدہ گھر ہے اور کھیت ہیں اور ادھر جس پہاڑی پر ہم تھے اس کے برابر میں بھیڑوں کا باڑہ تھا...... جب رحمٰن نے شب بسری کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو میں نے جان لیا کہ وہ کسی نہ کسی بہانے ادھر فیئری میڈو میں ٹھہرے گا اور پھر اس قیام کو ہمارے کھاتے میں ڈال کر ہم سے

رقم وصول کرے؟۔

"مولوی صاحب آپ جاؤ......" میں نے اس کے کندھے کو تھپکا "آپ کا بیوی صاحب اور آٹھ بچے آپ کا انتظار کرتا ہے"

"نہیں ہم بندوق لایا ہے۔ تمہارے لئے شکار کرے گا مارخور کھلائے گا......"

"ہم مارخور نہیں کھاتا......"

"مارخور نہیں کھاتا؟ کیوں نہیں کھاتا؟" اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"ہم کو مردہ مارخور اچھا نہیں لگتا۔ پہاڑوں میں گھومتا زندہ مارخور اچھا لگتا ہے......"

"تو پھر ہم ادھر تمہاری چوکیداری کرے گا بندوق سے ...... ادھر کے لوگ کوہستانی بہت خطرناک ہیں"

میں اس بارے میں بھی معلومات حاصل کر چکا تھا کہ سیاحوں کے خیمے یہاں بالکل محفوظ رہتے ہیں اور کوہستانی اتنے خطرناک نہیں ہوتے جتنے دکھائی دیتے ہیں "مولوی صاحب آپ فکر نہ کرو اور اپنی بیوی صاحب کے پاس جاؤ اور چار دن کے بعد واپس آؤ اور ہمیں نیچے لے جاؤ۔"

"چلو قدم خان۔" مولوی صاحب نے ناگواری سے ہر حال میں شکرگزار قدم خان کو کہنی مار کر کہا "ہم چار دن میں آئے گا...... اگر تم زندہ بچ گیا تو واپس لے جائے گا"

ہم رحمٰن اور قدم خان کو پہاڑی سے اترتا دیکھتے رہے ... وہ فیئری میڈو کے میدان میں چلتے تھے...... پھر وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے

کوہستانی حضرات ہم سے روٹھے ہوئے دوسری جانب منہ کر کے ابھی تک براجمان تھے اور بھوری داڑھی والا دوربین سے برزل کو بے دلی سے دیکھتا تھا...... میں ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا لیکن انہوں نے میرے نہایت پرجوش "السلام علیکم" کا جواب بالکل نہ دیا......

"کیا حال ہے خان صاحب ......" ان میں سے کسی ایک نے بڑبڑا کر کچھ کہا اور زمین پر تھوکا۔

"یار یہ دوربین تو دکھاؤ۔" میں نے دوستی کرنے کے لئے بھوری داڑھی والے کے آگے ہاتھ کر دیا...... اس نے مجھے اک چشم حقارت سے دیکھا کہ یہ منہ اور

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

دوربین اور پھر برزل پاس کی جانب دیکھنے لگا۔

"یار ہم تمہارا مہمان ہے' تمہارے وطن میں آیا ہے ..... کیسا کوہستانی ہے مہمان کو دوربین نہیں دکھاتا!"

اس نے اپنی نیلی آنکھوں میں غصہ بھر کر مجھے دیکھا کہ مہمان کا حوالہ دے کر مجھے بلیک میل کرتا ہے یہ لو دوربین ..... اور اس نے دوربین مجھے تھمانے کی بجائے میرے آگے پھینک دی۔ غصہ تو مجھے بھی بہت آیا کہ یہ حقیر کوہستانی کیا جانے کہ اس کے سامنے اس وقت نیلی وژن کا ایک سپر سٹار بیٹھا ہے۔ اگرچہ باندر ٹوپی پہننے سے اور مسلسل مسافت اور بے تحاشا بڑھی ہوئی بے ترتیب داڑھی کی وجہ سے فی الحال ایک سپر مسخرہ لگ رہا ہے۔ لیکن میں نے اس لاعلم کوہستانی کو کچھ نہ کہنا مناسب جانا یہ نہیں کہ میں اس کی کلاشنکوف سے خوفزدہ ہو گیا تھا ..... یہ میرا اپنا فیصلہ تھا کہ میں اپنے غصے کو قابو میں رکھوں گا ..... دوربین سے میں نے نانگا پربت پر توجہ مرکوز کی ..... اس کی سفیدی میں اتنی زیادہ چمک تھی کہ آنکھیں چندھیا گئیں ..... ہمارے عین نیچے رائے کوٹ گلیشیر تھا جس کا سلیٹی رنگ کا جسم ایک دریا کی طرح نانگا پربت کے قدموں سے جا ملتا تھا..... یہ برف کا ایک تھما ہوا دریا تھا لیکن اس کے نیچے اس برف میں پوشیدہ ایک اور دریا تھا جس کی آواز ہم تک پہنچتی تھی۔ اس کے پانی فتوری کے قریب جا کر برف میں سے ظاہر ہو کر روشنی میں آتے ہیں۔

ایک گڑگڑاہٹ ہوئی اور ایک گونجدار آواز فیری میڈو پر بہت دیر ٹھہری رہی..... اور اس لمحے میں نانگا پربت کے اس حصے کو دیکھ رہا تھا جہاں سے یہ گونج سفر کرتی ہوئی ہم تک آئی تھی اور یہ ایک چھوٹا سا ایوالانچ یعنی برفانی طوفان تھا جو سفید دھند کی صورت نیچے آ رہا تھا اور میں نے دیکھا کہ کئی چٹانیں جن کی سیاہی نمایاں تھی اب برف سے ڈھک چکی تھیں۔

میں نے دوربین آنکھوں سے ہٹائی اور نیلی آنکھوں والے کوہستانی کو دے دی..... "شکریہ....."

اس نے کچھ نہ کہا ..... اور پھر سب یکدم اٹھے اور سلام دعا کئے بغیر نیچے اترنے لگے.....

میں نے مطیع کی طرف دیکھا تو وہ مشائلہ کی ہتھیلی پر انگلی چلا کر اسے نوید دے رہا تھا کہ تم تین بچوں کی ماں بنو گی اور تم غیر ممالک کے سفر کرو گی... تھامس ایک سوکھے ہوئے تنے پر آئینہ ٹکائے شیو کر رہا تھا..... اور ہاں اس پہاڑی پر جو چھوٹا سا جنگل تھا اس میں اور جہاں ہمارا خیمہ تھا اس کے آس پاس بے شمار سوکھے ہوئے درخت اور ان کے تنے تھے ..... یہ درخت بارش اور برف کی وجہ سے بالکل کھوکھلے ہو چکے تھے اور مدتوں سے یہاں پڑے تھے صرف اس لئے کہ یہاں کسی کو لکڑی کی ضرورت نہ تھی اور جتنی ضرورت تھی وہ انہیں اپنے جھونپڑوں کے ارد گرد مہیا ہو جاتی تھی۔ ہمارے خیمے کے عین پیچھے ایک بہت بڑا درخت ایک عرصے سے پڑا تھا اور دور سے کسی سیاہ چمکتی اژدھے کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ آئندہ چند دنوں میں یہ ہمارا ساتھی بنا اور ہم اس کی اوٹ میں کھانا بناتے' کھاتے اور دھوپ سینکتے کیونکہ خیمہ کے پاس' رحمٰن ٹھیک کہتا تھا' ہوا بہت تیز ہوتی تھی۔

گاڈفرے عام جرمنوں کی نسبت پستہ قد تھا۔ تھوڑا سا جھلی لیکن نہایت خوش مزاج شخص..... وہ سفر کے دوران کم سے کم سامان اٹھانے پر یقین رکھتا تھا چنانچہ ایک سلیپنگ بیگ اور شاید ایک جوڑا کپڑوں کے سوا اس کے پاس اور کچھ نہ تھا۔ میں نے شب بسری کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگا۔

"میں ہمیشہ کھلے آسمان تلے سونا پسند کرتا ہوں..... خیمے صرف بزدلوں کے لئے ہوتے ہیں"

"اور اگر بارش آ جائے تو؟"

"تھوڑا سا بھیگ جانے میں کوئی حرج نہیں....." وہ اپنی داڑھی میں انگلی سے کنگھی کرتا ہوا کہنے لگا "ویسے تھامس نے مجھے اجازت دے دی ہے کہ اگر زیادہ بارش ہو جائے تو میں ان کے خیمے میں پناہ لے سکتا ہوں....."

"اور ہمارے خیمے میں بھی ....." مطیع نے فوراً کہا۔

"شکریہ..... کیا آپ کافی پینا پسند کریں گے؟ کیونکہ میرے پاس تھوڑی سی کافی ہے..... اور یہاں تو کھانا پکانے اور کافی وغیرہ بنانے میں کوئی پرابلم نہیں ہو گی۔ یہاں اتنی زیادہ لکڑی ہے ..... میں نے دیکھا ہے کہ لکڑی اتنی خشک ہے کہ یہ بہت اچھی طرح جلے گی۔" گاڈفرے نیچے اتر کر خشک لکڑی جمع کرنے لگا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ نیچے سے فیری میڈو سے "ہم مسلمان تم مسلمان" رحمٰن صاحب پھر چلے آ رہے ہیں ..... ان کے ساتھ قدم خان بھی ہے اور ایک بچہ ٹین اٹھائے ہوئے ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہم تک پہنچے تو ہانپ رہے تھے... اس پہاڑی پر خیمہ زن ہونے کا یہ فائدہ بھی ہوا

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

کہ جو کوئی بھی ہمیں ملنے آتا تھا راستے میں کم از کم ایک مرتبہ سانس درست کرنے کے لئے رکتا تھا اور پھر جب ہم تک پہنچتا تھا تو قدرے توقف کر کے سلسلہ کلام کا آغاز کرتا تھا۔

"ہم پھر آگیا۔۔۔" رحمٰن نے اپنی داڑھی پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔ "تم پانی بھول گیا تھا۔۔۔"

"کونسا پانی؟"

"وہ پانی ۔۔۔ نیچے فیری میڈو میں۔۔ ندی کا پانی ۔۔۔ ادھر سے ادھر کیسے لائے گا؟ ہم تتوری میں پہنچا تو یاد آیا کہ صاحب کے پاس پانی نہیں ہے۔۔۔ کیسے لائے گا؟۔۔ وہاں سے ادھر واپس آیا۔۔۔۔"

میرا جی چاہا کہ میں رحمٰن کو جپھا ڈال کر کہوں مولوی صاحب ہم مسلمان تم مسلمان تھینک یو ویری مچ۔۔۔ کیونکہ وہ درست کہتا تھا۔ نانگا پربت کو دیکھنے میں ہم سب ایسے مگن ہوئے تھے کہ ہمیں قطعی طور پر یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ ہمیں کافی یا چائے بنانے' پینے اور دیگر ضروریات کے لئے پانی کی ضرورت پڑے گی اور پانی۔۔ وہ نیچے تھا۔۔۔

"قدم خان۔۔۔ پانی لاؤ" رحمٰن نے اپنی مذہبی سربراہی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے قدم خان کو پلاسٹک کا بڑا کین دیتے ہوئے حکم دیا۔ قدم خان نے سر جھکا کر کین تھاما اور نیچے اترنے لگا۔ تب رحمٰن نے ہمیں دوسری سرپرائز دی۔۔ اس بچے کو ٹین سمیت پیش کیا گیا جو اب تک ایک طرف بیٹھا اپنی ناک میں انگلی چلا رہا تھا۔

"یہ تمہارے لئے لسی لایا ہے۔۔۔"

رحمٰن نے ٹین کو فخریہ انداز میں ہمارے سامنے رکھ دیا۔۔۔ اور اس ٹین میں سفید گاڑھا دہی تھا اور اس کی سفیدی میں کوئی سیاہی نہ تیرتی تھی اور اگر تھی تو کہیں اس کی گہرائی میں تھی اور مجھے پیاس لگ رہی تھی ۔۔۔۔ میں نے سامان میں سے چینی نکال کر دہی پر چھڑکی اور سب کو دعوت دی کہ ہم مسلمان تم مسلمان ۔۔۔ جب کسی نے بھی اس دعوت پر لبیک نہ کہا تو میں نے ٹین اٹھا کر منہ سے لگا لیا اور آہستہ آہستہ اس شاندار اور میٹھے دہی کو پینے اور کھانے لگا۔۔۔ اور آج پھر میری تھکاوٹ زائل ہوئی۔ میرا گڑگڑاتا ہوا پیٹ درست ہوا اور وہ نامعلوم لیکن قے آور قسم کا سردرد بھی زائل ہو گیا جو فیری میڈو میں پہنچتے ہی شروع ہو گیا تھا۔۔۔ یہاں ذرا کچھ بلندی کا

حساب کتاب ہو جائے۔۔ سندھ پر رائے کوٹ پل سطح سمندر سے گیارہ سو چورانوے میٹر اونچا ہے۔ تاتو کی بلندی دو ہزار تین سو میٹر ہے اور فیری میڈو تین ہزار دو سو میٹر پر واقع ہے اور جہاں ہمارا خیمہ واقع تھا یہ مقام تقریباً ساڑھے تین ہزار میٹر کی بلندی پر تھا یعنی دس گیارہ ہزار فٹ کی اونچائی ۔۔۔۔ اور یہ اونچائی بہت زیادہ ہوتی ہے اور انسانی جسم اور دماغ پر اثرانداز ہوتی ہے ۔۔۔ اونچائی کی اس بیماری کا واحد علاج دہی ہے۔۔۔ اور یہ آزمودہ نسخہ ہے۔

میں نے دہی کے عوض کچھ رقم اس بچہ کو دینی چاہی تو رحمٰن نے ایک بہت اچھی بات کی۔ کہنے لگا "پیسہ مت دو۔ ابھی یہ لسی مہمان سمجھ کر لایا ہے۔ اگر پیسہ دو گے تو بعد میں سب ٹورسٹ کو گاہک سمجھ کر لائے گا۔ لالچ کرے گا" چنانچہ میں نے بچے کو چند بسکٹ اور چیونگم کا ایک پیکٹ دے کر رخصت کر دیا۔۔۔ بچے نے چیونگم کے پیکٹ کو غور سے دیکھا اور کہنے لگا "یہ دیسی ہے۔ ہم تو جرمن چیونگم کھاتا ہے۔۔" میں نے بے حد معذرت کی کہ فی الحال میرے پاس تو یہی ہے۔۔۔

قدم خان جیری کین بھر کر لا چکا تھا۔ گاڈفرے کا چولہا خوب دھڑا دھڑ جل رہا تھا اور اس پر رکھی کیتلی میں پانی ابل رہا تھا۔

رحمٰن اور قدم خان چار روز بعد آنے کا وعدہ کر کے پھر نیچے اتر گئے۔۔۔

اور پھر تیز ہوا۔ سامنے نانگا پربت۔ دھواں گی گرم کافی اور خیمے کا پھڑپھڑاتا ہوا پردہ۔۔۔ ایک بوڑھا چرواہا رسی بٹتا ہوا اوپر آگیا۔۔۔ ہمیں دیکھ کر مسکراتا رہا۔۔۔ ہم نے اسے بیٹھنے کو کہا۔۔۔ وہ اردو بہت کم سمجھتا تھا۔۔۔ تھا اس کا ارادہ تھا کہ وہ اگلی صبح نانگا پربت کے بیس کیمپ تک جائے اور وہ اس کے راستے کے بارے میں بابے سے پوچھنے لگا۔۔۔ بابے نے بتایا کہ نیچے یہ جو گھنا جنگل ہے اس میں سے راستہ جاتا ہے۔ جنگلی جانور کوئی ایسا نہیں جو نقصان پہنچا سکے۔ بھیڑیئے ہیں تو سہی لیکن انسان سے ڈرتے ہیں اور پھر ادھر بیال کیمپ سے آگے گلیشیئر کے ساتھ چل کر بیس کیمپ آتا ہے۔۔۔ صرف احتیاط یہ چاہئے کہ گلیشیئر کے بعد جو نالہ ہے وہ صبح سویرے آسانی سے پار کیا جا سکتا ہے لیکن دو بجے کے بعد برف پگھلنے کی وجہ سے ناقابل عبور ہو جاتا ہے اس لئے جو کوئی بھی ادھر جاتا ہے دو بجے سے پہلے نالہ پار کر کے ادھر آ جاتا ہے ورنہ رات ادھر بسر کرنا پڑتی ہے اور رات کو ادھر اتنی سردی ہو جاتی ہے کہ چھوٹے موٹے نالے بھی جم جاتے ہیں۔۔۔ بابے نے یہ بتایا کہ وہ ہمیں دو سو روپے میں ایک چھوٹی سی

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

بھیڑ بھوننے کے لئے دے دے گا۔

میں نے اگلی صبح تھامس اینڈ کمپنی کے ساتھ نانگا پربت کے بیس کیمپ جانے کا فیصلہ کر لیا۔۔۔ ملنچ سے پوچھا تو کہنے لگا "پہلے تے ٹانگیں اکڑی ہوئی ہیں اب صبح سویرے پھر چڑھائی مجھ سے نہیں ہو گی لیکن مجھے جگا دینا میں کوشش کروں گا۔۔۔"

ادھر بیزل پاس تھا۔ ادھر گھنے جنگلوں کے علاقے تھے ادھر نانگا پربت کی بلندی تھی چنانچہ شام بڑی تیزی سے فیری میڈو میں اترنے لگی۔ وہاں اندھیرا پھیلتا گیا لیکن ہمارے سامنے نانگا پربت کی سفید دیوار پر دھوپ سرخ ہو رہی تھی۔۔۔ جیسے وادی چپلو کے گھر میں ایک لڑکی نے باہر جھانکا اور ہمیں دیکھ کر اس کے گال ہمارے دیکھتے دیکھتے سرخ ہو گئے تھے پھر وہ سرخی مدھم ہونے لگی۔۔۔

"میرے پاس رات کے کھانے کے لئے تھوڑی سی کشمش اور خوبانی کے بادام ہیں۔۔۔" گاڈفرے کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی پوٹلی تھی۔۔۔

"تم صرف یہ کھاؤ گے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں ساتھ پانی بھی پیوں گا۔۔۔"

میں نے خیمے سے اپنی خوراک کا مکمل ذخیرہ نکال کر اس کے سامنے ڈھیر کر دیا "تم ہمارے مہمان ہو۔۔۔ جو جی چاہے کھاؤ"

گاڈفرے کی آنکھیں کھل گئیں "او مائی گاڈ۔۔۔ سوپ فوڈ۔۔۔ سوپ۔۔۔ مچھلی۔۔۔ گوشت۔۔۔ پنیر۔۔۔ چاول اور۔۔۔ سیون اپ۔۔۔ میری ایک پیشکش ہے۔۔۔ میں بہت زبردست کک ہوں۔۔۔ خوراک تمہاری ہو گی اور اسے پکاؤں گا میں۔۔۔ اور تھوڑا سا میں بھی کھاؤں گا؟"

"یہ طے پا گیا۔۔۔" میں نے ہنس کر کہا اور اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام لیا۔۔۔

ہم سب خنکی کے باوجود بھاری سویٹر پہنے ہوئے نانگا پربت کی جانب منہ کئے ہوئے بیٹھے رہے۔۔۔ وہ اب تاریکی کے باوجود صاف نظر آ رہی تھی۔ رائے کوٹ گلیشیئر کے نیچے چلنے والے دریا کا شور کم ہو گیا تھا کیونکہ اب سردی کی وجہ سے چھوٹے موٹے نالے بھی جم چکے تھے اور برف نہیں پگھل رہی تھی۔۔۔ اور نانگا پربت ایسی دکھائی دیتی تھی جیسے ٹیلی ویژن آف کر دیں تو اس کی سکرین اندھیرے میں بھی نظر آتی رہتی ہے۔۔۔

گاڈفرے بڑے تنے کی اوٹ میں آگ جلا رہا تھا اور اس کی کیتلی میں چکن نوڈل سوپ ابل رہا تھا' اس کے بعد آملیٹ بھی تیار ہونا تھا۔۔۔

تھامس اور مشائلہ بھی ذرا کھلے اور اپنے بارے میں گفتگو کرنے لگے "ہم تبت میں تھے۔ کوہ کیلاش دیکھنے گئے۔ لاسہ اور کھٹمنڈو بھی دیکھا لیکن۔۔۔ ہمیں معلوم نہ تھا پاکستان میں یہ بھی ہے" اور "یہ" سے ان کی مراد وہ سب کچھ تھا جس کے حصار میں ہم بیٹھے تھے جو ہمارے آس پاس بلند تھا' جو اندھیرے میں بھی نظر آتا تھا۔۔۔

کھانے کے بعد ہمارے جرمن کک نے کافی کے گرم مگ ہماری ہتھیلیوں کے درمیان میں رکھ دیئے۔۔۔

گاڈفرے اپنے سلیپنگ بیگ میں لیٹ گیا اور سر کے نیچے بازو رکھ کر بولا۔ وہ ہم سے کچھ دور تھا اس لئے اندھیرے میں اس کی آواز آئی "اوپر دیکھو"

اوپر آسمان تاروں سے بھرا ہوا تھا۔۔۔

"او مائی گاڈ" مشائلہ تھامس کے بازو پر جھکی ہوئی بولی "یہ تارے تو اتنے نزدیک ہیں یہاں سے۔۔۔ تھامس میں قسم کھاتی ہوں یہ نیچے گر پڑیں گے۔۔۔" وہ بے حد سنجیدہ تھی۔۔۔

"اگر یہ نیچے گر پڑیں گے تو ہم انہیں اٹھا لیں گے۔۔۔" گاڈفرے کی ہنستی ہوئی آواز آئی اور "پھر انہیں اپنی جیبوں میں سنبھال لیں گے اور جب بھی اداس ہوں گے تو چپکے سے اپنی جیب میں جھانک لیا کریں گے۔۔۔ تم نے وہ گیت نہیں سنا کہ ایک ستارے کو سنبھال لو۔۔۔ اپنی جیب میں سنبھال لو برے وقتوں کے لئے۔۔۔"

"سنا ہے۔۔۔"

میں بھی منہ اٹھائے تاروں کو دیکھتا جاتا تھا۔۔۔ اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ اگر آپ نانگا پربت کی جانب دیکھتے رہیں تو تارے اس کے پیچھے سے طلوع ہوتے رہتے ہیں۔۔۔

"درختوں کی طرف دیکھو۔۔۔" گاڈفرے پھر بولا۔

اور چیڑ کے درختوں پر جو آسمان تھا اس میں بہت سارے ستارے یکدم ٹوٹ کر روشنی پھیلاتے گم ہو رہے تھے۔۔۔ ایک اور تارے نے سفید دودھیا راستہ بنایا۔

"اوہ۔۔۔" گاڈفرے یکدم بولا "تم نے ستارہ ٹوٹتے دیکھ کر کوئی خواہش کی؟"

"ہاں۔۔۔" میں نے اندھیرے میں سر ہلایا اور اندھیرے میں آنکھوں کی نمی نظر

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

نہیں آتی "میں نے خواہش کی کہ میں اپنے بچوں سے ملوں... آج انہیں دیکھے مجھے دس روز ہو گئے ہیں"

فیری میڈو کے چرواہوں کے کتے زور زور سے بھونکنے لگے۔

"بیس کیمپ نانگا پربت"

رات بہت گہری نیند آئی۔

ہمارے سلیپنگ بیگ بلندیوں کے آزمودہ تھے کیونکہ یہ کے ٹو کے بیس کیمپ سے ہو کر آئے تھے اور میجر مبشر کے تھے۔ اور ہمارا اگلو خیمہ مکمل طور پر ہوا بند تھا اور ہم اس کے اندر نہایت آرام سے تھے اور کبھی کبھار اس کا کپڑا ہوا کے زور سے ہلتا' یہ احساس دلانے کے لئے کہ باہر موسم سرد ہے... جب میں سلیپنگ بیگ میں گھس کر لیٹا ہوں تو مجھے کچھ الجھن سی محسوس ہوئی... جیسے سانس لینے میں دقت ہوتی ہو اور ہوا بدن میں کھینچنے کے لئے معمول سے زیادہ زور لگانا پڑتا ہو لیکن یہ بلندی کی وجہ سے تھا اور اس کا کوئی علاج نہ تھا۔ دوسری الجھن خاموشی کی تھی۔ ایک سناٹا--- اور اس سناٹے میں صرف رائے کوٹ گلیشیئر کے نیچے پوشیدہ دریا چلنے کی آواز--- خیمے کا کپڑا پھڑپھڑاتا ہوا--- مطیع کے مسلسل خراٹے--- تو اس ناآشنا خاموشی سے الجھن ہوتی... لیکن اس رات نیند بہت گہری آئی اور ایسی آئی کہ دل و دماغ کے اندر ان کی تہ میں گہری ہو کر بیٹھ گئی۔

ہاں رات کے پچھلے پہر میں جاگ گیا۔ کچھ ہوا تھا۔ کوئی تبدیلی تھی۔ کیا ہوا تھا؟... شاید دریا کا شور میرے کانوں تک نہیں آ رہا تھا کیونکہ سناٹا مکمل ہو چکا تھا۔ کیا دریا بند ہو گیا ہے؟ میرا نیم خوابیدہ ذہن سگنل بھیج رہا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دریا رک جائے... لیکن کچھ تو ہوا تھا کیونکہ دریا کے چلنے آواز نہیں آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے جب اس خاموشی کو قبول کر لیا تو ایک ہلکا سا دھماکہ ہوا اور اس کے ساتھ ہی دریا کی آواز پھر سے میرے کانوں میں آنے لگی... اور اس رات یہ عمل دو تین بار ہوا۔ دریا کی آواز بند ہو جاتی اور تھوڑی دیر کے بعد پھر سے جاری ہو جاتی۔ اگلے روز ایک مقامی چرواہے نے بتایا کہ دراصل زیر برف بہنے والے دریا کے راستے

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

ذرا خوفزدہ ہو کر' احتیاط سے اور مرعوبیت سے دیکھتے ہیں کہ اس پر ایک نظر آپ کو حقیر بنا کر رکھ دیتی ہے۔۔۔ یہ آپ سے پرے اپنی الگ دنیا میں ہے اور آپ اس دنیا میں داخل نہیں ہو سکتے۔۔۔ مجھے آج اس دنیا کے کنارے تک جانا تھا یعنی بیس کیمپ تک۔۔۔ دھوپ دیکھتے دیکھتے برف پر کھسکتی ہوئے آگے ہو رہی تھی۔۔۔ ایک چھوٹا سا بادل کہیں سے نمودار ہو کر نانگا پربت کی چوٹی کے گرد لپٹنے کی کوشش میں تھا۔

میرے سامنے نانگا پربت کی چوٹی تھی اور یہ آٹھ ہزار ایک سو چھبیس میٹر بلند تھی۔۔۔ اس کے دائیں جانب ذرا نیچے گنالو کی چوٹی تھی جس کی بلندی سات ہزار میٹر کے قریب ہے۔ نانگا پربت کے بائیں جانب تین خوبصورت چوٹیاں یکے بعد دیگرے نظر آتی ہیں یعنی سلور پیک۔ شاید اسے چاندی کی چوٹی اس لئے کہا جاتا ہو کہ دھوپ ادھر سے آتی ہے اور اس کی برفوں کو چاندی کی طرح چمکاتی ہے۔ سلور کوٹ کے بعد رائے کوٹ پیک ہے اور پھر چنگورہ پیک ہے۔

دریا ایک مرتبہ پھر رک گیا تھا۔

نانگا پربت کی بالائی تہیں مکمل دھوپ میں آ چکی تھیں لیکن رائے کوٹ گلیشیئر' برزل پاس' فیری میڈو اور جنگل سب کے سب ابھی گہرے سائے میں تھے۔

"کیا یہ تم ہو مسٹ آنسر۔۔۔" یہ تھامس کی آواز تھی۔ شاید میں کھانسا تھا۔

"ہاں۔۔۔"

تھامس کے خیمے کے قریب گاڈفرے سویا ہوا تھا۔ اس نے کروٹ بدلی اور وہ سویا ہوا نہیں تھا۔ "یہ بالکل مسٹ آنسر ہے تھامس اور یہ پچھلے آدھ گھنٹے سے یہاں بدھ بھکشوؤں کی طرح بیٹھا نانگا پربت کو دیکھ رہا ہے۔ اور میں اسے دیکھ رہا تھا"

"ادھر آ جاؤ گاڈفرے۔۔۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں میں اپنے سلیپنگ بیگ کی گرمی اور اپنے چہرے کو نوچ کرتی سردی سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔۔۔"

"رات کیسی گزری؟"

"بہت شاندار۔۔۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے داڑھی میں زور سے کھجلی کی اور سلیپنگ بیگ کو لپیٹ کر میرے پاس آ گیا۔ "مجھے یاد آیا کہ آج ہم نے بیس کیمپ تک جانا ہے۔ اور رات بہت شاندار تھی۔۔۔ یورپ میں لوگ کھلی فضا میں سونے کے مزے کو بالکل نہیں جانتے۔۔۔ کروڑوں لوگ ہیں جو آج تک باہر گھاس پر یا اپنے فارم کے کسی کھیت میں کھلی فضا میں نہیں سوئے۔۔۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی خطرناک بات ہے۔ میں بھی یہی سمجھتا تھا۔ پھر میں آسٹریلیا گیا تو وہاں پہلی بار اپنی

میں کبھی کبھار بہت بڑا تودا گر جاتا ہے اور اسے بند کر دیتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ پانی کا دباؤ بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے راستے میں آئے ہوئے برفانی تودے کو دھکیل کر حسب معمول بہنے لگتا ہے۔

باہر ہلکی سی روشنی ہوئی تو میں نے ٹارچ جلا کر وقت دیکھا۔ ساڑھے چار بج رہے تھے۔ میں نے خیمے کے پردے کی زپ اتاری اور باہر جھانکا۔ نانگا پربت ایک صاف آسمان میں اور نانگا پربت سے مراد صرف ایک چوٹی یا پہاڑ نہیں ہے بلکہ نانگا پربت کا سلسلہ کوہ ہے جس میں کئی چوٹیاں اور درے شامل ہیں۔ برف کے قلعے اور سفید دیواریں۔ رائے کوٹ چوٹی کی جانب سے برف کا ایک چھوٹا سا حصہ دھوپ میں آ رہا تھا۔۔۔ میں خیمے سے باہر آیا اور ربڑ میٹرس بچھا کر بیٹھ گیا۔ سردی تھی لیکن بے آرام نہیں کرتی تھی' صرف اپنے ہونے کا پتہ بتاتی تھی۔ نانگا پربت ایک پکچر پوسٹ کارڈ کی طرح سفید اور شفاف اور ایک ایک تفصیل کے ساتھ دکھائی دے رہی تھی۔۔۔ اس صبح وہاں اور کوئی نہ تھا جو اسے دیکھتا تھا۔ فیری میڈو میں گھنے جنگل اور رائے کوٹ گلیشیئر کے آس پاس کوئی نہ تھا جو میری طرح اس پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

یہ علاقہ وہی تھا جسے قدیم زمانہ میں دردستان کہتے تھے۔ یہ عظیم ہمالیہ کا وہ مغربی حصہ ہے جو وادی کشمیر سے کھسکتا ہوا دریائے سندھ کے قریب قراقرم کے سامنے آ جاتا ہے۔ اور ہمالیہ کا یہ حصہ نانگا پربت کی عظیم چوٹی کے حوالے سے جانا جاتا ہے۔ آج ان علاقوں کو دیامر کہتے ہیں۔ ننگا پہاڑ۔۔۔ اور یہی نانگا پربت کا مقامی نام ہے۔۔۔ اسے دیاموری بھی کہتے ہیں۔ اسے قاتل چوٹی اس لئے کہا گیا کہ اب تک پچاس کے قریب کوہ پیما اسے زیر کرنے کی خواہش میں خود زیرِ زمین جا چکے ہیں۔ بلکہ زیرِ برف کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ اور اس قتل کا آغاز پہلی برطانوی مہم کے لیڈر ممری سے ہوا جو ۱۸۹۷ء میں نانگا پربت کی جانب آئی۔ ممری کے ایک ساتھی نارمن کولی نے حادثے کے بعد اپنی ڈائری میں لکھا۔

"سورج کی روشنی اور خوبصورتی ختم ہو گئی۔ وحشی' ظالم اور دھتکارتی ہوئی نانگا پربت۔۔۔ اس اجنبی سرزمین میں صرف خوف اور وحشت ہے۔ اور سب سے زیادہ خوفناک احساس یہ ہے کہ۔۔۔ یہ چیز آپ کے سامنے ننگی کھڑی ہے اور اسے پرواہ تک نہیں۔۔۔ کچھ بھی پوشیدہ نہیں۔۔۔ اس کی پتھریلی بدتمیزی' اس کی ظالمانہ وحشت اور انسان کی کوششوں سے مکمل لاپرواہی ایسی چیزیں ہیں کہ انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ جگہ کسی اور دنیا میں واقع ہے۔۔۔"

اور یہ درست ہے۔۔۔ آپ نانگا پربت کو لاپرواہی یا پیار سے نہیں دیکھتے بلکہ

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

بھیڑوں کے فارم پر باہر سویا- اور میں تمہیں بتاتا ہوں کہ یہ تو ایک بالکل نئی زندگی تھی- اور مسٹ آنسر کھلی فضا میں سونے سے آپ اپنے چہرے پر موسم بدلتے ہوئے محسوس کرتے ہیں- جب ہوا آتی ہے- جب اوس پڑتی ہے- جب دھوپ چمکتی ہے- تو یہ سب کچھ تم خود محسوس کرتے ہو- کئی بار ایسا ہوا کہ اوس پڑ رہی تھی تو میں جاگ گیا اور پھر اس کی نمی کی پھوار کو محسوس کرتا مسکراتا رہا--- میں تمہارے لئے کافی بناؤں؟"

"نہیں نہیں- شکریہ"

"لیکن میں تو تمہارا آفیشل کک ہوں--- کک گاڈفرے" وہ اٹھ کر درختوں کی جانب چلا گیا....

مشائلہ نے خیمے میں سے سر باہر نکالا "گڈ مارننگ"

"گٹن مارگن---"

"آہ تم جرمن بولتے ہو---"

"بس اتنی سی ہی--- کیا ہم روانہ ہو رہے ہیں یا نہیں---؟"

اس کا سر خیمے کے اندر ہوا- پھر باہر آیا "بس پانچ منٹ----"

پانچ منٹ میں کک گاڈفرے نے کافی تیار کر لی.... اور پانچ منٹ میں تھامس اور مشائلہ تیار ہو کر خیمے سے باہر آ گئے- مطیع نیند میں تھا اور اس نے نیند میں ہی اعلان کیا تھا کہ "سکیوں ٹھنڈ لگ وسی" اس یادگار صبح کی ایک تصویر میرے سامنے ہے جو گاڈفرے نے اتاری تھی.... ہم تینوں اتنے گہرے سائے میں ہیں کہ بمشکل نظر آتے ہیں پہاڑی سے اتر رہے ہیں' مشائلہ نے ایک چھوٹا سا رک سیک اٹھا رکھا ہے جس پر اس کے سنہری بالوں کے چوٹی آرام کر رہی ہے اور وہ ہائکنگ سٹک کے سہارے اتر رہی ہے- تھامس کے پاس پانی کی بوتل ہے اور اس کی عینک کے شیشے گہرے سائے میں بھی چمکتے ہیں اور اس کے آگے میں ہوں' قدرے جھکا ہوا ہائکنگ سٹک تھامے- شلوار قمیض اور ایک ہلکے سویٹر اور سفید پی کیپ میں--- لیکن اس تصویر میں یہ کردار اہم نہیں اس کا اصل جلال سائے سے نیچے رائے کوٹ گلیشیئر کے سرمئی دریا اور پھر مکمل طور پر دھوپ سے روشن نانگا پربت میں ہے.... یوں لگتا ہے ان برفوں میں دوپہر ہو چکی ہے-

ہم چاروں اپنی چھڑیوں پر بوجھ ڈالتے نیچے فیری میڈو میں آ گئے.... یہاں ابھی تک تنہائی تھی.... اور خالی ہونے کی بنا پر اب یہ خاصا بڑا لگ رہا تھا.... اور اس صبح میں نے جانا کہ فیری میڈو کیا ہے---- نانگا پربت سیاہ جنگل کے اوپر ایک سفید جہاز

کی طرح لنگر انداز ہوئی تھی اور چراگاہ کے درمیان بہنے والے پانی صبح کی روشنی میں ایسے تھے جیسے پارے کی ندی ہو.... دائیں جانب کے پہاڑوں سے برف کی منجمد ندیاں نیچے تک آ رہی تھیں....

ہم جنگل میں داخل ہو گئے.... بلکہ جنگل ہمارے اندر آیا اور رس بس گیا کیونکہ اگلے ایک گھنٹے کے لئے ہم اس کا ایک حصہ تھے.... چیڑ کے بلند درختوں کے نیچے چیڑ کے خشک بال ڈھیروں کی صورت میں پڑے تھے- تنوں کے گرد باریک پتوں کی بیلیں سبز سانپوں کی طرح لپٹی ہوئی تھیں اور یہ درخت بے حد قدیم تھے.... مشائلہ چلتے چلتے جھکی--- "تھامس---" تھامس اس کی قریب ہوا "تھامس جنگل کے فرش پر بچھے ہوئے یہ پودے دیکھو--- کیا زرد مرکز اور سفید پتیوں والا یہ پھول سٹرابری کا نہیں ہے؟"

تھامس نے جھک کر ان لاتعداد پھولوں کو دیکھا جو فرش کے ساتھ بچھے ہوئے تھے.... "تم درست کہتی ہو یہ سٹرابری کے پودے ہیں--- لیکن اتنے زیادہ--- پورا جنگل بھرا پڑا ہے...."

میں نے سٹرابری کے پودے کو بڑھتے اور پھول کے بعد پھل بنتے دیکھا تھا اور میں جانتا تھا کہ اگلے پانچ چھ ہفتوں کے اندر اندر اس پورے جنگل میں سرخ سٹرابری بچھی ہو گی....

جنگل میں ایک چھوٹی سی ندی بہتی تھی اور اس کے پانیوں کے اندر بھی سبزہ تھا کہ اس کی گہرائی کہیں بھی ایک دو فٹ سے زیادہ نہ تھی.... اور اس کے پانیوں میں چیڑ اور برچ کے سفید درخت جانے کن صدیوں سے گرتے تھے اور کھوکھلے ہو کر دھیرے دھیرے ختم ہو جاتے تھے.... یہ اس کے سفید اور سبز پانیوں میں آڑے ترچھے اور بے بس ہو کر سفید اور سیاہ ڈھانچوں کی طرح پڑے تھے- ان ڈھانچوں کو با آسانی اٹھایا جا سکتا تھا کہ یہ مسلسل بارش اور برف باری سے کھوکھلے ہو چکے تھے.... ان گرے ہوئے درختوں میں سے نئے درخت اور پودے پھوٹ رہے تھے ...... یہ جنگل مختلف تھا--- اس لئے کہ جب سے یہ وجود میں آیا تھا تب سے یہاں کوئی لکڑہارا داخل نہیں ہوا تھا.... یہاں قدرت کا ایک نظام اپنے حساب سے جاری و ساری تھا.... درخت اگتے تھے' اپنی طبعی عمر کو پہنچتے تھے اور پھر یا تو کسی طوفان یا تیز ہوا کے باعث گر جاتے تھے اور یا پھر وہیں کھڑے کھڑے سوکھ جاتے تھے اور ذرا سی ہوا سے بھی چرچراتے تھے اور ہم جیسے مسافروں کو ڈراتے تھے کہ ہم گر سکتے ہیں.... اور ہمارے

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

سامنے ایسا ہوا... چنانچہ ہم ذرا خوف میں بھی چلتے تھے۔ یہاں ہم زمین پر نہیں چلتے تھے، کیونکہ یہاں زمین تھی نہیں—— ہزاروں برسوں سے جو پتے، ٹہنیاں اور تنے گرتے تھے وہ ایک مسامدار نیم سیاہ برادے کی صورت میں ذرہ ذرہ بجتے چلے جاتے تھے... اس برادے میں پانی آسانی سے جذب ہوتا تھا اور اس میں سے گھاس اور پھول نکلتے تھے... یہ فوم کی طرح نرم تھا اور اس پر چلنے سے پاؤں کو آرام ملتا تھا۔ میں نے کبھی ایسا منظر نہیں دیکھا تھا۔ سورج کی روشنی ادھریوں بھی کم آتی تھی اور ابھی تو یہ جنگل سائے میں تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ ادھر سے کوہ پیما گزرتے رہتے ہیں اور یہ چراگاہ کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود ایسا لگتا تھا کہ ہم پہلے انسان ہیں جو اس کی ہزاروں برس کی تنہائی میں مخل ہوئے ہیں... یہ قدرت کا ایک معبد تھا اور ہم اس میں جوتوں سمیت چلے آئے تھے... جیسے یہ نانگا پربت سے اترنے والی روایتی پریوں کا باغ تھا... برف کی پریاں مینڈک اور سفید اژدھے اس کے مکین تھے... جہاں جہاں پانی چلتا تھا وہاں کناروں کے ساتھ چیڑ کے جو چھوٹے درخت تھے ان پر بانسائی درختوں کا گمان ہوتا تھا یعنی چھوٹے چھوٹے لیکن جزئیات میں مکمل... جیسے کسی جادوگر نے انہیں چھوٹا بنا دیا تھا... ہمارا راستہ جنگل میں سے نکل کر اس بلندی پر آگیا جہاں رائے کوٹ گلیشیئر گہرائی میں تھا اور ابھی سائے میں تھا۔ البتہ اس پر عمودی کھڑی چٹانوں میں سے گھاس اور سرخ پھولوں کی لڑیاں لٹکتی تھیں اور ان لڑیوں اور نیچے برف کے درمیان سینکڑوں میٹر کا فاصلہ تھا... دھوپ اس چٹان پر اترنے کو تھی۔

یہاں سے ایک راستہ، بلکہ چھوٹی سی پگڈنڈی اترتی تھی۔ ہم بے حد احتیاط سے اس پر اترنے لگے... اور یہیں سے بیال کیمپ کا علاقہ شروع ہوتا تھا۔ اس کے درمیان میں بھی ایک ندی چلتی تھی لیکن یہ ایک باقاعدہ ندی تھی اور اس میں تیزی بھی تھی اور گہرائی بھی۔ لیکن یہ نظر کم آتی تھی کیونکہ ہم اپنے ہی قد کے چھوٹے چھوٹے چیڑ کی درختوں میں چلتے تھے۔ موٹے موٹے مور پنکھ کے درختوں کے بیچوں بیچ چلتے تھے اور اگرچہ ایک دوسرے کے آگے پیچھے چلتے تھے لیکن ایک دوسرے کو نظر نہیں آتے تھے اور ہر شخص اپنے آپ کے ساتھ تنہا تھا۔ یہ علاقہ ایک جاپانی باغ کی طرح تھا... اس میں درخت پودے اور جھاڑیاں ایسی تھیں جیسے باقاعدہ منصوبہ بندی سے لگائی گئی ہوں... اور یہ سب چیزیں مختصر تھیں۔ بیال کیمپ کا یہ حصہ خوبصورتی کی ہیٹ ٹرک تھا... پہلے کستوری۔ پھر قدیم جنگل اور اب یہ جاپانی باغ۔

ہم سانس لینے کے لئے رکے اور ندی سے پانی پینے کی کوشش کی... لیکن پانی کو لبوں تک لانے سے پیشتر ہی ہتھیلی سن ہو جاتی اور ہم پیاسے رہ جاتے... اور ہاں کئی بار مور پنکھ کے گھنے درخت یوں لگتے جیسے موٹے موٹے سبز ریچھ دونوں ٹانگوں پر بیٹھے ہمیں دیکھ رہے ہیں اور ہم ٹھٹک جاتے... اور یہاں پرندے بہت کم دکھائی دیتے... شنید تھا کہ مارخور کے علاوہ ان خطوں میں رام چکور اور مرغ زریں پایا جاتا ہے... مارخور تو ظاہر ہے، ادھر بزنل پاس کے آس پاس ہوتا ہوگا اور ادھر اگر مرغ زریں تھا تو فی الحال کسی کنج میں پوشیدہ، خوابیدہ تھا اسے احساس نہ تھا کہ صبح ہو چکی ہے اور چند مسافر ادھر سے گزرتے ہیں۔

بیال کیمپ کے جاپانی باغ کے بعد درخت ذرا کم ہو گئے اور ایک سرسبز ڈھلوان اور بیال کیمپ کے ویران گاؤں کے اوپر ایک بار پھر نانگا پربت کسی منہ زور سیلاب کی طرح یکدم رکی ہوئی نظر آئی... جیسے یہ اب ہمارے اوپر آگرے گی... بیال کیمپ بھی تاتو اور منھاتھ کے باشندوں کا سرکیمپ ہے... وہ یہاں اپنے مویشی چرانے آتے ہیں اور پھر سردیوں میں واپس چلے جاتے ہیں... ہم گاؤں کے جھونپڑوں کے پاس سے گزرے تو وہاں بالکل ویرانی تھی... پھر ایک بچہ دوڑتا ہوا ہمارے پاس آیا اور اپنی بند مٹھی ہماری آنکھوں کے پاس لا کر کھول دی... اس میں پتھر کے چند ٹکڑے تھے۔ وہ اپنی زبان میں کچھ کہتا تھا جو ہماری سمجھ سے باہر تھا... ہم سب نے اس کے ساتھ زبردستی ہاتھ ملایا تو وہ خوفزدہ ہو کر بھاگ گیا... بیال کیمپ سے آگے تھوڑی چڑھائی تھی اور یہاں دو چرواہے جو ہمیں دور سے دیکھتے تھے میرے بلانے پر قریب آ گئے۔ ان کے ساتھ ساتھ ان کی کل بکریاں بھی ہمارے قریب آ گئیں... مشاکلہ نے "ہاؤ سویٹ" کہہ کر ان کو باری باری پیار کرنا شروع کر دیا... بلکہ ایک بکری جو یقیناً بکرا تھا مشاکلہ کی زانوں پر منہ رکھ کر تقریباً مست ہو گیا... اس پر سب نے تھامس کو ذرا چھیڑا کہ بڑے میاں یہ بکرے آپ کے رقیب ہو گئے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ جب بھی تھامس مشاکلہ کے قریب جاتا تو وہ بکرا اسے ٹکر مارنے کے لئے پوزیشن لے لیتا...

یہ بیال کیمپ کا آخر تھا... اور سبزے اور خوبصورتی کا بھی... کیونکہ آگے نانگا پربت تھی... سیاہ اور خطرناک چٹانیں... بھربھرے پہاڑ اور گلیشیئر...

میں نے نوجوان چرواہے سے ہیں کیمپ جانے والے راستے کے بارے میں دریافت کیا... وہ ہمیں اس مقام پر لے گیا جہاں ایک بہت بڑی چٹان تھی، جہاں سے

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

دہشت کا آغاز ہوتا تھا.... نیچے ہمارے قدموں میں رائے کوٹ گلیشیئر کے سرمئی اہرام تھے.... اہرام اس لئے کہ مسلسل پھیلاؤ اور سکڑنے کے باعث اس کی برفوں کی شکل ٹکونوں میں بٹ چکی تھی اور یہ سینکڑوں بھاری برفیلی ٹکونیں آہستہ آہستہ حرکت کرتی تھیں اور ان میں سے آواز آتی تھی۔ یہاں زندگی میں میں نے پہلی بار گلیشیئر کی آواز سنی.... ایک کڑکڑاہٹ.... جیسے کچھ ٹوٹ رہا ہو اور یہ آواز دل کو خوف سے بھرتی تھی.... تو ہمارے قدموں میں تقریباً آدھ کلومیٹر نیچے سرد سرمئی اہراموں کا ایک منجمد دریا تھا جو کڑکڑاتا تھا اور شاید اپنی جگہ بدلتا تھا اور جہاں یہ ختم ہوتا تھا وہاں سے نانگا پربت کے سفید گلیشیئر شروع ہو جاتے تھے.... اور نانگا پربت پر دھوپ کم ہونے لگی تھی اور ایک گہری دھند نیچے آ رہی تھی.... صرف میں نہیں سب لوگ اس منظر کو دیکھ کر خاصے دہشت زدہ ہو گئے.... ہمیں تو آگے جانے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن چرواہے نے ایک کچی لکیر کی طرف اشارہ کیا جو ہمارے نیچے رائے کوٹ گلیشیئر سے تقریباً دو سو میٹر کی بلندی پر اس بھربھری پہاڑی میں نظر آ رہی تھی جو گلیشیئر کے ساتھ ایک سو بیس ڈگری کا زاویہ بنا رہی تھی۔

"ہاں...." گاڈفرے نے سر ہلایا "یہ راستہ میرے لئے نہیں ہے"

"کیا تم ڈر گئے ہو؟" میں نے ایک مردہ مسکراہٹ سے بہادر بننے کی کوشش کی۔

"ہاں" گاڈفرے نے صرف اتنا کہا۔

نوجوان چرواہے کو ہم نے اشارہ کیا کہ وہ چلا جائے کیونکہ ہم اس کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر سکتے تھے....

"یہ راستہ میرے لئے بھی نہیں ہے...." خاصی دیر بعد مشائلہ بولی۔

"کیا تم بھی ڈر گئی ہو؟" میری آواز بیٹھنے لگی۔

"ہاں، میں اس کچے راستے میں گر کر گلیشیئر میں غائب ہونا پسند نہیں کروں گی...."

"واپس چلیں" میں نے فوراً کہا....

تھامس نے عینک اتار کر اس کے شیشے صاف کئے اور پھر اپنی ٹھوڑی پکڑ کر بولا "یہ راستہ اتنا خطرناک نہیں جتنا کہ دکھائی دیتا ہے.... سب لوگ ادھر سے ہی آتے ہیں اور اتنی دور آ کر بیس کیمپ تک نہ جانا' عمر بھر کا پچھتاوا ہو گا...."

"ہاں یہ بھی ہے...." مشائلہ دانت بھینچ کر کہنے لگی "تم چلو گے؟"

"کون میں؟" میں نے بدک کر کہا.... "ہاں کیوں نہیں...." اور یہ میں نے سوچے سمجھے بغیر کہا تھا۔

"تو پھر فیری میڈو میں آج شام ملاقات ہو گی.... میں نے جتنی نانگا پربت دیکھنا تھی دیکھ لی.... میرے لئے یہی کافی ہے...." گاڈفرے نے ہم تینوں سے ہاتھ ملایا اور سیٹی بجاتا ہوا ان چرواہوں کے پاس چلا گیا جو دور کھڑے ہمارا تماشا دیکھ رہے تھے۔

"آؤ...." تھامس نے کہا۔

ہم اس پہاڑی سے ذرا نیچے گئے اور پھر کچی پگڈنڈی پر آگے پیچھے چلنے لگے.... اور یہ راستہ اتنا ہی خطرناک تھا جتنا کہ یہ اوپر سے دکھائی دیتا تھا۔ ہمارے اور رائے کوٹ گلیشیئر کے درمیان کچھ نہ تھا.... پاؤں تلے جتنے کنکر آئے اور لڑھکے وہ دو سو میٹر کی ڈھلوان پر بلا روک ٹوک رفتار پکڑتے نیچے گلیشیئر کی گہرائی میں گم ہوئے.... راستے میں روکنے کے لئے نہ کوئی جھاڑی تھی نہ کوئی پتھر.... صرف بھربھرے سنگریزے تھے.... میں نے صرف ایک بار رک کر نانگا پربت کو اپنے اوپر امڈتے دیکھا وہاں دھند اتر رہی تھی لیکن یہاں ابھی دھوپ تھی اور یہ ایک نہایت شاندار اور عظیم الشان منظر ہوتا اگر میں اسے اپنے گھر میں کافی پیتے ہوئے ٹیلی ویژن پر دیکھتا.... لیکن یہ میرے سامنے تھا اور میں ایک بھربھری پہاڑی پر معلق تھا اور نیچے رائے کوٹ گلیشیئر مسلسل چٹختا تھا۔ بولتا تھا جیسے بلاتا ہو.... اور اس کے نیچے جو پوشیدہ دریا تھا اس کا شور بھی ہم تک پہنچتا تھا اور اس وقت ہم نانگا پربت کے دامن کی وسعت میں اکیلے تھے اور نہ کوئی ہمیں دیکھتا تھا اور نہ ہم کسی کو دیکھتے تھے.... تو دائیں ہاتھ پر رائے کوٹ گلیشیئر کا نوکیلا شہر نیچے تھا اور بائیں ہاتھ پر بھری بھری سنگریزوں والی پہاڑی آسمان کو جاتی تھی اور اس کی ڈھلوان پر کہیں کہیں صرف گھاس سرسراتی تھی....

اوپر ہمارے سروں کے عین اوپر نانگا پربت پر ایک مدھم سی گڑگڑاہٹ ہوئی.... اور یہ کوئی برفانی تودہ نہ تھا بلکہ گہرے بادل تھے جو گھنے ہو رہے تھے....

ہم تینوں صرف کچے راستے کو دیکھتے تھے اور ہماری احتیاط ہمارے قدموں میں تھی.... یہاں احساس ہوا کہ ایسے علاقے کے لئے جاگر شوز نہایت بے کار ہوتے ہیں اور خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ بھربھری جگہوں اور سنگریزوں پر نہیں ٹھہرتے.... یہاں کے لئے ہائیکنگ بوٹ ازحد ضروری ہیں.... عجیب بات تھی کہ پسینہ صرف میرے پاؤں میں تھا چہرے پر نہ تھا.... بادل زیادہ گرجنے لگے اور ان کی آواز

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

گلیشیئر کے چٹخنے کی ساتھ مل کر زیادہ ڈراؤنی لگتی تھی.......... اس لئے میرے اندر اس عظیم الشان پہاڑ سے لطف اندوز ہونے کا احساس ختم ہو گیا اور میں اس سے خوفزدہ ہونے لگا.... میری خواہش تھی کہ میں واپس چلا جاؤں.... لیکن اس چھوٹے سے راستے سے مڑنا بھی دشوار تھا....

بیس کیمپ اب دور نہیں تھا۔ چوٹی کے عین نیچے جہاں گلیشیئر ختم ہو رہا تھا اس کے دامن میں.... زیادہ سے زیادہ ایک کلومیٹر دور....

رائے کوٹ گلیشیئر یکدم بل کھا کر مڑا.... ہمارا راستہ نیچے ہوا اور تھوڑی دیر میں ہم اس کے کنارے پر چلنے لگے اور یہاں کوئی خطرہ نہ تھا.... یہیں پر وہ نالہ ہمارے سامنے آیا جسے ہم نے واپسی پر دو بجے سے پیشتر عبور کرنا تھا۔ ابھی اس میں پانی خاصا کم تھا۔ ہم پتھروں کو پھلانگتے پار چلے گئے۔

"ویسے یہ نالہ تھوڑی دیر میں ناقابل عبور ہو سکتا ہے کیونکہ بہاؤ میں تیزی آ رہی ہے----" تھامس کہنے لگا.... لیکن اب ہم ایک اطمینان کی کیفیت میں چلتے تھے اور ہمارے دل میں صرف ایک ڈر تھا کہ واپسی پر ہمیں اسی کچے راستے پر چلنا ہو گا۔

اور پھر جیسے پلک جھپکتے ہی موسم بدل گیا---- ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی---- ہمارے اوپر چوٹی دھند اور سیاہ بادلوں میں گھری ہوئی تھی اور یہ گہری دھند ذرا نیچے ہونے لگی اور پھر بوندا باندی شروع ہو گئی۔ اور یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ یہ بوندیں تقریباً برف ہی تھیں.... اور مجھے اپنی ایک اور حماقت کا بھی احساس ہوا کہ میں صرف ایک باریک سویٹر نما جرسی ساتھ لایا تھا اور میرے پاس بھاری جیکٹ ہونی چاہئے تھی.... تھامس اور مشائلہ پورا بندوبست کر کے نکلے تھے چنانچہ انہوں نے رک کر بیگ میں سے جیکٹس نکال کر پہنیں اور ان پر بارش سے بچانے کے لئے برساتیاں اوڑھ لیں....

اور میں شلوار قمیض ...... میں چلا جا رہا ہوں خدا کے سہارے.........

اور پھر گلیشیئر ہمارے راستے میں آ گیا.... ہم تینوں رک گئے.... یہ تقریباً سو میٹر چوڑا تھا اور ہمیں اسے عبور کر کے دوسری طرف جانا تھا جہاں بیس کیمپ تھا.... چند پتھر ان مقامات کی نشاندہی کر رہے تھے جہاں سے گلیشیئر قابل عبور تھا.... ہم رکے رہے کیونکہ گلیشیئر کے ساتھ خرمستیاں نہیں کی جا سکتیں.... اس میں دراڑیں ہوتی ہیں جن میں پھسل کر آپ ایک عظیم اور اندھیرے آئس بکس میں جا گرتے ہیں اور پانچ منٹ کے اندر اندر گلیشیئر کا حصہ بن جاتے ہیں اور جہاں سے گلیشیئر نرم ہو جائے وہ ایک طرح کی برفانی دلدل ہوتی ہے اور ہم تو پہلے سے خاصے دہشت زدہ ہو

چکے تھے اور اوپر سے بادل نانگا پربت سے نیچے آ رہے تھے۔

"کیا خیال ہے!" میں نے چھڑی سے گلیشیئر کی نرم برف کو محسوس کرتے ہوئے تھامس سے پوچھا اور اس لمحے نانگا پربت سے ایک تیز ہوا میرے چہرے تک آئی تھی اور اسے یخ کرتی تھی.... بوندا باندی کم ہو چکی تھی۔

"گلیشیئر عبور کرنے کا میرا کوئی تجربہ نہیں----" وہ فکرمندی سے بولا۔

"جہاں جہاں برف پر پتھر پڑے ہیں وہ راستہ ہو گا---- یہاں کے لوگوں نے رکھے ہوں گے----"

"یہاں رہتا کون ہے---- نہیں میں تو رسک نہیں لے سکتا"۔ تھامس نے فیصلہ دے دیا....

"ہم بیس کیمپ نہیں دیکھ سکیں گے----" مشائلہ روہانسی ہو گئی۔

"یہ ضروری تو نہیں کہ بیس کیمپ کو ہاتھ لگا کر دیکھا جائے.... یہ سامنے ہی تو ہے.... واپس چلیں؟" تھامس نے مجھ سے پوچھا اور اس سے پیشتر میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ کچھ ہو جائے میں اس مخدوش گلیشیئر پر قدم نہیں رکھوں گا اور اگر تھامس اینڈ مشائلہ جاتے ہیں تو جائیں میں ان کا یہیں بیٹھ کر انتظار کروں گا---- چنانچہ میں نے بظاہر لاپروائی سے کہا "ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی.... ویسے میرے خیال میں اس گلیشیئر کو آسانی سے عبور کیا جا سکتا ہے----"

"ٹھیک ہے----" تھامس ایک پتھر پر بیٹھ گیا "تم ہو آؤ ہم یہاں انتظار کرتے ہیں----" اور وہ ہنس رہا تھا اور وہ جانتا تھا کہ میں کتنا خوفزدہ ہو چکا ہوں---- تب میں نے بھی ہنسنا شروع کر دیا اور مشائلہ بھی نہ رہ سکی اور ہماری اس ہنسی میں شامل ہو گئی جو ہماری نانگا پربت سے قریب ترین ہنسی تھی.... اوپر موسم زیادہ خراب ہو رہا تھا اور ہمیں واپس جانا تھا.... بادل اور دھند اس گلیشیئر تک آ چکے تھے جسے ہم چوم کے چھوڑ رہے تھے....

"اور ہاں----" تھامس ہنستا ہوا رک گیا۔ "کم از کم میں اس کچے راستے سے واپس نہیں جاؤں گا۔ وہ کچھ زیادہ ہی خطرناک ہے----"

"اس کے علاوہ اور کون سا راستہ ہے؟" میں نے اس کی جانب دیکھا اور وہ اوپر پہاڑی کی طرف دیکھ رہا تھا....

"ہم اگر کسی طرح اس پہاڑی پر چڑھ جائیں تو دوسری جانب یقیناً ٹریل کیمپ ہو گا.... ہم ادھر اتر جائیں گے----"

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"لیکن اس پر کوئی راستہ نہیں ہے اور راستے کے بغیر پہاڑوں میں شارٹ کٹ کرنا دانشمندی نہیں ہے۔۔۔"

"یہ دانشمندی نہیں ہے اور جس راستے پر سے ہم آئے ہیں اسی پر سے واپس جانا انتہائی بے وقوفی ہے۔۔۔ میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا لیکن میں نیچے چٹختے ہوئے گلیشیئر سے اتنا خوفزدہ تھا کہ میں بول نہیں سکتا تھا اور میری ٹانگوں میں سکت نہیں تھی۔۔۔ میں اس راستے سے واپس نہیں جاؤں گا"۔

"یہ پہاڑی بھی تو خاصی سٹیپ دکھائی دیتی ہے اور سیدھی چلی جا رہی ہے بغیر کسی جھاڑی یا پتھر کی رکاوٹ کے۔۔۔"

میں بھی اس راستے سے نہیں لوٹنا چاہتا تھا لیکن اس پہاڑی کے تیور بھی مجھے اچھے نظر نہیں آ رہے تھے۔۔۔

"تھامس مجھے بھوک لگی ہے۔۔۔ ہم پہلے لنچ کیوں نہ کر لیں؟" مشائلہ نے کہا۔۔۔

"یہ تمہارا آخری لنچ ہو گا۔۔۔" تھامس نے سر ہلایا "یہاں نہیں۔۔۔ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے۔۔۔"

اور واقعی یہ ایک عجیب' اس دنیا سے باہر کی جگہ تھی۔۔۔ یہاں کوئی نہ تھا سوائے پہاڑوں کی آخری عظمت اور خوف کے۔۔۔ بادل کی گرج اگرچہ گنج سے آتی تھی لیکن مسلسل تھی اور تاریکی بڑھ رہی تھی اور ابھی صرف ڈیڑھ بجا تھا۔۔۔ مشائلہ اپنے سویٹر سے کمر بستہ ہوئی اور ہائیکنگ سٹک سے پہاڑی کو تھپک تھپک کر یکدم اوپر چڑھنے لگی۔۔۔ وہ جہاں جہاں قدم رکھتی تھی وہاں سے سنگریزے حرکت کرتے ہوئے نیچے آنے لگتے لیکن وہ بہت تیزی سے اوپر گئی۔۔۔ تقریباً بیس فٹ اوپر جا کر اس نے آس پاس کی صورت حال کا جائزہ لیا اور کہنے لگی "آگے زیادہ مشکل نہیں ہے۔۔۔ آ جاؤ"۔

پہلے تھامس گیا اور میں دیکھ رہا تھا کہ وہ مشکل سے گیا۔۔۔ اور ہاں اس مقام پر بھی رائے کوٹ گلیشیئر نیچے سے چیخ رہا تھا اور اوپر سے جتنے چھوٹے چھوٹے پتھر اپنی جگہ چھوڑ رہے تھے وہ سیدھے گلیشیئر میں ہی جا رہے تھے چنانچہ اگر آپ لڑھکتے ہیں تو ان پتھروں کے نقش قدم پر لڑھکتے گلیشیئر کو جاتے ہیں بہرحال اب کوئی چارہ نہ تھا۔۔۔ میں نے ہمت کی اور مشائلہ کی ہدایات کے مطابق اور وہ بھی جہاں کھڑی تھی مشکل سے کھڑی تھی اور مسلسل ہدایات دیئے جا رہی تھی اور میں ان پر عمل کرتا تیزی سے اوپر چڑھنے لگا۔ لیکن مجھے میرے پہلے قدم نے بتا دیا کہ بھائی جان آپ نے حماقت کی ہے۔۔۔ اس پہاڑی پر صرف گھاس اور چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں تھیں اور بھربھرے سنگریزے تھے چنانچہ قدم تو کہیں نہ جمتا تھا۔ یوں بھی ڈھلوان کی وجہ سے قدم ٹیڑھا پڑتا تھا اور پورے جسم کا زاویہ معلق سی حالت میں بنتا تھا۔ یہ بہت مشکل کوہ پیمائی تھی اور میں اس کے لئے ذہنی طور پر کم اور جسمانی طور پر زیادہ ناموزوں تھا۔۔۔ تھامس اور مشائلہ مجھ سے کم عمر تھے اور ان کے بدن ریس کے گھوڑے کی طرح کے ہوئے تھے۔۔۔ بہرحال میں نے ایک دانشمندی کی کہ کہیں رکا نہیں اور گرتا پڑتا اس مقام پر پہنچ گیا جو نیچے سے تقریباً بیس فٹ کی بلندی پر تھا۔۔۔ مشائلہ فوراً آگے چل دی۔۔۔ اور تھامس بھی۔۔۔ انہوں نے خاصی بلندی پر جا کر کہا کہ بس آگے تو میدان ہے۔ ہمت کرو اور آ جاؤ۔۔۔

"میں واپس جاؤں گا۔۔۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور میں جانتا تھا کہ میں واپس نہیں جا سکتا۔

"نہیں۔۔۔ اب بہت بہتر ہے" مشائلہ اپنی سٹک سے دوسری جانب اشارہ کر رہی تھی اور ایسے اشارہ کر رہی تھی جیسے دوسری جانب پنجاب کے میدان ہیں "اب بہت بہتر ہے۔۔۔ آ جاؤ"۔

اور بہتر یہ تھا کہ اب سنگریزوں کی بجائے گول گول پتھر تھے جن پر پاؤں رکھتا تو وہ رولر سکیٹس کی طرح چلنے لگتے اور سیدھے کھائی میں جا کر خوفناک آوازیں نکالنے لگتے۔۔۔ ایک بار دونوں پاؤں پر کھڑا تھا اور نیچے سے پتھر کھسک رہے تھے اور میں تقریباً چار فٹ اسی حالت میں نیچے گیا لیکن لڑھکنے سے بچ گیا۔ ہم تینوں اب ایک دوسرے پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ جیسے رسوں سے بندھے ہوں۔۔۔ ایک کا پاؤں پھسلتا تو دوسرا سنبھلنے کی کوشش کرتا۔۔۔ ہمیں کچھ پتا نہ تھا کہ آس پاس کیا ہے اور ہم کہاں ہیں۔ ہم صرف یہ جانتے تھے کہ ہم ایک مشکل میں ہیں اور دھوپ جا چکی ہے اور سرد نوکیلی ہوا نانگا پربت سے سیدھی آ رہی ہے اور ہم اس کے راستے میں ہیں اور وہ ہمیں ہٹا دینا چاہتی ہے۔۔۔ اور ہم ہٹ نہیں سکتے کہ ہٹ کر جائیں کہاں۔۔۔

پہاڑی میں ایک نالے کی خشک گزرگاہ سامنے آ گئی۔۔۔ ریت اور چھوٹے چھوٹے پتھر اور اس کا زاویہ ایک سو پچیس کے لگ بھگ تھا۔۔۔ اور ظاہر ہے کہ پہاڑی کی نسبت گزرگاہ تو ذرا زیادہ شتابی سے دھڑام سے نیچے جا رہی تھی۔۔۔ اس کی چوڑائی چھ سات فٹ سے زیادہ نہ تھی۔۔۔ پہلے تھامس گیا اور پتہ نہیں کس طرح گیا اور پھر

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

مشائلہ.... وہ قدرے جھجکی لیکن دوسری جانب چلی گئی۔

"اگر تم تیزی سے رکے بغیر جلدی سے آ جاؤ تو کوئی مسئلہ نہیں ــــ" تھامس بولا۔

"مجھ سے نہیں ہو گا ــــ" اور مجھے یقین تھا کہ میں پھسل جاؤں گا.... وہاں پاؤں رکھنے کو تو جگہ نہ تھی ــــ "میں واپس جاؤں گا" حالانکہ کہاں جا سکتا تھا۔

"اب ہم خاصی بلندی پر ہیں ــــ" تھامس کے لہجے میں تاسف تھا' معذرت تھی "تم نیچے نہیں جا سکتے۔ آئی ایم سوری یہ میرا قصور ہے.... وہ کچا راستہ اس کی نسبت بہت بہتر تھا...."

میں نے کافی عرصہ کے بعد نیچے دیکھنے کی کوشش کی اور وہ ٹھیک کہتا تھا' نیچے اترنا ناممکن تھا.... برساتی نالے کی اس خشک ترچھی اور نیچے گہرائیوں میں گم ہوتی گزرگاہ کو میں نے جیسے عبور کیا ہے وہ میں نہیں جانتا.... یہ اندھیرے میں ایک چھلانگ تھی.... میں کچھ دیر ایک معلق حالت میں شاید ہوا میں سے گزرتا ہوا دوسری جانب تھا....اور میرا سانس بے ربط تھا۔ یہاں فیئری میڈو کی نسبت بلندی بھی زیادہ تھی بلکہ ہم اپنے سفر کے بلند ترین مقام پر پہنچ چکے تھے' تقریباً بارہ ہزار پانچ سو فٹ کی بلندی پر.... اور کوشش کر رہے تھے کہ آہستہ آہستہ نیچے آئیں۔ لڑھکتے ہوئے نہ آئیں.... ایک اور مشکل یہ تھی کہ آرام کرنے کے لئے یا سانس درست کرنے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی.... ڈھلوان اتنی تھی کہ آپ پہاڑ پر منہ رکھ کر ہاتھ پھیلا کر تھوڑی دیر اس حالت میں اگر رہ سکتے تھے تو بس یہی آرام تھا.... اور میں اس حالت میں پھولے ہوئے سانس کے ساتھ پڑا ہوا تھا۔ تب دھند مزید تاریک ہو گئی اور پھر بونداباندی شروع ہوئی.... اور تھوڑی دیر ہی میں یہ بوندیں اولوں کی شکل اختیار کر گئیں.... سردی کی شدت میں یکدم اضافہ ہو گیا اور میں کانپنے لگا....

"یہاں سے نکلنا چاہئے مسٹر آنسر ــــ" مشائلہ نے آواز دی اور وہ ذرا آگے تھی "اگر شام ہو گئی تو ہم منجمد ہو جائیں گے"۔

میں پھر چلنے لگا ــــ لیکن اب ذرا بہتر طریقے سے کیونکہ اب میں نے اپنی چھڑی پھینک دی تھی اور ہاتھوں کا پورا استعمال کر رہا تھا اور اکثر خطرے میں گھرے جانور کی طرح اپنے چاروں ہاتھ پاؤں پر چلنے لگتا.... اسی حالت میں میں نے ایک اور نالہ عبور کیا....

دور کچھ بڑی چٹانیں نظر آ رہی تھیں اور ہمارا خیال تھا کہ ان کے دوسری جانب بیال کیمپ ہو گا لیکن ابھی یہ چٹانیں بہت دور تھیں......

پہاڑ جیسے ہمیں صرف اپنے آپ پر سے گرانے کے لئے اور سیدھا ہو گیا اور ہم تقریباً اس سے لپٹ لپٹ کر چلنے لگے.... نیچے رائے کوٹ گلیشیئر تو تھا لیکن یہاں سے نظر نہیں آتا تھا البتہ جتنے پتھر لڑھکتے ان کی گونج بتاتی کہ وہ بہت نیچے گئے ہیں اور بہت گہرے گئے ہیں۔

تب میرے سامنے ایک اور خشک گزرگاہ تھی.... سامنے تو نہیں تھی بلکہ نظروں کے سامنے ترچھی ہو کر نیچے گر رہی تھی.... تھامس دوسری جانب پہنچ چکا تھا۔

"یہ ذرا خطرناک ہے لیکن مشکل نہیں" وہ کہہ رہا تھا.... اور ژالہ باری ہلکی برف باری میں بدل رہی تھی اور یہ برف میرے بدن پر گرتی تھی اور اسے یخ بستہ کرتی تھی....

یہ خشک گزرگاہ زیادہ سے زیادہ چھ سات فٹ چوڑی تھی لیکن اتنی سٹیپ تھی کہ اسے پار کرنے کے لئے ایک چھوٹا سا پل درکار تھا۔ اس کے درمیان میں تھامس کے بوٹوں کے نشان تھے.... "تم جلدی سے ان پر قدم رکھ کے آ جاؤ۔ اتنی جلدی کہ تم گر نہ سکو...." اور جیسے مجھے اپنی موت کا یقین ہے ایسے اس لمحے جب ہر سو دھند کی تاریکی پھیل رہی تھی اور ہلکی برف باری ہو رہی تھی اور نیچے رائے کوٹ گلیشیئر ہمیں بلاتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں کبھی بھی اس پل صراط کو عبور نہیں کر سکتا۔ "ــــ تھامس میں دوسری طرف نہیں آ سکوں گا ــــ میں جانتا ہوں"۔

تھامس کا بڑھا ہوا ہاتھ نیچے ہو گیا ــــ وہ مجھے سہارا بھی نہیں دے سکتا تھا کیونکہ فاصلہ زیادہ تھا.... میرا بدن سردی کی شدت سے کانپتا چلا جا رہا تھا.... "میں یہاں بیٹھتا ہوں تم کہیں سے مدد لے کر آؤ" میں ڈھلوان کے ساتھ ٹیک لگا کر اس طرح بیٹھا کہ ہر لمحے آگے کو جھکتا جاتا تھا....

تھامس بہت دیر تک چپ رہا۔ اس دوران مشائلہ جرمن میں نہ جانے اسے کیا کہتی رہی.... میری پلکوں پر برف کے گالے گر کر پانی ہو رہے تھے اور یہ سرد پانی میرے چہرے پر سے نیچے اتر کر گردن کے اندر چلا جاتا تھا.... مجھے معلوم تھا کہ مدد کہیں سے نہیں آ سکتی ــــ نزدیک ترین جگہ بیال کیمپ تھی جہاں ہم صرف دو چرواہوں سے ملے تھے اور وہ بھی شاید اب تک فیئری میڈو لوٹ گئے ہوں گے۔ اور فیئری میڈو اتنے فاصلے پر تھا کہ وہاں پہنچ کر اگر واپس آیا جاتا تو رات ہو جاتی.... بلکہ خاصی رات ہو جاتی ــــ اور کھلی فضا میں' برف باری میں' نانگا پربت کے دامن میں' رات

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

گزرتی نہیں بندہ گزر جاتا ہے.... میں اٹھ کھڑا ہوا "میں کوشش کرتا ہوں ----"

"وَنڈ بار ----" تھامس چیخا۔ "بس جہاں میرے بوٹوں کے نشان ہیں وہاں سختی سے قدم جما کر آ جاؤ' مشکل نہیں ہے۔" میں احتیاط سے آگے بڑھا.... تھامس نے اپنا بازو پھیلا رکھا تھا اور اس کی ہتھیلی کھلی تھی.... میری کوشش یہ تھی کہ خطرناک حصہ عبور کرنے سے پیشتر تھامس کا ہاتھ پکڑ لوں.... میں کھسکتا ہوا آگے ہوا نیچے دیکھے بغیر اور بلاآخر تھامس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا.... "مجھے مضبوطی سے پکڑنا"۔

"تم فکر نہ کرو"۔

اسی لمحے میں نے قدم آگے بڑھایا۔ تھامس کے بوٹوں کے نشان پر رکھا اور دوسرا قدم اٹھانے سے پیشتر کچھ ہوا.... یہی ہوا کہ میرے قدموں کے تلے سے زمین نکل گئی اور سنگریزے اور پتھر شور مچاتے نیچے گہرائی میں جا رہے تھے اور میں ---- رائے کوٹ گلیشیئر کے اوپر کہیں لٹک رہا تھا۔

"ہاتھ مت چھوڑنا ----" تھامس میرے اوپر کہیں تھا اور کہہ رہا تھا.... جب میں گرا ہوں تو میری کلائی میں اتنی شدت سے درد ہوا کہ میں نے تھامس کا ہاتھ تقریباً چھوڑ دیا تھا۔

"کیا تم نے مجھے مضبوطی سے پکڑا ہوا ہے؟" یہ فقرہ میں نے ایک خلا میں کہا تھا۔ میرا دل خالی ہو چکا تھا.... مجھے اب تھوڑی دیر میں رائے کوٹ گلیشیئر پر گرنا تھا.... کتنی دور تک گرنا تھا یہ میں نہیں جانتا تھا اور میں صرف لٹک نہیں رہا تھا۔ تھامس کا دایاں ہاتھ میرے دائیں ہاتھ میں تھا اور میں اپنے بائیں ہاتھ اور دونوں پاؤں کو ہر جانب پٹخ رہا تھا اور چلا رہا تھا.... تھامس کچھ کہہ رہا تھا لیکن پتہ نہیں کیا کہہ رہا تھا۔ اور عجیب بات ہے کہ اس حالت میں جب میرے اور موت کے درمیان شاید کچھ سیکنڈ کا فاصلہ تھا.... وہ فاصلہ جو مجھے نیچے گرتے ہوئے لگتا.... میں زیادہ نروس نہیں تھا.... شاید یقینی موت انسان کو اطمینان بھی دیتی ہے۔ میں ایک ایسے شخص کی طرح تھا جو کسی سکائی سکریپر کی کھڑکی کو پکڑے ایک ہاتھ سے لٹک رہا ہے اور تب اس لمحے میں نے اوپر دیکھا اور وہاں نانگا پربت تھی بادلوں اور دھند میں.... کلر ماؤنٹین.... مار ڈالنے والی چوٹی.... قاتل پہاڑ.... اور میں اس کی ایک کھائی کے اوپر لٹک رہا تھا.... اور میں ان تمام کوہ پیماؤں کا آخری لمحوں کا حصہ دار بن گیا جن کو اس نے ہلاک کر دیا تھا.... انہوں نے بھی برف کے طوفانوں میں دبتے یا کسی ایسی ہی کھائی میں گرتے اسی طرح آخری بار نانگا پربت کو اوپر دیکھا ہو گا' سیاہ اور دہشت ناک ...... مجھے معلوم

ہو گیا کہ انہیں کیا محسوس ہوا ہو گا ...... میں لٹک رہا تھا اور میری ناک کے عین سامنے کوئی تیز مہک والا پودا تھا اور وہ میری ناک کو چھوتا آگے پیچھے ہوتا تھا اور اس کی مہک اب بھی مجھے یاد ہے.... اس وقت وہ آخری مہک تھی..... اور میں کتنی دیر تھامس کا ہاتھ پکڑ سکتا تھا یا اس میں کتنی ہمت تھی کہ وہ ایک شخص کو صرف ایک ہاتھ سے یوں پکڑے رکھے.... وہ کچھ کہہ رہا تھا.... اور مسلسل کہہ رہا تھا....اور چونکہ وہ انگریزی میں کہہ رہا تھا اس لئے میرا ذہن اسے فوراً نہیں سمجھ رہا تھا اور مجھے یہ سمجھنے میں خاصی دیر لگی کہ وہ کہہ رہا ہے "گریب..... گریب..... گریب ود یور لیفٹ ہینڈ اینڈ کک ود یور رائٹ لیگ"

یہی بات اگر وہ پنجابی میں کہہ رہا ہوتا کہ "کھبا ہتھ اور سجی لت" تو میں بغیر سمجھے اسے سمجھ جاتا اور میرے ریفلکسز فوراً کام کرنے لگتے.... میں نے اس کی ہدایت کے مطابق اپنے بائیں ہاتھ سے ہر شے کو پکڑنا شروع کر دیا۔ گھاس' سنگریزے' مٹی کوئی بھی شے اور دائیں ٹانگ سے پہاڑی کو کک کرنا شروع کر دیا..... ہاتھ میں کچھ نہ آیا... پاؤں کے نیچے بوٹ مارنے کی وجہ سے تھوڑی سے جگہ بنی اور میں نے فوراً کہا "مجھے کھینچ لو...." جہاں میں نے پاؤں رکھنے کو جگہ بنائی تھی وہ جگہ چند سیکنڈ کے لئے رہی اور پھر ڈھے گئی لیکن اتنی دیر میں تھامس مجھے اوپر کھینچ چکا تھا اور میں پہاڑی پر تیز مہک کے پودوں کے اوپر اوندھا پڑا تھا اور مجھ پر برف سفید ہو رہی تھی .... میرا منہ کھلا تھا اور ہونٹ مٹی پر تھے ..... اور میرا بدن گزر جانے والے لمحے کے خوف سے اب کانپ رہا تھا.... میرا سارا بدن سرد ہو رہا تھا لیکن قمیض کی جیب کے اندر ایک چھوٹی سی جگہ تھی جہاں سے گرمی پھیلتی تھی.... جیب میں بٹوے کے اندر میرے بچوں کی ایک تصویر تھی..... اور اس تصویر کو نکال کر دیکھنے کی اب مجھے ضرورت نہ تھی وہ میرے سامنے تھی۔ ان کا ایک ایک نقش میرے سامنے تھا اور میرے سر پر' بالوں پر جو برف گرتی تھی اور پگھلتی تھی اور اس کا سرد پانی میرے چہرے پر راستے بناتا تھا' اس سرد پانی میں چند گرم بوندیں بھی شامل ہوتی تھیں کہ میں ان سے دوبارہ ملوں گا.... میں واپس آؤں گا۔

"ہم آرام نہیں کر سکتے ------ آجاؤ" تھامس نے پھر ہاتھ آگے کر دیا۔

اس کے بعد دو اور خشک نالے آئے جو خطرناکی میں کم نہ تھے لیکن میں اب کچھ نڈر اور کچھ لاپروا سا ہو چکا تھا..... اب میں نانگا پربت کے ہاتھ آنے والا نہیں...... کئی بار تھامس نے مجھے احتیاط سے چلنے کی تلقین کی....

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

پھر وہ بڑے پتھر آ گئے اور ہم ان پر چلنے لگے...... ان کے پار دوسری جانب نیچے کہیں بیال کیمپ تھا..... لیکن ہم ان جانے میں برچ کے سفید درختوں کے ایک چھوٹے سے ذخیرے میں آ نکلے تھے..... برچ صرف اسی بلندی پر ہوتا ہے نیچے فیئری میڈو بھی اس کے لئے بہت گرم ہے... یہ ایک ڈھلوان تھی... سرسبز صرف وہاں جہاں وہ الپائن پھولوں کے ڈھیروں اور جونیپر کے خوبصورت پودوں سے ڈھکی ہوئی نہیں تھی..... کہیں کہیں سفید پتھر تھے جیسے سجا کر رکھے گئے ہیں..... سفید برچ..... الپائن پھولوں کے درجنوں رنگ اور جانے کیسے کیسے ان دیکھے پودے اور رنگین پتوں والی جھاڑیاں..... یہاں بھی نانگا پربت عین اوپر تھی لیکن ہم اس کی برفباری اور دھند کی زد سے باہر آ چکے تھے...... یہاں ڈھلتی دھوپ تھی اور دائیں جانب رائے کوٹ گلیشیئر تھا۔ سامنے برزل پاس تھا اور ان سے پرے فیئری میڈو..... فنتوری اور تاتو سے پرے بلکہ دریائے سندھ سے پرے اتنے طویل فاصلے کے باوجود یہاں سے راکاپوشی صاف نظر آ رہی تھی..... ہم سینکڑوں کلومیٹر پھیلے ہوئے اس عظیم منظر کے گواہ تھے....

ہم یہاں سے جانا نہیں چاہتے تھے..... اور ہم مختلف پتھروں پر بیٹھ گئے... الگ الگ..... جزیروں کی طرح..... نانگا پربت سے منہ موڑ کر..... سامنے سینکڑوں کلومیٹر تک پھیلے ہوئے اس عظیم منظر کو دیکھتے رہے.... اور نامعلوم جھاڑیوں کی مہک تیز ہوئی.... اور ہم یہاں سے جانا نہیں چاہتے تھے۔ اور ہم بھول چکے تھے کہ تھوڑی دیر پہلے ہم گھر سے نکل کر جنگل میں کھو جانے والے بچوں کی طرح بے آسرا اور بے بس بھٹکتے تھے اور نانگا پربت ہمیں ابدی آرام دینے کے لئے دھند میں لپیٹتی تھی اور برف ہمارے جسموں پر سفید ہوتی تھی.... میں ڈر سے خالی تھا اور میرا بدن پرسکون تھا..... میرا خوف ان پھولوں کے اندر رہ گیا تھا جو گلیشیئر پر لٹکتے ہوئے میری ناک کے آگے آتے تھے اور اپنی جنگلی مہک چھوڑتے تھے۔

”فیئری میڈو کا جنگل، مارخور اور برفانی انسان اور آخری آلاؤ“

ہم وہاں بیٹھے رہے اور تب میں نے تھامس سے کہا ”..... جان بچانے کا شکریہ“

”نہیں نہیں تم خطرے میں نہیں تھے....“ وہ میری طرف نہیں دیکھتا تھا اور ادھر دیکھتا تھا جدھر سینکڑوں کلومیٹر طویل منظر سامنے تھا اور اس کے آخر میں راکاپوشی اور دوسری بلند چوٹیاں نظر آ رہی تھیں... ”میں نے تمہیں مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور میں خود بھی مضبوط تھا... ویسے بھی تم گرتے تو دس بیس میٹر کے بعد ٹھہر جاتے....“

”اور شاید نہ ٹھہرتا....“

”شاید... لیکن مجھے یقین ہے کہ تم مرتے نہیں صرف ہڈیاں ٹوٹتیں....“

”اور اگر ایسا ہو جاتا تو تم مجھے اٹھا کر فیئری میڈو تک لے جاتے...“

”ہاں کیوں نہیں.... دوست کس لئے ہوتے ہیں..... لیکن ایسا ہوا نہیں... اور جو ہوا نہیں اس کا کیا غم....“

دھوپ مدھم ہو کر قدرے سرد ہونے لگی اور ہم اٹھ کھڑے ہوئے...

واپسی پر بھی ہم جزیروں کی طرح رہے .... الگ الگ...... خاموش .... اور اپنے آپ میں گم .... صرف بیال کیمپ کے جاپانی باغ میں ہم ذرا قریب رہے تاکہ گم نہ ہو جائیں کیونکہ یہاں مور پنکھ کے سبز ریچھ بیٹھے تھے اور کوئی راستہ نہ تھا اور ہم بھٹک سکتے تھے... قدیم جنگل میں بھی خنکی بڑھ چکی تھی اور پانی کے چلنے کی آواز تیز ہو

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

چکی تھی۔۔۔ خشک درخت ہوا سے ہلتے تھے اور چرچراتے تھے۔۔۔۔ صرف ایک بار ہم سے دور ایک درخت گرا اور دیر تک اس کے کڑکڑانے کی آواز آتی رہی۔۔۔ جب فرش پر سٹرابیری کے پھول دکھائی دیئے تو ہم فیئری میڈو کے قریب ہو چکے تھے۔۔۔۔ اور یہاں فیئری میڈو کے کنارے پر جنگل میں منگل تھا۔۔۔۔

آسٹرین گروپ آچکا تھا۔

درختوں رنگا رنگ خیمے چیڑ کے تناور درختوں تلے ایستادہ تھے۔۔۔۔ ایک قنات دو تنوں کے درمیان اس طرح باندھی گئی تھا کہ اس کی نیچے ایک سٹنگ روم بن گیا تھا اور یہاں مختلف لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ایک عارضی باورچی خانے میں خوراک پک رہی تھی اور اس کی خوشبو ہم تک آ رہی تھی۔۔۔ پہلی نظر میں ہم نے دیکھا کہ بیشتر سیاح عمر رسیدہ تھے۔ انہوں نے نہایت بیش قیمت ٹریکنگ سوٹ پہنے ہوئے تھے اور ان کے بوٹ نئے اور چمکیلے تھے۔ ایک نوجوان گروہ میں سے جو درختوں کے نیچے براجمان تھا ایک دبلا بھورے بالوں اور آنکھوں والا شخص اٹھا اور ہمیں غور سے دیکھتا ہمارے پاس آگیا۔۔۔۔

"تارڑ صاحب ہم بہت فکر مند تھے۔۔۔۔ ہیں کیمپ کو جانے والے شام سے بہت پہلے واپس آ جاتے ہیں اور آپ نے تو بہت دیر کر دی۔۔۔ میرا نام رحمت نبی ہے اور میں اس آسٹرین گروپ کو لے کر آیا ہوں' ایک سیاحتی ادارے میں ملازم ہوں۔۔۔۔"

"گلگت میں اکرام صاحب نے آپ کا ذکر کیا تھا۔۔۔" میں نے رحمت سے ہاتھ ملا کر اس کا تعارف اپنے ساتھیوں سے کروایا۔ "آپ کون سے راستے سے یہاں آئے ہیں؟"

"ہم سڑک کی جانب سے تاتو پہنچے اور بڑی مشکل سے پہنچے۔۔۔۔" رحمت نبی بے حد چست اور پھرتیلا شخص تھا۔۔۔۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر بات کرتا تھا اور کم بات کرتا تھا "لیکن آئیے ناں آپ کو گرم گرم کافی پلائی جائے۔۔۔"

گرم گرم کافی۔۔۔ مجھے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔۔۔۔ اس جنگل میں نانگا پربت سے واپسی پر گرم گرم کافی۔۔۔۔ ہم مسکراتے اور سرہلاتے اس کے ساتھ چلے گئے اور ایک قنات کے نیچے بیٹھ گئے جہاں چند دوسرے سیاح بھی براجمان تھے۔۔۔۔ مطیع یہاں ہم سے پہلے موجود تھا اور ایک آسٹرین لڑکی کا ہاتھ تھامے بیٹھا تھا۔۔۔۔

"یہ جناب ماریتا ہے۔۔۔" اس نے فوراً تعارف کروایا۔ "کہتی ہے آسٹریا آف۔۔۔۔

اسے میں نے صدپارہ گولڈ کی پوٹلی دکھائی ہے بہت متاثر ہوئی ہے۔۔۔"

ماریتا نیلی جین' سفید بلاؤز اور سرخ زری والے دوپٹے میں تھی اور یہ دوپٹہ اس نے جانے کہاں سے لیا تھا۔ اس کے ساتھی بہن بھائی ارسلا اور رولینڈ یورپی کی بجائے بہت زیادہ ایشائی لگتے تھے کیونکہ وہ دونوں بے حد شرمائے شرمائے سے رہتے تھے اور بہت کم بولتے تھے۔۔۔۔

کافی آ گئی۔۔۔۔۔ اور اس میں وہ گرم طاقت تھی جس نے مجھے کسی حد تک بحال کر دیا۔۔۔

"ہیں کیمپ تو ان دنوں پھولوں سے ڈھکا ہوتا ہے۔۔۔ آپ نے وہ بورڈ دیکھا جو نانگا پربت کو سر کرنے والے جرمن ہرمن بوہل کی یاد میں آویزاں کیا گیا تھا۔۔۔"

"ہم وہاں تک نہیں پہنچ سکے۔۔۔۔"

مشائلہ نے کہا کیونکہ میں اور تھامس پیچھے سے کافی پیتے رہے اور مسکراتے رہے۔

"کیوں؟۔۔۔۔۔۔"

پہلے کوئی نہیں بولتا تھا اور اب ہم تینوں بولنے لگے۔۔۔ اور جب ہم بول چکے اور ہم نے اپنی داستان بیان کر لی تو گویا وہ تجربہ ماضی کا حصہ بن گیا' ہم اس سے فوری طور پر الگ ہو گئے اور اس کی دہشت ہم سے الگ ہو گئی اور وہ احساس کی سطح پر ہماری زندگی کی کتاب پر لکھا گیا اور وہ ورق پلٹا گیا۔

"آپ کو ہمارے علاقے میں کون سے جگہ سب سے اچھی لگی؟" رحمت نبی نے مجھ سے پوچھا۔۔۔

"وہاں تاتو سے آتے ہوئے جب چڑھائی ختم ہوتی ہے اور فنتوری کا علاقہ شروع ہوتا ہے وہاں بائیں ہاتھ پر رائٹ کوٹ گلیشیئر کے عین اوپر ایک بلند سطح پر لکڑی کے شہتیروں سے بنا ہوا ایک چھوٹا سا کیبن ہے مجھے اس کے آس پاس کا علاقہ پسند آیا۔۔۔۔"

"اور اس کیبن کے دروازے پر ایک چھوٹا سا تالا لگا ہوا ہے؟"

"ہاں مجھے یاد تو پڑتا ہے"

"وہ کیبن میرا ہے۔۔۔ آپ جب چاہیں آئیں اور اس میں جتنے دن چاہیں قیام کریں۔۔۔۔"

وہ کیبن اب بھی ان بہت ساری جگہوں میں سے ایک ہے جو میں نے جمع کر

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

رکھی ہیں کہ ایک دن وہاں جاؤں گا اور زندگی کے چند دن گزاروں گا اور ظاہر ہے کہ میں جا نہیں سکوں گا لیکن ایسی جگہوں کو جمع کر لینے میں تو کوئی حرج نہیں... اس ہوا' رائے کوٹ گلیشیئر میں بہنے والے پوشیدہ دریا کے شور' نفتوری کے سبزے اور رنگ اور نانگا پربت کی چوٹی سے مدھم گڑگڑاہٹ کے ساتھ اترتے برفانی طوفانوں کی سفید دھول کو جمع کر لینے میں کیا حرج ہے...

رحمت نبی کے گروپ کا بلتی باورچی حسین بار بار مجھ سے رات کے کھانے کے بارے میں پوچھتا کہ صاحب کیا کھاؤ گے اور میں ذرا شرمندہ سا محسوس کرتا کہ میں کس طرح ان پر بوجھ ہوں... ہمارے پاس بہت خوارک ہے... میں بار بار کہتا اور ہمارے پاس واقعی بہت خوارک تھی۔ لیکن رحمت نبی کہتا "میں تتو کا رہنے والا ہوں۔ آپ میرے مہمان ہیں۔ آپ جتنے روز بھی فیئری میڈو میں ٹھہریں گے میرے مہمان ہوں گے... آپ جس کھانے کی خواہش کریں گے' حسین آپ کو بنا دے گا..."

رحمت نبی کے گروپ کے بوڑھے سیاح سب کے سب اپنے آپ میں گمن تھے... وہ بہت زیادہ حرکت نہیں کرتے تھے... وہ مجھے بہت تنہا اور اداس اور بغیر خواہش کے لگے... خلاء میں گھورتے ہوئے اور اوپر دیکھتے ہوئے۔ کسی پتھر پر بیٹھے ہوئے' کافی پیتے ہوئے' میں نے ان کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا...

"آپ نے کیسے جانا کہ وہاں ملک پاکستان کے شمال میں شاہراہ ریشم ہے اور اس پر ایک پل رائے کوٹ نام کا ہے جسے آپ سب رکھیوٹ کہتے ہیں اور اس پل سے دو دن کی سخت مسافت کے بعد فیئری میڈو آتا ہے... آپ نے کیسے جانا؟" میں نے مارتا سے دریافت کیا۔

"میں آسٹریا میں ایک پرائیویٹ فرم میں کام کرتی ہوں... میں جب بھی اپنے باس کے کمرے جاتی' وہاں اس کی کرسی کے پیچھے ایک بہت بڑی پینٹنگ کو دیکھتی... اس پینٹنگ میں ایک وسیع سبزہ زار ہے' جنگل ہے اور ایک خوبصورت سفید پہاڑ ہے... میں اپنے باس سے کہتی کہ کیا یہ ممکن ہے کہ کہیں دنیا میں کوئی ایسی جگہ ہو اور وہ کہتا "نہیں مارتا یہ تو ایک خوبصورت تخیل ہے' ایک پینٹنگ ہے..." اور میں اسے دیکھتی رہتی... پھر ایک روز میری سالگرہ تھی اور میں ظاہر ہے دفتر سے چھٹی تو کر نہیں سکتی تھی اس لئے ذرا بن سنور کے چلی گئی... میرے باس کو معلوم تھا کہ اس روز میری سالگرہ ہے اور وہ کہنے لگا... "مارتا میں تمہیں ایک عجیب و غریب تحفہ دینا چاہتا ہوں... میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ یہ پینٹنگ نہیں ہے... ایک تصویر ہے اور... ایک جگہ ہے... اس دنیا میں ہے... پاکستان میں ہے ... اور اس کا نام فیئری میڈو ہے۔" میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ میں یہاں آؤں گی... اور اب میں یہاں ہوں اس پینٹنگ میں"

اس دوران ایک مرتبہ پھر ہرمن بوہل کے بارے میں گفتگو شروع ہو گئی...

ایک نفیس اور خوبصورت بوڑھا جو ایک پرانے کوٹ میں ملبوس تھا بہت دیر سے رسی بٹنے میں مصروف تھا... وہ ذرا قریب آ گیا... رحمت نبی نے بتایا کہ یہ میرے چاچا ہیں۔ چاچا کہنے لگے "مجھے یاد ہے جب جرمنوں نے نانگا پربت کو فتح کیا تھا... ہرمن بوہل نے یہاں فیئری میڈو میں چوٹی پر چڑھنے کی خوشی میں بہت بڑا دعوت کیا تھا۔ گائے بیل کو بھی کھانا ملا تھا... پھر دو سال پہلے اس کی بیوی ادھر آئی تھی... ہیں کیمپ میں جا کر اس کی یاد میں جو بورڈ ہے اسے دیکھ کر بہت روئی... اور وہ بہت اونچا اونچا روئی نانگا پربت کے پاس... وہ ان ساری جگہوں پر گئی جہاں اس کا خاوند گیا تھا"

"باباجی... وہ جو ہے میسنر وہ بھی تو ادھر آیا تھا..." میں نے پوچھا۔

"ہاں وہ بھی آیا تھا... میسنر کا بھائی بھی کو بیا تھا اور وہ نانگا پربت پر مرا تھا... اور جب میسنر اکیلا چوٹی پر پہنچا تو وہاں سے گرا... تیز ہوا کی وجہ سے... اور ادھر بونر کی طرف گرا... نیچے تک گرتا گیا... پھر ایک چرواہے نے اسے کراہتے ہوئے دیکھا اور اسے اٹھا کر نیچے گاؤں بونر فارم میں لے گیا اور علاج کیا..."

"ہمارے ساتھ ڈاکٹر فرنز گارنر بھی ہے..." رحمت نبی کہنے لگا "فیئری میڈو کے بارے میں کتاب لکھ رہا ہے... خاص طور پر یہاں کے پھولوں اور پودوں کے بارے میں... اس وقت پریوں کے ساتھ ہے ورنہ ملاقات کرواتے ..."

"پریوں کے ساتھ؟"

"ہاں ..." رحمت نبی مسکرانے لگا "وہ اپنے خیمے میں ہے پریوں کے ساتھ..."

رحمت نبی کے گروپ کے چند لوگ شام کے کھانے کے لئے کسی سوپ کی خواہش لے کر آئے اور وہ ان سے باتیں کرنے لگا... ہم نے اس کی کافی کا شکریہ ادا کیا اور جنگل سے نکل کر اپنی پہاڑی پر چڑھنے لگے... یہاں مجھے نقاہت سی محسوس ہوئی اور مجھے متعدد بار رک کر سانس درست کرنا پڑا... اوپر خیمے کے باہر گاڈ فرے ایک مطمئن انسان کی طرح بیٹھا مسکرا رہا تھا... "میں تم لوگوں کے لئے کافی بنا کر لاتا

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

ہوں"......

"تھینک یو گاڈفرے......" مشائلہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "ہم کافی پی کر آئے ہیں......"

جب اسے ہماری مہم جوئی کے بارے میں علم ہوا تو اس کی مسکراہٹ سمٹ گئی

"مسٹانسر میں پہاڑوں کو جانتا ہوں.... ان کے یہ بظاہر آسان راستے موت کے پھندے ہوتے ہیں- میں کبھی رسک نہیں لیتا.... میں نے وہ راستہ دیکھا تو جان لیا کہ اس میں خطرہ ہے.... تمہیں پتہ ہے کہ جو لوگ بھی پہاڑوں پر چڑھتے ہیں وہ اسی طرح مرتے ہیں.... ایک جھوٹی انا کی تسلی کے لئے' لوگ انہیں ڈرپوک نہ کہیں اور وہ دل کی آواز پر کان نہیں دھرتے اور کسی موت کے پھندے والے راستے پر قدم رکھ دیتے ہیں......"

مجھے ایک بے چینی کا احساس ہو رہا تھا .... یہ زکام اور بخار کی آمد تھی- ناک میں چلبلاہٹ اور ایک پر لطف احساس والی حدت- میرا ماتھا بے حد گرم تھا اور آنکھیں جلتی تھیں..... یہ اس سرد موسم کا شاخسانہ تھا جو نانگا پربت کے دامن میں تھا اور اس برف باری کا نتیجہ تھا جس میں' میں تیز مہک کی جڑی بوٹیوں پر اوندھا پڑا تھا اور مجھ پر برف کے گالے گرتے تھے..... میں نے اپنی میڈیکل کٹ نکالی جو ڈاکٹر محمد رمضان کے مشورے سے تیار کی گئی تھی...... وہاں ایک کاغذ پر زکام اور بخار کے آگے جن دوائیوں کا تذکرہ تھا وہ میں نے فوری طور پر نگلیں اور خیمے میں سے ربڑ میٹرس نکال کر اس میں ہوا بھر کر وہیں کھلی فضا میں لیٹ گیا- مشائلہ اور تھامس اپنے خیمے میں جا چکے تھے...... گاڈفرے پانی لینے کے لئے نیچے فیری میڈو چلا گیا......

میں کچھ دیر اونگھتا رہا..... ادھر شام اتر چکی تھی لیکن نانگا پربت حسب معمول ابھی دھوپ میں تھی...... میری آنکھیں بند تھیں اور میں دراصل اپنے اس ہلکے بخار اور زکام سے لطف اندوز ہو رہا تھا.. کسی کے کھانسنے کی آواز پر میں نے آنکھیں کھول دیں... نیلی آنکھوں والا کوہستانی اور اس کا ایک ساتھی بظاہر مجھ سے بے پرواہ بڑزل پاس کو تکتے جا رہے تھے.... انہیں دیکھ کر میں اپنی مسکراہٹ قابو میں نہ رکھ سکا...... وہ جاننا چاہتے تھے باہر کی دنیا کے بارے میں' ہمارے بارے میں' لیکن ان کی انا بہت اونچی تھی' نانگا پربت سے بھی اونچی' اور وہ یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے اور اپنے بھولپن کی وجہ سے ظاہر کر دیتے تھے...... نیلی آنکھوں والے کے کمبل کے نیچے ایک

بندوق تھی..... میں اپنی میٹرس سے اٹھا اور ان کے قریب جا بیٹھا..... وہ حسب توقع لاتعلق بیٹھے رہے اور میں نے سرد مہری کی برف توڑنے کے لئے ایک مرتبہ پھر دوربین مانگی... اس بار نیلی آنکھوں نے دوربین میری طرف پھینکی نہیں بلکہ ہاتھ بڑھا کر آگے کر دی..... لیکن اس بار بھی اس نے میری طرف دیکھنا گوارہ نہیں کیا بلکہ بظاہر بے دلی سے دوسری جانب دیکھتا رہا.. میں نے دوربین کو آنکھوں سے لگا کر رائے کوٹ گلیشیئر کو دیکھا جس کے ادھر کچا راستہ تھا..... وہ ایک اور دنیا تھی..... نوکیلے اہراموں کی سرد اور یہاں سے بے آواز دنیا' اور اس کے اوپر نانگا پربت تقریباً سائے میں جا چکی تھی..... دوربین واپس کر کے میں نے بیس کیمپ کے سفر کی داستان شروع کر دی' میں اپنے آپ سے جیسے مخاطب تھا.... وہ سنتے تھے لیکن اپنی دلچسپی ظاہر نہیں کرتے تھے.... جب میں نے اپنے بخار اور زکام کا بتایا اور وہ اس کی علامات میرے چہرے اور آنکھوں میں دیکھ بھی سکتے تھے تو انہوں نے پہلی بار مجھ پر نگاہ کی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے نیلی آنکھوں والے سے پوچھا اور وہ ایک نہایت دلکش نین نقش والا نوجوان تھا۔

"تیمور خان......" اس نے غصے سے کہا۔

"اور تمہارا؟" میں نے دوسرے کوہستانی سے دریافت کیا۔

"یہ میرا بھائی ہے....." تیمور خان ایسے بولا جیسے کہہ رہا ہو کہ نظر نہیں آ رہا یہ میرا بھائی ہے......

گاڈفرے نیچے سے پانی لے آیا اور چائے کے لئے کیتلی آگ پر رکھ دی.... میں نے اسے اشارہ کیا اور وہ سمجھ گیا.... جب چائے آئی تو تین مگ تھے..... "یہ تمہارے لئے ہے تیمور...... اور تمہارے ساتھی کے لئے......"

وہ گھبرا گیا "نہیں نہیں......"

"تم ہمارے خیمے کے باہر آ کر بیٹھے ہو' ہمارے مہمان ہو.... چائے پیو...... تم تو اپنے مہمانوں سے بولتے بھی نہیں لیکن ہم ایسے نہیں' چائے پیو"

یہ فقرہ تیمور پر بہت ساری بجلیاں بن کر گرا- وہ بھسم ہو گیا' اس کی دنیا برباد ہو گئی کیونکہ کوہستانی بھی پٹھانوں کی طرح مہمان نوازی کے بارے میں بے حد حساس ہیں.... میں نے اس کے علاوہ کچھ نہیں کہا اور اگر میں کچھ کہتا تو شاید وہ مجھے وہیں قتل کر دیتا..... لیکن وہ نرم پڑ گیا اور میرے آس پاس بیٹھنے لگا "کہاں سے آئے ہو؟ کیا

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

کرتے ہو؟ کیوں آئے ہو؟"

جب دوستی ذرا مستحکم ہو گئی تو وہ ذرا آزاد ہو گیا "یہ جو انگریز مرد اور عورت ہیں..." اس نے تھامس کے خیمے کی طرف دیکھا "یہ..." اور ایک فحش اشارہ کیا۔

"نہیں نہیں......" میں نے گھبرا کر کہا "میاں بیوی ہیں..."

لیکن تیمور یورپی مردوں اور عورتوں کے اخلاق کے بارے میں مخصوص نظریات پر شدت سے قائم تھا... "یہ سب ادھر عیاشی کرنے آتا ہے..." اور یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں بھی عیاشی چھلکتی تھی... میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اس قسم کی حرکتیں یہ لوگ۔ اپنے گھروں میں' گلیوں بازاروں اور میزوں کرسیوں پر بھی کر سکتے ہیں انہیں صرف اس کام کی غرض سے یورپ چھوڑ کر گلگت اور پھر دو دن پہاڑوں میں مشقت کر کے فیئری میڈو پہنچنے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن... تیمور بار بار اسی اشارے کی گردان کر رہا تھا "تمہیں کیسے پتہ ہے کہ یہ میاں بیوی ہے... تم نے نکاح نامہ دیکھا ہے؟"

"نہیں... لیکن وہ دونوں ایک دوسرے سے اتنے بیزار ہیں کہ میاں بیوی ہی ہو سکتے ہیں..."

ادھر نیچے جو گورا اور گوری تھا فرانس سے آیا تھا... سارا دن خیمے سے باہر نہیں آتا تھا... کیا کرتا تھا خیمے میں؟"

"پتہ نہیں یار......" میں نے تنگ آ کر کہا... اور پھر موضوع بدلنے کی خاطر اس کے ساتھی کی بندوق کے بارے میں گفتگو شروع کر دی "اس بندوق سے کیا کرتا ہے؟"

"فائر کرتا ہے... آپ فائر کرے گا" اس نے بندوق میری طرف بڑھائی۔

"نہیں... کس پر کرے گا؟"

"ادھر..." اس نے پھر خیمے کی طرف اشارہ کیا "اس پر کرو... کافر لوگ ہے۔ عیاشی کرتا ہے"

شام ہو چکی تھی۔ نیچے فیئری میڈو میں آج خوب رونق تھی... دس بارہ بچے فٹ بال کھیل رہے تھے اور ان کی چیخوں اور شور کی آواز کبھی کبھی اوپر ہم تک بھی آ جاتی تھی... کچھ آسٹرین بوڑھے بھی ادھر ادھر ٹہل رہے تھے لیکن الگ الگ...... یہ سب کچھ تھوڑی ہی دیر میں تاریکی کی نذر ہو گیا۔ میں نے رحمٰن کی لالٹین خیمے سے نکال کر روشن کی اور اپنے پاس رکھ لی... نیچے سے کوئی ادھر آیا اور وہ لالٹین کی روشنی سے پرے تھا تو ہم پہچانتے رہے اور جب اس کی زد میں آیا تو یہ بختی تک حسین تھا' وہ ایک ٹفن کیریئر اٹھائے ہوئے تھا "رحمت نبی نے آپ کے لئے شام کا کھانا بھیجا ہے..." اس نے کیریئر میرے آگے رکھا اور سلام کر کے پھر نیچے اترنے لگا...

"آؤ تیمور کھانا کھاؤ..."

اور یہ تیمور کی برداشت سے باہر تھا کہ میں اسے کھانا بھی پیش کروں چنانچہ وہ سر ہلاتا اٹھ کھڑا ہوا...

"تم کیا کرتے ہو تیمور؟"

وہ چار پانچ قدم نیچے جا چکا تھا جب میں نے یہ سوال کیا اور وہ ادھر اندھیرے میں سے بولا "ہم شکاری ہیں"

"یار کیسا شکاری ہے کہ مہمان کو شکار نہیں کھلاتا..."

"کیا کھائے گا؟"

"مار خور..."

"اچھا......" اس کی تیز آواز آئی اور وہ اپنے ساتھی سمیت تاریکی میں اتر گیا۔

رات کے کھانے میں گرم سوپ' آلو قیمہ اور چاول تھے...

مجھے اگرچہ بخار تھا زکام تھا لیکن میں کوہ پیماؤں والی ایک گرم ترین جیکٹ میں تھا اور بالکل محفوظ تھا... صرف میرے چہرے پر سرد ہوا تھی اور مجھے وہ بھلی لگتی تھی...

لالٹین کی روشنی کا گھیرا جب مختصر ہونے لگا تو میں نے اس کی لو اونچی نہیں کی... اس کا شیشہ اوپر کر کے بجھا دیا...

"شکریہ..." گاڈ فرے کی آواز آئی جو اپنے سلیپنگ بیگ میں لیٹ چکا تھا۔ "میں تمہاری لالٹین کی روشنی کی وجہ سے ستارے نہیں دیکھ سکتا تھا... اب دیکھ سکتا ہوں۔"

نیچے جنگل میں جہاں رحمت نبی کا گروپ خیمہ زن تھا وہاں چیڑ کے درختوں کی تاریکی ہولے ہولے دہکنے لگی لو دینے لگی' روشن ہونے لگی... نیچے جنگل میں انہوں

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

نے الاؤ روشن کر رکھا تھا۔

اس رات مجھے بخار بہت تھا اور زکام بہت تھا...... اور میں کروٹیں بدلتا رہا.... میرے بدن میں بھی درد تھا۔ خاص طور پر دونوں کندھوں کے جوڑوں میں...... اور یہ رائے کوٹ گلیشیئر پر لٹکنے کا نتیجہ تھا.... بخار کی حدت میں ایک سست مزہ بھی تھا اس لئے میں بے مزہ نہ ہوا... رات کے پچھلے پہر میں نے بہتر محسوس کیا۔ ایسے لگا جیسے میرے بدن پر رکھا ہوا بوجھ کسی نے اٹھا لیا ہو..... میں گہری نیند میں چلا گیا اور پھر جانے کیا وقت تھا کہ میں نے گہری نیند میں ایک برا خواب دیکھا کہ میرے خیمے کا پردہ چاک ہو رہا ہے خنجر سے اور پھر اس چاک شدہ حصے سے تیمور خان کا سر باہر آتا ہے اور کہتا ہے..... "اوئے... اوئے سوتا ہے؟"... لیکن یہ سچ مچ تیمور خان کا سر تھا جو خیمے کے پردے میں سے اندر آکر کہہ رہا تھا۔

"اوئے...... اوئے سوتا ہے؟"

میں کچھ ٹھنڈا ہو گیا.... رات کے اس پہر یہ کوہستانی کیا چاہتا ہے.... میرے پاس جو ایک عدد خان تھا وہ اس وقت خراٹے مار خان تھا اور بے خبر سوتا تھا......

"کیا ہے؟" میں نے اپنی آواز ناراض بنانے کی کوشش کی۔

اس نے جواب میں اپنی بندوق خیمے کے اندر کر دی "یہ ہے...."

یہ ہے؟ میں لرزنے لگا..... یا اللہ.... "یہ یہ..... کیا ہے؟"

"بندوق ہے...." وہ بولا "اس سے تمہارے لئے مارخور مار کر لائے گا... اور برزل پاس سے..... رات ادھر رہے گا۔ کل آئے گا..... صرف تمہارے لئے جاتا ہے.... انتظار کرنا...." خیمے کا پردہ برابر ہو گیا اور وہ چلا گیا......"

میں نے وقت دیکھا تو پانچ بجنے کو تھے.... تھوڑی دیر کروٹیں بدلنے کے بعد میں خیمے سے باہر آکر میٹرس پر بیٹھ گیا.....

سردی شدید تھی.... نانگا پربت کا ایک چھوٹا سا حصہ پہلی دھوپ میں تھا.... گاڈفرے آنکھیں ملتا ہوا آگیا "تمہارا خیال ہے کہ تم اگر نانگا پربت سے آنکھیں اٹھاؤ گے تو یہ اوجھل ہو جائے گی.... اس وقت فیئری میڈو بالکل سنسان پڑا ہے.... آؤ کچھ تصویریں اتار لیں...."

میں نے جاگر پہنے اور ہم نیچے اترنے لگے۔

فیئری میڈو کی گھاس میں سے چھوٹے چھوٹے پھولوں کی سفیدی اور زردی اس وقت زیادہ نمایاں تھی۔ ہم نے اس کی چھوٹی سی ندی پر جھک کر منہ ہاتھ دھویا اور پانی کی یخ بستگی نے ہمارے چہروں کو چوکنا کر دیا.... پھر ہم اسی ندی کو پھلانگ کر اس مقام تک گئے جہاں سے جنگل، نانگا پربت اور فیئری میڈو کا پورا میدان نظر آتا ہے.... ہم تصویریں اتارتے رہے اور بے مقصد ادھر ادھر گھومتے رہے.... صبح کی خنکی میں فیئری میڈو کی تنہائی نے میری بیماری کو تقریباً زائل کر دیا.... یہاں سے ہمارا نیلا خیمہ نانگا پربت کی سفیدی کے سامنے ایک دھبے کی صورت نظر آ رہا تھا.... فیئری میڈو میں گشت کرنے کے بعد ہم جنگل میں چلے گئے.... اور وہاں ناشتے کے لئے برتنوں کی آوازیں آ رہی تھیں.... دھواں اٹھ رہا تھا....

"میں آپ کا ناشتہ پہاڑی پر بھیجنے والا تھا.... اچھا ہوا آپ آ گئے.... حسین.... کارن فلیکس لاؤ مہمانوں کے لئے...." رحمت نبی ہمیں دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا....

ہم اس کے ساتھ قنات کے نیچے بیٹھ گئے.... چند پورٹر آگ جلائے بیٹھے تھے.... اس کی گرمی ہم تک بھی آتی تھی....

"آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟ ٹھیک ہے؟ ویسے ہمارے ساتھ ایک ڈاکٹر بھی ہے...."

آسٹرین سیاح اپنے خیموں سے نکل کر ناشتے کے لئے آنے لگے.... ان میں مارتا، ارسلا اور رولینڈ بھی تھے.... مارتا ایک بہت دوست اور ملنسار قسم کی لڑکی تھی.... اس کے سیاسی خیالات بے حد ترقی پسندانہ تھے اور وہ ہمہ وقت اپنے گروپ کے بزرگوں سے الجھتی رہتی تھی.... اس کے آتے ہی آسٹرین صدر کرٹ والڈ ہائم پر عائد کردہ الزام پر بحث شروع ہو گئی کہ کیا دوسری جنگ عظیم میں وہ واقعی نازیوں کا آلۂ کار تھا اور یہودیوں کے قتل عام میں شریک تھا.... مارتا کا خیال تھا کہ ایسا تھا اور بزرگوں کا خیال تھا کہ اگر ایسا تھا تو پھر کیا ہوا.... ارسلا اور رولینڈ صرف مسکراتے تھے.... اس دوران ایک شخص ناشتے کے لئے آیا جو آسٹرین کسانوں کے مخصوص لباس میں تھا.... پائپ کے کش لگاتا ہوا وہ گھاس پر بیٹھ گیا۔

"یہ ڈاکٹر فرڈگارٹز ہیں.... جو فیئری میڈو پر کتاب لکھ رہے ہیں...." مارتا نے تعارف کرایا۔

"جن سے کل ملاقات اس لئے نہ ہو سکی کہ یہ اپنے خیمے میں پریوں کی ساتھ تھے....؟"

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

ڈاکٹر گارڈنر نے مجھ پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور پھر قہقہہ مار کر ہنس دیا۔۔۔

"آپ کا کیا پروفیشن ہے؟"

"آوارہ گردی۔۔۔" میں نے بھی ہنس کر کہا۔

"آ۔۔۔ اے ویگابانڈ۔۔۔ وہ تو ہم سب ہیں ورنہ ہم یہاں نہ ہوتے۔۔۔ لیکن جناب کیا شاندار ملک ہے آپ کا' آپ خوش قسمت ہیں جو اس ملک میں رہتے ہیں۔۔۔"

"ہم یقیناً ہیں ڈاکٹر گارنر۔۔۔ اور کیا آپ واقعی فیئری میڈو پر کتاب لکھ رہے ہیں؟"

"ایک لمحہ۔۔۔" اس نے انگلی کھڑی کی پھر اٹھا اور اپنے خیمے کی طرف چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کے پاس ایک فائل تھی جس میں کچھ فوٹو سٹیٹ شدہ کاغذات تھے۔۔۔ اور یہ اس کی کتاب کے کچھ ورق تھے جو چھپ چکے تھے۔ ان میں فیئری میڈو اور نانگا پربت کے دامن میں اگنے والے پھولوں اور درختوں کی تفصیل تھی۔۔۔

"میں ایک سکول ٹیچر ہوں اور بیالوجسٹ ہوں۔۔۔ فیئری میڈو اور اس کے آس پاس کا علاقہ میرا جانا پہچانا ہے' میں اپنی کتاب کے سلسلے میں تین ماہ یہاں اکیلا گھومتا رہا۔۔۔ یہاں پائے جانے والے پھول' پودے اور تتلیاں ایک عجوبہ ہیں اس لئے کہ ان میں ایشیائی' ترکی اور یورپی اقسام موجود ہیں۔ دنیا میں میں نے تو کم از کم کہیں بھی' کسی ایک مقام پر ان تینوں اقسام کو اگتے اور اڑتے نہیں پایا۔۔۔"

ایک بوڑھا آسٹرین جو پہلے ہی بہت بیزار بیٹھا تھا ڈاکٹر کی گفتگو سننے کے لئے آگے آیا اور پھر مسکرا کر کہنے لگا "دراصل یہی وہ شخص ہے جو اس علاقے کی تعریف میں زمین و آسمان ایک کر دیتا ہے اور مجھ جیسے ریٹائرڈ بوڑھوں کو اولڈ ہیپل ہوم سے نکال کر یہاں لے آتا ہے۔۔۔"

بعد میں معلوم ہوا کہ ڈاکٹر گارنر ایک کامیاب ٹریول ایجنٹ بھی ہے اور لوگوں کو ٹور پر یہاں لے کر آتا ہے۔ اس کے علاوہ فیئری میڈو سے تتلیاں پکڑ کر یورپ کے عجائب گھروں کو سپلائی کرتا ہے۔۔۔

"کیا تمہیں پودوں اور درختوں سے دلچسپی ہے؟" ڈاکٹر گارنر نے مجھ سے پوچھا۔

"میرے والد رحمت خان تارڑ ایک معروف ماہر زراعت ہیں اور انہوں نے زراعت کے موضوع پر درجنوں کتابیں تحقیق و تصنیف کی ہیں۔ میں بھی بہت عرصہ اس شعبہ سے منسلک رہا ہوں۔۔۔"

"ہاں۔۔۔" ڈاکٹر بے حد خوش ہوا "پھر تو تم میری زبان سمجھ سکتے ہو۔۔۔ یہاں تو ایسے ایسے پودے ہیں کہ میں کیا بیان کروں۔ یہ فیئری میڈو والے کو ہستانی مجھے خبطی سمجھتے ہیں کیونکہ میں اکثر کسی تتلی کے پیچھے بھاگتا ہوا اسے جال میں لانے کی کوشش کر رہا ہوتا ہوں یا کیمرے کے ساتھ کسی خطرناک چٹان کے ساتھ لٹک کر کسی پھول کی تصویر اتار رہا ہوتا ہوں۔۔۔ تم جانتے ہو کہ یہاں پانٹس گیرارڈیانہ بھی پایا جاتا ہے؟" ڈاکٹر کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ مجھے ستائش چاہنے والی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔۔۔

"نہیں میں نہیں جانتا تھا۔۔۔" میں نے جھینپ کر کہا۔

"اور جناب یہاں تمارکس گالیکا بھی ہے۔۔۔"

"اچھا۔۔۔" میں نے کان کھجا کر کہا "کمال ہے۔۔۔"

"میرے قریب آکر میری بات سنو۔۔۔" وہ اب پودوں کی دنیا میں تھا اور بے حد خوش تھا کہ اسے مجھ جیسا "پودہ ایکسپرٹ" مل گیا ہے "یہاں جونیپرس یبی گلوبوسا اتنا زیادہ پایا جاتا ہے کہ تم یقین نہیں کر سکتے۔۔۔"

"کیا واقعی؟"

"اور آرٹیمیا میری ٹیما' کوچیا' روزا و بیانہ' کولوٹیا' بربرس اور لونی سیرا تو بے حد عام ہیں۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ زراعت کے پاکستانی ماہرین ان علاقوں کی نباتات پر بے شمار کتابیں تحریر کر چکے ہوں گے۔۔۔"

زراعت کے پاکستانی ماہرین عام طور پر اپنے اسلام آباد کے دفتروں سے باہر نکل کر اپنے لان میں کھلے ہوئے پھول اور پودے بھی نہیں دیکھتے۔۔۔ لیکن میں نے اسے یہ نہیں بتایا بلکہ کندھے اچکا کر ایک مسکراہٹ کے ساتھ اس کا جواب دے دیا جو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

میں نے ڈاکٹر فرنز کی کتاب کے اوراق پر ایک نظر ڈالی۔۔۔ اس نے رائے کوٹ سے لے کر نانگا پربت کے دامن تک کے علاقے کے نقشے نباتاتی حوالے سے بنا کر شامل کر رکھے تھے اور ادھر اگنے والا پتہ پتہ بوٹا بوٹا اس میں درج تھا۔۔۔

اس نے مجھے نانگا پربت کی ایک ایسی تصویر دکھائی جو حیران کن تھی۔۔۔ ایک وسیع جھیل میں نانگا پربت سورج ڈوبنے کے بعد گلابی رنگ میں۔۔۔ "میں لوگوں کو

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

فیری میڈو کی یہ تصویر دکھاتا ہوں اور وہ کھنچے چلے آتے ہیں..."

"لیکن یہ منظر میں نے تو ادھر نہیں دیکھا... فیری میڈو میں جھیل کہاں سے آ گئی؟"

"اس کی ایک کہانی ہے... میں ایک روز جنگل میں تھا کہ شدید بارش شروع ہو گئی... ادھر فیری میڈو کی طرف آیا تو ادھر واٹلے کے پاس ایک جگہ پر تھوڑا سا پانی جمع ہو چکا تھا... بس میں نے ایک خاص زاویے سے نانگا پربت کی تصویر ایسے اتاری کہ اس تھوڑے سے پانی میں وہ نظر آنے لگی... بس یہی وہ جھیل ہے... تھوڑی سی دیر بعد پانی خشک ہو گیا اور جھیل غائب۔ اب جو سیاح ادھر آتے ہیں تو مجھ سے پوچھتے ہیں کہ فیری میڈو کی جھیل کہاں ہے تو میں کہتا ہوں یہ طلسمی چراگاہ ہے' جھیل غائب ہو گئی ہے"۔

"ویسے ادھر جھیل تو ہے..."

"ہاں... وہیں واٹلے کے ساتھ ذرا نیچے ایک عام سی جھیل ہے... کبھی کبھار جب میں پریوں کے ساتھ تنہا ہونا چاہتا ہوں تو وہاں چلا جاتا ہوں..."

"پریوں کے ساتھ... انہی پریوں کے ساتھ جو..."

"ہاں وہی... پریاں" وہ پھر ہنسنے لگا۔

"آج شام اگر فرصت ہو تو میرے خیمے میں چلے آنا تمہاری ملاقات کروا دوں گا... پھر ملیں گے میں یہاں کیمپ جا رہا ہوں" وہ اسی طرح خوش و خرم ہاتھ ملتا ہوا چلا گیا۔

"یہ کس قسم کی پریوں کی بات کر رہا تھا؟" میں نے مارتا سے پوچھا جو ڈاکٹر کی گفتگو کے دوران مسلسل مسکرائے چلی جا رہی تھی۔

"یہ اس قسم کی پریوں کی بات کر رہا تھا جو کہ آدھی بوتل وہسکی پینے کے بعد ہر ایک کو نظر آنے لگتی ہیں... سارا دن جنگل میں گھومتا رہتا ہے اور شام ہوتے ہی اپنے خیمے میں بند ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ وقت پریوں کے لئے ہے اور پھر کبھی کبھی اس کے گانے کی آواز بھی آتی ہے..."

ہم جہاں بیٹھے تھے وہ جنگل کا شروع تھا... یہاں سے ایک جانب تو فیری میڈو کا کچھ حصہ نظر آتا تھا اور دوسری جانب وہ گہری خاموشی تھی جو ادھر سے آتی تھی' جدھر خاموش ندی میں برچ کے سینکڑوں برس قدیم تنے پڑے تھے اور پانی کے زور

سے جب چلتے تھے تو زندہ لگتے تھے... میں مسلسل ادھر دیکھ رہا تھا اور مجھے مسلسل ادھر سے بلاوا آتا تھا...

"تم اور تمہارے دوست بھی ہماری پہاڑی پر آؤ۔ نانگا پربت کا حسین ترین روپ تو ادھر سے ہی دکھائی دیتا ہے..."

"ہم آئیں گے..." مارتا نے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور پھر سر جھٹک کر کہنے لگی "تم بہت عجیب مرد ہو..."

"کیوں؟"

"پتہ نہیں..." اس نے پھر سر جھٹکا... "لیکن تم ہو..."

جنگل کے اندر وہی خاموشی تھی اور اس خاموشی کے اندر وہی سرسراہٹ تھی اور میں اس کے اندر ایک ایلس کی طرح حیرت میں گھومتا تھا اور وہ ایک ونڈر لینڈ تھی...

اس روز اور اس سے اگلے روز میں اسی ونڈر لینڈ میں رہا... میں بہت کم فیری میڈو کی طرف آتا... کبھی میں جنگل کی تنہائی میں خوفزدہ ہو جاتا اور گھبراہٹ میں پرانے تنوں کو پھلانگتا اور پانی میں چلتا واپس فیری میڈو میں آ جاتا... لیکن یہ بہت کم ہوتا۔ میں اکثر اس میں گم رہتا... اور اس جنگل کے گم اسرار میں چلتے ہوئے مجھے مارکیز کے ناول "سو برس کی تنہائی" کا خیال آتا رہتا... اس کے جنگل کا خیال آتا رہتا... ایک روز میں جھیل کی طرف بھی گیا جو ایک بڑا تالاب تھا جہاں مویشی پانی پینے کے لئے آتے تھے... اس کے باوجود اس میں خاموشی اور تنہائی کا حسن تھا... اس کے کنارے بھی گرے ہوئے درخت تھے' بوسیدہ تنے اور کڑکڑاتی ٹہنیاں۔ اور جیسا کہ ہوتا ہے مجھے فیری میڈو کی عادت ہو گئی اس پہاڑی پر مستقل خیمے' قریب پڑے درخت کے تنے' رائے کوٹ گلیشیئر میں پوشیدہ دریا کی آواز اور نانگا پربت کی صبح اور دوپہر اور شام کی عادت ہو گئی...

اور جب عادت ہو جاتی ہے تو اس سے اگلے روز کوچ کرنا ہوتا ہے۔

جسے عادت ہو جائے وہ خانہ بدوش نہیں رہتا... اس کے خیمے کے آس پاس گھاس بلند نہیں ہونی چاہئے... تو اگلے روز رحمن اور قدم خان نے آنا تھا اور ہمیں فیری میڈو سے کوچ کرنا تھا۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

ہماری آخری شام کی دھوپ تھی جو ڈھل رہی تھی اور ہم اپنے خیموں سے باہر بیٹھے نانگا پربت کو دیکھتے تھے اور ہمارے دل میں اس ظالم پہاڑ کے لئے بھی نرم گوشہ پیدا ہوتا تھا اور ہم بچھڑ جانے سے پیشتر والی اداسی کا شکار ہوتے تھے۔ شام گہری ہونے لگی تو گاڈفرے نے آگ جلائی اور ہمارے آخری کھانے کا بندوبست کرنے لگا... لکڑیوں کا دھواں اس تازہ اور تیز سرد ہوا میں نتھنوں میں جاتا تھا تو بھلا لگتا تھا...

نیچے سے کچھ لوگ اوپر آ رہے تھے... رحمت نبی' مارتا' ارسلا' رولینڈ اور کچھ کوہستانی اور کچھ آسٹرین بوڑھے...

"تم نے کہا تھا ناں کہ کبھی ہماری پہاڑی پر آنا..." مارتا ہانپتی ہوئی میرے پاس بیٹھ گئی... "اوہ مائی گاڈ... تم درست کہتے تھے... یہاں سے تو نانگا پربت... تم درست کہتے تھے..."

گاڈفرے نے ایک اچھے باورچی کی طرح مہمانوں کے لئے جلدی سے کافی بنا لی... اور جو کافی نہیں پیتے تھے ان کے لئے بسکٹ...

"تیمور خان تو ابھی نہیں آیا؟" رحمت نبی نے مجھ سے پوچھا "وہ آپ کے لئے مارخور شکار کرنے گیا ہوا ہے..."

"کیا واقعی ادھر مارخور ہے؟"

"ادھر برزل پاس میں تو اب بھی ہے..." رحمت نبی کہنے لگا... "لیکن پہلے ہمارے دادا کے زمانے میں ادھر بھی بہت تھا... میرے پردادا جن کا نام خوش ملک تھا ادھر شکار کرنے آئے تھے... وہ چلاس کی جانب سے گونر فارم کے راستے ادھر آئے... اور پہلی بار سامنے والی پہاڑی پر پہنچے اور انہوں نے نیچے دیکھا تو نیچے... یہ فیری میڈو تھا۔ اس میں لمبی لمبی گھاس تھی اور گھاس میں جلی ہوئی سیاہ لکڑیاں تھیں جو کسی مسافر نے شاید رات گزارنے کے لئے جلائی تھیں... پھر تارڑ صاحب وہ سیاہ لکڑیاں حرکت میں آ گئیں... کیونکہ وہ تو بہت سارے مارخوروں کے سینگ تھے جو گھاس میں بیٹھے تھے اور اوپر سے ان کے صرف سینگ نظر آتے تھے... مارخور اٹھے اور ادھر جنگل میں چلے گئے' پورا ریوڑ... پردادا خوش ملک کو ایسی چراگاہ کی تلاش تھی جہاں کچھ میدان ہو پانی ہو... انہوں نے واپس جا کر برطانوی حکومت سے اجازت لی اور اس زمین کا مالیہ دے کر اسے اپنی چراگاہ بنا لیا..."

"اور اب سنا ہے کہ فیری میڈو میں ایک ہوٹل بن رہا ہے... شنگریلا قسم کا... یہ پہاڑی جس پر ہم بیٹھے ہیں فروخت ہو چکی ہے..." مارتا نے سر جھٹک کر کہا اور بہت بے بسی سے کہا "آپ لوگ ایسا کیوں کرتے ہو؟ اور یہ بھی سنا ہے کہ آپ جنگل فروخت کر رہے ہیں... جب سڑک بن جائے گی تو یہ جنگل کٹ جائے گا اور بقول ڈاکٹر گارڈز اگر جنگل کٹ گیا تو فیری میڈو ختم ہو جائے گا اور یہاں سیلاب کے پانی آ جائیں گے..."

"لوگوں کو روزگار ملے گا۔ ترقی ہو گی... کیوں تارڑ صاحب آپ کا کیا خیال ہے؟"

"ترقی تو ہونی چاہئے..." میں نے بھی بے بسی سے کہا "لیکن زمین پر کچھ جگہیں تو ایسی ہونی چاہئیں جہاں خانہ بدوش جا سکیں... اور اگر فیری میڈو نہ ہو گا تو خانہ بدوش کہاں جائیں گے..."

تاریکی گہری ہونے لگی تو مطیع لالٹین جلا کر لے آیا اور اسے ہمارے درمیان رکھ دیا...

ارسلا جو ہمیشہ چپ بیٹھی رہتی تھی ذرا جھجک کر بولی "میں نے سنا ہے کہ نانگا پربت کے علاقوں میں برف کے انسان بھی ہوتے ہیں... کیا یہ سچ ہے؟"

"اگر یہ سچ ہے تو بھی کوئی کچھ نہ کہے کیونکہ تھوڑی دیر میں تو آپ چلے جائیں گے اور ہمارے لئے فیری میڈو میں اپنی آخری رات گزارنا مشکل ہو جائے گا... برف کے انسان غالباً خاصے خونخوار ہوتے ہیں..." مطیع ہنسنے لگا۔ وہ یوں بھی مارتا کی موجودگی میں کچھ زیادہ ہنستا تھا۔

"کیوں چاچا..." رحمت نبی نے اپنے چاچا کی طرف دیکھا...

"ہاں..." چاچا نے سر ہلایا... "ہوتا ہے..."

"ہیں" ارسلا خوفزدہ ہو گئی "واقعی ہوتا ہے؟"

"کدھر ہوتا ہے بھئی؟" مطیع کی ہنسی منجمد ہو گئی... مجھ پر بھی کچھ کپکپی سی طاری ہو گئی۔

"اس کو ہم برمنڈو کہتے ہیں... بن مانس کی طرح ہوتا ہے۔ ہمارے دادا کا اس سے لڑائی ہوا تھا... ادھر فیری میڈو میں... ہمارے دادا کا بندوق ٹوٹ گیا تھا... بہت لوگوں نے ادھر سے دیکھا... انہوں نے سمجھا کہ شاید دو بڑے کتے لڑ رہے ہیں... ہاں

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

برہنڈو تو ہوتا ہے...."

"اس کی کچھ تفصیل بتائیں...." میں نے چاچا سے پوچھا....

"نہیں نہیں تفصیل نہیں چاہئے...." مارینا ہاتھ اٹھا کر بولی "اس وقت نہیں .... اگرچہ مجھے یقین ہے کہ سنومین کا وجود نہیں ہے لیکن ان ہمالین علاقوں کا کچھ پتہ نہیں...."

"آپ یہاں الاؤ کیوں نہیں روشن کرتے؟" رحمت نبی کہنے لگا "چلو بھئی سب لوگ اپنے حصے کی لکڑی لے کر آئیں...."

اور حیرت انگیز حد تک لکڑی بے حد خشک تھی اور چند لمحوں کے اندر ہمارے خیموں کے سامنے الاؤ کے شعلے بلند ہو رہے تھے اور اس کی روشنی میں ہمارے چہرے تمتما رہے تھے.... مطیع بڑے بڑے تنے کھینچتا ہوا لا رہا تھا اور الاؤ کی بلندی میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا.... آس پاس جو کچھ دکھائی دیتا تھا وہ آگ نے ختم کر دیا اور اب ہمارے چہرے تھے جو چمکتے تھے....

"ہوا کے رخ کا دھیان رکھنا کہیں خیمے زد میں نہ آ جائیں...." کسی نے کہا....

تاریکی میں سے یکدم کچھ سامنے آ گیا.... مارینا اور ارسلا نے ہلکی سی چیخیں ماریں اور ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ ہمارے سانس بھی نیچے کے نیچے اور اوپر کے اوپر' کیونکہ سنومین کی دہشت ہم میں تھی۔ لیکن یہ تیمور خان تھا.... تھکا ہوا اور پژمردہ.... اس کا بھائی بھی ہمراہ تھا۔ وہ ہمارے قریب آ کر بیٹھ گئے "نہیں ملا سور کا بچہ...." تیمور نے زمین پر تھوکا "ہم صبح چلے اور رات کو ادھر برزل پاس کی چٹانوں پر پہنچے.... رات آگ جلا کر بیٹھے اور صبح سویرے پورے سات مارخور دیکھے.... ہمارے سامنے تھے پر ہاتھ نہیں آئے.... جتنی دیر میں نشانہ لیا وہ غائب ہو گئے۔ بہت تلاش کیا یارا.... فکر نہ کرو ہم پھر جائے گا اور تم کو ضرور مارخور کھلائے گا...."

"ہم تو صبح جا رہے ہیں تیمور...."

"پر کیوں یارا.... یہ اچھا جگہ ہے ادھر ٹھہرو...."

خیموں کے پیچھے جو بڑا تنا تھا جس کے ساتھ ٹیک لگا کر ہم بیٹھتے تھے' منہ ہاتھ دھوتے تھے اور ہوا سے بچاؤ کر کے چولہا جلاتے تھے مطیع اس تنے کو الاؤ تک لانے کی کوشش کر رہا تھا....

"نہیں مطیع.... اسے رہنے دو.... ہمارے بعد کوئی اور بھی تو آئیں گے.... اسے رہنے دو"

الاؤ سے ذرا پیچھے ہٹتے تو شدید سردی کا احساس ہوتا....

"نارڈ صاحب نانگا پربت کی دوسری جانب ایک وادی ہے۔ وادیٔ روپل.... اور ایک وسیع میدان ہے لاتوبو.... چوٹی کے عین نیچے' وہ بھی بے حد خوبصورت ہیں.... کبھی ادھر بھی جایئے گا...." رحمت نبی اٹھتے ہوئے بولا "صبح ملاقات ہو گی...."

اور وہ اپنے چاچا کے ہمراہ نیچے اترنے لگا.... باقی لوگ بھی رخصت ہونے لگے.... تھامس اور مشائلہ اپنے خیمے میں جا چکے تھے۔ مطیع بھی اٹھا اور خیمے میں چلا گیا.... میں گھٹنوں پر سر رکھے آگ میں دیکھتا رہا۔ الاؤ مدھم ہونے لگتا تو میں اس میں مزید لکڑی ڈال دیتا....

آواز صرف لکڑی کے جلنے کی تھی' پوشیدہ دریا کی تھی اور تیز ہوا کی تھی....

یکدم دریا رک گیا اس کا شور ختم گیا۔

"سٹانس...." گاڈفرے نے پکارا۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر کھلی فضا میں اپنے سلیپنگ بیگ میں لیٹا ہوا تھا "الاؤ میں مزید لکڑی نہ ڈالنا۔ آگ کی روشنی ہوتی ہے تو مجھے ستارے نظر نہیں آتے...."

چونکہ شدید سردی تھی اس لئے الاؤ بڑی تیزی سے ٹھنڈا ہونے لگا.... ہمارے آس پاس اندھیرا ہوا تو نانگا پربت کی سفیدی کچھ کچھ دکھائی دینے لگی....

اوپر آسمان پر ستارے نظر آنے لگے....

نیچے زمین پر فیئری میڈو کا راستہ نظر آ رہا تھا۔

دو پہاڑوں کے درمیان جو لکیر تھی وہ تاتو نالہ تھا جس کے آخر میں رائے کوٹ گلیشیئر لیٹا تھا اور اس پر نانگا پربت سایہ فگن تھی....

رائے کوٹ گلیشیئر پر ایک سرسبز حصہ جھکا دکھائی دیتا تھا جو فیئری میڈو تھا اور یہیں دو برس پیشتر اپنے قیام کی آخری رات ہم نے ایک الاؤ روشن کیا تھا اور گاڈفرے نے کہا تھا اسے بجھا دو مجھے ستارے نظر نہیں آتے....

ہمارا فوکر طیارہ اسلام آباد سے گلگت جا رہا تھا اور ہم اس وقت دریائے سندھ کے اوپر پرواز کرتے ہوئے رائے کوٹ پل کے قریب آ چکے تھے اور میں نے واضح طور پر اس سپاٹ کی نشاندہی کی جہاں پل کے پہلو میں ریتلی زمین پر دو برس پیشتر میں

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

نے اور مطیع نے اپنا خیمہ نصب کر کے رات گزاری تھی۔

میں ایک بار پھر دیوسائی میدان عبور کرنے کی غرض سے گھر سے نکلا تھا۔

اور اس سفر میں میرا چھوٹا بیٹا سمیر اور میرا مصور دوست منصور راہی تھے....

اور ہم فیری میڈو کے اوپر سے گزر رہے تھے۔

اور نانگا پربت کی بلندی جیسے جہاز کو چھونے کو آتی تھی' ہم بے حد نزدیک تھے.... میں اور سمیر طیارے کی چھوٹے سے کاک پٹ میں جھکے ہوئے کھڑے تھے اور ہم گلگت جا رہے تھے۔

دُوسرا سفر

۱ - گلگت گیم ۱۸۱
۲ - روڈ ٹو استور اور چکور ہی چکور ۲۰۳
۳ - ترشنگ، پاکستان کا خُوبصورت ترین گاؤں ۲۱۴
۴ - رُوپل گلیشئر کے ہاتھی اور شوکور پر ایک زرد خیمہ اور سرد رات ۲۲۹
۵ - ٹاپ میدان اور شل مکھی دیامیر (سو چہروں والا پہاڑ) ۲۴۴
۶ - لاتوبو۔ بیس کیمپ نانگا پربت پر تارڑ پرچم ۲۵۴
۷ - شکاری یار محمد اور لاتوبو کا آخری ہرن اور داستانِ نانگا پربت ۲۵۹
۸ - کوہ پیماؤں کا قبرستان جہاں ہوا تیز چلتی تھی ۲۶۵
۹ - ٹاپ میدان کی رات میں الاؤ اور اس کے سائے نانگا پربت پر ۲۷۷
۱۰ - گھر لوٹنے والے مویشی ۲۹۱
۱۱ - وادیٔ رُوپل دیکھنے والے آوارہ گرد کی مُسکراہٹ میں فرق ہوتا ہے ۲۹۸
۱۲ - ترشنگ ایک تصویر ۳۱۰
۱۳ - پورٹر سُلطان کے کوہستانی گھر میں ۳۲۳
۱۴ - خُوبصورتی کا خوف اور راما جھیل ۳۲۹
۱۵ - دُھندلائی ہُوئی، ایک خیال میں...... نانگا پربت ۳۳۵

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"گلگت گیم"

نیچے زمین پر فیئری میڈو کا راستہ نظر آ رہا تھا۔

یہیں دو برس پیشتر' اپنے قیام کی آخری رات ہم نے ایک الاؤ روشن کیا تھا اور گاڈفرے نے کہا تھا' اسے بجھا دو مجھے ستارے نظر نہیں آتے۔۔

دو برس پیشتر۔۔۔

اور اب نانگا پربت کی بلند ترین چوٹی جیسے جہاز کے پر کو چھونے آتی تھی ہم بے حد نزدیک تھے اور کاک پٹ میں جھکے ہوئے کھڑے تھے اور ہم گلگت جا رہے تھے۔ اور وہاں سے استور۔ ترشنگ۔ وادی روپل اور نانگا پربت کی روپل سائڈ۔۔۔ اور پھر وہاں سے دیوسائی کے میدان عبور کر کے سکردو۔۔۔ کم از کم ہماری منصوبہ بندی تو یہی تھی۔۔۔ اور اس بار میں نے خصوصی طور پر اگست کے آغاز کا چناؤ کیا تھا کہ ان دنوں بہر صورت دیوسائی کی برفیں پگھل جاتی تھیں۔۔۔۔

کیپٹن زبیر کا کہنا تھا کہ ایک مرتبہ دیوسائی میدان کے اوپر پرواز کرتے ہوئے میں نے ایک حیران کر دینے والا منظر دیکھا۔ دیوسائی کی ایک جھیل اوپر سے اتنی شفاف اور صاف تھی کہ اس کے پانی دکھائی نہ دیتے تھے اور جھیل کی تہ اور کنارے بالکل خالی نظر آتے تھے۔

اس دیوسائی پر دھوپ نکلے تو گرمی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے اور اگر دھوپ کے آگے چھوٹا سا بادل آجائے تو اس کے سائے میں درجہ حرارت منفی ہو جاتا ہے۔۔۔۔

دو برس پیشتر اس عظیم میدان نے مجھے راستہ نہیں دیا تھا کہ اس راستے کی برفیں جولائی کے آخر تک نہیں پگھلی تھیں۔۔۔ اور اب تو اگست کا آغاز تھا۔۔۔ وہاں میرے لیے راستہ ہوگا۔۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

اس سفر میں میرے ساتھی نظامی اور خان کی بجائے میرا چھوٹا بیٹا سمیر اور منصور منصور راہی تھے۔۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں ایک ایسے جہاز میں سوار ہوں جو صاف موسموں میں گلگت کی جانب پرواز کر رہا ہے۔۔ ہر مساتی سفر کی طرح اس سفر کی منصوبہ بندی اور تیاری پر بھی بہت پسینہ بہا تھا' بہت دنوں سے مشقت ہو رہی تھی۔۔ صبح کی نشریات سے رخصت کا بندوبست۔ رک سیک۔ سلیپنگ بیگ۔ کھانے پینے کا مکمل انتظام۔ راستے کے بارے میں معلومات اور ان کے سوا ایک ہزار ایک باتیں۔۔ سوال اور ان کے جواب جو کبھی ملتے اور کبھی نہ ملتے۔۔ گلگت کے لیے نشستیں پی آئی اے کے ناردرن ایریا دفتر سے بک ہوتی ہیں۔۔ وہاں زیدی صاحب نے فوری طور پر نشستوں کا انتظام کر دیا اور کہنے لگے "اب آپ موسم کے ہاتھ میں ہیں۔۔ کتنے دن سے فلائٹ نہیں گئی۔۔ شاید اس روز چلی جائے۔۔" پھر کچھ سوچ کر مسکرائے "ویسے تمام آوارہ گردوں کے چہرے ایک جیسے ہوتے ہیں۔۔ پر شوق اور تمتماتے ہوئے۔۔ پی آئی اے میں بھی ایک پائلٹ ہیں زبیر۔۔ وہ بھی پہاڑوں میں دھکے کھانے کے بڑے شوقین ہیں۔۔ پچھلے دنوں دیوسائی میدان بھی گئے تھے۔۔"

دیوسائی کا نام سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔۔ میری فرمائش پر زیدی صاحب نے زبیر صاحب کو فون کیا' معلوم ہوا نماز پڑھ رہے ہیں۔۔ شام کو ہوٹل پہنچ کر میں نے پھر کوشش کی۔۔ زبیر صاحب سے بات ہوئی۔۔ کہنے لگے' چند روز ٹھہر جائیں تو میں پھر جانے کو تیار ہوں۔۔ اگلے پانچ روز روزانہ زبیر صاحب سے گفتگو ہوئی اور ان کی پہاڑوں میں آوارہ گردی کے حوالے سے ہوئی۔۔ (اگست ۱۹۸۸ء میں پی آئی اے کا ایک فوکر جہاز گلگت سے اسلام آباد آتے ہوئے نانگا پربت اور دیوسائی کے علاقوں میں لاپتہ ہو گیا۔ کیپٹن زبیر اس جہاز کے پائلٹ تھے۔)

اور سمیر کے ساتھ میرا وعدہ تھا کہ جب وہ آٹھویں جماعت میں جائے گا تو میں اسے اپنے ہمراہ ٹریکنگ پر لے جاؤں گا اور اب وہ نویں جماعت کا طالب علم تھا۔۔ مجھ سے زیادہ بلند ہو چکا تھا۔۔ منصور راہی بھی پہاڑوں کا ڈسا ہوا تھا۔۔ صبح کی نشریات میں بچوں کو مصوری سکھاتا تھا۔۔ بنگالی تھا لیکن ایک نستعلیق لکھنؤی انداز کی خاتون سے شادی شدہ تھا اور ہر سانس کے ساتھ اس کے نام کی مالا جپتا تھا۔۔ اگر آپ اس سے پوچھیں کہ راہی آج موسم کیسا ہے تو وہ اپنی معصوم مسکراہٹ کے ساتھ کہے گا۔۔۔ باجرہ! اور آج موسم بہت برا تھا۔۔

ہماری فلائٹ ساڑھے دس بجے صبح تھی ۔۔ ہمارے رک سیک ٹیلی ویژن کی سوزوکی وین میں پڑے تھے اور میں پورے پاکستان کو "السلام و علیکم خواتین و حضرات

اور صبح بخیر سارے پاکستان اور پیارے پاکستان" کہہ رہا تھا اور اس وقت پورے سات بجے تھے اور ہم سٹوڈیو میں بھیگتے ہوئے پہنچے تھے اور ابھی تک چھما چھم بارش برس رہی تھی ۔۔ اور میں بے حد گھبرایا ہوا تھا۔ اگر آج فلائٹ نہ گئی تو کیا ہو گا۔۔۔ میرے پاس بے حد مختصر وقت تھا۔ چند روز مری جان صرف چند روز اور ان میں جتنے دن کم ہوں گے اتنے ہی سانس کم ہوں گے ۔۔ میں اگلا پروگرام اناؤنس کرتا اور جب پروگرام آن ائیر جاتا تو میزبان کی کرسی چھوڑ کر گلے میں سے مائک اتار کر بھاگتا ہوا سٹوڈیوز سے باہر جاتا اور اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکتا۔ باہر بارش اور تیز بارش۔ اور میں مایوسی میں نچڑتا ہوا پھر واپس آ جاتا اس یقین کے ساتھ کہ نہیں آج نہیں ۔۔ پروگرام کا اختتام ہوا تو میں نے ناظرین کو اپنے سفر کے بارے میں بتایا اور "آپ کے لیے اور پورے پاکستان کے لیے ایک خوش نصیب دن کی خواہش کے ساتھ" اجازت لے کر سٹوڈیوز سے باہر آ گیا۔۔ بارش رک چکی تھی لیکن بادل ابھی تک گھنے تھے ۔۔

ایئرپورٹ لاؤنج میں ایک ایئر ہوسٹس میرے پاس آئی "تارڑ صاحب میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟"

"آپ میرے لیے دعا کر سکتی ہیں" میں نے سر ہلا کر کہا "یہ دعا کہ آج گلگت کی فلائٹ چلی جائے"

"ابھی تو بادل ہیں اور گلگت کی فلائٹ ۔۔ خیر میں دعا کروں گی۔۔" وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی اور اسی لمحے سلمان رشید وارد ہو گیا "السلام و علیکم بھائی جان۔۔ میں سلمان رشید ہوں"

"اچھا؟" میں نے ایک بوسیدہ مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلایا۔ میں اس قسم کے کرداروں سے سخت بیزار تھا جو فی الفور فری ہو جاتے ہیں اور آپ کو بھائی جان۔ چاچا جی۔ بابا جی وغیرہ بنا لیتے ہیں ۔۔۔ یہ صاحب ایک چیک شرٹ اور جین کے علاوہ ایک بہت بڑی مسکراہٹ میں ملبوس تھے "میں بھی گلگت جا رہا ہوں"

"ہوں!" اور میں نے سر ہلایا "اگر فلائٹ گئی تو۔۔"

"بھائی جان فلائٹ جائے ہی جائے" اس نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔

"ہو نہ جائے ہی جائے" میں نے اتنی ہی بے یقینی کے ساتھ کہا اور اسی وقت لاؤنج کے بڑے شیشوں میں سے میں نے دیکھا کہ ایک موٹر ٹرالی سامان سے بھری ایک جانب کھڑے فوکر جہاز کی طرف چلی جا رہی ہے۔ اور اس پر ہمارے نیلے اور سرخ رک سیک رکھے ہوئے ہیں۔ اگر سامان لد رہا ہے تو فلائٹ جا رہی ہے ۔۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"مبشر کا کیا حال ہے؟" اس کردار سلمان رشید نے پوچھا "بھائی جان ہم دونوں کاکول اکیڈمی میں اکٹھے تھے۔ آج کل کہاں ہے؟"

"میجر مبشر؟۔۔۔ وہ ان دنوں ترکی کی پہاڑیوں میں ہے۔ لیکن آپ۔۔۔"

"میں نے آرمی چھوڑ دی ہے کیونکہ مجھے آوارہ گردی کا شوق ہے بھائی جان۔۔۔" سلمان رشید کی شکل سے بالکل یہ مترشح نہیں ہوتا تھا کہ وہ کبھی آرمی ڈسپلن کا بھی پابند رہا ہے۔ "مجھے یاد ہے کہ میں نے کامیو کی پہلی کتاب مبشر سے لے کر پڑھی تھی اور اس پر آپ کا نام لکھا تھا"

"لیکن تم اب کیا کرتے ہو؟"

"آوارہ گردی بھائی جان۔ گلگت سے میں سکردو جاؤں گا ایک ٹریک پر۔۔۔ اور پھر اخباروں میں سفرنامہ لکھ کر روزی کماؤں گا۔ بس میں اور کچھ نہیں کرتا"

لاؤنج میں نصب شدہ سپیکرز میں کچھ گونج سی پیدا ہوئی اور پھر وہ اعلان سنائی دیا جو ہم سننا چاہتے تھے "خواتین و حضرات گلگت کے لیے ہماری پرواز روانگی کے لیے تیار ہے۔۔۔ آپ سے التماس ہے کہ گیٹ نمبر ۲ سے جہاز پر تشریف لے جائیں اور لاؤنج سے نکلتے ہوئے اپنے سگریٹ بجھا دیں۔۔۔ شکریہ"

جیٹ ہوائی جہازوں کے بعد فوکر طیارہ ایک کھلونا ہے۔۔۔ ایک ایسا کھلونا جو ہمیں بچپن میں لے جاتا ہے جب جادوئی قالین آسمانوں پر اڑتے ہیں اور ہم ان پر سوار حیرت سے دنیا کو گزرتا دیکھتے ہیں۔

راہی مسلسل کیمرے سے آنکھ لگائے تصویریں اتار رہا تھا۔ سمیر کے چہرے پر وہ مسرت اور حیرت تھی جو پہلی پرواز کے دوران ہر چہرے پر ہوتی ہے۔ جہاز اڑا اور مرگلہ کی پہاڑیوں کو عبور کر کے تھوڑی دیر کے لیے جانی پہچانی لینڈ سکیپ سے گزرا اور پھر ہمارے نیچے قراقرم اور ہمالیہ کے برف زار تھے۔

ہماری درخواست پر ہمیں کاک پٹ میں بلا لیا گیا۔ یہ اتنا چھوٹا تھا کہ ہم جھک کر بمشکل اپنے آپ کو اس میں قائم رکھتے تھے۔ صرف ایک شخص ذرا اونچا ہو کر پائلٹ کے کندھے پر سے جھانک کر اس منظر کو دیکھ سکتا تھا جو شاید وہاں نہ تھا بلکہ کہیں اور کسی اور دنیا اور کائنات اور سیارے میں تھا یا شاید کوئی فلم تھی یا سوتے جاگتے میں کوئی لمحہ تھا یا موت کے بعد کوئی وادی تھی جو بند آنکھوں کے اندر تھی اور جو کوئی اس وادی کو دیکھتا تھا واپس نہیں جا سکتا تھا۔۔۔ ہم ایک اڑن کھٹولے پر سوار اس وادی میں خاموشی سے تیرتے تھے جہاں کوئی نہ تھا۔ برف تھی' برف کے راستے اور جھیلیں تھیں اور ہیبت ناک خاموشی تھی۔ کوئی اور سیارہ تھا جس پر ہمیں اترنا تھا اور

ہم زمین سے کروڑوں کلومیٹر دور آ چکے تھے۔ صرف پنکھے کی ایک مدھم شور کرتی آواز تھی اور جہاز کا ایک ونگ تھا جو ہمارے ساتھ ساتھ تھا۔ ہم ان پہاڑوں کے اوپر ہوئے جن کی چوٹیوں سے برف کی لکیریں نیچے اترتی تھیں اور وہاں ایک بڑی جھیل تھی جو سیف الملوک تھی۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ سیف الملوک ہے لیکن اس بلندی سے وہ ہمارے لیے کوئی اور جھیل تھی۔ کسی خلاء میں' کسی خیال میں ایک نیلگوں عکس۔ پھر بابو سر ٹیک۔۔۔ اور ہارس شو لیک کیونکہ یہ گھوڑے کے نعل کی شکل کی ہے

۔۔

"اوئے ابو میں نے ہارس شو لیک نہیں دیکھی' کہاں ہے؟" سمیر چونک کر بولا۔

"۔۔۔ آپ دیکھیں گے بیٹے۔" پائلٹ نے پیار سے کہا اور پھر خصوصی طور پر جہاز کو ذرا ڈائیو کر کے اس زاویئے پر لے گیا جہاں سے سمیر اس جھیل کو دیکھ سکتا تھا۔

"دیکھ لی؟" پائلٹ نے پوچھا۔

"تھینک یو انکل۔۔"

اور پائلٹ نے جہاز کو پھر سے سیدھا کر لیا۔

سلیپنگ بیوٹی ہماری جانب آ رہی تھی۔۔

برف پوش چوٹیوں کا ایک سلسلہ جو کسی برہنہ حسن خوابیدہ سے مشابہ تھا۔۔ برف کی ایک عورت۔۔۔ جو یقیناً بے حد ٹھنڈی تھی۔۔ اسی لیے تو ابھی تک ویسی کی ویسی ہی لیٹی ہوئی تھی۔۔۔۔ اس کا سینہ اور ٹھوڑی بے حد نمایاں تھے۔۔۔۔۔۔ نیچے دو الگ تھلگ اور ویران جھیلیں تھیں جن پر سے جہاز پرواز کر رہا تھا۔

"ان کا کیا نام ہے" سمیر نے پائلٹ سے دریافت کیا۔

"ان کا کوئی نام نہیں"

"یہاں لوگ جاتے ہوں گے؟"

"نہیں۔ ان تک جانے کا کوئی راستہ نہیں"

"کوئی تو ہو گا" سمیر نے بے یقینی سے سر ہلایا۔ اور مجھے اس میں اپنا آپ نظر آیا۔

موسم حیرت انگیز طور پر صاف اور دور دور تک چمکتا تھا۔۔۔ پائلٹ نے اصرار کیا کہ ہم گلگت لینڈ کرنے تک کاک پٹ میں ہی ٹھہرے رہیں۔۔۔ اس چھوٹے سے کاک پٹ میں جہاں دو آدمی بمشکل بیٹھے ہوئے تھے اور ہم دونوں بمشکل اپنے آپ کو اس کے اندر رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔۔۔۔۔ دنیا کا وسیع ترین کوہستانی سلسلہ نظر آ رہا تھا جو ہمارے آس پاس سرکتا چلا جاتا تھا۔ پائلٹ نے ایک گیئر نما شئے دبا کر

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

جہاز کو قدرے بلند کیا' سامنے کا منظر قدرے نمایاں ہوا "میرا خیال درست ثابت ہوا ہے آج کے ٹو نظر آ رہی ہے۔ ذرا غور سے دیکھنا ہو گا' فاصلہ بہت ہے"

خاموش پہاڑوں سے پرے جہاں بہت برف تھی اور نیچے بادل تھے اور اوپر سو فیصد نیلا اور کھلا اور خالی آسمان' وہاں بہت ساری چوٹیوں میں سے ایک کے ٹو یا شاہ گوری تھی ..... کونسی ؟......وہ جس کے اوپر ایک موہوم سا زرد بادل کبھی نظر آتا ہے اور کبھی نہیں آتا۔ کے ٹو بقیہ چوٹیوں کی طرح نظر نہیں آتی تھی بلکہ کچھ آپ کے تخیل میں اس کی تمام تر تصویریں جو تھیں وہ باری باری دکھائی پڑتی تھیں اور کبھی اس کی ہلکی زرد شبیہہ کا دھوکہ سا ہوتا تھا۔ البتہ مشہور چوٹی براڈ پیک واقعی بے حد چوڑی تھی اور صاف ابھرتی تھی۔۔۔ گیشربرم سلسلے کی چوٹیاں بھی نظر آ رہی تھیں اور راکاپوشی چونکہ قریب ترین تھی اس لیے وہ برف ہی برف تھی۔ جہاز کا زاویہ ذرا سا بدلا تو کے ٹو واقعی نظر آ گئی اور یہ ہماری خوش بختی تھی کیونکہ فلائٹ کے دوران بہت کم لوگوں نے اسے دیکھا تھا بلکہ ایک ماہ کی مشقت اور کوہ پیمائی کے باوجود بے شمار کوہ پیما برے موسم کی وجہ سے اس کی شکل دیکھے بغیر واپس آجاتے ہیں۔ اور ہم نے اس کی خواہش نہیں کی تھی اور یہ نظر آ گئی..... اہرام نما کے ٹو جو دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی ہے۔

"گلگت اب زیادہ دور نہیں..... ہم اس وقت چلاس کے اوپر ہیں....." پائلٹ نے بتایا۔

نیچے دریائے سندھ کا بل کھاتا ہوا وجود پہاڑوں میں بند تھا۔

.......جہاز ذرا ترچھا ہوا اور پھر.....نیچے زمین پر فیری میڈو کا راستہ نظر آ رہا تھا۔

یہیں دو برس پیشتر.....اپنے قیام کی آخری رات ہم نے الاؤ روشن کیا تھا اور گاڈفرے نے کہا تھا "اسے بجھا دو مجھے ستارے نظر نہیں آتے.....دو برس پیشتر.....بولڈر رج ہمارے عین نیچے تھی اور یہیں کہیں میں اور خان گری اور چڑھائی کی شدت سے بوکھلائے ہوئے ایک ایسے ہی جہاز کو دیکھتے تھے۔ ناتو نالہ رائے کوٹ گلیشیئر سے چلتا آ رہا تھا اور دریائے سندھ میں گم ہو رہا تھا۔ نانگا پربت کی پوری برفیلی کائنات دائیں ہاتھ پر تھی اور اس کے دامن میں فیری میڈو تھا.....فیری میڈو ادھر تھا اور اس بار ہم نے نانگا پربت کی دوسری جانب ادھر جانا تھا اور وہ رخ یہاں سے نظر نہیں آتا تھا۔

جہاز نیچے ہونے لگا۔۔۔ وادیء گلگت کے سبز ٹکڑے دریائے گلگت کے آس پاس تھے اور قریب ہو رہے تھے۔ ہم اپنی نشستوں پر واپس چلے گئے..... جہاز ایک چٹان کی جانب جا رہا تھا..... نیچے شاہراہ ریشم پر دو کاریں رینگ رہی تھیں' لگتا تھا کہ چٹانوں کے ساتھ چیونٹیاں چپٹی ہوئی ہیں۔ جہاز نے ایک دھچکے کے ساتھ اپنے پہیے نکالے.....اور چند لمحوں میں ہم گلگت کی زمین کو چھو رہے تھے۔

ماؤنٹ بلور ہوٹل' گلگت کے عین بازار میں ہوتے ہوئے بھی وہاں نہیں ہے۔ بلکہ وہاں ہے جہاں ایک پوشیدہ پر سکون پرانی رہائش گاہ ہے جس کے آس پاس ایک نیم ویران باغ ہے اور جہاں سیب اور اخروٹ کے درخت ہیں۔ اس کا ماحول گلگت سے الگ اور کٹا ہوا ہے.....پتھریلی دیواروں پر جنگلی گلاب کی بیلیں چھائی ہوئی ہیں اور گھاس کو ایک عرصے سے کاٹا نہیں گیا۔ البتہ یہاں کے بستر صفائی کے کسی مقابلے میں کسی قسم کی پوزیشن حاصل نہیں کر سکتے..... لیکن یہاں ایک ایسا ٹھہراؤ ہے' ایسی سستی ہے کہ انسان کسی اور جگہ جانے کے قابل نہیں رہتا.....برآمدے میں نہایت قدیمی صوفوں کے ڈھانچے ہیں جن پر اب بھی تھوڑی بہت کوشش سے بیٹھ جانا ممکن ہے۔ یہاں کے ویٹر بھی خاموش اور دھیمے ہیں۔ راہبر حسن مینجر ہیں اور انہیں مسکرانے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں.....

اور یہاں ایئرپورٹ سے آنے کے بعد منظر کچھ یوں تھا کہ میر باغ میں خیمہ زن چند انگریز یا آئرش یا سکاٹش قسم کے سیاحوں کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا۔ راہی بستر پر لیٹا یوگا کی کسی مشق میں مگن تھا۔ سلمان سو رہا تھا اور خراٹے لے رہا تھا اور میں برآمدے کے قدیمی صوفے پر براجمان اپنے اندر بے حد خوش تھا کہ مجھے وہ کچھ مل رہا تھا جو میرے دل کی خواہش تھی.....

گلگت ایک ایسا شہر ہے جس کے در و دیوار میں صرف کوہ پیمائی اور ایڈونچر کی کہانیاں ہیں اور جہاں سے نامعلوم وادیوں اور دور افتادہ پہاڑی سلسلوں کے لئے بے شمار راستے نکلتے ہیں ـــ یہ کیسا عجیب احساس تھا کہ ابھی صرف ساڑھے تین گھنٹے پیشتر میں ایک انتہائی میکانکی زندگی کا بے بس پرزہ تھا' ٹیلی ویژن سٹوڈیوز میں ایک روبوٹ تھا اور اب ـــ میں آزاد تھا اور گلگت میں تھا اور مجھے روپل جانا تھا اور روپل کو کون جانتا ہے اور میں نے اسے جانا تھا۔۔۔ اور پھر دیوسائی میدان..... زندگی اس سے زیادہ بامقصد نہیں ہو سکتی تھی' وہ زندگی جسے میں زندگی کہتا تھا.....

راہی جو خاصی دیر سے مردوں کی طرح بے حس و حرکت ٹانگیں اور ہاتھ پھیلائے لیٹا ہوا تھا یکدم چھلانگ لگا کر اٹھ بیٹھا "میں تیار ہوں"

اس پر سلمان بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا "بھائی جان کیا ہوا؟"

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"یہ تیار ہے ــــ" میں نے کہا "کس چیز کے لئے تیار ہے یہ تم خود پوچھ لو"

"کیوں راہی صاحب؟"

"میں اب مولی ٹماٹر اور پیاز کا سینڈوچ کھانے کو تیار ہوں ــــ یہ دیکھو" اس نے بستر کے نیچے سے ایک شاپنگ بیگ نکال کر اسے بستر پر الٹ دیا اور متعدد ٹماٹر پیاز اور مولیاں وغیرہ ادھر ادھر لڑھک گئے..... "ڈبل روٹی بھی ہے ــ ڈبل روٹی کے ساتھ ٹماٹر کھاؤ' ایسا کھانا تمہیں پورے گلگت میں نہیں ملے گا۔"

"یقیناً نہیں ملے گا۔"

راہی صاحب نے تقریباً زبردستی سب حضرات کو ایک ایک سلائس اور مولی یا چھلا ہوا پیاز تھما دیا.....اور ہم قدرے آبدیدہ ہو کر اس سینڈوچ کو کھانے لگے..... آئندہ چند دنوں میں راہی نے مجھے اپنی خوراک کی عادت سے بے حد حیران کیا۔ وہ بے حد سادہ غذا کھاتا تھا' کچی سبزیاں' ابلے ہوئے چاول اور دال.....اور بس۔

گلگت کے اس پہلے لنچ سے ہماری تشفی نہ ہوئی اور میں اور سمیر ہوٹل سے باہر آ گئے اور نزدیکی بیکری سے کچھ مقامی کیک خرید کر اپنا پیٹ بھرا.....بیگ صاحب کی دوکان بھی یہاں سے بالکل قریب تھی.....جی ایم بیگ میرے لیے گلگت کا دوسرا نام تھے۔ ایک ایسا شخص جسے میں دوست کہہ سکتا تھا.....نہ صرف وہ بلکہ جس ماحول میں وہ بیٹھتے تھے وہ بھی میرے لیے کشش رکھتا تھا.....طرح طرح کے نوادرات۔ نقشے۔ کوہ پیمائی کے روٹ۔ چینی ہینڈی کرافٹ۔ چترالی قالین اور ان کے درمیان بیگ صاحب سنہری مسکراہٹ کے ساتھ سینے پر ہاتھ باندھے سرہلاتے ہوئے..... اور اس دوران غیر ملکی گاہک اور دوست جو کوہ پیمائی اور ٹریکنگ کے بارے میں ان سے مفت مشورے کرتے تھے..... ہم بیگ صاحب کی بک شاپ پر پہنچے تو وہاں ایک منحنی سا نوجوان جھاڑ پونچھ کر رہا تھا۔ "بیگ صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ نہیں ہیں ــــ" نوجوان نے ناک چڑھا کر کہا "میں نیک نام ہوں ــــ"

"ٹھیک ہے آپ نیک نام ہوں گے لیکن بیگ صاحب کہاں گئے ہیں؟"

"او ہو آپ تو تارڑ صاحب ہیں ــــ" نوجوان نے میرے نزدیک آ کر مجھے سر سے پاؤں تک اچھی طرح دیکھنے کے بعد کہا "میں گھر فون کرتا ہوں" اس نوجوان نے گھر فون کیا اور اطلاع کر دی کہ تارڑ صاحب لاہور سے آئے ہیں' ماؤنٹ بلور میں ہیں' بیگ صاحب کا انتظار کر رہے ہیں۔

"شکریہ۔ ویسے آپ کا کیا نام ہے"

"نیک نام ــــ" نوجوان مسکرایا "میں بیگ صاحب کا چھوٹا بیٹا ہوں ــــ"

ہم دوکان سے باہر آئے تو گلگت کے بازار میں تین بڑے بانکے گھڑسوار جا رہے تھے۔ وہ پٹھان تھے شلوار قمیض۔ پشاوری چپلوں' تلے دار تلّے اور بندوقوں سمیت۔ لیکن وہ کچھ زیادہ ہی پٹھان نظر آ رہے تھے..... یہ تینوں بانکے جب ہمارے قریب آئے تو معلوم ہوا کہ ان میں ایک باگی ہے اور پٹھان لباس میں ہے۔ بقیہ دو حضرات بھی دراصل امریکی سیاح تھے۔

"ہے ــــ تم کہاں جا رہے ہو؟" میں نے منہ پر ہاتھ رکھ کر انہیں پکارا۔

"درہ خنجراب کے راستے بیجنگ..... ساتھ چلنا چاہتے ہو؟" ان میں سے ایک نے پیچھے مڑ کر ہاتھ ہلایا۔

بس یہی گلگت کی چارم تھی' اس قسم کے منظر صرف اسی شہر میں دیکھنے کو ملتے تھے.....دو سفید گھوڑے اور درمیان میں ایک براؤن رنگ کا گٹھے بدن والا تھرتھراتا ہوا گھوڑا .....اور ان پر نیلی پگڑیوں والے "پٹھان" جو دنیا کی بلند ترین شاہراہ پر سفر کرتے ہوئے چین جا رہے تھے..... یہاں کے لوگ ایسے عجوبوں کو عجوبہ نہیں سمجھتے' انہیں عادت پڑ چکی ہے۔

"ابو چناران چلیں؟ ریاض صاحب سے مل آئیں" ــــ سمیر نے مشورہ دیا۔

چناران کے ساتھ ہماری بہت ساری یادیں وابستہ تھیں.....ابھی دو برس قبل ہم سب نیلی سوزوکی پر سوار جب خنجراب گئے تھے تو گلگت میں ہم چناران کے چناروں میں ہی تو قیام پذیر ہوئے تھے.....راستے میں دو صاحبان سے راستہ پوچھا تو وہ بھی ادھر جا رہے تھے..... "ہم سیاحوں کا ایک گروپ چترال سے لائے تھے' شندور پاس اور ہنسٹر کے راستے..... اب واپس چترال جائیں گے ــــ چناران میں مسافر تلاش کرنے جا رہے ہیں"

ایک جانب باغ تھا اور اس باغ کے گھنے درختوں اور سبزے اور بے پناہ خود رو پھولوں میں ایک گھر تھا ــــ کسی ایسے شخص کا جو زندگی کی حقیقت جان چکا ہو..... یہ ایک قراقری ریاست کے بوڑھے شہزادے کی رہائش گاہ تھی۔

"چناران" وہیں تھا لیکن ریاض صاحب وہاں نہ تھے۔

"اب کہاں جائیں؟" سمیر نے اپنی ٹھوڑی ہاتھ میں لیتے ہوئے سرہلایا۔

"ماؤنٹ بلور ہوٹل ــــ میں تھک چکا ہوں"

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

ہوٹل کے باغ باغیچے اسی طرح سکون اور ٹھہراؤ میں سرسبز ہو رہے تھے اور ہمارے کمرے میں بستر پر ٹیل بریز بیٹھا اپنے گنجے سر کو ایک کچے تربوز کی طرح انگلیوں سے ٹھونک بجا رہا تھا اور کہہ رہا تھا "سواد آگیا ہے بھائی جان—"

یہ سلمان رشید تھا جو تازہ تازہ ٹنڈ شدہ تھا اور بے حد ہونق لگ رہا تھا "ٹریکنگ کے لیے ٹنڈ بہترین شے ہے بھائی جان — سفر کے دوران سب سے زیادہ مٹی بال جمع کرتے ہیں۔ اور نہ رہیں گے بال تو پھر صفائی ہی صفائی — ابھی ابھی ایک کوہستانی نائی نے ایک عدد کھنڈے استرے کے ساتھ ایسے ایسے کمالات دکھائے ہیں کہ کیا بیان کروں خود ہی دیکھ لیجئے" یہ کہہ کر وہ اپنی ٹنڈ سمیت اٹھا اور جھکا جھکا میرے پاس آگیا— ٹنڈ پر نائی کے کمالات بصورت روئی کے کھیت صاف نظر آ رہے تھے.....

راہی اپنی بیگم کو پکچر پوسٹ کارڈ لکھ رہا تھا اور آہیں بھی بھرتا جاتا تھا ساتھ ساتھ!

اور ایک کرسی پر سیدھی کمر اور سنہری مسکراہٹ کے ساتھ بیگ صاحب تشریف رکھتے تھے.... پتلون قمیض میں اور قراقلی ٹوپی کے بغیر وہ خاصے نوجوان لگ رہے تھے۔

"ہاں آں۔ تارڑ صاحب۔ نیک نام نے آپ کا بتایا— بہت دیر سے انتظار کر رہا تھا.... سلجوق کا کیا حال ہے؟ بیگم صاحبہ ٹھیک ہیں— میرا بھیجا ہوا چینی شیر پسند آیا— اس مرتبہ کہاں جایئے گا؟ اکرام نے تو مجھے آپ کے لیے خیمہ نہیں بھیجا وہ خود ایک مہم کے ساتھ کنکورڈیا گیا ہوا ہے کے ٹو کے بیس کیمپ کی طرف — اور آج شام نار تھ ان میں قراقرم رائٹرز فورم کی جانب سے آپ کے اعزاز میں ایک شام ہے— گلگت میں کتنے روز قیام رہے گا؟"

میں مسکراتا رہا اور مسکراتے سرہلاتے بیگ صاحب کی گفتگو سنتا رہا اور پھر درجہ بہ درجہ ان کے سوالوں کے جواب دیئے۔

"اچھا.... تو اس بار آپ روپل اور دیوسائی جائیں گے....ان کی مسکراہٹ کچھ اور زیادہ سنہری ہو گئی "اچھا— تو کچھ خوراک اور..... کھانا پکانے کا بندوبست ہے؟— خیمہ؟ میرے پاس تو خیمے ختم ہو گئے.....دریافت کروں گا آپ کے لیے..... اور جناب فوری طور پر کل ہی سفر پر روانہ ہونا دانش مندی نہیں..... آپ میدانوں سے آئے ہیں ذرا موسم کو ایک دو روز میں قبول کریں پھر بلندی کی طرف جائیں— تو میں اب شام کو آؤں گا آپ کو لینے.....ابھی گھر کو جاتا ہوں— " بیگ صاحب اٹھے درجہ بہ درجہ سب سے ہاتھ ملایا اور رخصت ہو گئے۔

"بھائی جان—" سلمان ابھی تک اپنی ٹنڈ پر ہاتھ پھیر پھیر کر مزے لے رہا تھا "مجھے یاد پڑتا ہے کہ شمالی علاقوں کے بارے میں کئی انگریزی کتابوں میں شاید جن بیگ صاحب کا ذکر آتا ہے تو شاید یہی بیگ صاحب ہیں—"

"یہی بیگ صاحب ہیں—"

باہر دھوپ ڈھل رہی تھی.....اخروٹ کے گھیرے دار درخت کی شاخوں میں چڑیاں شور کرتی تھیں اور ہم برآمدے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے.....ہمارے برابر کے کمرے میں کچھ جاپانی قسم کی کچھ چیزیں تھیں ' ان کے بارے میں یہ طے کرنا بے حد دشوار تھا کہ وہ عورتیں ہیں یا مرد ہیں یا صرف کٹھ پتلیاں ہیں۔ وہ کہیں آتے جاتے نہیں تھے۔ بہت دنوں سے ماؤنٹ بلور کے اس کمرے میں مقیم تھے اور وہیں برآمدے میں چاول وغیرہ ابال کر انہیں دودھ میں بھگو کر کھا لیتے تھے۔

"ویسے بھائی جان" سلمان کمرے سے نکل کر برآمدے میں آگیا جہاں صوفوں کے ڈھانچوں پر میں بمشکل توازن قائم رکھے بیٹھا تھا اور اخروٹ کے درختوں میں گونجتی چڑیوں کی چہکار سن رہا تھا "ویسے بھائی جان ٹنڈ پر اگر ناریل لگایا جائے تو دماغ کے علاوہ دیگر جسمانی عوارض کے لیے بھی بے حد مفید ہے..... آپ میری ٹنڈ کو مائینڈ تو نہیں کرتے؟"

"کرتا ہوں........"

"اس کا علاج میرے پاس ہے" اس نے گلے میں بندھا ہوا فلسطینی رومال کھولا اور اسے سر پر گرہ دے کر باندھ لیا.....اب وہ کسی بے بس اور حسین دوشیزہ کو لوٹ لینے والا سمندری قزاق لگ رہا تھا۔

جاپانی کمروں کی جانب سے ایک نوجوان ہیرو نما شخص آیا اور بڑا مئودب ہو کر سلمان کے قریب بیٹھ گیا۔

"بھائی جان یہ اخلاق ہے۔ بڑا خوش اخلاق ہے" یہ کہہ کر سلمان نے ایک زوردار قہقہہ لگایا جس کی شدت سے اخروٹ کا درخت چڑیوں سے خالی ہو گیا "یہاں شمالی علاقوں میں گوجرانوالہ کی ایک مل کا کپڑا فروخت کرتا ہے۔"

اخلاق واقعی خوش اخلاق تھا۔ اور اس نے شام کے کھانے پر ہماری رفاقت پر اصرار کیا اور ایسے کیا جیسے ہم اس کے گھر آئے ہوئے تھے.....

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"ہاں جی پھر اخلاق صاحب اس بندوبست کا کیا بندوبست ہوا ؟" سلمان نے اتنے دھیمے لہجے میں اس سے پوچھا کہ میرے کان کھڑے ہو گئے کہ یہ اتنے دھیمے لہجے میں کیوں پوچھتا ہے۔ اخلاق ذرا شرمندہ ہوا اور اسے ایک طرف لے جا کر کچھ گفت و شنید کی جو میں شنید نہ کر سکا۔۔۔۔ پھر سلمان ایک شرارتی بچے کی طرح مسکراتا ہوا اور ہاتھ ملتا ہوا آیا اور کہنے لگا "بھائی جان دعا کیجئے گا۔۔" اور پھر دونوں چلے گئے' سلمان کان کھجاتا ہوا اور اخلاق گردن کھجاتا ہوا۔

سلمان کے قہقہے کی شدت سے رخصت شدہ چڑیاں اخروٹ کے درخت پر واپس آنے لگیں۔۔۔۔ ماؤنٹ بلور کے بڑے پھاٹک میں سے ایک نوجوان جھک کر داخل ہوا اور دوسرا بغیر جھکے داخل ہو گیا کہ وہ ذرا پستہ قد تھا۔ دراز قد نوجوان نے اپنی ستواں ناک پر انگلی سے کھجایا اور پھر چاروں طرف دیکھا۔۔۔۔ اس کی نظریں واپس آئیں جہاں میں برآمدے میں بیٹھا تھا اور وہ میرے جانب آنے لگا۔۔۔۔ یہ نجیب تھا' اسلام آباد کی ایک ویران سڑک پر سیر کرتے ہوئے وہ سامنے سے آ گیا تھا۔۔۔۔ گلگت کے قریب بونجی کا رہنے والا تھا' شکل سے ہالی وڈ کی کاؤ بوائے فلموں کا ہیرو لگتا تھا' طالب علم تھا اور کوہ پیماؤں کے ہمراہ گائڈ کے طور پر جاتا تھا۔۔۔۔ بے حد ملنسار' خوش مزاج اور صرف اپنی باتیں کرنے والا۔۔۔۔ اسلام آباد میں ہی میں نے ان دنوں میں گلگت آنے کا تذکرہ کیا تھا۔۔۔۔

"میں روزانہ ایئرپورٹ فون کر کے آپ کا پتہ کرتا تھا۔ "یہ شاد مینا ہے" اس نے نیلی جین نما پتلون نئی شرٹ اور ایک بڑی مسکراہٹ میں ملبوس اپنے ساتھی کی جانب اشارہ کیا۔۔۔۔

"کیا مینا ہے؟" میرے پلے کچھ نہ پڑا۔

"شاد مینا" اس پستہ قد نوجوان نے ہنس کر کہا اور جب ہنس کر کہا تو معلوم ہوا کہ وہ نوجوان تو ہے لیکن اس کے ساتھ خاتون بھی ہے۔۔۔۔

"میں آپ سے ملنا چاہتی تھی۔۔۔۔"

"آپ گلگت ایسے وحشی علاقے میں کیا کر رہی ہیں ؟"

"میں ایک کوہ پیما مہم کے ساتھ رابطہ افسر کے طور پر جا رہی ہوں"

"پہاڑوں میں" میں نے بے یقینی سے کہا۔

"کوہ پیما مہمیں عام طور پر پہاڑوں میں ہی جایا کرتی ہیں" وہ بدستور ہنستی ہوئی بولی۔۔۔۔

"تارڑ صاحب یہ شاد مینا پاکستان کی پہلی کوہ پیما خاتون ہے۔۔۔۔ بالتورو گلیشیئر کر کے آئی ہے اور اب جتورہ جا رہی ہے۔۔۔۔ بہت زبردست لڑکی ہے جی۔۔۔"

"اس میں کوئی شک نہیں ۔۔۔۔ آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔۔۔۔" اور مجھے واقعی اس سے مل کر بے حد خوشی ہوئی تھی۔۔۔۔ "اور تم کیا کر رہے ہو؟"

نجیب کو بس اسی سوال کا انتظار تھا "آپ وولف گینگ کو جانتے ہیں؟ نہیں جانتے ۔۔۔۔ جرمن ہے اور دنیا کے مشہور ترین راک کلائمبرز میں شمار ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔ لیکن وہ دوسرے چٹانوں پر چڑھنے والوں کی طرح نہیں ہے کہ رسوں میخوں اور کلہاڑیوں کی مدد سے اوپر جائے۔ بلکہ وہ فری کلائمبنگ کرتا ہے۔۔۔۔ اس طرح" نجیب نے ہتھیلیاں پھیلا کر اپنی انگلیوں کو کسی خیالی چٹان میں پیوست کرتے ہوئے کہا "وہ کوئی سہارا نہیں لیتا اور صرف اپنے پاؤں اور ہاتھوں کے ساتھ چٹانوں پر چڑھتا ہے۔۔۔۔ جیسے زمانہ قدیم کا انسان چڑھتا تھا۔۔۔۔"

"خطرناک تو ہو گا۔۔۔"

"بہت کم فری کلائمبر زندہ بچتے ہیں۔۔۔۔ لیکن یہ لوگ آپ جانتے ہیں کہ یہاں۔۔" نجیب نے انگلی سے اپنے سر کو چھوا "بالکل ڈھیلے ہوتے ہیں"

"تو پھر تم اس وولف کے ساتھ کیوں جا رہے ہو؟"

"تارڑ صاحب یہ تو ایک زبردست چانس ہے۔ میرے لیے۔۔۔۔ صرف یہ کہہ دینا کہ میں وولف گینگ کے ساتھ راک کلائمبنگ کرتا رہا ہوں دوسرے لوگوں کو حسد میں جلا کر دینے کے لیے کافی ہے۔۔۔۔ اور پتہ ہے ہم کیا کلائمب کریں گے؟۔۔۔ ٹرینگو ٹاورز"

"ٹرینگو ٹاورز" ان چٹانوں کا مجموعہ ہے جو کنکورڈیا کے راستے میں پڑتی ہیں اور جنہیں دیکھ کر ایک مرتبہ تو دل تھم جاتا ہے کہ ان کی بلندی اور شکل آسمان کی وسعتوں میں چھید کرتے ہوئے میناروں کی طرح ہے۔ وہ دنیا کے ہر راک کلائمبر کا خواب ہیں۔۔۔۔

سلمان اور اخلاق منہ لٹکائے واپس آ رہے تھے "آپ نے دعا نہیں کی ناں بھائی جان" سلمان شکایت بھرے لہجے میں بولا "بندوبست کا کوئی بندوبست نہیں ہوا۔ ہنزہ واٹر تو دور کی بات ہے یہاں تو سوڈا واٹر بھی نہیں ملتا۔۔۔۔ بھائی جان یہ چڑیاں کیوں شور کر رہی ہیں۔" اس نے غصے سے اخروٹ کے درخت کو گھورا اور پھر "ہوئے ہوئے" کہتے ہوئے زور زور سے تالی بجائی' چڑیاں پہلے چپ ہوئیں اور پھر اپنے پروں کی

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

پھڑپھڑاہٹ کے ساتھ درخت خالی کر گئیں۔

ہنزہ اور گلگت کے علاقوں میں بیگ حضرات بکثرت پائے جاتے ہیں..... آپ کسی بھی گورے چٹے اور خوش شکل صاحب کو بے دھڑک "بیگ صاحب کیا حال چال ہے؟" کہہ سکتے ہیں..... اور وہ بیگ صاحب ہو گا اور اگر نہیں ہو گا تو نہ سہی اس کے برابر کھڑا ہوا شخص تو ضرور ہو گا..... میرے سامنے بھی ایک اور بیگ صاحب تھے' ضیاء اللہ بیگ۔۔۔ پہلی ملاقات راولپنڈی میں چنگیز سلطان کے دفتر میں ہوئی تھی جہاں انہوں نے اپنے پامیر ٹورز کا کارڈ تھمایا تھا اور اب دوسری ملاقات ان کے دفتر میں ہو رہی تھی۔

"نانگا پربت کی روپل سائڈ کو جانے کے لیے آپ کو استور پہنچنا ہو گا اور استور روڈ بہت خراب ہے...... سکردو روڈ تو بارہ دن بند رہنے کے بعد آج شاید کھل جائے لیکن استور روڈ..... بہرحال استور سے آپ کو ترشنگ جانا ہو گا۔۔ وہاں تک جانے کے لیے آپ کو پوری جیپ کرائے پر حاصل کرنی ہو گی..... عام لوگوں کے لیے ترشنگ تک کا کرایہ اٹھارہ سو روپے' لیکن آپ کے لیے میں اپنی کمیشن چھوڑ دوں گا۔۔ چودہ سو روپے..... لیکن آپ واپس بھی تو آئیں گے؟"

"جی نہیں۔۔" میں نے سر ہلایا "نانگا پربت سے ہم واپس ترشنگ آئیں گے اور وہاں سے چلم چوکی اور پھر دیوسائی عبور کر کے ہم سکردو میں اتریں گے۔۔ ادھر واپس نہیں آئیں گے"

"اور آپ پرسوں صبح روانہ ہونا چاہیں گے؟ ٹھیک ہے میں کل جیپ بک کر دوں گا لیکن شرط یہ ہے کہ موسم صاف ہو' تھوڑی سی بارش استور روڈ کو استور نالے میں گرا دینے کے لیے کافی ہوتی ہے۔۔"

سفری منصوبہ بندی طے کرنے کے بعد ضیاء صاحب کے والد صاحب نے ہمیں اپنے کلام سے نوازا' وہ بہت اچھے شاعر تھے..... اور پھر پامیر ٹور کے دفتر میں شی ی زو داخل ہوا..... یہ ایک دبلا پتلا عینک کرتی جسم اور کھلے منہ والا جاپانی تھا جو صرف اشاروں سے بات کرتا تھا یا کبھی کبھار ایک جھٹکے دار "آہ" کرتا تھا۔ اس کے علاوہ جب کسی بھی موقع پر وہ بے بس ہو جاتا تھا یا بہت خوش ہوتا تھا تو کہتا تھا "نو پرابلم"۔۔ وہ آیا' اپنے رک سیک کی جیب میں سے ایک نقشہ نکالا اور میز پر پھیلا کر کہنے لگا "مازنو پاس۔"

ضیاء اللہ بیگ نے فوراً میری جانب دیکھا اور پھر جاپانی سے کہنے لگا۔۔ "آہ مازنو پاس" جاپانی نے جواباً ایک اور "آہ" کی اور چپ ہو گیا۔ اور ضیاء اللہ بیگ ایک تجربہ کار ٹور آپریٹر کی طرح رواں ہو گیا "جیپ ٹو استور۔ جیپ ٹو ترشنگ۔ ترشنگ ٹو مازنو پاس ٹریکنگ"

"آہ۔۔" جاپانی نے مدبرانہ انداز میں سر ہلایا۔

"جیپ ٹو ترشنگ اینڈ بیک گلگت تھرٹی سکس ہنڈرڈ۔۔" بیگ صاحب نے رقم کاغذ پر لکھ کر دکھائی کہ جیپ کے ترشنگ جانے اور آنے کا اتنا خرچہ ہو گا۔

"نو پرابلم۔۔" جاپانی نے اپنے رک سیک کی ایک خفیہ جیب میں سے رقم نکال کر میز پر رکھ دی۔

"آپ کا کام بھی ہو گیا تارڑ صاحب۔۔" بیگ صاحب نے جاپانی کی رقم گنتے ہوئے کہا "اسے کچھ پیسے دے کر اسی کے ساتھ روانہ ہو جائیں۔۔"

چنانچہ میں نے جاپانی کے ساتھ گفت و شنید کی کہ بھائی ہم آدھا کرایہ دیتے ہیں ہم تینوں کو بھی ساتھ لے چلو۔ اسے کیا اعتراض ہو سکتا تھا' بلکہ وہ خوش تھا کہ کچھ رقم اسے فوری طور پر واپس مل رہی ہے..... چنانچہ ایک "آہ" کے ساتھ معاملہ طے پا گیا۔

"پرسوں صبح جیپ پانچ بجے آپ کے ہوٹل میں ہو گی۔۔ اس جاپانی سے پوچھئے کہ یہ کونسے ہوٹل میں قیام پذیر ہے" بیگ صاحب نے جاپانی کو رسید لکھ کر دے دی۔

"میں کیسے پوچھوں؟" میں نے کان کھجاتے ہوئے عرض کیا "بہرحال۔۔ جاپانی ..... ہوٹل؟"

جاپانی نے پھر میری بات غور سے سنی اور سر جھٹک کر بولا "نو پرابلم"

"سمیر یار تم کوشش کرو" میں نے ہتھیار ڈال دیے.....

سمیر نے جاپانی کا جائزہ لیا۔ اس کے ساتھ متعدد بار ہاتھ ملایا اور پھر کہنے لگا "ی۔ مائی فادر ہوٹل ماؤنٹ بلور۔ یووہاٹ ہوٹل؟"

جاپانی نے مزید خوش ہو کر کہا "آہ آہ" اور پھر بال پوائنٹ پکڑ کر اپنی ہتھیلی پر کچھ لکھ کر سمیر کو دکھایا..... ہتھیلی پر ماؤنٹ بلور لکھا ہوا تھا.....

"ارے یہ بھی وہیں رہتا ہے" سمیر خوش ہو گیا "ہاؤ آر یو جاپانی۔۔" اس نے جاپانی کے ساتھ ایک مرتبہ پھر ہاتھ ملایا اور اس کے جواب میں جاپانی نے کمر تک جھک

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

کر ایک شدید جھٹکے کے ساتھ "آہ" کی اور رک سیک اٹھا کر دفتر سے باہر چلا گیا۔

"تو پرسوں صبح جیپ آپ کے ہوٹل میں ہو گی" بیگ صاحب نے تاکید کی۔

"آہ۔" میں نے مسکرا کر کہا اور ہم دونوں پامیر ٹور کے دفتر سے باہر آ گئے جہاں راہی ہمارا منتظر تھا۔ اور اس کے ہاتھ میں آٹے کا ایک تھیلا تھا لیکن اس میں آٹا نہ تھا بلکہ پیاز' چاول' دالیں اور آلو تھے جو اس نے متوقع پہاڑی راستوں کے لئے خریدے تھے۔ میں نے اس لمحے تو چاول اور دالوں کی اس پوٹلی کو شدید نظر حقارت سے دیکھا کیونکہ خوراک کے طور پر ہمارے رک سیک میں ٹین بند' قورمے۔ کوفتے۔ بھنا ہوا گوشت۔ حلیم۔ سارڈین مچھلیاں۔ پنیر۔ سیون اپ اور کوکا کولا اور پتہ نہیں کیا کیا تھا لیکن بعد میں نانگا پربت کے دامن میں راہی کے بنگالی طرز کے پھیکے دال چاول میں جو مزا آیا وہ بالکل بہشتی تھا۔ اب ہمیں ایک عدد خیمے کی تلاش تھی' ہر دو بیگ صاحبان اس سلسلے میں معذرت کر چکے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس سیزن میں گلگت میں خیموں کا قحط پڑ جاتا ہے۔ ہمارے لیے یہ امر باعث تشویش تھا..... استور سے آگے اگر آپ کے پاس خیمہ نہیں ہے تو آپ ایک مردہ بلغ ہیں..... بلکہ منجمد مردہ بلغ.....چنانچہ خیمے کی تلاش شروع ہو گئی۔ جماعت خانہ بازار میں داو کی دوکان پر بڑی ورائٹی تھی..... پولینڈ کی کسی کوہ پیما ٹیم کا تاواں نکور سامان کوہ پیمائی ان کے پاس مناسب اور غیر مناسب داموں پر موجود تھا..... مجھے کوہ پیمائی کے بوٹ جی کو لگے لیکن میں ان کا کیا کرتا..... میں جوگر شوز پہنے ہوئے تھا..... ایک جرمن طرز کا خیمہ دستیاب تھا لیکن صرف دو آدمیوں کے لیے تھا اور صرف ساڑھے تین ہزار کا تھا چنانچہ یہ دونوں باتیں ناقابل قبول تھیں..... دوکان میں مشہور کوہ پیما میسنر کی تصویر آویزاں تھی جو داو کے بقول اس کا فرینڈ تھا۔ یہاں راہی کو ایک روسی سٹوو پسند آ گیا جو اس نے فوراً خرید لیا۔ دوسرے داو جو پارک ہوٹل کے سائے میں دوکانداری کرتے تھے ان کے پاس بھی کرائے پر اٹھانے کے لیے کوئی خیمہ نہ تھا۔ یہ داو صاحب بڑی حضرت چیز ہیں..... ایک اور دوست "ماؤنٹین موورز" کے مسرت صاحب تھے لیکن وہ بھی خیمہ خلاص تھے..... پھر ایک ایسی دوکان ملی جس میں سیکنڈ ہینڈ اشیاء کے انبار لگے تھے۔ ان میں ایک خیمے کے آثار تھے' میخیں اور ڈنڈے اور کپڑے کے تھان۔

"کیا ان سب کو ملا کر ایک خیمہ بنایا جا سکتا ہے؟" میں نے دوکاندار سے پوچھا۔

"معلوم نہیں صاحب" دوکاندار نے نہایت شرافت سے جواب دیا" مجھے ایک

پورٹر دے گیا تھا۔ کہتا تھا خیمہ ہے..... پتہ نہیں ہے کہ نہیں۔۔ آپ دیکھ لو"

ہم نے اسے بہت دیر تک دیکھا..... الٹا سیدھا کیا۔ الٹا پلٹا کیا لیکن وہ خیمہ نہ بنا..... ہم مایوس ہو کر جی ایم بیگ کی دوکان پر آ گئے۔

"یہ سٹوو کیسا ہے؟" راہی نے بڑے فخر سے اپنا سٹوو بیگ صاحب کے سامنے پیش کیا۔

"آں.....اچھا ہے..... لیکن بھاری ہے' ایک گدھا آپ کو چاہیے اسے اٹھانے کے لئے"

بیگ صاحب درست کہتے تھے ہم نے سٹوو کے وزن کے بارے میں سنجیدگی سے غور نہیں کیا تھا "تو پھر کیا کریں۔۔"

بیگ صاحب نے ایک انتہائی مختصر سا سٹوو کا بچہ ہمارے سامنے رکھ دیا "یہ چینی ہے۔ بہت کار آمد ہے....."

"اس پر کھانا پک سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں پک سکتا؟" بیگ صاحب نے بازار سے سپرٹ کی ایک بوتل منگائی اور سٹوو کے بچے میں بھر دی..... پھر اسے دیا سلائی دکھائی تو وہ دیکھتے ہی دیکھتے اچھی خاصی گرمی دینے لگا "یہ چینی ہے بہت کار آمد ہے" بیگ صاحب اپنی سنہری مسکراہٹ کو استعمال میں لائے "اور یہ تحفہ ہے میری طرف سے آپ کے گلگت آنے پر....."

"آہ۔" میں نے صرف اتنا کہا۔

اس شام نارتھ ان کے منگول طرز کے شاندار ہال میں بہت ساری شمعیں روشن تھیں..... کچھ شمعیں ایسی جو لوڈشیڈنگ کی وجہ سے انتظامیہ نے جلائی تھیں اور بیشتر شمعیں محبت کی جو لوگوں کے دلوں میں روشن تھیں اور ان کی لو سے نارتھ ان کا ہال جھلملاتا تھا..... یہاں بیگ صاحب قراقرم رائٹرز فورم کی جانب سے ہمیں خوش آمدید کہہ رہے تھے..... ادیب۔ شاعر۔ دانشور اور صحافی ہم سے اپنے دل کی بات کرتے تھے کہ ہمیں الگ نہ رکھیں' ہمیں بھی پاکستانی تہذیب کے دھارے میں شامل کر لیں..... شیشے کی چھت تک پہنچتی کھڑکیوں میں سے وہ شام جھانکتی تھی جو ہمیشہ میرے دماغ میں فتور پھونکتی تھی..... گلگت کے بلند پہاڑوں کے اوپر ابھی شفق کی سرخی ٹھہری ہوئی تھی' کھڑکیوں کے شیشے باہر کی خنکی سے ٹھنڈے ہو رہے تھے اور باہر ایک اداسی تھی جو میری منتظر تھی اور میں اس تک جانا چاہتا تھا' اس سے ملاقات کرتا

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

چاہتا تھا اور یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ تم ہمیشہ میرے اندر خیمہ زن رہیں تو اب اجنبی کیوں ہوتی ہو..... اور میں بے بس ہو کر تمہاری طرف کھنچا چلا آتا ہوں تو کیوں مجھے بے بس کرتی ہو..... اور اس اداسی کو میں نے بہت جگہوں پر اپنا منتظر پایا۔ یہ میری تاک میں نہیں تھی بلکہ میری منتظر تھی..... اور پھر میں نے اس منظر' اس مقام کی تھوڑی سی اداسی کو اپنے ساتھ بھی لیا اور اسے اپنے گھر تک لے آیا' اپنے ساتھ بسایا..... لکڑی سے بنے ہوئے اس ہال میں لوگ اپنی محبت کا اظہار کر رہے تھے..... اور باہر وہ میری منتظر تھی..... لیکن جونہی تاریکی گہری ہوئی وہ چلی گئی.....

گلگت بازار کی ویرانی میں ہم ہوٹل ماؤنٹ بلور کی جانب چلتے تھے.....

باہر بادل تھے۔

برآمدے کے سامنے اخروٹ کے درخت میں خاموشی تھی۔

راہی نے اپنا روسی سٹوو کھول رکھا تھا اور اب اسے دوبارہ جوڑنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا۔

سلمان ڈائری لکھ رہا تھا اور اپنی ٹنڈ کو نہایت اہتمام سے سہلا رہا تھا۔

مجموعی طور پر سستی اور کاہلی کا موسم تھا۔ یوں بھی ہم سب "کاشغران" سے کابلی پلاؤ اور کوفتے تناول کر کے آئے تھے۔

اس موسم میں گلگت ریڈیو کے سٹیشن ڈائریکٹر اکرم خان آ گئے۔ ان کے ہمراہ جنگ کا نوجوان آئیڈلسٹ فخر تھا جو تازہ تازہ ریڈیو پروڈیوسر بھرتی ہوا تھا۔ فخر سے میری سلام دعا پرانی تھی..... اکرم صاحب بڑی پر بہار شخصیت تھے۔ انہوں نے ہمیں اپنی ویگن میں ڈالا اور دنیور لے گئے کیونکہ گلگت کا ریڈیو سٹیشن وہاں سے خاصے فاصلے پر واقع دنیور کے قصبے میں ہے۔ یہاں انٹرویوز لئے گئے اور چائے پلائی گئی..... واپسی پر ہم بازار میں اتر گئے کیونکہ ہمارے پاس سب کچھ تھا لیکن ابھی تک خیمہ نہیں تھا اور خیمے کے بغیر ہم ترشنگ جانے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے.....

ایک مرتبہ پھر ہم اس دوکان کے سامنے کھڑے تھے جہاں سیکنڈ ہینڈ اشیاء کے انبار میں ایک خیمے کے آثار پڑے تھے۔

"کیا یہ واقعی خیمے کی صورت میں ایستادہ ہو جائے گا" میں نے دوکاندار سے پوچھا اور دوکاندار نے انتہائی ناگواری سے کہا "کیا پتہ"

"ہم اسے لگا کر دیکھ لیں۔ اگر لگ گیا تو خرید لیں گے"

"لے جاؤ"

ہم نے خیمے کی گٹھڑیاں سر پر اٹھائیں اور پامیر ٹور کے سامنے واقع چھوٹے سے باغیچے میں آ گئے۔ نجیب آر ایس ریستوران میں چائے پی رہا تھا' ہمیں دیکھ کر فوراً باہر آ گیا "کیا ہو رہا ہے سر؟"

"کیا یہ خیمہ ہو سکتا ہے؟" میں نے دونوں گٹھڑیوں اور میخوں کی جانب اشارہ کیا۔

"ہو سکتا ہے ہو۔ ہو سکتا ہے نہ ہو۔" اس نے فوراً "گٹھڑیاں کھول کر کپڑے کو زمین پر پھیلا دیا۔ پھر راڈ جوڑنے لگا..... فوری طور پر ایک چھوٹا سا ہجوم جمع ہو گیا جو اس خیمہ پزل کو حل کرنے کے لئے مشورے دینے لگا۔ کچھ کا خیال تھا کہ یہ خیمہ ہے اور بیشتر کا خیال تھا کہ کبھی یہ خیمہ تھا اور اس کے کچھ حصے ہیں اور کچھ غائب ہیں..... نجیب کی کوششیں رنگ لائیں اور خیمہ تیار ہو گیا..... لیکن یہ سنگل تھا اس پر جو ڈبل چادر بارش سے بچاؤ کے لئے ہوتی ہے وہ غائب تھی۔ اس کی جگہ دوکاندار نے ہمیں کوئی کمبل نما چیز دے دی تھی..... بہرحال فقیروں کو چناؤ کا اختیار نہیں ہوتا' ہم نے مجبوراً "یہ سنگل خیمہ خرید لیا..... لیکن یہ بے حد غلیظ تھا..... ہوٹل واپس آ کر ہم نے اسے ایک ٹب میں بھگو دیا۔ راہی اور سمیر اسے ماہر دھوبیوں کی طرح دھونے لگے..... جب خیمہ دھل چکا تو نجیب نے اسے اٹھایا اور کہنے لگا "اب اسے سوکھنے کے لئے سامنے والی پتھریلی دیوار پر ڈال دیا جائے تو بہتر رہے گا..... لیکن دیوار پر کون چڑھے گا یہ بیحد اونچی ہے"

"ہوں" اس نے سر ہلایا۔

"کیسے راک کلائمبر ہو؟ ایک چھوٹی سی دیوار کو بھی کلائمب نہیں کر سکتے"

نجیب شرمندہ ہو کر کہنے لگا "مجھے تو یاد ہی نہیں رہا تھا۔ کمال ہے یہ دیوار کیا چیز ہے" اس نے ایک چھلانگ لگائی اور دیوار سے چمٹ گیا اور پھر اچک کر اس کے اوپر جا بیٹھا "لاؤ خیمہ لاؤ"

زرد رنگ کا خیمہ ماؤنٹ بلور کی دیوار پر پڑا سوکھتا تھا اور اخروٹ کے درخت میں اب چڑیاں بولتی تھیں..... یہ زرد رنگ امید کا رنگ تھا۔ اس امید میں ہم نے جنگلوں اور ویرانوں میں راتیں گزاری تھیں..... میں جب اس خیمے کو دیکھتا تھا تو میرے اندر کے خانہ بدوش کا خون گرم ہوتا تھا..... وہاں جہاں میں قید تھا وہاں میں نے اپنے آپ کو چھڑانے کے لے اتنا زور لگایا تھا کہ میری گردن زخمی ہو گئی تھی۔ اس پر

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

اس رسی کے نشان خون آلود تھے جس کے ساتھ میں باندھا گیا تھا..... اور اب میرے سامنے زرد رنگ کا خیمہ ماؤنٹ بلور کی دیوار پر پڑا سوکھتا تھا' اخروٹ کے درخت میں چڑیاں بولتی تھیں اور میری گردن پر کوئی زخم نہ تھا..... پہاڑوں میں' دور دراز کی وادیوں میں پہنچنے اور ان کی ازلی خاموشیوں میں بسیرا کرنے کے خیال نے مجھے آزاد کر دیا تھا اور غلامی کے تمام زخم مندمل کر دیئے تھے..... میں نے ایک گہرا سانس اپنے اندر کھینچا اور اس کے ساتھ خیمے کی زردی اور چڑیوں کا شور اور گلگت کی چٹانوں کی خنک اور وحشی ہوا سب میرے اندر گئے اور وہاں بسیرا کیا۔

اس شام فخر نے پارک ہوٹل میں ہمیں کھانے کے لئے مدعو کیا تھا.....

وہاں بھی صرف پہاڑوں اور بلند چوٹیوں کی باتیں تھیں..... ایک جانب پیرس سے پیکنگ کار ریلی کے شرکاء کندھے سکیڑتے' بازو لہراتے اور ہونٹ بھینچتے آس پاس کے ماحول سے بے خبر ایک چھوٹا سا فرانس بنائے بیٹھے تھے اور آپ جانتے ہیں کہ فرانس میں کیا کچھ ہوتا ہے..... یہیں پر راک کلائمبر وولف گانگ سے میری ملاقات ہوئی..... میں نے نادانی کی جو اس سے ہاتھ ملایا' وہ کسی انسان کی نہیں لوہے کے روبوٹ کی آہنی گرفت تھی..... وہ بنیان پہنے ہوئے تھا اور اس کا بدن دکھائی دیتا تھا کہ صرف لوہا ہے..... ظاہر ہے ہاتھوں کے پنجوں اور پاؤں سے چٹانوں میں جگہ بنا کر اوپر جانے کے لئے اس قسم کا وجود درکار تھا.....

"آخر فری راک کلائمبنگ ہی کیوں؟"

"یہ ہمیشہ پہلا سوال ہوتا ہے جو مجھ سے پوچھا جاتا ہے۔۔" وہ مسکرایا تو اس کے بدن کی سختی کچھ نرم پڑی "یورپ میں ہر شے خودکار ہو رہی ہے۔۔ انسان پیچھے رہ گیا ہے' وہ مشینوں اور سازو سامان کا محتاج ہو گیا ہے..... کچھ اسی طرح کوہ پیمائی اور چٹان پیمائی بھی مکینیکل ہو گئی ہے۔ یہاں اس قسم کا انتہائی پیچیدہ اور جدید سازو سامان استعمال کیا جا رہا ہے کہ یہ پہاڑوں اور چٹانوں کے ساتھ زیادتی ہے۔۔"

"چٹانوں کے ساتھ زیادتی ہے؟"

"ہاں۔۔ جیسے آپ کسی جنگلی جانور کو کلاشنکوف سے بھون ڈالیں تو یہ زیادتی نہیں ہے؟ چٹانوں اور پہاڑوں کی طاقت اور ان کی خطرناکی کو بھی موقع ملنا چاہیے کہ وہ انسان پر حاوی ہو سکیں۔۔ بس اسی لئے ہم چٹانوں پر صرف اپنے پنجے جما کر چڑھتے ہیں..... اور یوں لاکھوں برس قبل فطرت اور انسان میں جو رشتہ تھا اسے دوبارہ جوڑتے ہیں..... یوں بھی اگر آپ پانچ چھ ہزار میٹر بلند ایک عمودی چٹان کے ساتھ رسے کے بغیر چڑھتے ہوں تو وہ جو احساس ہے بس اس کے لئے ہم یہ خطرات مول لیتے ہیں"

"ویسے ہم پاکستانیوں کا ایک تھیسس یہ بھی ہے کہ یورپی لوگوں کو چونکہ پیچھے سے رونے والا کوئی نہیں ہوتا اس لئے وہ اپنی زندگی خطرے میں ڈالتے ہیں....."

"نہیں۔۔ نہیں۔۔" وولف گانگ بے حد محظوظ ہوا "یہ خیال غلط ہے..... ہماری مائیں اور بہنیں بھی ہمارے لئے فکرمند رہتی ہیں..... میں جتنے روز یہاں رہوں گا میرے خاندان کے لوگ روزانہ گلگت فون کر کے میرا پتہ کریں گے۔۔ آپ جانتے ہیں کہ پچھلے برس بھی میں ٹرنگو ٹاورز کو سر کرنے کے لے آیا تھا لیکن صرف دس روز کے بعد میرے ساتھی اپنی بیویوں اور خاتون دوستوں کے لئے اداس ہو گئے۔ کسی کو اپنی ماں یاد آنے لگی کہ وہ اس طرح کا کھانا پکاتی تھی اور کسی کو اپنے بچے یاد آنے لگے اور نتیجہ یہ نکلا کہ ہم مہم ختم کر کے واپس چلے گئے کیونکہ ہم اداس ہو گئے تھے..... نہیں' ہمارے پیچھے بھی رونے والے ہوتے ہیں۔۔"

گلگت کا بازار سنسان ہو چکا تھا اور بادلوں کی وجہ سے تاریکی کچھ زیادہ تھی جب ہم اپنے ہوٹل واپس جا رہے تھے..... اگلے روز کے سفر کا خوف ہمارے اندر بیٹھ رہا تھا..... ہم ماؤنٹ بلور کا پھاٹک کھول کر اندر داخل ہوئے تو ہمارے کمرے کے سامنے جیپ نمبر جی ایل ٹی ۹۹۰۰ کھڑی تھی..... اگلی صبح ہمیں ترشنگ لے جانے کے لئے ..... اندھیرے میں بھی پتھریلی دیوار پر پھیلا ہوا زرد خیمہ نظر آ رہا تھا..... البتہ اخروٹ کے درخت میں خاموشی تھی۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"روڈ تو استور اور چکور ہی چکور"

رات نیند کچھ کم آئی البتہ وہ نم مہک آتی رہی جو یہ بتاتی تھی کہ باہر پتوں اور گھاس پر ہلکی بارش ہے جو انہیں صاف کرتی ہے اور بے آواز گرتی چلی جاتی ہے..... پھر دھلی ہوئی فضا میں تیرتی مؤذن کی آواز آئی..... میں نے اپنے گرد کمبل لپیٹا اور اندھیرے میں آنکھیں جھپکتا برآمدے میں آگیا۔ یہاں بارش کی کن من آواز آتی تھی پر ذرا کم کم..... بوندا باندی تھی..... اخروٹ کے درخت تلے ہماری جیپ بھیگ رہی تھی..... میں واپس کمرے میں آگیا..... اگر موسم کے یہی آثار رہے تو استور روڈ پر سفر مشکل تھا..... بہر طور میں نے شیو کی اور شدید سرد پانیوں سے غسل کیا.....

کیمر نیند میں بڑبڑا رہا تھا۔ میں نے اس کا کندھا پکڑ کر ہلایا "بیٹے اٹھو" وہ فوراً آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ ایک مسکراہٹ اس کے لبوں پر آئی اور پھر آنکھیں بند کر کے بستر پر ڈھیر ہو گیا..... وہ ابھی تک گہری نیند میں تھا۔ میں دوبارہ باہر آیا تو جیپ ڈرائیور ٹائروں کی ہوا چیک کر رہا تھا اور بارش تھم چکی تھی۔

"سلام جناب..... میرا نام علاؤالدین ہے۔ آپ کو استور لے جانا ہے"

"ہم پندرہ منٹ میں تیار ہو جائیں گے"

اس نے آسمان کی طرف دیکھا جہاں بادلوں کی تاریکی تھی "استور روڈ بہت خراب ہے جناب..... اگر وہاں بھی اتنی بارش ہوئی ہے تو آج نہ جائیں..... آپ ابھی آرام کریں..... سورج نکلے گا تو جائیں گے"

میں باغ میں سے ہوتا ہوا جاپانی کے خیمے کے قریب چلا گیا "شی می زو"

فوری طور پر ایک جھٹکے دار جواب "آہ" کی صورت میں آیا۔ وہ بیدار ہو چکا تھا۔

"تیار ہو جاؤ۔ ہم استور جائیں گے۔"

"نو پرابلم"

میں واپس آیا تو کیمر سلیپنگ بیگ لپیٹ کر انہیں رک سیک میں ٹھونس رہا تھا۔

"شاباش" میں نے اسے تھپکی دی۔

علاؤالدین نے ہمارے رک سیک اور بیگ جیپ کے پچھلے حصے میں ایک مضبوط رسے کے ساتھ باندھے اور پھر ان پر واٹر پروف بچھا دیا..... تاریکی کم ہو رہی تھی اور اخروٹ کا درخت آہستہ آہستہ پرشور ہو رہا تھا۔

"میرے خیال سے بسم اللہ کریں" میں نے علاؤالدین سے کہا۔

"صاحب خطرہ ہو گا..... ابھی بادل ہیں" اس نے ہتھیلی پھیلا کر کسی ایک بوند کو محسوس کرنے کی کوشش کی۔

"خطرہ ہو گا تو واپس آجائیں گے"

جاپانی اور راہی اگلی نشستوں پر بیٹھ گئے اور ہم دونوں پچھلی سیٹوں پر براجمان ہو گئے..... گلگت کا بازار خالی تھا۔ ابھی نیم تاریکی تھی اور سڑک بھیگی ہوئی تھی..... ایئر پورٹ کے قریب سے گزر کر ہم نے پل عبور کیا اور دنیور کے قصبے سے گزر کر جگلوٹ کی جانب رواں ہو گئے..... جیپ کی رفتار کم تھی کیونکہ سڑک پر پھسلن تھی..... جگلوٹ میں تیل پانی چیک ہوا اور پھر ہم شاہراہ ریشم سے نیچے اتر کر دریائے گلگت پر واقع ایک معلق پل کو عبور کر کے دوسری جانب چلے گئے اور دوسری جانب جاتے ہی معلوم ہو گیا کہ شاہراہ ریشم اور عام سڑکوں میں کیا فرق ہوتا ہے..... کیونکہ یہاں سے جیپ کے پھڑپھڑانے اچھلنے، ہچکنے کا جو سلسلہ شروع ہوا تو صرف اس روز ختم ہوا جب ہم دس دن کے سفر کے بعد اسی پل کو پار کر کے شاہراہ ریشم پر واپس آئے..... اور جیپ کی ہر حرکت کے ساتھ آپ بھی بے اختیار ہو کر وہی حرکت کرتے ہیں اور آپ کی پسلیوں کا جل ترنگ بجتا چلا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد بونجی کا علاقہ شروع ہو گیا..... زیادہ تر عمارتیں فوجی نوعیت کی تھیں۔ ایک بہت بڑے سیمنٹ شدہ میدان میں فوج کا ایک دستہ پریڈ کرتا ہوا پاکستانی پرچم کو سلامی دے رہا تھا۔ ان کے پس منظر میں قراقرم کی نیم تاریک بلندیاں اور بادل تھے..... بونجی میں ہم ایک قدیم مسجد کے سامنے ایک چائے خانے کے باہر تھوڑی دیر کے لیے رکے.....

بونجی سے باہر باغوں کا ایک سلسلہ تھا۔

آبادی ختم ہوئی تو ہر شے پیچھے ہٹتی چلی گئی..... اور ہم ایک بہت ہی وسیع لینڈ سکیپ میں مختصر ہوتے چلے گئے۔ ہماری حیثیت کم ہوتی چلی گئی اور پھر جیسے ایک ذیو نٹی، جو ہماری جیپ تھی، کسی بے انت ویرانے میں رینگ رہی تھی۔ اس حیرت

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

ناک لینڈ سکیپ کے آخر میں قراقرم بلند تھے اور اتنے زیادہ بلند تھے کہ آپ کو وہ ایک مرتبہ دیکھنے سے نظر نہیں آتے تھے بلکہ آپ پہلے سامنے دیکھتے تھے اور پھر سر اٹھا کر اوپر دیکھتے تھے۔ انہیں بلندیوں میں کہیں شاہراہ ریشم کا فیتہ تھا۔ اور ان کے نیچے سندھ تھا جو یہاں سے نظر نہیں آتا تھا البتہ وہ کھائی نظر آتی تھی جس کے اندر وہ رواں تھا۔۔۔۔ میں اس وسعت میں سانس لینا چاہتا تھا اور ڈرائیور نے میرے کہنے پر جیپ روک دی۔۔۔۔ میں باہر آیا تو مزید مختصر اور بے حیثیت ہو گیا۔۔۔۔ پاکستانی شمال میں اتنی شاندار اور وسیع لینڈ سکیپ میں نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔۔۔۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ لیکن ان میں برسنے کی خواہش کم دکھائی دیتی تھی اور ظاہر ہے یہاں ہوا بلا روک ٹوک چلتی تھی۔۔۔۔ میں نے ایک مرتبہ افغانستان میں ایک ایسے ہی لینڈ سکیپ میں کچھ وقت گزارا تھا جب سفر میں بس کا ٹائر پنکچر ہو گیا تھا۔۔۔۔ پستہ قد جھاڑیوں کے پھیلاؤ میں کچی سڑک کا ایک حصہ ٹیڑھی مانگ کی طرح بل کھا رہا تھا۔۔۔۔ ایک جانب بونجی تھا جدھر سے ہم آئے تھے اور دوسری جانب خشک چٹانوں کی وہ عظیم دہشتناک دیوار تھی جس کے اندر کوئی راستہ تھا جس پر ہمیں جانا تھا۔ اور وہ راستہ ان تاریک چٹانوں کے اندر ہی اندر استور اور ترشنگ تک جاتا تھا۔ یہ باہر کی دنیا تھی جس میں ہم کھڑے تھے اور وہ ایک پوشیدہ اور الگ تھلگ دنیا تھی جہاں ہمیں جانا تھا۔۔۔۔ یہاں سے بولڈر رج کی وہ بلندی بھی نظر آتی تھی جسے عبور کر کے فیری میڈو کے لئے سفر کیا جاتا ہے۔۔۔۔ جب میں اور خان وہاں تھے تو ہم نے شاید اس وسیع لینڈ سکیپ کو بھی دیکھا ہو گا لیکن اس وقت دو برس پیشتر ہم تھکاوٹ اور پسینے سے اتنے بے حال تھے کہ ہمیں صرف چند قدم آگے تک دکھائی دیتا تھا ہم نے اسے کہاں دیکھا ہو گا۔۔۔۔

"وری گرینڈ۔۔۔۔" سمیر نے جاپانی سے کہا جو تصویریں اتارنے میں مشغول تھا۔۔۔۔

"آہ" اس نے جواب دیا۔

"یو لائک اٹ؟" راہی نے پوچھا۔

"نو پرابلم"

راہی آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے قریب آگیا "آپ کو معلوم ہے کہ میں نے بنگلہ دیش کی بجائے پاکستان میں رہنا کیوں پسند کیا۔ اس لیے کہ میں پہاڑوں سے دور نہیں رہ سکتا۔۔۔۔ یہ میری کمزوری ہیں۔ میں کاغان بھی گیا ہوں لیکن تارڑ صاحب ۔۔۔۔ یہ تو پہاڑ نہیں کچھ اور ہیں۔" اس نے آس پاس ایک دیوانے کی طرح دیکھا "بابا یہ تو۔۔۔۔ پتہ نہیں کیا ہیں۔۔۔۔ اتنے اونچے اور رعب والے۔۔۔۔ اس لینڈ سکیپ کو ساری

عمر دیکھ سکتا ہوں۔" راہی بہت متاثر نظر آ رہا تھا۔۔۔۔ وہ ایک بڑے پتھر پر کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔۔۔۔ بالکل ساکت اور اکڑا ہوا جیسے قدیم زمانوں کا کوئی جاپانی سمورائے ہو۔۔۔۔

اس ہوش گم کر دینے والی بے حساب لینڈ سکیپ نے ہم پر ایسی دھاک بٹھا دی کہ ہم اس سے پرے دھندلی اور برف پوش چوٹیوں کے ایک مجموعے کو نہ پہچان سکے۔۔۔۔ اور پھر مجھے خیال آیا کہ ہمیں تو ان کے پاس جانا ہے ان کے دامن میں۔۔۔۔ یہ نانگا پربت تھی۔۔۔۔ ابھی بہت دور اور غیر واضح ۔۔۔۔ جیسے زمین کا نہیں آسمانوں کا حصہ ہے۔۔۔۔ اور چاہے یہ آسمان پر تھی ہم نے اس تک پہنچنا تھا۔۔۔۔

سفر دوبارہ شروع ہوا تو لینڈ سکیپ کی میدانی کیفیت بدلنے لگی اور دھیرے دھیرے یہ چٹانوں میں بدلی اور ہم ایک ایسے کنارے پر چلنے لگے جس کے نیچے ایک وسیع دریائی گذرگاہ کی ریت اور ٹیلے تھے اور قراقرم کے ساتھ دریائے سندھ سکردو کی جانب سے بہتا آ رہا تھا اور ادھر جدھر ہم تھے وہاں سے چٹانوں کے اندر سے استور نالہ اپنے زور میں جھاگ اڑاتا شور کرتا آتا تھا' گزرگاہ میں داخل ہو کر پرسکون ہوتا تھا اور سندھ کے ساتھ اس کا گہرا اور خاموش ملاپ ہونے لگتا تھا۔۔۔۔ اس نالے کے اوپر ایک معلق پل تھا جس پر ہماری جیپ کھڑکھڑاتی ہوئی گزرنے لگی۔۔۔۔ پل کے پار زیادہ جگہ نہ تھی' صرف "استور" کا بورڈ آویزاں تھا اور اس بورڈ کے ساتھ ایک عمودی بلندی تھی اور بلندی کے ساتھ ایک نیم پختہ راستہ چڑھتا ہوا تھا اور یہ راستہ اندر چٹانوں کے اندر جا رہا تھا۔۔۔۔ ایک عظیم وسعت میں سفر کرنے کے بعد ہم گویا ایک تنگ گلی میں داخل ہو گئے۔ نیچے استور نالہ دوسری طرف ایک اور بلندی۔ آسمان کم اور خشک چٹانیں زیادہ۔۔۔۔ اور خون خشک اس سے بھی زیادہ۔۔۔۔ ہم باہر کی دنیا سے اندر کی دنیا میں سفر کرنے لگے۔۔۔۔ سوئے استور!

آسمان جہاں کہیں اور جب کبھی دکھائی دیتا تھا اس پر بادل کم نظر آ رہے تھے اور بارش کا خطرہ ٹل چکا تھا۔ لیکن یہ کیسا سفر تھا۔ ایک نامعلوم کے اندر تک جانے کا سفر۔۔۔۔ ایک چھوٹی سی کچی سڑک جو نیم پتھریلے چٹانی سلسلے میں سے کھودی گئی ہے۔ نیچے استور نالہ جسے اللہ جانے نالہ کیوں کہا جاتا ہے کہ یہ باقاعدہ ایک دریا ہے اور دریا کے ساتھ ایک اور سلسلہ کوہ جس کے پار آپ کبھی نہیں دیکھ سکتے اور یہ نالہ بھی زیادہ شریف نہیں' اس کی تندی دیکھنے کے لائق ہے۔ اور چٹانوں میں بھنچا ہوا اس کا پانی جھاگ کی وجہ سے دکھائی نہیں دیتا۔ اسے شیطانی نالہ بھی کہا جاتا ہے۔۔۔۔ چنانچہ استور تک آپ ایک چٹانی سینڈوچ میں بند ہیں۔۔۔۔ آپ کی جیپ' ایک کچی سڑک اور

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

ایک نالہ۔ اور آپ کبھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کہیں نہیں جا رہے' ایک ہی مقام پر آپ کی جیپ کا انجن چل رہا ہے کیونکہ آس پاس' دائیں بائیں وہی ہے جو ایک گھنٹہ پیشتر تھا.....ہاں کبھی کبھار دوسری جانب کوئی بلند آبشار نالے میں گرتی دکھائی دیتی ہے تو زندگی کا احساس ہوتا ہے۔.....

اور یا پھر چنداکے چکور ہیں.....

جیپ ایک اکتا دینے والی دھن میں دھچکے کھاتی آپ کو دھکے دیتی مڑتی چلی جاتی ہے' چڑھائی چڑھتی ہے۔ اس کے ٹائروں کے تلے جو کنکر اور پتھر آتے ہیں وہ آپ کے سامنے استور نالے میں گرتے جاتے ہیں۔ اور لگتا ہے استور نالے میں ہر وہ شے گرے گی جو سڑک پر نہیں رہے گی لیکن آپ خوفزدہ نہیں کیونکہ آپ بے بس ہیں۔ آپ کچھ نہیں کر سکتے....آپ کو نانگا پربت جانے کے لئے مجبور نہیں کیا گیا تھا۔ اگر نہیں کیا گیا تھا اور آپ اپنی من مرضی سے آئے ہیں تو پھر بھگتئے.....اور پھر آپ دیکھتے ہیں کہ کچی سڑک پر کبوتروں کا ایک غول آرام کر رہا ہے کیونکہ آس پاس سڑک کے علاوہ کوئی ایسی ہموار جگہ نہیں جہاں وہ بیٹھ کر غٹرغوں کر سکیں..... جیپ قریب ہوتی ہے تو وہ بمشکل اس کے ٹائروں تلے کچلے جانے سے بچتے ہیں کہ انہیں جیپیں دیکھنے کی عادت نہیں.....وہ پھڑپھڑا کر اڑتے ہیں اور پھر جیپ کے آگے آگے سڑک کے اوپر اڑنے لگتے ہیں' اور اڑتے چلے جاتے ہیں' جیسے وہ راستہ دکھا رہے ہوں.....اور پھر کبوتروں کا ایک ایسا غول نظر آتا ہے جو جیپ قریب آنے پر ڈرتا نہیں بلکہ آگے آگے دوڑنے لگتا ہے.....اور تھوڑی دیر میں ہمیں پتہ چلتا ہے کہ یہ چکور ہیں.....

"سچ مچ کے چکور ہیں؟" راہی حیران ہو کر پوچھتا ہے.....

"پکڑیں گے صاحب....." علاؤالدین جیپ روک لیتا ہے۔

کم از کم ایک درجن چکور چٹان کے سائے میں بیٹھے ہیں بلکہ کھڑے ہیں کیونکہ چکور بیٹھ کیسے سکتا ہے' وہ جیپ کو رکتا دیکھ کر اڑتے نہیں۔

"کیا یہ پکڑے جا سکتے ہیں؟" سمیر پوچھتا ہے.....

"ہاں صاحب.....اگر آپ کہتے ہیں تو میں کوشش کرتا ہوں....." علاؤالدین گھر سے فرار ہونے والی مرغی کو پکڑنے کے انداز میں جھک کر ان کی جانب چلتا ہے....."نہیں صاحب" وہ پلٹتا ہے "یہ بہت چھوٹے ہیں...بچے ہیں..."

اب ہم اپنی مردہ دلی سے باہر آ گئے ہیں کیونکہ ہر موڑ پر کبوتر اور چکور دکھائی دیتے ہیں... کبوتر راستہ دکھانے کے انداز میں جیپ کے آگے پرواز کرتے ہیں اور دور تک ہمارا ساتھ دیتے ہیں اور چکور اپنے آپ کو بچانے کے لئے چٹان کے ساتھ لگ

جاتے ہیں یا اڑان کر کے استور نالے کے اوپر چلے جاتے ہیں۔ اور یہیں پر ہم نے سیاہ تیتروں کے جوڑے بھی دیکھے.....

چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ روڈ ٹو استور از فل آف چکورز.....نو پرابلم

استور تک سفر طے ہونے کا احساس اس لئے بھی نہیں ہوتا کہ راستے میں کوئی آبادی نہیں.....کوئی کھیت نہیں - کوئی کچھ نہیں .....سوائے استور نالے' کچی سڑک اور چکوروں کے.....

دوپہر ہو چکی تھی.....اور ایک موڑ کے بعد ہم نے ایک ٹریفک جیم دیکھا.....تین چار جیپیں اور درجن بھر ٹریکٹر ٹرالیاں بھی سڑک پر کھڑی تھیں اور ان کے آگے سڑک غائب تھی.....فوج کے نوجوان بیلچوں سے مٹی ہٹا رہے تھے اور اوپر ایک بل ڈوزر سر ٹکرا رہا تھا.....

علاؤالدین نے جیپ روکنے کے بعد پہلا سوال یہ پوچھا کہ کھانے پینے کا کوئی بندوبست ہے کہ نہیں' ہو سکتا ہے ادھر رات بسر کرنی پڑ جائے... اس نے پچھلے ٹائروں کے پیچھے بڑے بڑے پتھر رکھ کر اطمینان کیا کہ جیپ لڑھکنے نہ پائے اور پھر تازہ ترین صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے آگے چلا گیا.....

سڑک کا تقریباً ایک فرلانگ کا حصہ نیچے گر چکا تھا.....اس کے نیچے ایک پرانی سڑک تھی جو بالکل ڈھے چکی تھی اور اب اسے چھوڑ کر ایک نئی سڑک پہاڑ میں سے تراشنے کی کوشش کی جا رہی تھی.....دوسری جانب بھی ٹریکٹر ٹرالیوں اور جیپوں کے مسافر سڑک کے کنارے بیٹھ کر استور نالے کو تکتے جا رہے تھے..... ان کے لئے یہ معمول تھا کہ استور روڈ گر گئی ہے اور رات ادھر ہوگی .... لیکن شب بسری کے لئے بھی یہ مقام کچھ زیادہ پر فضا نظر نہیں آتا تھا..... اور یہاں سے استور نالہ بھی سیدھا نیچے تھا.....

میں بھی بقیہ مسافروں کی طرح سڑک کے کنارے پر بیٹھ کر استور نالے کے پانیوں کو دیکھنے لگا.....سمیر اور جاپانی کا آپس میں ایک تعلیمی معاہدہ ہو گیا جس کے تحت سمیر اسے انگریزی سکھا رہا تھا اور وہ اسے جاپانی سے آگاہ کر رہا تھا..... راہی اپنی سکیچ بک نکال کر استور روڈ کو کاغذ پر منتقل کرنے لگا۔

یہ عارضی پڑاؤ آہستہ آہستہ زیادہ آباد ہونے لگا..... اکثر ٹریکٹر ڈرائیور آگ سلگا کر چائے تیار کرنے لگے۔ چند فوجی جیپیں دھول اڑاتی ہوئی چلی آ رہی تھیں..... ان میں سے ایک جیپ میرے قریب آن رکی اور اس میں سے تین نوجوان کپتان برآمد

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

ہوئے' انہوں نے دریا میں گری ہوئی سڑک کو دیکھا اور زیر لب کچھ ناگفتہ بہ الفاظ کہے۔۔۔ بل ڈوزر اپنا آہنی جبڑا کھولے مسلسل پہاڑ کو میدان بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔۔۔ فوجی جوان کدالوں پر جھکے پسینے میں نچڑتے تھے۔۔۔۔ ایک کپتان میرے قریب سے گزرا۔ پہلے گزر گیا اور پھر واپس آ کر کہا "آپ ہیں؟" کہہ کے بیحد پرمسرت ہوا' زور دار جھٹکے کے ساتھ بار بار ہاتھ ملایا اور کہنے لگا "گویا آپ سچ مچ سفر کر کے سفرنامے تحریر کرتے ہیں۔۔۔ میرے لائق کوئی خدمت؟"

"اگر آپ ہمیں آج ہی دوسری جانب پہنچانے کا بندوبست کر سکتے ہیں تو کر دیجئے۔۔۔ کہ یہ سڑک فوج کے زیر انتظام ہے۔۔۔۔ نہیں کر سکتے تو نہ سہی۔۔۔"

نوجوان کپتان نے اپنے آپ کو سنجیدہ ظاہر کرنے کے لئے تیوریاں بھی چڑھائیں اور کہنے لگا " آئی ول ٹرائی مائی بیسٹ سر۔۔۔" بقیہ دونوں کپتان بھی اس کے ہمراہ آگے چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آئے اور کہنے لگے "آپ صرف ڈیڑھ گھنٹے تو انتظار کر سکتے ہیں ناں؟۔۔۔ ابھی اس پہاڑ کو ڈائنامائیٹ سے اڑایا جائیگا۔۔۔"

لوگ پیچھے ہٹنے لگے۔۔۔ آگے تک گئی ہوئی جیپیں واپس ہونے لگیں اور فوجی جوانوں نے سب کو خبردار کیا۔۔۔ اور پھر ایسا شاندار دھماکہ ہوا کہ آدھے پہاڑ کے ساتھ درخت اور جھاڑیاں بھی فضا میں بلند ہوئیں۔۔۔۔ گرد کا ایک بادل عارضی طور پر ہوا میں معلق ہوا۔۔۔ بل ڈوزر پھر سے راستہ بنانے لگا اور واقعی ایک گھنٹے کے بعد ہم پھر سے رواں دواں تھے۔۔۔

پچھلے پہر ہوا میں خنکی محسوس ہوئی۔ خشک جھاڑیوں کی بجائے چیڑ کے چھوٹے چھوٹے درخت نظر آنے لگے اور ہم ذرا نیچے ہو کر تقریباً دریا کے ساتھ آ گئے۔۔۔۔ تھوڑی دیر کے لئے رکے' اپنے آپ کو ٹھنڈے پانی سے بھگو کر تروتازہ کیا اور پھر چل اے مسافر چل۔۔۔

"علاؤالدین بھائی" راہی نے ڈرائیور سے کہا "استور کتنی دور رہ گیا ہے؟"

"استور ادھر رہ گیا ہے" اس نے دریا کے ساتھ بلندی کی جانب چڑھتی ہوئی ایک سڑک کی طرف اشارہ کیا "ادھر سے دو کلومیٹر اوپر ہے لیکن ہم ادھر سے سیدھے ترشنگ جائیں گے"

"اور چائے کہاں پئیں گے؟" راہی نے بڑی معصومیت سے دریافت کیا۔

"گریکوٹ میں۔۔۔"

چنانچہ ہم استور نہ دیکھ سکے' اس کے آس پاس کو سونگھ کر آگے نکل گئے۔

گریکوٹ' بلند اور خشک پہاڑوں میں گھرا ہوا ایک مختصر سا قصبہ تھا۔۔۔یہاں استور نالے کا پاٹ بہت وسیع تھا۔ چند فوجی بیرکیں تھیں۔ تین چار دوکانیں اور ایک چائے خانہ تھا جس کی کالک بھری دیواروں کے ساتھ ٹیک لگا کر ہم دھواں بھری چائے نوش کرتے تھے اور مزے کرتے تھے۔۔۔ گریکوٹ میرے لئے بے حد اہم تھا۔۔۔ یہاں سے اوپر کو راستہ جاتا تھا' چلم چوکی کو۔۔۔ اور اس سے اوپر دیوسائی کے میدان تھے۔۔۔ ہماری منصوبہ بندی یہی تھی کہ نانگا پربت سے واپسی پر گریکوٹ آیا جائے اور یہاں سے چلم چوکی اور دیوسائی اور وہاں سے سکردو۔۔۔چائے خانے کا مالک عبداللہ ہمارے ساتھ جانے کو تیار تھا لیکن اس نے شک کا ایک بیج ہمارے دل میں بو دیا' کہنے لگا "اوپر جو بڑا پانی ہے اسے عبور کرنے کے لئے ہر برس لکڑی کا پل بنایا جاتا ہے اور سردیوں کے شروع میں اس پل کو توڑ کر آگ تاپی جاتی ہے۔ بڑے پانی کو کئی لوگ پیدل بھی عبور کرتے ہیں اور کئی لوگ اس کوشش میں پانی میں گر کر بہتے چلے جاتے ہیں۔ اور چلے جاتے ہیں۔۔۔ اس برس ابھی تک وہ پل نہیں بنا"

"تو ہم اسے پار نہیں کر سکتے؟"

"نہیں۔ نائلون کا رسہ ہو تو ایک دوسرے کو باندھ کر دوسری طرف جایا جا سکتا ہے"

اسی بڑے پانی یا کالے پانی کے بارے میں مجھے پی آئی اے کے کیپٹن زبیر نے بتایا تھا کہ اگر کبھی آپ کو اسے عبور کرنا پڑے تو بوٹ پہنے رکھئے گا' اگر ننگے پاؤں چلے تو اس کے سنگریزے بلیڈوں کی طرح تیز دھار کے ہیں۔ پاؤں کٹتا چلا جاتا ہے اور آپ کو خبر تک نہیں ہوتی کیونکہ آپ یخ بستہ پانیوں میں ہوتے ہیں۔۔۔۔ اور پھر جب پتہ چلتا ہے تو آپ وقتی طور پر اپاہج ہو چکے ہوتے ہیں۔۔۔۔ گریکوٹ کے دھواں بھرے چائے خانے میں عبداللہ نے ہمیں دیوسائی کے کئی قصے سنائے۔۔۔ جن میں ایک یہ بھی تھا کہ صرف تین برس پیشتر تین مقامی گڈریے راستہ بھول گئے اور برف کے ساتھ برف ہو گئے۔۔۔اور یہ کہ دیوسائی پر ایک صاف آسمان چند لمحوں میں ابرآلود ہو کر پاؤ بھر وزن کے اولے آپ پر گرا سکتا ہے۔ ہمیں شام سے پہلے ترشنگ پہنچنا تھا اور سچی بات ہے میں اپنے آپ کو کوس رہا تھا کہ اس قسم کے علاقے کو دیکھنے کے لیے میں نے اتنا تردد کیوں کیا؟ ترشنگ آخر گریکوٹ سے ذرا بہتر کوئی گاؤں ہو گا تو پھر کیا ہو گا۔۔۔۔

گریکوٹ کے راستے میں بھی سڑک متعدد مقامات پر گری ہوئی تھی اور وہاں

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

ٹریک یک طرفہ تھی۔۔ یہ راستہ دریا سے اتنی اونچائی پر تھا کہ جیپ سے جھانکنے پر ہوائی جہاز کے کاک پٹ کا سا منظر دکھائی دیتا تھا۔۔۔ایک جگہ ایک ٹریکٹر ٹرالی پر تودہ گرا ہوا تھا اور صرف ٹریکٹر کا سٹیرنگ مٹی سے باہر تھا۔ چند مزدور اسے کھود کر باہر نکالنے کی کوشش میں مصروف تھے۔۔ڈرائیور کے بارے میں اطلاع ملی کہ وہ تودے کی گڑگڑاہٹ سن کر ٹریکٹر سے کود گیا تھا اور کود کر سیدھا دریا میں گیا تھا۔۔۔ اور یہاں پر دریا میں بہت بڑے بل ڈوزر کا ڈھانچہ چرمر ہو کر پڑا تھا اور پانی کے زور سے ذرا سا حرکت کرتا تھا۔۔۔ گریگوٹ کی بیرکوں کے ساتھ ہم نے استور نالے پر واقع بڑے پل کو عبور کیا۔ پل کے پار فوج کے محکمہ سپلائی کا ڈپو تھا۔ ڈپو کے قریب اوپر سے ایک نالے کے ساتھ ایک راستہ اوپر کو اٹھ رہا تھا۔۔۔۔۔۔

"صاحب یہ نالہ دیوسائی سے آرہا ہے" علاؤالدین نے پیچھے مڑ کر کہا۔۔۔

"تو پھر روکو یار اسے سلام کریں"

اس نے جیپ روکی اور میری طرف عجیب نظروں سے دیکھا "صاحب کے سلام کرے گا؟"

"اسے" میں نے نالے کی طرف ایک دیوانے کی طرح اشارہ کیا "اسے بابا۔ یہ جو اوپر دیوسائی کے میدانوں سے آ رہا ہے۔ جہاں میں جانا چاہتا ہوں اور جا نہیں سکا۔ لیکن اس مرتبہ ہم جائیں گے۔۔"

"نالے کو سلام کرتا ہے؟" علاؤالدین نے راہی کو اپنا رازداں بنانے کی کوشش کی "کیوں کرتا ہے؟"

راہی نے سر ہلایا "اس کا پیچ ڈھیلا ہے۔۔۔ یہ ادھر دماغ میں گڑبڑ ہے"

نالے کا نیلگوں پانی میری آنکھوں کو ٹھنڈک دے رہا تھا۔۔۔

"ابھی آگے سڑک بہت خراب ہے۔۔۔" علاؤالدین بولا "ادھر خراب ہو تو ایک دن میں ٹھیک ہو جاتی ہے ادھر خراب ہو تو مہینہ مہینہ خراب رہتی ہے۔ شام سے پہلے پہنچنا ہے"

اب لینڈ سکیپ اتنی ویران اور آنکھوں کو دکھ دینے والی بنجر نہ تھی بلکہ تھوڑی سی شادابی تھی' سفیدے کے درخت تھے۔ یہاں سے ہم نے ایک مرتبہ پھر استور نالے کو رحمان پور پل سے عبور کیا لیکن یہاں اس کا نام روپل نالہ تھا۔۔۔۔ ایک راستہ رحمان پور اور رتو کو جا رہا تھا لیکن ہم ترشنگ جانے والے راستے پر تھے۔۔۔ جہاں استور ایک دنیا کے اندر ایک اور دنیا تھی وہاں استور سے آگے پھر ایک اور جہان تھا۔۔ ایک نیا ان دیکھا جہان۔۔۔ جہاں بہت کم لوگ آئے تھے۔۔۔ ہمارے آگے ترشنگ تھا۔۔۔ اور پتہ نہیں جس کی جانب ہم اتنے طویل سفر کے بعد آئے تھے وہ کیسا تھا۔۔۔ ترشنگ۔۔۔

شام قریب تھی اور ہمارا پورا دن سفر میں گذرا تھا۔ ہم اپنے وقت اور اپنے عہد کو پیچھے چھوڑ کر آگے جا رہے تھے۔ ایک نئے وقت اور نئے عہد میں۔۔ آس پاس سبزہ زیادہ ہو رہا تھا اور روپل نالہ ہم سے پرے ہو چکا تھا۔ ہم ایک سرسبز میدان میں داخل ہوئے۔ پھر بونجی کی طرح پہاڑ پیچھے ہوئے اور لینڈ سکیپ وسیع ہونے لگی۔ میں پچھلی نشست پر بیٹھا بار بار پوچھتا تھا کہ ترشنگ کتنی دور ہے کیونکہ اب میری ہڈیاں بھی دکھ رہی تھیں۔۔۔ میں ونڈ شیلڈ کو دیکھ رہا تھا جس میں ایک بہت وسیع علاقہ شام کی آمد سے پیشتر ایک بجھی ہوئی روشنی میں تھا' ہلکے بادل تھے۔ اور اندر جو ہوا آ رہی تھی اس میں ٹھنڈک تھی۔ اور پھر میں نے دیکھا کہ ونڈ شیلڈ برف سے سفید ہو گئی ہے اور یہ بہت شتابی سے ہوا۔۔۔ بہت غیر متوقع طور پر' جیسے یونانی دیو مالا میں جیسن کی کشتی کے سامنے سمندر کے میدان میں سے ایک عفریت ابھرتا ہے اور آسمان تک چلا جاتا ہے اور اس کے سامنے کشتی اور اس کے مسافر خوفزدہ چہروں کے ساتھ منہ کھولے اسے دیکھتے ہیں۔۔۔ کچھ ایسے ہی اس سرسبز میدان میں شام کی آمد سے پیشتر ایک بجھی ہوئی روشنی میں نانگا پربت کا سلسلہ ہائے کوہ یوں بلند ہوا کہ بلند ہوتا چلا گیا اور اس نے پورے آسمان کو بھر لیا اور ہم پرمسرت چہروں کے ساتھ منہ کھولے اسے دیکھتے تھے اور اس کے آس پاس گہرے بادل تھے جن میں سے ایک گڑگڑاہٹ نکل کر نیچے میدان تک آتی۔۔۔ اور مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ منظر میرے سامنے ہے میں اسے دیکھ رہا ہوں۔۔۔ کیونکہ یہ ایک اور وقت تھا ایک اور عہد تھا جس میں ہم سفر کر رہے تھے۔۔۔ کھیتوں میں بہت سارے جامنی رنگوں کے پھول ہوا سے اپنی جگہ عارضی طور پر بدلتے تھے۔۔۔ سڑک سیدھی جا رہی تھی۔۔۔ چند مکانوں کے سامنے ایک شخص کھڑا ہاتھ ہلا رہا تھا۔ جیپ رک گئی۔۔۔ یہ مولوی یونس تھا۔۔۔

"آپ آگے نہیں جاؤ۔ سڑک روپل نالے میں گر گئی ہے"

میرا دل بیٹھ گیا۔ اب اتنی دور آ کر اور نانگا پربت کو یوں شاندار دیکھنے کے بعد اگر واپس جانا پڑا تو۔۔۔۔۔۔

"آپ کہاں جاؤ گے؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"ترشنگ اور پھر روپل کے راستے نانگا پربت کے بیس کیمپ"

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"تو پھر پورٹر ہم آپ کو دیں گے۔ یہ ہمارا حق ہے چورت والوں کا۔۔۔"

"بابا ہم ادھر ترشنگ پہنچیں تو پورٹر لیں گے ناں۔۔۔ تمہیں یقین ہے کہ سڑک بالکل خراب ہے اور اس پر سے گزرا نہیں جا سکتا؟"

"ہاں صاحب۔۔۔ ابھی دو جیپیں واپس گئی ہیں۔۔۔ اور وہ حصہ اچھا نہیں ہے کیونکہ دریا بالکل ساتھ ہے۔۔۔ آپ رات ادھر گزار لو۔ ہو سکتا ہے کل تک ٹھیک ہو جائے"

"کیوں صاحب۔۔۔" علاؤالدین نے مجھ سے پوچھا۔

"کیا تم اس سے پیشتر ترشنگ گئے ہو؟"

"نہیں صاحب صرف استور تک ہی آیا ہوں۔ ویسے بھی یہ سڑک تو ابھی بنی ہے ورنہ ادھر تک تو لوگ پیدل آتے تھے ۔۔۔۔ صرف دو برس پہلے سڑک نہیں تھی۔۔"

"کیا خیال ہے جاپانی؟"

"آہ" اس نے سر جھکایا۔

"میرا خیال ہے کہ وہاں تک جا کر دیکھ لیا جائے کہ کتنی خراب ہے۔۔۔ اگر نہ گذر سکے تو واپس یہاں آ جائیں گے"

"نوپرابلم۔" اس نے جھک کر کہا۔

"چلو بھئی علاؤالدین"

مولوی یونس نے سر ہلایا اور پھر کہنے لگا "آپ واپس آ جاؤ گے۔ لیکن نانگا پربت کے پورٹر آپ ہم سے لینا۔۔۔ اس گاؤں کا نام چورت ہے۔"

چورت کے فوراً بعد میدان ختم ہو گیا اور روپل نالہ ہمارے قریب آ گیا۔ یہ گہرائی میں نہ تھا بلکہ سڑک سے صرف دس بیس فٹ نیچے تھا۔ بہت تیز نہ تھا۔۔۔ یہاں راستہ خاصا خراب تھا اور جیپ بہت سوچ سوچ کر دھچکوں کے ساتھ چلتی تھی۔ ایک موڑ پر ہم نے ایک خوبصورت آبشار کو بہت بلندی سے کچی سڑک پر گرتے دیکھا۔ نہیں اسے آبشار نہیں کہا جا سکتا' یہ کسی گلیشیئر کا پانی تھا جو چھوٹی چھوٹی نالیوں کی صورت میں نیچے آ رہا تھا۔ اور پھر ایک مسلسل پھوار اور بارش کی شکل میں سڑک پر گر کر روپل نالے میں جا ملتا تھا۔۔۔ اس آبشار کے آگے وہ مقام تھا جس کے بارے میں مولوی یونس نے اطلاع دی تھی کہ وہاں سڑک دریا میں گر چکی ہے۔ ہم جیپ روک کر آگے گئے۔۔۔ آبشار کا پانی ہم پر گرتا تھا۔ وہاں سڑک کا ایک چھوٹا سا حصہ غائب تھا اور وہاں سے دس بیس فٹ نیچے دریا کا پانی تھا۔۔۔ اور یہ ایسا چھوٹا سا حصہ تھا جس پر سے جیپ کا ٹائر گزرنا تھا کیونکہ پہاڑ کی جانب کوئی گنجائش نہ تھی۔ اب حساب کتاب یہ لگانا تھا کہ اگر جیپ یہاں سے گزاری جائے تو کیا وہ بیلنس قائم رکھے گی یا ترچھی ہو کر دریا میں گر جائے گی۔۔۔ ہم اس سوراخ کو تو پر نہیں کر سکتے تھے جہاں سے سڑک غائب تھی۔۔۔

"صاحب ذرا مدد کرو پتھر لاؤ" ڈرائیور نے اس حصے کو بوٹ سے دباتے ہوئے کہا۔۔۔ چنانچہ سب نے حسب مقدور اپنے اپنے سنگ اٹھائے اور وہاں ڈھیر کر دیئے۔۔۔ علاؤالدین جیپ میں سوار ہوا پھر اسے آہستہ سے نہایت احتیاط سے چلاتا ہوا گرے ہوئے حصے کے قریب لے گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے باہر نکل کر پھر حساب کتاب کیا اور دوبارہ اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔۔۔ اور ہم دوسری جانب سانس روکے جیپ پر نظریں جمائے کھڑے تھے۔۔۔ اور ہم نے دیکھا کہ اس حصے پر سے گزرتے ہوئے جیپ کا اگلا ٹائر لحظہ بھر کے لئے ہوا میں معلق ہوا اور پھر پچھلے ٹائر کی بھی یہی کیفیت ہوئی لیکن جیپ ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ ہماری جانب آ گئی ۔۔۔ ہم سب نے باری باری ڈرائیور سے ہاتھ ملایا اور اس کی پیٹھ تھپکی ۔۔۔ خاص طور پر جاپانی "نوپرابلم ۔ نوپرابلم" کہتا نڈھال ہوتا تھا۔

اور حیرت انگیز طور پر ہمارے بدنوں میں تھکاوٹ کم ہو گئی۔۔۔ ہماری پسلیاں جو آپس میں بجڑ کر رگڑی جا چکی تھیں قدرے آرام سے ہو گئیں۔

"بس جی ترشنگ نزدیک ہے۔" علاؤالدین کو اس بات پر فخر تھا کہ جہاں سے دو جیپ ڈرائیور خوفزدہ ہو کر واپس چلے گئے وہاں سے اس نے اپنے کمال فن سے راستہ بنا لیا۔۔۔ اور راستہ نیچے ہو کر ایک چھوٹے سے نالے تک گیا۔ اسے عبور کر کے اوپر ہوا اور چڑھتا گیا اور پھر جیپ رک گئی۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

ترشنگ' پاکستان کا خوبصورت ترین گاؤں

ہم باہر آ گئے۔

ترشنگ!

اور ترشنگ کیا ہے؟

ترشنگ ایک مجبوری ہے۔ ترشنگ ایک اور فنتوری ہے جہاں پہنچ کر جب میں جیپ سے باہر نکلا ہوں تو منہ اٹھا کر جب دیکھتا ہوں تو دیکھتا چلا جاتا ہوں۔۔۔ یہاں آپ ہرگز یہ نہیں کہہ سکتے کہ گر فردوس بر روئے زمین است ... کیونکہ یہ تو فردوس بر روئے زمین است و زمین است و زمین است ...

نانگا پربت کی چوٹیوں کی سفید اور آسمان تک کی دیواریں اور ان میں گھرا ہوا ایک وسیع سبزہ زار جس میں کھیت ہیں اور پھول ہیں اور چشمے ہیں' چند مکان ہیں ان کے مکین ہیں اور کھیتوں میں ابھی جو کی فصل تیار نہیں ہوئی اور کھیتوں میں جو کے خوشے کم ہیں اور ہزاروں رنگ کے پھول زیادہ ہیں۔۔۔ یہ برفیلی سفید دیواریں اتنی بلند ہیں اور اتنی قریب ہیں کہ آپ ان کی تصویر نہیں اتار سکتے ... اور بلندی کی شفاف ہوا ہے جو آپ کی قمیض اور بنیان کے پیچھے جا کر آپ کے ماس پر سرد بوسہ دیتی ہیں۔ آپ کا بدن تھرتھراتا ہے اور اسے مزید اور مسلسل بوسوں کی خواہش رہتی ہے اور یہ خواہش پوری ہوتی جاتی ہے۔۔ ترشنگ کو میں بیان نہیں کر سکتا۔۔ انگریزی محاورے کے مطابق دیکھنا یقین کرنا ہے لیکن اسے دیکھ کر ہی یقین آتا ہے کہ وہ کیا ہے۔۔۔ میں ترشنگ کو اس لیے مجبوری کہتا ہوں کہ اسے آپ کے سامنے زندہ کرنا میرے بس سے باہر ہے۔۔ اور یوں بھی اگر قدرت کے تمام عظیم منظر کتابوں میں اور لفظوں میں زندہ ہو سکتے تو مجھ ایسے آوارہ گرد اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر ان تک کیوں جاتے' اپنی منڈی کی خلوت میں بیٹھ کر ان کے بارے میں کتابوں میں کیوں نہ پڑھ لیتے ... اور ترشنگ ایک بلند سطح کا علاقہ ہے۔۔ اور اس بلند سطح کے باوجود آس پاس کے پہاڑ اس

پر جھکے ہوئے ہیں۔۔ شاید اسے پاکستان کا حسین ترین قصبہ کہنا چاہئے۔۔

علاؤالدین جیپ کے پیچھے بندھا ہوا سامان کھول کر زمین پر رکھ رہا تھا۔۔

راہی بہت پریشان تھا۔۔۔ وہ نانگا پربت کی دیواروں کی جانب دیکھتا تھا اور پھر بے بسی سے مسکراتا ہوا میری طرف دیکھتا تھا۔۔۔

شام ترشنگ پر اترنے کو تھی۔۔۔

ہمارے گرد اور سامان کے گرد ترشنگ کے کسان 'مزدور اور بچے جمع ہو رہے تھے۔۔ وہ ہمیں دیکھ رہے تھے۔۔ انہیں غیر ملکی سیاحوں کو دیکھنے کی عادت تھی لیکن پاکستانی سیاح ان کے لئے عجوبہ تھے۔۔۔ علاؤالدین نے جب سارا سامان اتار دیا تو میں نے اسے شب بسری کے بارے میں پوچھا۔

"میرا ایک دوست ہے گریکوٹ میں ... صاحب مجھے رات سے پہلے ادھر پہنچنا ہے۔۔" اس نے باری باری سب سے ہاتھ ملایا اور پھر اس کی جیپ نیچے اتر رہی تھی اور پھر ہم اسے دیکھ نہیں سکتے تھے اور تب ہمیں یکدم احساس ہوا کہ باہر کی دنیا سے ہمارا رابطہ ختم ہو گیا ہے۔ اور ہمیں بھی آج کی رات بسر کرنے کے بارے میں سوچنا ہے۔۔ ایک دبلا پتلا کچھ مسکین سا نوجوان سفید شلوار قمیض میں اور تیکھے ناک نقشے اور سفید رنگت والا ہمارے گرد منڈلا رہا تھا۔۔ "کدھر جائے گا صاحب؟ پورٹر چاہئے؟ مانٹو جائے گا مانٹو لے جائے گا۔۔ ہر جگہ لے جائے گا۔۔ کدھر جائے گا؟ یہ ادھر میرا ہوٹل ہے۔۔ اس کا نام نانگا پربت ٹورسٹ کاٹج ہوٹل ترشنگ ہے۔۔"

"کہاں ہے؟"

"یہ ادھر ہے۔۔" اس نے ندی کے ساتھ زیر تعمیر چند کمروں کی طرف اشارہ کیا "یہ ترشنگ کا پہلا ہوٹل ہے"۔۔۔

"جب بنے گا تو پہلا ہوٹل ہو گا ناں؟"

"بنے گا کیوں نہیں۔ بنے گا۔۔۔۔ آؤ دیکھو۔۔۔ آؤ بہت اچھا کمرہ ہے"

"آپ ادھر سامان کے پاس ٹھہرو ــــ میں آتا ہوں" میں نے میمر سے کہا اور اس نوجوان کے ساتھ ان کمروں کے اندر چلا گیا۔ تین کمرے تھے۔ ایک میں ریت تھی بقیہ دو میں فرش پر پتھر تھے اور ٹین کی چھت میں سے پانی ٹپک رہا تھا۔۔۔ کھڑکیاں بھی تھیں لیکن ان میں شیشے وغیرہ نہیں تھے اس لیے ہوا کی آمد و رفت کا انتظام انتہائی تسلی بخش تھا۔ غسل یا دیگر ضروریات کے لیے ترشنگ کے کھیت اور برفانی ندی ... خیال رہے کہ ترشنگ کے کھیت میں اگر آپ بیٹھتے ہیں تو آپ کے ارد گرد پھول ہوں گے خوشبو ہو گی اور آپ کے لبوں پر ایک معصوم مسکراہٹ کھیل رہی ہو گی۔۔۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"یہاں سونے کا کہاں انتظام ہے؟"

"ادھر فرش پر... میں ترپال بچھا دوں گا..."

"نہیں ہمارے پاس خیمہ ہے"

"باہر سردی ہو گی صاحب... یہ ترشنگ ہے... اور میرا نام احسان ہے"

"ہوں" میں نے سر ہلایا اور باہر آ گیا... باہر سامان تو وہیں پڑا ہوا تھا لیکن راہی' جاپانی اور سمیر منہ اٹھائے ادھر ادھر کھیتوں میں گھوم رہے تھے۔ میں نے "اوئے اوئے" کر کے انہیں واپس بلایا۔ اور ترشنگ کے واحد ہوٹل کی رہائشی سہولتوں سے آگاہ کیا۔ سب نے کہا کہ ہمارے پاس خیمہ ہے ہمیں کیا پرواہ ہے... جاپانی کے پاس اپنا خیمہ تھا چنانچہ وہ تو ظاہر ہے نو پرابلم... اور خوراک کا بھی بندوبست تھا چنانچہ بالکل نو پرابلم۔

اس دوران اہل ترشنگ کی نظریں ہم سے جدا ہو کر کیچڑ سے بھرے ہوئے اس راستے کی طرف اٹھ گئیں جو چورت کی طرف سے آ رہا تھا... شدید بارشوں کی وجہ سے ترشنگ کے آس پاس اور سڑک پر کیچڑ کی بہتات تھی۔ اس راستے پر ایک چھوٹی پاجیرو جیپ چلی آ رہی تھی... یہ کہاں سے آ گئی... اور اس مقام سے کیسے گزر کر آ گئی جہاں سڑک گری ہوئی تھی... پاجیرو نزدیک آئی تو تمام لوگ ہمیں چھوڑ کر ادھر چلے گئے... پاجیرو میں سے اترنے والے چہرے غیر ملکی تھے۔ احسان ہمیں بھول کر ان کے گرد پھڑپھڑانے لگا۔ اور انہیں اپنے ہوٹل میں ٹھہرانے پر راضی کر لیا... وہ اپنا سامان کمروں میں منتقل کرنے لگے۔

ہم ایسے لا پرواہ مسافروں کی طرح تھے جو اپنی منزل پر پہنچ چکے تھے اور اب انہیں کہیں نہیں جانا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد راہی نے اپنے بازو ملتے ہوئے کہا "سردی ہے..."

سمیر نے اپنی افغان جیکٹ رک سیک میں سے کھینچ کر باہر نکالی اور پہن لی...

یہ ایسا وقت تھا جب نانگا پربت کے سائے رینگتے ہوئے ترشنگ کی روشنی کم کر رہے تھے۔ ہوا نہیں تھی لیکن ترشنگ کے ٹھہراؤ میں' فضا کے سکوت میں ٹھنڈک بڑھتی جا رہی تھی۔ اس لمحے ان کمروں میں سے جنہیں احسان' نانگا پربت ٹورسٹ کاٹج روئل ترشنگ کا نام دیتا تھا ایک خوش شکل اور مناسب مقامات پر بھری بھری خاتون باہر نکلی... اس کے کاندھے پر ایک چھوٹا سا تولیہ تھا اور ہاتھ میں برش جس پر لگی ٹوتھ پیسٹ کو وہ سنبھالتی چلی آتی تھی۔ اس نے ہماری طرف ذرا ناراض نظروں سے دیکھا اور پھر اسی دو تین فٹ چوڑی ندی کے کنارے بیٹھ کر دانت صاف کرنے لگی...

دلچسپ بات یہ تھی کہ پہلے اس نے ندی پر جھک کر منہ دھونے کی کوشش کی اور جہاں تھی وہیں سن ہو کر رہ گئی کہ پانی بالکل برف تھا پھر اس نے منہ دھونے کا ایک طریقہ نکالا۔ وہ ایک ہاتھ سے منہ پر چھینٹا مارتی اور فوراً دوسرے ہاتھ میں تھامے تولیے سے منہ پونچھ لیتی تاکہ برفیلا پانی زیادہ دیر چہرے پر رہ کر اسے برف نہ بنائے... اس منظر کو دیکھ کر ہم نے اپنے آپ کو کچھ بے گھر اور مسکین سا محسوس کیا... اور ہمارے مسکین محسوس کرنے میں اس سردی کا بڑا عمل دخل تھا جو لمحہ بہ لمحہ بڑھتی چلی جاتی تھی... یہ ایسی سردی تھی جو ہمارے زرد خیمے کے سنگل کپڑے سے تو نہ رکتی تھی... ہمیں شب بسری کے لیے چھت درکار تھی... لیکن ہم انکار کر چکے تھے اور اب یہ ہماری انا کا مسئلہ بن چکا تھا... ایک بار احسان کمروں سے باہر آیا تو میں نے ایک بہت چوڑی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی جانب دیکھا۔ وہ اڑتا چلا آیا "کمرہ چاہئے؟"

"نہیں۔ یہاں کون سی جگہ خیمے لگانے کے لیے مناسب رہے گی؟"

"سردی ہو گی صاحب... اور ترشنگ کی ساری زمین گلیشیئر کے پانیوں کی وجہ سے نم آلود اور دھنے والی ہے... ہاں گراؤنڈ میں لگا لیں جہاں بچے فٹ بال کھیل رہے ہیں..."

"اچھا تو سردی ہو گی..." میں نے ذرا لاپروائی سے ادھر ادھر دیکھا اور اس لمحے میرا بدن کپکپا رہا تھا کیونکہ میری جیکٹ رک سیک میں سلیپنگ بیگ کے نیچے دبی ہوئی تھی اور میں اسے نکال کر پہن نہیں سکتا تھا...

"خیر سردی تو کیا ہو گی لیکن... ذرا کمرہ ایک مرتبہ پھر دکھا دو"

احسان نے پتھروں کے فرش پر ہمارے لیے جو ترپال بچھائی وہ بھی گیلی تھی... لیکن یہاں باہر کی نسبت حالات خاصے بہتر تھے... یوں بھی ساتھ والے کمرے سے صاحب لوگوں کی چیخوں... پرمسرت قہقہوں کی آواز آ رہی تھی۔ ہم نے رک سیک کھول کر سلیپنگ بیگ نکالے اور انہیں گیلی ترپال پر بچھا دیا۔ میں نے جیکٹ پہنی تو اس کی گرمی نے مجھے بڑا گہرا سکھ دیا۔ جاپانی ایک گونگے غلام کی طرح ہم جو کہتے تھے اس پر "آہ آہ" سر ہلاتا تھا اور جاپانی ابھی تھوڑی سی روشنی ہے آؤ ترشنگ کا قصبہ دیکھ آئیں... اور نو پرابلم۔

اور باہر تھوڑی سی روشنی تھی... کسی مقام کو دور دراز کی مسافتیں طے کرنے کے بعد وہاں پہنچنے پر دیکھنا اور ایسے دیکھنا کہ سامان زمین پر پڑا ہو اور شب بسری کے لیے ٹھکانہ نہ ہو یہ اور بات ہے اور پھر اسی مقام کو اس اطمینان سے دیکھنا کہ ہمارے پاس واپس جانے کے لیے ایک چھت ہے جس کے نیچے ہمارا سامان محفوظ ہے۔ بالکل

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

اور بات ہے۔۔۔ پہلے آپ اجنبی ہوتے ہیں یونہی گزرنے والے اور پھر آپ اس مقام کے باسی ہو جاتے ہیں۔۔ اور وہاں کے باسی بھی آپ کو قبول کر لیتے ہیں۔ میں اور سمیر اپنی چھڑیاں ٹیکتے ترشنگ کے کھیتوں میں اطمینان سے چلتے تھے۔۔۔ ہمارے "کاٹیج" کے سامنے جو نہر تھی اس میں کسی پہاڑی بکرے کے سینگ اٹکے ہوئے تھے۔

"یہ مارخور کے سینگ ہیں ابو؟" سمیر نے انھیں اپنی چھڑی سے چھوا۔

"پتہ نہیں۔۔۔ بہر طور کسی بکرے کے ہیں"

"نہیں مارخور کے ہیں۔۔ انھیں اٹھا لوں ابو؟ ترشنگ کے سوونیئر کے طور پر؟"

"نانگا پربت سے واپسی پر اٹھا لینا۔۔ انھیں اور کوئی نہیں اٹھائے گا"

نہر کے دوسری جانب ایک چھوٹی سی پن چکی تھی۔۔۔ ایک چھوٹی سی آبشار۔ آبشار کے آس پاس جیسے درختوں گل دان سجے ہوں۔۔ ایک سوکھی ٹہنیوں والا درخت۔۔ اور ان کے پس منظر میں ترشنگ کے کھیت مکان اور نانگا پربت کی سفید دنیا تھی۔۔۔ یہاں زمین واقعی نرم اور گیلی تھی۔ اور وہ فوم کی طرح پاؤں تلے دبتی تھی۔۔ اور اس زمین پر جہاں گھاس تھی وہاں زرد پھول تھے اور جہاں کھیت تھے ان میں جامنی رنگ کے پھولوں کی دیواریں تھی۔۔۔ سردی میں اضافہ ہو رہا تھا۔۔۔ ہم خاصی دور تک گئے' نانگا پربت کے نزدیک ہونے کی کوشش کی۔۔۔ کھیتوں میں جہاں کچھ پتھر تھے ان پر بیٹھ کر آرام کیا۔۔ آرام بے حد ضروری تھا ترشنگ ایک گلیشیئر گاؤں ہے اور اس کی بلندی تقریباً" بارہ ہزار فٹ کے قریب ہے۔ یہاں ہوا بے حد کم ہے اور فوراً سانس پھول جاتا ہے اور اس کے علاوہ ہلکا سا سردرد تب تک۔۔ جب تک آپ بلندی کے عادی نہیں ہو جاتے۔ اس مقام پر ہم نے ترشنگ کے چوبی لینڈ مارک کو دیکھا۔

ترشنگ کی ہریاول کے درمیان ایک نسبتاً بنجر پہاڑی ہے جس کے اوپر درختوں کے تنوں اور پتھر سے بنا ہوا ایک سیاہ اور چوکور ڈھانچہ ہے۔۔۔۔ یہ ڈھانچہ بہت دور سے دکھائی دیتا ہے اور اس کی تعمیر کا ڈھنگ بے حد منفرد ہے۔۔۔۔ یہ کیا ہے؟۔۔۔۔ یہ ہم کل صبح کھوج لگائیں گے کیونکہ فی الحال ترشنگ مکمل تاریکی کی لپیٹ میں آ رہا تھا اور پاؤں تلے کی زمین میں سے سردی بدن میں جاتی تھی اور گرم جیکٹ کو جیسے جسم سے الگ کر دیتی تھی۔

"کاٹیج" کے اندر ایک اور دنیا آباد تھی۔۔۔۔ بے فکر فرانسیسی سیاحوں کی دنیا جو

ریت پر میز سجائے اور اس پر موم بتیاں جلائے فرانس کے جنوبی حصوں میں تیار کی گئی انگور کی شراب پی رہے تھے اور موم بتیوں کی ناکافی روشنی ان کی آنکھوں میں الاؤ کی صورت جلتی تھی۔۔۔۔ راہی نے ہماری موجودگی میں کمرے کو رہائش کے قابل بنانے کی کوشش کی تھی۔۔۔۔ کھڑکی کے آگے ایک چادر لٹکائی گئی تھی۔۔۔۔ ہم سب کا سامان قرینے سے رکھا ہوا تھا اور۔۔۔۔ ایک موم بتی روشن تھی۔۔۔۔

احسان ہانپتا ہوا کمرے میں آ گیا" صاحب آپ کو کھانا چاہئے؟۔۔۔۔"

"کھانے میں کیا ہو گا؟" ہم نے پوچھا۔

"کھانے میں کھانا ہو گا صاحب۔۔۔۔ ہم گوروں کے لے کھانا بنائے گا تو آپ کو بھی کھلا دے گا۔۔۔۔ ٹھیک ہے؟"

احسان کچھ زیادہ ہی پر مسرت نظر آ رہا تھا بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ وہ پر مسرت طور پر بوکھلایا ہوا نظر آ رہا تھا' فرانس کے جنوبی حصوں کے انگوروں کا اثر ترشنگ کو بھی مخمور کر رہا تھا۔

راہی اپنے طور پر ڈنر تیار کرنے کی کوشش میں تھا۔۔۔۔ جاپانی اپنی ڈائری لکھ رہا تھا۔۔۔۔ وہ ایک روبوٹ کی طرح منظم اور بے جان تھا۔۔۔۔ نانگا پربت کی قربت محسوس ہو رہی تھی۔۔۔۔ ہم مکمل گرم لباسوں میں تھے اور اپنے سلیپنگ بیگوں میں تھے اور اس کے باوجود ایک سرد بے چینی تھی۔۔۔۔

"یہ بیگ صاحب والا بچہ سٹوو کیسے جلتا ہے؟۔۔۔ میں تھوڑی سی دال بنا لوں"

"سپرٹ کی بوتل میں سے تھوڑی سی سپرٹ سٹوو کے اندر ڈالو اور تھوڑی سی باہر اور پھر آگ لگا دو"

راہی نے ایسا ہی کیا اور آگ لگا دی۔۔۔۔ اور آگ پورے سٹوو کو لگی اور اس کے شعلے چھت کو چھونے لگے' ایک چھوٹی سی بھگدڑ اور سراسیمگی پھیلی جس میں جاپانی "آہ آہ" کا شور مچا رہا تھا۔ میں "راہی' راہی" کر رہا تھا اور سمیر "ابو ابو" کے نعرے لگا رہا تھا۔

خوش قسمتی سے آگ پر جلد ہی قابو پا لیا گیا ورنہ ترشنگ میں تو کہتے ہیں کہ فائر بریگیڈ کی سہولت بھی نہیں ہے۔۔۔۔ البتہ اس کا روشن پہلو یہ تھا کہ راہی کی دال گل گئی۔

ہمارے فرانسیسی ہمسایوں کے قہقہے مزید شوخ اور قدرے بے ربط ہوئے تو میں نے اٹھ کر ان کے کمرے میں جھانکا چونکہ اس کاٹیج کے ابھی دروازے بھی نہیں لگے

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

تھے اس لئے جھانکنے کے لئے اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو جانا ہی کافی تھا۔ احسان ایک انتہائی قلندرانہ مسکراہٹ کے ساتھ ان کے قریب یوں کھڑا تھا کہ اس کی گردن اس کے دھڑ سے ایک فٹ آگے کو نکلی ہوئی تھی اور ظاہر ہے گردن کے اوپر اس کا سر بھی تھا اور سر کے ساتھ جو چہرہ تھا اس پر اس کی قلندرانہ مسکراہٹ سجی تھی..... میں نے ان فرانسیسیوں کے ساتھ ذرا سوشل ہونے کی کوشش کی لیکن انہوں نے انتہائی سرد مہری کا مظاہرہ کیا..... ترشنگ میں یوں بھی سرد مہری کچھ زیادہ ہی سرد ہوتی ہے۔ وہ اسلام آباد میں فرانسیسی سفارت خانے میں کام کرتے تھے اور پالیسی کے طور پر سوشل ہونے والے پاکستانیوں سے سرد مہری برتتے تھے.....

"کھانا صاحب....." احسان نے ان سے چمکتی آنکھوں سے پوچھا۔

"کھانا کھانا" سب نے مل کر جواب دیا۔

اور ہمیں بعد میں جو کھانا ملا وہ پانی میں بھگویا ہوا تازہ تازہ ساگ تھا اور کچے پکے چاول تھے کیونکہ ایک عدد مرغی جو شاید ترشنگ کی آخری مرغی تھی فرانسیسی انگوروں کے کام آ چکی تھی۔ جاپانی بھیگے ہوئے ساگ کو اپنے ذاتی کانٹے میں پرو کر اسے غور سے دیکھ رہا تھا کہ یہ کیا ہے پھر اس نے میری جانب دیکھا.....

"نو پرابلم" میں نے کہا۔

اس نے ساگ منہ میں ڈال لیا..... خاصی دیر چبانے کے بعد اسے نگلا اور پھر پیٹ پر ہاتھ رکھ کر پوچھا "نو پرابلم؟"

اس نازک موڑ پر راہی کی دال بہت کام آئی.....

گیلی ترپال کی ٹھنڈک سلیپنگ بیگ کے اندر تک آتی تھی اور پہلو بدلنے سے فرش پر بچھے پتھر ہڈیوں میں چبھتے تھے.....

فرانسیسیوں کے قہقہے اب کبھی کبھار بلند ہوتے تھے..... تاہم چینی کے الٹے مگ پر موم بتی کی موم پھیل رہی تھی اور اس کی بتی بجھنے سے پیشتر پھڑپھڑا رہی تھی.....

ترشنگ کی رات میں پانی کے چلنے کی آواز تھی اور اس کے ٹپکنے کی آواز تھی..... چونکہ میں جین کی جیکٹ اور موٹے اور اونی سویٹر اور ٹوپی کے ساتھ محو خواب ہونے کی کوشش کر رہا تھا اس لئے محویت زیادہ تھی اور خواب نہ ہونے کے برابر..... پہلو بدلتے ہوئے محسوس ہوتا کہ اپنے بھاری سامان سمیت پہلو بدل رہا ہوں..... اور سانس مشکل سے آتا تھا..... سر درد شدید..... اور ایک برفیلی بے چینی جس کی وجہ سے نیند نہیں آتی تھی۔ سمیر بھی کروٹیں بدل رہا تھا..... یہ ایک طویل رات تھی، یخ بستہ اور سرد سکوت کے ساتھ۔

اور جب صبح ہوئی تو اس کی آمد کا یوں پتہ چلا کہ چھت سے مزید پانی ٹپکنے لگا..... رات جو کچھ منجمد ہوا تھا وہ اب پانی میں بدل رہا تھا..... مجھے احساس ہوا کہ سمیر اٹھ کر باہر گیا ہے..... راہی جاپانی سے گفتگو کر رہا ہے اور اس کے جواب میں شی ی زو کی "آہ..... نو پرابلم" بھی میں سن رہا تھا..... لیکن میں ابھی اٹھنا نہیں چاہتا تھا اس لئے سر سلیپنگ بیگ میں گھسائے اونگھتا رہا۔ پھر یکدم سمیر کی آواز آئی۔ "راہی انکل، ابو جاگ رہے ہیں؟"

اور راہی کہہ رہا تھا "تارڑ صاحب کو ابھی سونے دو سمیر..... وہ رات ٹھیک طرح سے سوئے نہیں"

"نہیں اب وہ نہیں سو سکتے..... اوئے ابو"

"کیا اوئے ابو---" میں نے سلیپنگ بیگ چہرے سے اتار پھینکا "بد تمیز بچہ---"

"ابو ---" وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا میرے پاس آگیا اور اپنے بڑے بڑے ہاتھ پھیلا کر کہنے لگا "ابو باہر زبردست منظر ہے۔ کل تو کچھ بھی نہیں تھا....."

اور واقعی کل کچھ بھی نہیں تھا..... آسمان صاف تھا اور دھویا ہوا تھا، اس کی نیلاہٹ جیسے نانگا پربت کے سلسلہ کوہ کے ساتھ چھوتی ہوئی اس میں بھی نیل گھولتی تھی۔ ہم ابھی سائے میں تھے لیکن تمام بلندیاں دھوپ میں تھیں۔ کاٹیج کے ساتھ بلند ٹیلے پر لکڑی کا سیاہ ڈھانچہ برف کی سفیدی میں اتنا واضح تھا کہ اس کے شہتیر اور چھپر گنے جا سکتے تھے..... اور ہوا ایسی صاف اور تیز کاٹ والی تھی کہ گہرا سانس لینے پر وہ بدن میں جل ترنگ بجاتی چلی جاتی تھی.....

اگر میں ترشنگ نہ دیکھتا تو کیا ہوتا۔ شائد کچھ نہ ہوتا لیکن میں وہ نہ ہوتا جو اب ہوں..... کیونکہ ترشنگ کی اس صبح کو نانگا پربت کی دنیا میں اس سرد نیلاہٹ کے آسمان تلے جب میں نے گہرے سانس لئے تھے تو وہ ہوا جو میرے بدن میں گئی تھی وہ ہوا مردہ نہ تھی، زندہ تھی تو اس زندہ ہوا نے مجھے کچھ تو بدلا ہو گا..... اور میں نے یہ محسوس کیا ہے اور میں یہ جانتا ہوں کہ خانہ بدوش اسی لئے دوسروں سے الگ ہوتا ہے کہ اسے رب نے اپنے جلال اور جمال کے منظر دکھا کر دوسروں سے الگ کیا ہوتا ہے..... اور یہ رب کی مرضی ہوتی ہے کہ وہ کسے اپنا جلال اور جمال دکھائے.....

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

میں اور میر جیکٹوں میں ہاتھ ڈالے' سر پر اونی ٹوپیاں کھینچے اس ٹیلے پر چڑھنے لگے جس پر وہ سیاہ اور چوکور ڈھانچہ تھا..... صبح کی ہوا باریک تھی اور ہم آہستہ آہستہ چڑھ رہے تھے تاکہ سانس ختم نہ ہو۔ اوپر ایک بہت بڑے پتھر کے ساتھ درختوں کے تنے اس ترتیب سے ایک دوسرے کے اوپر رکھے گئے تھے کہ ایک بڑا چوکور کمرہ سا بن گیا تھا۔ شہتیروں کے درمیان جو جگہ تھی وہاں پتھر جما دیئے گئے تھے..... اس کے اندر کچھ نہ تھا..... البتہ آس پاس اور اس ٹیلے پر کہیں کہیں لکڑی کے تختے اور چھوٹے چھوٹے گڑھے تھے' یہ ترشنگ کا قبرستان تھا..... بعد میں ہمارے پورٹر سلطان نے ہمیں بتایا تھا کہ لکڑی کا یہ ڈھانچہ دراصل ترشنگ کا حفاظتی مینار ہے' جن زمانوں میں کوہستانی لوگ حملہ آور ہوتے تھے تو ترشنگ کے باسی اس مینار میں جا کر ان پر پتھر برساتے تھے اور گولیاں چلاتے تھے..... اسی لئے یہ علاقے کے بلند ترین ٹیلے پر واقع تھا..... نیچے ترشنگ کے کھیت ابھی نیم تاریک تھے اور ہم تیز دھوپ میں تھے لیکن اس کے باوجود ٹھٹھر رہے تھے۔ ترشنگ سے نانگا پربت کے سلسلہ کوہ میں رائے کوٹ پیک اور چانگرہ پیک زیادہ نمایاں ہیں..... جب میں یہ کہتا ہوں کہ ترشنگ کے پس منظر میں نانگا پربت کی برفیں تھیں تو دراصل میرا اشارہ اس پورے سلسلے کی طرف ہوتا ہے' پوری زنجیر کی طرف ہوتا ہے جسے نانگا پربت چین کہا جاتا ہے..... اور یہ چوٹیوں کا تسلسل ہے۔ ترشنگ میں اترتے گلیشیر کا نام ریشنگ ہے..... اس آبادی کو اگرچہ برفوں نے اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے لیکن بائیں جانب کھیتوں سے پرے گہرائی میں دریائے روپل ہے اور اس کے پار ایک انتہائی سرسبز میدان ہے جس میں ایک قصبہ ہے۔ ترشنگ کے سامنے ریشنگ گلیشیر کا بلند کنارہ ہے جسے عبور کر کے بیس کیمپ کی جانب سفر کیا جاتا ہے۔

ہم واپس آئے تو ندی کے آس پاس اور کاٹج کے سامنے ایک ہنگامہ بپا تھا..... یہاں فرانسیسی سیاحوں کے ساتھ مقامی پورٹر مازینو پاس تک لے جانے اور واپسی تک کا کرایہ طے کر رہے تھے..... دلچسپ بات یہ ہے کہ زیادہ جھگڑنے والے اور ذرا تیز طرار حضرات خود پورٹر نہیں ہوتے بلکہ کسی بھائی بھتیجے کو مزدوری دلانے کے لئے میدان میں کود پڑتے ہیں۔ جب معاملہ طے ہو جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ صاحب ابھی ٹھہرو اور وہ ہرنوں کی طرح قلانچیں بھرتے ہوئے کسی کوہستانی قصبے کو جاتے ہیں اور اپنے بھائی بھتیجے کو ساتھ لے آتے ہیں ..... ہم جب پورٹر مارکیٹ کے قریب پہنچے تو کچھ حضرات نے ہم پر ہلا بول دیا... میں نے انہیں سمجھایا کہ ہم مولوی یونس سے کہہ چکے ہیں کہ ان کے پورٹر لیں گے۔ اس پر سخت احتجاج ہوا کہ حق تو ترشنگ والوں کا ہے اور یہ چورت والے چونکہ راستے میں ہیں اس لئے جو بھی جیپ ادھر آتی ہے وہ اس کے ساتھ پہلے سے ہی معاملہ طے کر لیتے ہیں۔ یہ زیادتی ہے.....

"ٹھیک ہے ہم ایک پورٹر چورت کا لیں گے اور دو ترشنگ کے"

اس فیصلے کے بعد جب میں نے جاپانی کو آگاہ کیا کہ بھائی نوے روپے روزانہ پر آپ کے لئے بھی ایک پورٹر حاصل کر لیا گیا ہے تو اس نے مسکرا کر کہا "نو پرابلم"

اب کیا دیکھتا ہوں کہ احسان جاپانی کا رک سیک اٹھا کر اس کے سٹریپ اپنی کمر کے گرد باندھ رہا ہے اور روانہ ہونے کو ہے۔

"اوئے یہ کیا کر رہے ہو۔ ہم تینوں اکٹھے ہیں اور ہم نے تین پورٹر حاصل کر لئے ہیں"

اس پر احسان نے شور مچا دیا کہ جی میں نے تو جاپانی کے ساتھ بات کر لی ہے........ آپ بے شک پوچھ لیں۔ میں نے جاپانی کی طرف رجوع کیا "شی می ذو' کیا تم نے اس--- پورٹر کو کہا ہے کہ تمہارا سامان اٹھا لے؟"

"آہ..." اس نے سر جھٹکا۔

"دیکھا ناں میں ٹھیک کہتا تھا" احسان چیخا۔

"جاپانی .... میں نے تمہارے لئے پورٹر لے لیا ہے۔ ہم اکٹھے سفر کریں گے" میں نے پھر پوچھا۔

"نو پرابلم...." اس نے مسکرا کر کہا۔

دراصل جاپانی کو کچھ پتہ نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ اس کے لئے ہر چیز "نو--- نو پرابلم" تھی اور احسان نے اس کی سادگی کا فائدہ اٹھایا تھا اور چکر چلا دیا تھا۔۔۔

"تمہیں پتہ ہے کہ ہم ایک ٹیم ہیں اور اکٹھے ٹریکنگ کر رہے ہیں---" میں نے احسان کو اس طرح گھورا کہ اس کا رنگ زرد ہو گیا "دھوکہ کرتے ہو لوگوں کے ساتھ.... جاپانی کا سامان فوراً رکھ دو...."

اب احسان نے اہل ترشنگ سے فریاد شروع کر دی کہ دیکھو یہ صاحب میری روزی کے پیچھے پڑا ہوا ہے حالانکہ جاپانی بالکل راضی بازی ہے..... اہل ترشنگ بھی ظاہر ہے اسے اچھی طرح جانتے تھے چنانچہ وہ مسکراتے تھے اور میری طرف دیکھتے تھے..... وہ اسے پوچھتے کہ جاپانی تم ان پاکستانیوں کے ساتھ جاؤ گے؟" تو وہ کہتا" آہ...." اور اگر وہ کہتے کہ "احسان تمہارا سامان اٹھا کر مازینو پاس لے جائے؟" تو بھی وہ خوش

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

ہو کر کہتا تھا" آہ" اس پر سمیر مجھے ایک جانب لے گیا اور کہنے لگا" ابو ہم تو بیس کیمپ یا لاتوبو تک جائیں گے اور اس جاپانی نے یوں بھی ماتھیو پاس جانا ہے تو اسے جانے دیں.... احسان نے چکر تو چلایا ہے لیکن جانے دیں"

چنانچہ ہم نے اپنے عزیز ساتھی" آو نوپرابلم " کو بہ چشم نم رخصت کرنے کا فیصلہ کر لیا.... اب اس کا اور ہمارا سامنا نہیں ہونا تھا۔ ہم نے نانگا پربت سے واپسی پر چلم چوکی کے راستے دیوسائی چلے جانا تھا اور اس نے گلگت واپس جانا تھا جس کے لئے اس کی جیپ کی بکنگ ہو چکی تھی....

"پھر ملیں گے...." سمیر نے اسے پکارا۔

وہ ندی کے کنارے اکڑ کر کھڑا ہوا اور پورے دانت نکال کر بولا "نو پرابلم" اور پھر احسان کے پیچھے چلنے لگا جو بے حد خوش خوش پھدکتا ہوا چلا جا رہا تھا.... فرانسیسی بھی اپنے پورٹرز کے ہمراہ روانہ ہو گئے .... اب ہماری ٹیم باقی رہ گئی.... اور ندی کے کنارے دو باریش حضرات جو اپنی داڑھیوں کو کھجلاتے ہوئے بے حد لطف اندوز ہو رہے تھے باقی رہ گئے کیونکہ یہ ہمارے پورٹر تھے.... اگرچہ پورٹر تھے لیکن سلطان تھے.. ایک سلطان ولی قریبی قصبے تاکے کا باشندہ.... ذرا مسکین شکل کا اور کچھ درویش صورت کا اور دوسرا سلطان محمود کسرتی جسم کا ہوشیار شخص .... ان دونوں کے ذاتی گدھے پھولوں بھری گھاس پر پکڑ پکڑ منہ چلا رہے تھے.... ہمارا سامان "کاٹیج" کے باہر ندی کے کنارے پڑا تھا.... ہجوم ختم ہو چکا تھا اور اب ہم تھے ہمارے پورٹر تھے' ہمارے گدھے تھے اور سامان تھا.... اور سامان میں ایک اہم آئیٹم انڈوں کی پوٹلی تھی.... گلگت کے بازار میں دیگر سامان خریدتے ہوئے جب ہم نے چھ عدد انڈے خریدے تو بیگ صاحب کہنے لگے "ہاں آں تارڑ صاحب.... یہ آپ کے انڈے استور تک بھی نہیں پہنچیں گے.." اور جب استور روڈ پر دھکوں اور دھچکوں کا سلسلہ شروع ہوا تو ہمیں یقین ہو گیا کہ ہمارے چھ انڈے سلامت نہیں رہیں گے.. ان کی پوٹلی جیپ کی اگلی نشست کے نیچے رکھی گئی تھی اور ہماری نظروں کے سامنے کئی مرتبہ اچھلی تھی.... ترشنگ پہنچتے ہی ہم نے انڈے چیک کئے تو صرف ایک راستے کی صعوبتوں میں کام آیا تھا اور باقی پانچ زندہ سلامت تھے....

"ہاں جی سلطان صاحبان — سفر کی تیاری کریں؟"

"ہاں ناں —" سلطان ولی بولا اور "ہو ہو" کرتا اپنے گدھے کو گھیرنے لگا..

تھوڑی دیر میں دونوں گدھے پیک ہو گئے۔

"اس کا سب سے زیادہ خیال رکھنا ہے" میں نے انڈوں کی پوٹلی سلطان کو تھمائی۔ اس نے اسے ڈرتے ڈرتے پکڑا جیسے اس کے اندر کوئی زہریلا سانپ ہو....

"اس میں کیا ہے صاحب..؟"

"انڈے ... پانچ انڈے...."

"ٹوٹ جائیں گے صاحب...." وہ مسکرانے لگا" ادھر نہیں پہنچیں گے.."

اب ہماری ساری منصوبہ بندی کچھ یوں تھی کہ ہم نے نانگا پربت کے بیس کیمپ تک جانا تھا اور یہ تقریباً ڈیڑھ دن کا سفر تھا.... رات وادی روپل عبور کر کے ایک گلیشیر کے قریب بسر کرنی تھی.... یوں تو نانگا پربت کے روپل سائڈ میں مختلف بیس کیمپ ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ پسندیدہ بے یک ہے.... ہمارا ارادہ تھا کہ ہم بے یک میں ایک رات گزار کر لاتوبو کے میدان میں جائیں جو نانگا پربت کے دامن میں پھیلا ہوا ہے..

یہ علاقے مسلسل بارش کی زد میں رہتے تھے لیکن آج موسم بالکل صاف تھا.... نانگا پربت کے وسیع سلسلے میں جب بادل آ جاتے ہیں تو پھر وہ کہیں نہیں جاتے' وہ اس پہاڑ کو پرے تو نہیں کر سکتے اس لئے اس کی بلندیوں کے ساتھ لگ کر برستے رہتے ہیں.... اور آخری بوند تک برستے ہیں۔ اور اس دوران سیاح اور کوہ پیما اپنے خیموں میں دبکے رہتے ہیں.... تو ہمارے سفر کا آغاز روشن تھا۔

"چلیں صاحب؟" سلطان نے پوچھا اور پھر میرے سر ہلانے پر گدھوں کو "ہو ہو" کرنے لگا.... دونوں گدھے تربیت یافتہ تھے اس لئے فوراً گھاس سے منہ اٹھایا اور کان کھڑے کر کے چلنے لگے....

سفر کا یہ لمحہ بھی اپنے اندر ایک عجیب ہیجان خیز شدت رکھتا ہے.... یعنی ایک ان دیکھے اور ان جانے جہان کی جانب پہلا قدم .... ترشنگ تک تو جیپ آتی تھی اس لئے یہ راستے مسافروں کے عادی تھے لیکن اس سے پرے راستے نہ تھے' پگڈنڈیاں تھیں یا بس یہ خیال تھے کہ یہ راستے ہیں اور ان پر صرف وہ چلنے کو آتے تھے جو دوسروں کے نزدیک عقل خام رکھتے تھے۔ ترشنگ تک ایک رابطہ چلا آتا تھا.... لیکن اس سے آگے کچھ نہ تھا' ایک خلاء تھا جس میں ہم نے قدم رکھا اور اس پہلے قدم کے ساتھ جہاں ان دیکھے منظر دیکھنے تھے وہاں ان جانے خطرات کو بھی تو جاننا تھا....

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"روپل گلیشیئر کے ہاتھی اور شوکور پر ایک زرد خیمہ اور سرد رات"

ہم ترشنگ کے کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے بیشنگ گلیشیئر کے اس کنارے کے دامن میں پہنچ گئے جو دور سے ایک عمودی دیوار کی طرح نظر آتا ہے۔۔۔ اس پر ایک راستہ الحتا تھا۔۔۔ مجھے ابھی اپنی جسمانی صحت کی بہتری کے بارے میں کچھ علم نہ تھا۔ ایک شہری جسم بے حد نرم اور آرام طلب ہوتا ہے اور اس کے اندر کوہ پیمائی کی مشقت کرنے کے لئے نہ قوت ہوتی ہے اور نہ خواہش۔۔۔ مجھے میں خواہش تو بہت تھی۔۔۔۔۔ سلطان محمود گدھوں کا انچارج تھا چنانچہ وہ ہم سے خاصا آگے جا چکا تھا۔۔۔۔ سلطان ولی اور سمیر اکٹھے چل رہے تھے۔ میں اور راہی چھڑیاں ٹیکتے اور باتیں کرتے ترشنگ کی جانب مڑ کر دیکھتے تھے۔ کیونکہ ہم ترشنگ سے اونچے ہو رہے تھے اور وہ مکمل تفصیل سے اور اپنے پورے پھیلاؤ سے ہمیں نظر آ رہا تھا۔۔۔ ادھر سمیر اور سلطان کے آگے ایک نیلے آسمان میں نانگا پربت کی چوٹیاں جیسے لمحہ بہ لمحہ نزدیک آ رہی تھیں۔ میں نے متعدد بار کسی پتھر سے ٹیک لگا کر اپنا بے ربط ہوتا سانس درست کیا۔۔۔ میں اگرچہ راہی کے بارے میں فکر مند تھا لیکن وہ بڑے تحمل سے اور متانت سے چلتا جا رہا تھا۔۔۔ پہاڑوں میں لاپرواہ اور شوخ ہو کر چلنے والے بہت زیادہ دیر تک اور دور تک نہیں چلتے ۔۔۔ سمیر اور سلطان اوپر پہنچ کر ہمارا انتظار کر رہے تھے۔۔۔۔ سلطان انڈوں کی پوٹلی کو ایک بیٹرے کی طرح نرمی سے پکڑے ہوئے ایک بڑے پتھر پر بیٹھا تھا۔۔۔ اور سمیر اپنی چھڑی کی نوک سے چھوٹے چھوٹے پتھروں کو اس طرح دھکیل رہا تھا کہ وہ اس بلندی سے لڑھک کر نیچے گلیشیئر کی گزر گاہ تک گرتے جاتے تھے۔۔۔۔

اب ہمیں نیچے اترنا تھا' گلیشیئر کے راستے کو پار کر کے دوسری جانب' پھر کنارے کے اوپر جانا تھا اور پار جانا تھا۔۔۔

یہ گلیشیئر نانگا پربت کے سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ اس کی برفوں سے ملا ہوا تھا۔ لیکن ان دنوں یہاں بہت زیادہ برف نہیں تھی بلکہ سلیٹی رنگ کے پتھریلے ڈھیروں' بھر بھرے پتھروں اور سنگریزوں کا ایک تھما ہوا دریا تھا جس کے نیچے برف تھی۔۔۔ یہ برف کہیں کہیں سیاہ پتھروں کی طرح جھانکتی تھی۔۔۔ اور اس تھمے ہوئے دریا میں بعض پتھر کئی منزلہ عمارتوں جتنے بلند اور وسیع تھے۔۔۔ اور یہ گذرگاہ اپنے آس پاس کے منظر سے بالکل الگ نظر آتی تھی کیونکہ برف کی سفیدی اور ترشنگ کی ہریاول کے مقابلے میں یہ بالکل یک رنگ تھی۔۔۔ سلیٹی اور نیم سیاہ۔۔۔

"ابو آپ کو فیری میڈو کے راستے کی وہ تصویر یاد ہے جس میں ایک بہت بلند اور خشک پہاڑ میں کہیں آپ کے سامان سے لدا ہوا ایک گدھا ہے۔۔۔ اور وہ کبھی نظر آ جاتا ہے اور کبھی پتھروں میں نظر نہیں آتا۔ اور آپ اس کو "آیئے گدھا تلاش کریں" تصویر کہتے ہیں۔۔۔" سمیر نے اپنا لمبا بازو اٹھایا اور نیچے گلیشیئر کی گذرگاہ کی طرف اشارہ کیا" اب ذرا یہاں اپنے دو گدھے تلاش کریں"

گذرگاہ کئی سو میٹر چوڑی تھی اور میں نے بہت غور کیا لیکن وہاں پتھروں' برف کے سیاہ نوکیلے تودوں اور بھربھری سی کنکروں والی مٹی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔۔۔ یہ سلیٹی رنگ کی دنیا خاموش اور بے تصویر تھی۔

"میرا خیال ہے گدھے دوسرے کنارے پر چڑھ کر دوسری جانب اتر چکے ہیں۔۔۔"

"ہوں۔۔۔" سمیر نے سر ہلایا "وہ تھی آپ کی فیری میڈو "آیئے گدھا تلاش کریں" تصویر اور یہ ہے میری "وادی روپل آیئے گدھا تلاش کریں" تصویر۔۔۔ ذرا غور سے دیکھئے ابو ۔۔۔ اس بڑے پتھر کی سیدھ میں' آپ کا رک سیک سرخ رنگ کا ہے۔۔۔ آپ کو ایک سرخ دھبہ نظر نہیں آتا۔۔۔"

"نہیں آتا۔۔۔" میں نے بہت کوشش کی۔ میرا خیال تھا کہ سمیر ذرا باندر پن کے موڈ میں ہے۔۔۔

"ہے صاحب ۔۔۔ ہے ناں" سلطان نے بھی دانت نکال دیئے اور اس کے اگلے دو دانت کسی بیماری کی وجہ سے آدھے رہ گئے تھے۔۔۔

اور گدھا وہاں تھا۔۔۔ گدھا تو دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن ایک سرخ دھبہ ضرور نظر

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

آگیا... تو ہم خاصی بلندی پر تھے اور ہمیں نیچے جانا تھا...

اور ہاں... گلیشیر سے دوسری جانب ایک خشک پہاڑ تھا جس کے دامن میں ایک سرسبز علاقہ اور درخت تھے اور پس منظر میں ایک برفپوش چوٹی نظر آرہی تھی...

"وہ روپل ہے..." سلطان نے انڈوں والی پوٹلی سے ادھر اشارہ کیا...

"اگر وہ روپل ہے تو یہیں سے واپس چلیں..." میرے ذہن میں روپل کی وادی کچھ اور تھی اور یہ تو کچھ بھی نہ تھی...

"اور صاحب یہ ادھر پہلے چھوٹا روپل ہے اور ادھر ذرا بلندی پر بڑا روپل ہے... ہم ادھر جائیں گے پھر دریا پار کر کے اس پہاڑ پر چڑھ جائیں گے اور ادھر جو گلیشیر کا منہ نظر آتا ہے اس کے پاس آج رات کیمپ کریں گے..."

ہم نیچے اترنے لگے... یہ ایک چھوٹا سا بل کھاتا راستہ تھا جس پر چلنا مشکل تھا اور لڑھک جانا بہت آسان... اور مجھے سمیر کا فکر تھا... سمیر بچپن میں زمین پر مضبوطی سے پاؤں نہیں رکھتا تھا بلکہ قدرے لاپروائی سے چلتا تھا اور اکثر ادھر ادھر لڑھک جاتا تھا اور اس مناسبت سے اسے لڑھکو خاں بھی کہا جاتا تھا۔ اب ہم ایسے خطوں میں تھے جہاں یہ عادت زیادہ مفید نہیں تھی اور میں اس کے بارے میں فکر مند تھا۔

"تم میرے آگے چلو سمیر"

اس نے ہر قدم پھونک پھونک کر رکھا اور پھر کسی پختہ قدم پہاڑی خچر کی طرح نیچے اترنے لگا' البتہ میرے پاؤں ذرا بے قابو ہوتے تھے اور گھٹنے آپس میں بجتے تھے... نیچے جاتے ہوئے ہم نے دیکھا کہ گلیشیر کی گذرگاہ کے پار دوسرے کنارے پر ہمارے گدھے حرکت کر رہے تھے... نیچے اترتے ہوئے ہمارے کانوں میں گلیشیر کی توڑ پھوڑ کی آوازیں قریب ہوئیں۔ ان کے ساتھ پانی کے رسنے اور ٹپکنے کی آواز تھی اور ایک ٹھنڈک تھی' ہمارے نیچے ہزاروں برسوں سے منجمد برفیں تھیں۔ ہر برس نانگا پربت سے برف کھسک کر اس گزرگاہ پر آتی تھی اور اپنے ساتھ لائے ہوئے پتھروں اور چٹانوں سے الگ ہو کر پگھل کر نیچے دریائے روپل میں جا ملتی تھی... ہم اس گذرگاہ میں داخل ہوئے تو جیسے کسی خفیہ عبادت گاہ میں داخل ہوئے... یہاں کوئی نہ تھا صرف پانی کی مدھم آواز تھی ٹپکنے اور پگھلنے کی۔ کہیں کہیں گلیشیر کی بوتھی نظر آجاتی اور اس کے نیچے چھوٹے چھوٹے تالابوں میں پانی ٹپکتا دکھائی دیتا۔

ہم ایک بڑے پتھر پر چڑھ کر چھڑیاں ٹیکتے دوسری جانب اترے تو پتھروں کے سلیٹی ملبے کے قریب ایک چھوٹا سا شفاف تالاب تھا۔ پتھروں کے نیچے سے ایک نالی برآمد ہوتی تھی اور تالاب میں گرتی تھی... پانی ایسا شفاف تھا کہ اس میں پڑے ہوئے پتھر اور سنگریزے کسی شیشے میں منجمد لگتے تھے۔

"ابو میں ذرا اس جھیل کو قریب سے دیکھ لوں؟"

"یہاں سے دکھائی نہیں دے رہی؟"

"میں اس کے پانی میں اپنی چھڑی ڈبونا چاہتا ہوں — اور ہاتھ بھی لگانا چاہتا ہوں"

میرے سرہلانے پر وہ پتھروں کو پھلانگتا اس تالاب تک چلا گیا۔ وہ نیچے جھکا "ابو ادھر جہاں سے پانی آرہا ہے وہاں اندر بالکل اندھیرا ہے اور برف ہے اور ادھر بیٹھیں تو کیا ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا آتی ہے..."

"بچے' واپس آجاؤ"

بچہ واپس آگیا۔

پوشیدہ برف کے اس انبار پر چلنے کے باوجود اوپر جو دھوپ تھی وہ بدن جلاتی تھی اور پسینہ چہرے پر آتا تھا اور پھر سرد ہوا چل کر سرد گرم کرتی تھی... گزرگاہ کا اختتام ہوا' آگے دوسرا کنارہ تھا۔ دوسری دیوار تھی اور یہ کچی بھربھری اور سیدھی اوپر کو جاتی تھی... ایسے مقامات پر اگر آپ میں جھجک پیدا ہو تو مقامی لوگ کہتے ہیں "صاحب ڈرتے کیوں ہو ادھر سے تو بچہ اور بکری بھی گزرتا ہے..." اور یہ مقامی لوگ آپ کو یہ کبھی نہیں بتاتے کہ ادھر سے گذرتے ہوئے کتنا بچہ اور بکری نیچے گیا... شمالی علاقوں میں میں نے کئی جگہ مارخور کے ڈھانچے دیکھے ہیں اور یہ وہ مارخور ہوتے ہیں جو کسی چٹان سے پھسل کر وادی میں آگرتے ہیں... اور مارخور کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کا کسی چٹان سے گرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا... سلطان بھی کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کی جانب دیکھا تو وہ کہنے لگا "صاحب خطرناک تو ہے پر گذر جاؤ... راستہ ٹھیک ہے"

"میں پہلے جاتا ہوں" میں چھڑی ٹیکتا اس بھربھری مٹی اور سنگریزوں پر جما جما کر قدم رکھتا اوپر چڑھنے لگا... یہاں آپ جو چاہیں کر لیں آپ کا پاؤں سنگریزوں پر سے اس طرح پھسلتا تھا جیسے آپ نے رولر سکیٹس پہنے ہوئے ہیں۔ اور سنگریزے سیدھے گلیشیر کی گذرگاہ پر گرتے تھے... یہاں جان کا خطرہ تو کم تھا لیکن نیچے جانے کی

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

صورت میں آپ کے ایک چارپائی پر لٹا کر واپس گلگت لے جانے کا امکان بے حد قوی تھا۔۔۔ پسینہ جو ماتھے پر تیرتا آنکھوں میں گرتا تھا اسے پونچھنے کی کوشش میں بیلنس خراب ہو سکتا تھا اس لئے پسینہ آنکھوں میں گر کر آپ کے سامنے راستے کو دھندلاتا تھا۔۔۔ کنارے کے اوپر پہنچ کر میں نے پسینہ پونچھا اور نیچے کھڑے سمیر سے کہا کہ بس بیٹے بے حد احتیاط سے آجاؤ۔۔۔ وہ جھکا ہوا اس دیوار پر چڑھنے لگا اور اس کے ساتھ میرا سانس بھی بند ہو گیا کہ وہ بہت پھسلتا تھا۔۔۔ ایک جگہ اس نے قدم رکھا تو اس سے سنبھلا نہ گیا اور وہ گرتے گرتے بچا۔۔۔

"وہیں تھمو" میں چیخا۔۔۔ "سلطان اس کے آگے آکر اس کا ہاتھ پکڑو"

سلطان فوراً آگے آیا اور وہ بھی پھسلتا ہوا آیا اور اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ اس دوران سمیر بالکل بے حس و حرکت اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔۔۔ وہ خاصا خوفزدہ تھا لیکن مجھ سے زیادہ نہیں تھا۔۔۔ سلطان کا ہاتھ تھام کر وہ ہولے ہولے سانس روکے چڑھنے لگا۔۔۔ بھربھری مٹی مسلسل اس کے قدموں میں سے نکل رہی تھی۔۔۔ ایسی مٹی اور سنگریزوں پر چڑھنے کا اصول یہ ہے کہ آپ تیزی سے اوپر جاتے ہیں اور جتنی دیر میں آپ کا پاؤں پھسلنے لگتا ہے اتنی دیر میں آپ اسے اٹھا لیتے ہیں۔۔۔ لیکن اس طرح کی تیزی دکھانے کے لئے ہمت اور مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔۔۔ جب وہ دونوں قریب ہوئے تو میں نے اپنا ہاتھ آگے کیا لیکن سمیر کی نظریں بدستور نیچے راستے پر تھیں اور اس نے سر ہلا کر کہا کہ نہیں مجھے سہارے کی ضرورت نہیں۔۔۔

اوپر پہنچ کر اس نے اپنا ہیٹ اتارا جس پر اس نے "مسٹر سٹار سمیر" کے الفاظ لکھے ہوئے تھے اور بالوں میں ہاتھ پھیر کر ذرا غصے سے کہنے لگا "ابو میں اچھا بھلا آ رہا تھا لیکن آپ نے یہ کہا کہ بیٹا احتیاط سے ۔۔۔ تو میں گھبرا گیا آئندہ آپ نے مجھے یہ بالکل نہیں کہنا کہ بیٹے احتیاط سے"

"جب تک میں تمہارا باپ ہوں تب تک تو میں یہ کہتا رہوں گا کہ بیٹا احتیاط سے۔۔۔" میں نے اسے جپھی ڈال کر سینے سے لگایا اور تھپکا۔۔۔ لیکن اندر ہی اندر میں نے اس کے تجسس کو درست جانا کہ میں نے جب کہ وہ بے خطر آ رہا تھا اسے احتیاط کا مشورہ دے کر خوف سے تعارف کروا دیا تھا اور جھجک کو شامل کر دیا تھا۔۔۔

گلیشیر کے اس کنارے کے دوسری جانب ایک باقاعدہ ڈھلوان راستہ تھا جس کے دونوں جانب درخت تھے اور جنگلی گلاب کی جھاڑیاں تھیں۔۔۔

"تھوڑی دیر کے لئے رک جائیں۔۔۔"

"ہاں ہاں۔۔۔" سلطان نے سر ہلایا "پر ادھر درختوں کے پاس چشمہ ہے ادھر رکیں گے۔۔۔"

ہم نیچے آئے اور ہمارے آگے وادی روپل کے درمیان میں ایک راستہ تھا اور راستے کے دونوں جانب کھیت تھے۔ یہاں ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں وہ چشمہ تھا جہاں پہنچ کر تمام مسافر اور ٹریکر دم لیتے ہیں اور اس کے میٹھے پانیوں سے سیر ہو کر آگے چلتے ہیں۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا اور پھر جھک کر اپنا چہرہ چشمے کے پانی میں ڈبو دیا۔۔۔ اس کی خنکی چہرے کے راستے میرے بدن میں اترنے لگی اور جب میرے ہونٹ اور ناک سن ہونے لگے تو میں نے چہرہ پانی سے اٹھا کر جھٹکا۔۔۔ اور اس لمحے روپل کی ہوا نے میرے نم آلود چہرے پر خنک اور سرسراتے ہوئے سانس لئے اور اسی لمحے میں نے پہلی بار روپل کو دیکھا۔۔۔۔۔۔۔

روپل کو میں نے اگست کے پہلے دنوں میں دیکھا اور اگست کے پہلے دنوں میں روپل گھنے سبز رنگ کے کھیت ہیں جن میں بڑے بڑے پتھر کسی جاپانی باغ کی طرح سجے ہیں اور ان کھیتوں میں پانی بہتے ہیں اور ان پانیوں کے کنارے جامنی رنگ کے پھولوں کے انبار ہیں ۔۔۔ کھیتوں کی ہریاول ایسے ہے جیسے کسی امپرشنسٹ مصور نے اپنے کینوس پر بنیاد کے طور پر سبز رنگ لگایا ہے۔۔۔ اور پھر ان کھیتوں میں اور اس سبز کینوس پر اتنے زیادہ پھول ہیں ۔۔۔ رنگوں کی بوندیں اتنی بہتات میں ہیں۔۔۔ پھولوں کی بارش کے چھینٹے اتنے زیادہ ہیں' اتنے زیادہ ہیں کہ انسان یقین نہیں کرتا اور منہ کھول کر اس وادی کو دیکھتا رہتا ہے جو دور سے بے حد ویران اور سنسان سی لگی تھی۔۔۔ اور اب اس وادی کے کھیتوں میں لکڑی کے گھر ہیں جو پھولوں بھرے کھیتوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔۔۔۔ اور کھیتوں میں خواتین ہیں جن کے لباس انہی شوخ رنگوں کے ہیں جو ان کے آس پاس خنک ہوا میں جھومتے ہیں۔ عورتوں نے شوخ رنگوں کی ٹوپیاں بھی پہن رکھی ہیں۔۔۔ کھیتوں میں سبز کے علاوہ تین رنگ نمایاں ہیں' سرخ' زرد اور جامنی۔ سرخ گلاب' زرد چمکیلے پھول اور جام جھالروں والے تھے۔۔۔

ہم اس وادی و رنگ و بو میں چلنے لگے۔۔۔۔

؎ نکلے تیری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو

روپل کے پس منظر میں پہاڑ پھیکے رنگ کے ہیں اور کم بلندی کے ہیں لیکن۔۔۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

یہاں پس منظر کی طرف نظر نہیں جاتی، انسان زمین کو دیکھتا جاتا ہے اور زمین پر شوخ رنگوں کے چھینٹے ہیں۔ کھیتوں میں کام کرنے والی خواتین ہمارے بارے میں تجسس رکھتی ہیں' وہ اپنا کام بھول کر ہمیں دیکھنے کے لئے کھڑی ہو جاتی ہیں اور جب ہماری نظریں ان کے دیدہ زیب گھنوں اور خوش رنگ لباسوں کی طرف جاتی ہیں تو وہ اپنے آپ کو کھیتوں میں چھپا لیتی ہیں۔ اور ان کا چھپنا آسان ہے کہ وہ' ان کے لباس اور ان کے کھیتوں کے پھول یک رنگ ہیں۔۔۔ یہاں درخت بہت کم ہیں اور اسی لئے تین چار میل لمبی یہ وادی پوری کی پوری اپنے تمام رنگوں کے ساتھ آپ کے سامنے پھیلی نظر آتی ہے۔۔۔

جس راستے پر ہم چل رہے ہیں اسی راستے پر تین خواتین چلی آ رہی ہیں۔ ان میں سے ایک کی سرخ چادر ذرا ہوا سے اوپر اٹھتی ہے تو کسی کھیت کا حصہ ہو جاتی ہے کہ وہاں بھی سرخی مائل باریک پھولوں کی تہہ بچھی ہوئی ہے۔۔۔ ہم ان خواتین کو قریب سے دیکھنا چاہتے ہیں لیکن وہ ہمیں دیکھ کر راستہ بدل لیتی ہیں۔

راہی جو مسلسل تصویریں اتار رہا تھا یکدم کھڑا ہو گیا "مائی فرینڈ۔۔۔ میں برباد ہو گیا۔۔۔ تم نے مجھے ہلاک کر دیا۔ میں اب تک جو دنیا دیکھتا رہا وہ کیا تھی اور اب میرے سامنے جو دنیا ہے یہ کیا ہے' سب سے بڑا مصور وہی ہے اوپر والا۔۔۔ کیا رنگ لگائے ہیں اس نے۔۔۔ فرسٹ کلاس"

لاہور میں جب میں اور سمیر سر جوڑ کر اس سفر نانگا پربت کی منصوبہ بندی کرتے تو بار بار روپل کا ذکر آتا۔۔۔ اس پر بقیہ گھر والے سمیر کو چھیڑتے کہ اچھا روپل جاؤ گے۔۔۔ اور اس کا نام ہی مسٹر روپل پڑ گیا۔۔۔ اسی حوالے سے سمیر نے رک کر صرف اتنا کہا" ابو میں روپل میں ہوں۔۔۔ مسٹر روپل"

ہم ترشنگ سے سرسری گذرے تھے اور روپل سے اس سے بھی زیادہ سرسری گزر رہے تھے۔۔۔ یہ ان جگہوں سے ناانصافی تھی۔۔۔ ہم واپسی پر یہاں رکیں گے ہم نے فیصلہ کر لیا۔

ہم جس راستے پر تھے اس کے دونوں جانب پتھر جوڑ کر چھوٹی چھوٹی دیواریں اونچی کی گئی تھیں اور ان دیواروں کے ساتھ کھیت تھے۔۔۔ پھر کھیتوں کی بجائے گھر شروع ہو گئے۔ انہیں فارم ہاؤس کہنا زیادہ مناسب ہو گا کیونکہ روپل دراصل چورت اور ترشنگ کے رہنے والوں کا سمر کیمپ ہے۔ وہ اپنے مال مویشی سمیت گرمیوں میں ادھر آ جاتے ہیں۔ کاشتکاری کرتے ہیں' فصلیں کاٹتے ہیں اور شدید برفباری سے پیشتر واپس چلے جاتے ہیں۔ یہ نہیں کہ ان دنوں ترشنگ اور چورت میں موسم خوشگوار ہوتا ہے بس یہ ہے کہ سردیوں میں روپل برف تلے دب جاتا ہے اور کچھ نظر نہیں آتا اور ترشنگ میں بھی سب کچھ دب جاتا ہے لیکن انسان کہیں کہیں نظر آتا ہے اور زندہ رہتا ہے۔ میں نے ایک بار سلطان سے کہا کہ تم تو دعائیں کرتے ہو گے کہ یااللہ اس بار برف کم پڑے تاکہ زندگی آسان ہو۔ وہ کہنے لگا' نہیں صاحب ہم تو زیادہ برف کی دعائیں کرتے ہیں' جتنی زیادہ برف پڑے گی اتنی ہی پگھلے گی اور اتنا ہی زیادہ پانی ہو گا ہمارے کھیتوں کے لئے اور ندیوں کے لئے۔۔۔

روپل گاؤں میں صرف چند گھر تھے۔۔۔ باقی گھر پوری وادی میں کھیتوں کے ساتھ تھے۔

دائیں جانب وہی سوکھا ٹیلا نما پہاڑ اور بائیں جانب کھیتوں کی آخری حد کے نیچے دریائے روپل بہتا تھا جو یہاں سے دکھائی نہیں دیتا تھا۔

روپل میں ہمیں خبر ملی کہ بے یک بیس کیمپ سے جو راستہ تاپ میدان اور لاتوبو جاتا ہے دھوپ سے نرم پڑتی ہوئی برف کی وجہ سے خطرناک ہو گیا ہے اور اب ادھر سے جانا مناسب نہیں۔

سلطان زمین پر بیٹھ گیا" ادھر نانگا پربت ہے۔۔۔ اور یہ اس کے نیچے بے یک بیس کیمپ جہاں ان دنوں ایک جاپانی ٹیم کیمپ کر رہی ہے۔۔۔ اور ادھر تاپ میدان اور لاتوبو کے بیس کیمپ ہیں۔۔۔ ان کا آپس میں راستہ تو ہے لیکن وہ گلیشیر نرم پڑ گیا ہے۔۔۔ اگر ہم بے یک جاتے ہیں تو تاپ میدان اور لاتوبو جانے کے لئے پھر واپس روپل آئیں گے اور پھر یہاں سے آگے۔۔۔ تو بولو کدھر جائیں؟"

"لاتوبو اور تاپ میدان۔۔۔"

میں نے بہت سارے کوہ پیماؤں سے ان مقامات کے بارے میں بے حد توصیفی کلمات سنے تھے۔۔۔ اور وہاں پہنچ کر ہم بے یک جانے کی کوشش بھی کر سکتے تھے۔۔۔

روپل کی آبادی ختم ہو گئی۔۔۔ ایک پہاڑی نالہ راستے میں آیا جس کے پانی میں قدم رکھنے کو پتھر تھے۔۔۔۔ ذرا نیچے لکڑی کے ہموار چھتوں والے درجنوں مکانوں کا مجموعہ نظر آیا۔۔۔ یہ مکان جیسے ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔۔۔ شدید سردی کی وجہ سے ساتھ ساتھ اپنا بچاؤ کرتے ہوئے۔۔۔ یہ بڑا روپل یا اپر روپل تھا جو

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

ان دنوں بالکل ویران پڑا تھا۔ بیشتر جھونپڑے کھلے پڑے تھے۔ کواڑ بند تھے۔ کواڑوں کے اندر اندھیرے کمرے تھے جن میں شلغم اور ساگ سٹور کیے گئے تھے۔ ان مکانوں کے برآمدوں میں بھی انہیں دو سبزیوں کو سکھانے کے لئے ہاروں کی طرح گوندھ کر لٹکایا گیا تھا۔۔۔ ہم ان ویران مکانوں کی چھتوں پر چلتے تھے لیکن احتیاط کے ساتھ۔ ان کی چھتوں میں چوکور روشن دان تھے۔۔۔

اپر روپل میں ایک مرتبہ پھر دائیں ہاتھ پر نانگا پربت کا برفیلا جسم ظاہر ہونے لگا۔۔۔ اور یہی اس سلسلے کی بلند ترین چوٹی تھی۔۔۔

اور ہمیں بائیں ہاتھ پر نیچے اترنا تھا اور دریائے روپل عبور کر کے دوسری جانب شوکور تک جانا تھا شوکور روپل گلیشیر کے عین اوپر واقع ہے اور اس کے معنی سفید پہاڑ کے ہیں۔ اور اسی سفید پہاڑ پر ہم نے آج کی شب بسر کرنا تھی۔

ہم اپر روپل کے آخری گھر سے آگے گئے اور پھر نشیب میں بہتے تیز و تند روپل دریا کی طرف اترنے لگے۔ یہ اترائی بھی ایک دیوار کی طرح نیچے جا رہی تھی لیکن راستہ چوڑا تھا اور زمین سخت تھی۔۔۔

دوپہر ہو رہی تھی۔۔۔

"سلطان۔۔۔" راہی نے سوکھتے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا "مائی فرینڈ کچھ کھانا پینا ہو جائے۔۔۔ کچھ دال بھات ہو جائے۔"

"ہاں ناں۔۔۔" سلطان نے خوش مزاجی سے سر ہلایا "نیچے چشمہ ہے۔۔۔ ادھر بیٹھ کر کھائیں گے ناں۔۔۔"

اب ہم نے دیکھا کہ ہمارے گدھے ہمارے دوسرے سلطان کے ساتھ دریا کے پار پہاڑ پر چڑھ رہے ہیں "یہ ولی نہیں کھائے گا؟"

"کیا کرے گا۔۔۔" سلطان نے لاپروائی سے کہا "یہ ادھر پہنچے گا شوکور میں اور ہمارا انتظار کرے گا"

ہم روپل اور نانگا پربت سے اوجھل ہو کر نیچے چلے گئے۔ نیچے بڑے بڑے پتھر اور بلند درخت تھے جن کے بیچ میں گھاس کے قطعات تھے۔۔۔ ہم تھکن سے بے حال ہو کر درختوں کے سائے میں لیٹ گئے۔ یہاں صرف دریائے روپل کی تیزی کا مدھم شور سنائی دیتا تھا یا پھر کسی درخت کے پتوں میں پوشیدہ صرف ایک پرندے کی کوکل نما آواز۔۔۔ کو او۔۔۔ کو او۔۔۔

راہی نے سٹوو جلایا اور چاول ابالنے لگا۔ سلطان نے ادھر ادھر سے لکڑیاں جمع کر کے ایک دیسی چولہا بنایا اور میرے لئے کافی تیار کرنے لگا۔ سمیر اپنی پٹھانی ٹوپی منہ پر رکھ کر اونگھنے لگا۔۔۔

دو پتھروں کے اوپر ایک بہت بڑا پتھر اس انداز میں آن رکا تھا کہ اس کے نیچے بارش اور دھوپ سے محفوظ کمرہ سا بن گیا تھا۔ یہ رات گزارنے کے لئے بہت شاندار جگہ تھی اور یہاں سے بہت لوگ گذرے قیام کیا اور چلے گئے۔۔۔ تم نہ پہلے ہو نہ آخری۔۔۔

کھانے کے فوراً بعد ہم پھر چلنے لگے۔۔۔ مزید نیچے اترے اور دریائے روپل پر بنے ہوئے اس پل تک پہنچ گئے جو تین چار شہتیروں کو آر پار لٹا کر تیار کیا گیا تھا۔۔۔

"آہا۔۔۔ ویری ڈینجرس" راہی کمر پر ہاتھ رکھ کر اپنے جاپانی سمورائے انداز میں کھڑا ہو گیا۔

"ادھر سے تو گدھا بھی گذر گیا" سلطان نے دانت نکال کر کہا۔

"ہم گدھا نہیں ہے" راہی نے مکمل سنجیدگی سے اعلان کیا "تارڑ صاحب اس آدمی کو انفرمیشن دو کہ ہم گدھا نہیں ہے۔۔۔"

"ہم دونوں گدھا نہیں ہے۔۔۔" میں نے سلطان کو اطلاع دی

"ہم تو ہے۔۔۔" یہ آواز سمیر کی تھی جو سر نیچا کر کے نیچے تلے قدم رکھتا شہتیروں کے درمیان جو بڑے بڑے سوراخ تھے اور جن میں سے دریا کی جھاگ اوپر آتی تھی ان سے بچتا پل کے پار جا رہا تھا۔

"پھر تو ہم بھی ہے۔۔۔" راہی نے انگلی کھڑی کر کے کہا اور پل پر قدم رکھ کر زور سے دبایا کہ گرتا تو نہیں اور پھر اطمینان کر کے آرام سے چلنے لگا۔

"اگر سب ہے تو ہم بھی ہے۔۔۔" اور سب سے آخر میں میں نے قدم رکھا۔۔۔ اور مجھے یوں لگا جیسے صرف میرے قدم رکھنے کی وجہ سے دریا کی پھنکار میں اضافہ ہو گیا ہے کہ اوئے تم بھی بروٹس۔۔۔

دریا کے پار ایک راستہ اوپر کو بل کھاتا جا رہا تھا لیکن یہ ہریاول میں تھا اور جنگلی بوٹیوں اور چیڑ کے درختوں میں سے تھا۔۔۔ اور یہاں ڈھلوانوں پر پھول بھی کھلتے تھے۔۔۔ ہمارے بائیں جانب ایک خاص بلندی کے بعد درخت کم تھے اور یہ سنو لائن تھی۔۔۔ اس بلندی کے برابر سفید برچ کے ٹیڑھے میڑھے درختوں کا ایک جنگل ڈھلوان

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

پر جھکا ہوا تھا۔۔۔ دائیں جانب دریائے روپل نیچے رہ گیا تھا بلکہ وہ بہت نیچے تھا اور اس کی آواز اب ہم تک نہیں پہنچتی تھی۔۔۔ ہم پیچھے مڑ کر دیکھتے تھے تو وادی روپل ایک ہوائی منظر کی طرح نظر آتی تھی۔۔۔ اپر اور لوئر روپل اور ان سے پرے ترشنگ گلیشیر کی دیوار۔۔۔ کیا ہم سچ مچ اتنا فاصلہ طے کر کے یہاں تک پہنچے تھے۔۔۔؟

ہماری پگڈنڈی چھوٹی ہو رہی تھی اور بہت ہی تیزی سے بلند ہو رہی تھی۔۔۔

اور سورج بھی زرد ہونے لگا تھا۔

ہم آرام کرتے۔۔۔ سانس درست کرتے۔۔۔ چیونگم چباتے چلتے گئے۔۔۔

ایک مقام پر پگڈنڈی جو پہاڑ کے ساتھ چپٹی ہوئی تھی بل کھاتی ہوئی اٹھی اور کچھ زیادہ ہی اٹھ گئی۔ میں احتیاط سے آگے بڑھا تو یکدم احساس ہوا کہ میں کہاں کھڑا ہوں۔۔۔ میرے عین نیچے ہزار فٹ نیچے روپل گلیشیر میں سے نکلتا ہوا تیز دریا تھا اور اس کے پانیوں میں برف کے بڑے بڑے ٹکڑے آپس میں جنگلی بھینسوں کی طرح ٹکرا رہے تھے اور ڈکرا رہے تھے۔۔۔ یہاں کسی قسم کی کوئی گنجائش نہ تھی۔۔۔

"چلو ناں۔۔۔" سلطان میرے پیچھے کھڑا تھا اور یہاں اتنی جگہ نہ تھی کہ میں مڑ کر دیکھ سکتا۔۔۔ سامنے وہ دس بارہ فٹ کا ٹکڑا تھا جو بل کھاتا گلیشیر کے عین اوپر معلق تھا۔۔۔

نیچے نہیں دیکھو تو خطرناک نہیں ہے۔۔۔" یہ سلطان کی آواز تھی۔

عجیب احمق انسان تھا بھلا نیچے کس طرح نہ دیکھو۔۔۔ جیسے آپ ایک دو فٹ چوڑی میز پر با آسانی کھڑے ہو جاتے ہیں اور سارا دن کھڑے رہ سکتے ہیں لیکن اگر اسی میز کے پائے دو ہزار فٹ بلند ہو جائیں تو کیا اس پر آس پاس دیکھے بغیر کھڑا رہنا ممکن ہے۔۔۔ یہی صورت حال یہاں تھی۔۔۔ میں وہاں سے گزرا لیکن یقین کیجئے کہ وہاں سے گذرتے ہوئے میں تھوڑا سا اس جہاں سے بھی گذرا۔۔۔ دوسری جانب پہنچ کر میں نے سپر پر نظریں جما دیں۔۔۔ میں اسے 'بیٹا احتیاط سے' کہنے کو تھا لیکن بہتر یہی جانا کہ نہ کہوں اور وہ پورے دھیان سے لیکن بے خطر ہو کر اتنے حصے میں سے گذر کر میرے پاس آگیا۔

ہم اپنے رات کے پڑاؤ شوکور پہنچے تو دھوپ ڈھل چکی تھی۔۔۔

ہمارے دائیں ہاتھ پر نیچے کسی اور جہاں میں وادی روپل کا سرسبز ٹکڑا تھا۔۔۔ اپر روپل آدھا سائے میں تھا اور لوئر روپل ابھی دھوپ میں روشن تھا۔ ہم ایک گلیشیر

کے نزدیک اور دوسرے گلیشیر سے ہزاروں فٹ اوپر پہاڑ کے ساتھ ایک چھوٹے سے بڑھاؤ پر براجمان تھے اور یہ چھوٹا سا حصہ اس طرح معلق تھا کہ تیز ہوا کے ساتھ ہلتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔۔۔

روپل گلیشیر کی قدیم برف اپنی ٹوٹ پھوٹ اور سیاہی کے ساتھ عجیب منظر تھی۔۔۔ جیسے ہزاروں ہاتھی سر جوڑے کھڑے زور لگا رہے ہیں اور برف کے ٹوٹتے تودوں کے نیچے دریا میں گرنے کی آواز انہی جانوروں کی ہے۔۔۔ ہم انہی زور لگاتے ہاتھیوں کے عین اوپر کھڑے تھے۔۔۔ ہمارے آگے ایک چھوٹا سا ٹیلہ تھا اور اس ٹیلے سے چھوٹے پتھر نیچے گرتے تھے اور اسی ٹیلے سے پرے نانگا پربت تھی۔۔۔ زور لگاتے برفیلے ہاتھیوں کے اوپر نانگا پربت۔۔۔ ننگا پہاڑ۔۔۔ دیا میر۔۔۔ پہاڑوں کا بادشاہ شل کھمی۔۔۔ سو چہروں والا پہاڑ۔۔۔ اور کلر ماؤنٹین۔۔۔ قاتل پہاڑ۔۔۔

سلطان محمود گدھوں پر سے سامان اتار کر ہمارا انتظار کر رہا تھا۔۔۔

زرد خیمے کا کپڑا زمین پر بچھا ہوا تھا۔۔۔

جب کبھی گلیشیر کا کوئی ٹکڑا اپنی قدیم آماجگاہ سے ٹوٹ کر دریا میں گرتا تو گڑ گڑاہٹ کی گونج میں ہمیں اپنی خیمہ گاہ لرزتی ہوئی محسوس ہوتی۔۔۔ راہی میری جانب دیکھتا اور میں اس کی طرف۔

"مائی فرینڈ مجھے یہ نہ بتانا کہ ہم اس۔۔۔ کانپتی ہوئی جگہ پر رات گزاریں گے۔۔۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مائی فرینڈ۔۔۔ میں تمہیں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں بتا سکتا۔۔۔" میں نے بے چارگی سے کندھے سکیڑے۔

"آؤ آج کی رات گزارنے کے لئے ہم نانگا پربت کے دامن میں اپنا خیمہ نصب کریں۔۔۔ میخیں دھیان سے گاڑنا کہ یہاں رات کو ہوا تیز ہوگی۔۔۔"

پتھروں کی ایک چھوٹی سی دیوار کی اوٹ میں سلطان کھانا پکانے کے لئے آگ جلا رہا تھا اور اس کا دھواں اوپر اٹھ رہا تھا۔۔۔ اور زرد خیمہ تھا اور شب تھی جو قریب تھی۔ اور جنگلی بوٹیوں کی مہک گلیشیر کے ٹوٹنے کی آواز اور دریا کا شور اور سردی تھی جو رگ و پے میں اترتی تھی' اور دھوپ تھی جو ڈھل چکی تھی اور ہمارے سامنے نانگا پربت تھی اور ہم تھے اور صرف ہم تھے اور اسے دیکھتے تھے' اور کوئی نہ تھا اور ہم

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

اتنی دور سے اسے دیکھنے کے لئے آئے تھے۔۔۔ اور اسی لئے وہ بے لباس تھی' صرف ہمارے سامنے تھی' ہماری تھی۔

پتھروں کی ایک چھوٹی سی دیوار کی اوٹ میں سلطان کھانا پکانے کے لیے آگ جلا رہا تھا اور اس کا دھواں اوپر اٹھ رہا تھا۔۔ اور زرد خیمہ تھا اور شب تھی جو قریب تھی۔

ہوا کے زور سے خیمے کا پردہ پھڑپھڑا رہا تھا۔۔۔ راہی ایک چھوٹے سے پتھر کے ساتھ ڈھیلی میخوں کو نکال کر دوبارہ مضبوطی سے زمین میں گاڑ رہا تھا۔۔۔

سلطان محمود نے گدھوں کی پشت سے پالانے اتارے اور انہیں ایک بڑے پتھر پر رکھ دیا۔ "یہ صوفہ بن گیا ہے۔۔۔" اس نے ایک گدھے کو باندھ دیا اور دوسرے کو کھلا چھوڑ دیا "یہ والا گدھا بدمعاش ہے بھاگ جاتا ہے۔۔۔ اور یہ شریف ہے کہیں نہیں جائے گا"

ہم جہاں تھے وہاں صرف کنارے تھے۔۔۔ دائیں ہاتھ پر جہاں سے آئے تھے' چند میٹر جگہ پر پتھر بکھرے ہوئے تھے اور وہاں سے روپل نیچے تھا اور ہم میں کسی نے بھی بالکل کنارے پر کھڑے ہو کر نیچے جھانکنے کی کوشش نہ کی۔۔۔ خیمے کے سامنے ایک دو تین میٹر اونچا ٹیلا تھا جس پر ایک جھاڑی تھی اور وہاں بمشکل ایک آدمی کے بیٹھنے کی جگہ تھی اور اگر وہ آدمی وہاں بیٹھ کر گردن آگے کر کے دیکھنے کی کوشش کرے تو وہ گردن سمیت نیچے جاتا تھا۔۔۔ کیونکہ نیچے عین نیچے روپل گلیشیئر اور دریا کی وحشت تھی۔ ایک مسلسل شور تھا۔۔۔ میں یہیں سانس روکے بیٹھا تھا اور کافی کا مگ میرے ہاتھ میں تھا اور اسے ہونٹوں تک لاتے ہوئے بھی احتیاط برتتا کہ کہیں اتنی حرکت بھی مجھے نیچے نہ لے جائے۔۔۔

"ابو میں بھی آ جاؤں ۔۔۔" سمیر کی آواز آئی۔

"نہیں ۔۔۔" میں نے پیچھے دیکھے بغیر جواب دیا۔

"پھر آپ بھی واپس آ جائیں مجھے ڈر لگ رہا ہے"

میں اپنا وزن پیچھے کی طرف رکھتا ہوا نیچے آ گیا۔۔۔ ہماری خیمہ گاہ ترشنگ سے نانگا پربت جانے والے کوہ پیماؤں اور کوہ نوردوں کے لئے شب بسری کا کام دیتی تھی اور سبھی پورٹر اسے فرسٹ شاپ کہتے تھے۔۔۔ پتھروں کی دو چھوٹی چھوٹی چار دیواریاں اس امر کی غمازی کرتی تھیں کہ ان کے اندر ایک ایک خیمہ نصب ہو سکتا تھا اور

یہاں ہوا سے بچاؤ بھی ہو جاتا تھا۔ اس قسم کی ایک چاردیواری کی اوٹ میں سلطان کھانا بنا رہا تھا۔۔۔ چاول۔ دال اور ٹمن بند کوفتے۔۔۔

"یہ شوکور ہے؟" میں نے سلطان سے پوچھا۔

"ہاں ناں ۔۔۔" اس نے دھواں لگی نم آنکھوں سے میری جانب دیکھا۔۔۔

"لیکن شوکور تو سفید پہاڑ کو کہتے ہیں۔۔۔ سفید پہاڑ کہاں ہے؟"

"یہی ہے ۔۔۔" اس نے کہا۔۔۔ لیکن مجھے دو تین پتھروں کے علاوہ اور کچھ دکھائی نہ دیا۔ وہاں شوکور میں رات ہوئی تو یکدم ہوئی اور اس حساب سے سردی آئی کہ ہم جیسے کسی ڈیپ فریزر میں سانس لینے لگے۔۔۔ سمیر اپنی پٹھانی ٹوپی کانوں پر کھینچتے ہوئے بولا "اِدھر گلیشیئر اُدھر گلیشیئر تو اِدھر جے کی قلفی۔۔۔ کونسی قلفی؟ کھوئے والی ملائی والی ٹھنڈی ٹھار اے۔۔۔ اس نے لاہوری قلفی فروشوں والی ہیک لگائی"

"اِدھر نیچے تو روپل گلیشیئر لیکن اُدھر کدھر گلیشیئر؟"

"اُدھر ان پتھروں کی اوٹ میں ایک اور گلیشیئر میں ابھی دیکھ کر آیا ہوں"

"تم اُدھر کیا کرنے گئے تھے؟"

سمیر جو کہ بچہ تھا اگرچہ لم ڈھینگ ہو چکا تھا بچوں کی طرح مسکرایا۔ "میں۔۔۔ پانی کرنے گیا تھا"

"تو پھر؟"

"پھر کیا؟ گلیشیئر پر بیٹھنے سے قلفی جم گئی۔۔۔"

کھانے کے بعد الاؤ روشن کیا گیا۔۔۔ اور ہم سب اس کے گرد ہتھیلیاں پھیلائے بیٹھ گئے۔۔۔ اور پہلی بار ایک دوسرے کو بتایا کہ ہم کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔۔۔ دونوں سلطانوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ٹھیک ہے راہی تصویریں بناتا ہے اور میں لکھتا ہوں لیکن ہم کرتے کیا ہیں۔۔۔ سلطان ولی چورت کے اوپر ایک چھوٹی سی آبادی تاکے کا باشندہ تھا۔ وہاں پہاڑی پر اس کا گھر تھا' تھوڑی سی زمین تھی اور مال مویشی تھے۔ گرمیوں میں جب ادھر ٹیم آتی تھی تو وہ ان کے ساتھ پورٹر کے طور پر منسلک ہو جاتا تھا۔ سلطان محمود باہر جا چکا تھا۔ باہر سے مراد ہے استور اور گلگت سے باہر اسلام آباد اور پنجاب۔۔۔ وہ بھی کھیتی باڑی کا کام کرتا تھا اور گرمیوں میں سیاحوں کا بوجھ اٹھاتا تھا۔

"جب تم لوگ کسی ٹیم کے ساتھ چلے جاتے ہو تو تمہارے مال ڈنگر اور کھیتوں

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

کی نگہداشت کون کرتا ہے۔۔۔؟"

"کرتا ہے ناں۔۔۔" سلطان ولی زمین پر لکیریں کھینچتا ہوا کہنے لگا اور یہ اس کی عادت تھی کہ جب بھی وہ بات کرتا زمین پر کسی پتھر یا ٹہنی سے لکیریں کھینچنے لگتا اور اپنی گفتگو کے دوران "ہاں ناں۔۔۔" بہت استعمال کرتا۔

"کون کرتا ہے ناں؟"

"ہمارا بھائی کرتا ہے۔۔۔ وہ ٹیم کے ساتھ جاتا ہے تو ہم کرتا ہے۔۔"

بھائی سے اس کی مراد کزن حضرات کے علاوہ آبادی کے تمام مرد تھے۔۔۔ سلطان ولی کے باریش چہرے پر ایک دل پر اثر کرنے والی بے حد سادہ معصومیت تھی۔۔۔ وہ بہت دن ہمارے ساتھ رہا اور اس دوران کسی ایک لمحے میں میں نے اس کے چہرے کو سادگی اور معصومیت سے الگ نہ دیکھا۔ اور اس میں لالچ نام کو نہ تھا اور اس کی مسکراہٹ بچوں کی طرح پر کشش تھی۔ عام طور پر پورٹر آپ کا کھانا نہیں پکاتا لیکن سلطان نے یہ ذمہ داری اپنی مرضی سے قبول کر لی اور اب بیچد گھر بیبیوں کی طرح پہلے ہمیں کھانا کھلاتا تھا اور پھر بچا کھچا خود کھا کر برتن وغیرہ صاف کر کے کسی پتھر پر بیٹھ کر ہماری طرف دیکھتا رہتا تھا۔

"یہ جو تمہارا بیٹا ہے' سمیر۔۔۔ یہ بہت اچھا ہے" سلطان خوشی کے ساتھ کہہ رہا تھا "یہ اس نے آٹھ جماعت پاس کر لیا ہے؟"

"ہاں۔۔۔۔"

"تو پھر اس کا شادی بناؤ بڑا ہو گیا ہے۔۔۔۔" اس نے ماتھے پر تیوری ڈال کر بڑے مدبرانہ انداز میں مجھے مشورہ دیا اور پھر کچھ سوچ کر دیر تک سر ہلاتا رہا۔۔۔

"ادھر لوگ آتے ہیں۔۔۔ جنگل اور پہاڑ ہے۔۔ آبادی نہیں۔۔۔ تو اگر کوئی بیمار ہو جائے ٹیم کا ممبر تو اس کا علاج کیسے ہوتا ہے؟"

"ٹیم کے ساتھ' ڈاکٹر بھی آتا ہے۔۔۔ لیکن جو چھوٹا ٹیم ہوتا ہے تمہارے جیسا اس کا تو اللہ نگہبان ہوتا ہے۔۔۔ محمود۔۔۔" وہ اپنے ساتھی کی طرف متوجہ ہوا "یاد ہے میں اس انگریز کو کیسے لے گیا تھا؟"

"ہاں۔۔۔" محمود نے سر ہلایا "صاحب یہ ایک انگریز کے ساتھ ادھر آیا' تاپ میدان میں اور انگریز بیمار ہو گیا۔۔۔ بے ہوش ہو گیا بالکل۔۔۔ پھر یہ ترشنگ واپس گیا رات کو کیونکہ ہم لوگ رات کو بھی آسانی سے سفر کرتے ہیں اور وہاں سے گھوڑا لایا

اور پھر گھوڑے پر بٹھا کر استور تک لے گیا۔۔۔ تب استور تک جیپ نہیں جاتی تھی۔۔۔"

"صاحب ادھر ان دنوں ویشنگ میں جو جاپانی ٹیم کا کیمپ ہے تو اس میں ایک لیڈی بہت بیمار ہے۔ پہاڑ سے گرا ہے ٹانگ ٹوٹ گیا ہے۔۔۔"

"تمہیں کیسے پتہ ہے؟" سمیر نے پوچھا۔

"راستے میں جو لوگ ملتے ہیں وہ بتاتے ہیں۔ ان پہاڑوں میں نانگا پربت کے دامن میں اگر کچھ ہو جائے تو سب کو پتہ چل جاتا ہے۔۔۔ اس وقت سب کو پتہ ہے ترشنگ میں روپل میں اور ادھر مازینو پاس تک کہ سلطان ولی اور محمود ایک تین ممبر ٹیم کے ساتھ ہیں کیمپ جا رہا ہے"

"ادھر پاکستانی ٹیم بھی آتا ہے؟"

"ناں۔۔۔ کم آتا ہے۔۔۔ یہ جو تمہارا بیٹا سمیر ہے تو اس سے چھوٹا پاکستانی ادھر کبھی نہیں آیا۔۔۔ یہ بہت ہمت والا ہے۔۔۔"

سمیر نے ذرا گردن اکڑا کر سب کی جانب دیکھا۔۔۔ الاؤ تاریکی سے بلند ہو کر اس سفیدی کے آگے ایک بہتے ہوئے سرخ پردے کی مانند لہراتا تھا جو نانگا پربت کا وجود تھا۔۔۔ ہم سب اس کے آتشی بہاؤ کو تکتے جاتے تھے جس کی زبانیں تاریکی کو چاٹتی تھیں۔۔۔ ہمارے پیچھے سردی کے سرد ہاتھ تھے اور ہم سکڑتے ہتھیلیاں پھیلاتے آگ کے قریب ہوتے جاتے تھے۔۔۔

"ادھر جانور بھی آتا ہے؟"

"ہاں ناں۔۔۔ مارخور ہوتا ہے اور ادھر تاپ میدان میں ہرن تو میں نے دیکھا ہے۔۔۔ اور شیر بھی ہوتا ہے"

شیر کا نام سن کر راہی ذرا چوکنا ہوا "یہ شیر کیسا ہوتا ہے؟"

"بھیڑیے کی طرح ہوتا ہے۔۔۔" سلطان محمود نے کہا۔

"شیر' بھیڑیے کی طرح کیسے ہو گا۔۔۔ مائی فرینڈ تم نے کچھ اور دیکھا ہو گا"

"بھیڑیے کی طرح شکل نہیں صاحب۔۔۔ اس کا بال اور رنگ بھیڑیے کے موافق ہوتا ہے۔۔۔ ہم نے دیکھا ہے" ۔۔۔ سلطان یقیناً سنو لیپرڈ کے بارے میں بات کر رہا تھا۔

راہی نے میری جانب دیکھا اور پھر خوفزدہ ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"اس کا مطلب ہے کہ ادھر بھیڑیا تو ضرور ہوتا ہے۔۔۔"

"راہی چاچا۔۔۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "میرے پاس ساتھی آگو کی لکھی ہوئی ایک پاکستان گائیڈ ہے جس میں وہ لکھتا ہے کہ روپل نانگا پربت کے جنوبی رخ پر واقع ہے اور یہاں بے شمار بھیڑیئے گھومتے ہیں جو بکریوں اور بھیڑوں کو اٹھا لے جاتے ہیں۔۔۔ اسی لیے یہاں کا ماحول انتہائی ڈراؤنا ہے اور لگتا ہے کہ ہم کسی اور دنیا میں آ گئے ہیں۔۔۔"

"ہمیں تو ڈر لگ رہا ہے بابا۔۔۔" راہی جان بوجھ کر کپکپانے لگا "باپ رے باپ۔۔۔ تو ادھر تو ہم بالکل اکیلا رات کیسے گذارے گا۔۔۔"

"اسی لئے تو آگ جلایا ہے صاحب۔۔۔ بھیڑیا پاس نہیں آئے گا۔۔۔" سلطان سوکھی لکڑیاں اپنے گھٹنے پر رکھ کر توڑتا اور انہیں الاؤ میں جھونک دیتا۔۔۔ "ادھر ایک سال بہت بڑا آگ جلا تھا صاحب۔۔۔ وہ آگ بہت دور سے دکھائی دیتا تھا۔ روپل سے، تاپ میدان سے۔۔۔"

"کس نے جلایا تھا؟"

"جاپانی لوگ تھا صاحب انہوں نے جلایا تھا۔۔۔ ادھر ایک ٹیم آیا تھا تو اس کا ایک نوجوان ڈاکٹر نانگا پربت کے کیمپ تو سے گر گیا۔۔۔ کیمپ تو تک تو میں بھی گیا ہوں۔۔۔ تو پھر وہ مر گیا۔ ادھر برف سے جم گیا۔۔۔ ٹیم نے جاپان تار بھیجا کہ ڈاکٹر مر گیا ہے تو ہم اس کا لاش بھیجے یا ادھر کچھ کر دے کیا کرے۔۔۔ ادھر سے اس کا ماں باپ اور بہن نے لکھا کہ ہم آتا ہے۔ وہ آئے اور اسٹور سے تیل کا ٹین خریدا۔۔۔ پھر ادھر آیا۔۔۔ ٹیم کے لوگ نے اس کا لاش برف میں رکھا تھا۔ اسے نکال کر نیچے تاپ میدان میں لائے۔۔۔ لکڑیاں جمع کر کے اس میں اسے رکھا پھر تیل ڈال کر آگ لگا دی۔۔۔"

"وہ تو بہت روتے ہوں گے سلطان؟ اس کے ماں باپ؟" میر کچھ دیر کے بعد بولا۔

"ہاں ناں۔۔۔ روتے ہوں گے پر ہمیں کیا پتہ صاحب۔۔۔ جب انہوں نے تیل ڈالا تو آگ لگانے سے پہلے ہم کو کہا کہ تم اب جاؤ۔ ہم تمہارے سامنے اپنے بیٹے کو آگ نہیں لگائے گا۔۔۔ صرف اس کام کے لئے آئے تھے۔۔۔"

ہم پانچ تھے جو اس رات نانگا پربت کے روبرو الاؤ کے گرد بیٹھے تھے اور آگ کو دیکھتے تھے اور ہم تینوں سوچتے تھے کہ ان جاپانیوں نے پورٹرز کو کیوں کہا تھا کہ ہم

تمہارے سامنے اپنے پیارے کو نذر آتش نہیں کریں گے۔ تم چلے جاؤ یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔۔۔ شائد ماں نے اپنے بیٹے کے منجمد چہرے پر لٹکے ہوئے بالوں کو سنوارا ہو۔۔۔ شاید باپ نے اس کے سرد ماتھے پر بوسہ دیا ہو اور شاید بہن اس سے لپٹ کر آخری مرتبہ چیخی ہو۔۔۔ شائد!

ساری رات خیمے کا ایک حصہ تیز ہوا سے پھڑپھڑاتا رہا۔۔۔ یہ ہوا تھی یا کچھ اور تھا ہم اندازہ نہ لگا سکے۔ بہت دیر کچھ نہ ہوتا' سوائے دریا کے شور اور ہوا کی سرسراہٹ کے اور پھر یکدم کچھ پھڑپھڑانے لگتا۔۔۔ اور ہم خوفزدہ ہو جاتے۔۔۔

رات ہماری توقعات کے برعکس زیادہ سرد نہ تھی۔۔۔ یہ شوکور کی کیمپنگ سائٹ کا کمال تھا کہ یہاں ہوا سے بچاؤ ہو جاتا تھا۔۔۔

رات کے وقت شدید سردی کی وجہ سے گلیشیر بھی آرام سے پڑا رہتا ہے اور اس کے تودے الگ ہو کر دریا میں نہیں گرتے۔۔۔

محمود رات بسر کرنے کے لئے تاپ میدان میں چلا گیا تھا جہاں اس کے خاندان کی بہک تھی۔۔۔ وہ اپنے مال ڈنگر سمیت وہاں مقیم تھے۔۔۔ اور سلطان آگ کے پاس بیٹھا تھا۔۔۔ اس نے الاؤ اس طریقے سے روشن کیا تھا کہ اس کے شعلے پتھروں کو گرم کرتے رہیں اور یوں وہ ان پتھروں کے ساتھ لگ کر سونے کی کوشش کر رہا تھا۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

فیلڈ چوٹی کے نزدیک اور مرکل گلی ... اور نانگا پربت کا جنوبی شانہ ... چوٹی سے ذرا نیچے شانے کی طرح دکھائی دے رہا تھا...

یہ ایک شاندار منظروں والی روشن ترین صبح تھی... اور اسے صرف وہ دیکھتے ہیں جو روشن نصیب ہوتے ہیں...

کیمر خیمے سے باہر آیا اور ٹیلے پر بیٹھ کر دانتوں کو برش کرنے لگا... میں نے تصویر اتاری... پھاڑی ٹوپی اور جیکٹ میں ٹھنڈک سے محفوظ ایک ہاتھ میں ٹوتھ پیسٹ کی ٹیوب اور دوسرے میں برش اور پس منظر میں نیلا آسمان اور نانگا پربت جیسے اس کے کندھے کے اوپر سے جھانکتی ہوئی...

سوکھا دودھ ہمارے بہت کام آ رہا تھا اور سلطان نے ناشتے کے لئے گرم ابلتے ہوئے دودھ میں کارن فلیکس اور چینی ڈال کر ہر کسی کو سروس وہاں دی جہاں کہ وہ تھا... راہی ہم سے کچھ دور ایک بہت بڑے پتھر پر بیٹھا تھا اور کچھ سکیچ کر رہا تھا... کیمر برش کر رہا تھا اور میں اپنا پیالہ تھام کر دو چار احتیاط پسند قدم اٹھا کر چھوٹے ٹیلے پر جا بیٹھا جہاں سے "منظر" دکھائی دیتا تھا... "منظر" ہمیشہ سے میری کمزوری رہا ہے... ہوٹل کی کھڑکی سے کیا نظر آتا ہے... ٹرین کی کھڑکی... جہاز کی ونڈو سیٹ... میں اب بھی منظر دیکھ کر خوش ہوتا ہوں۔ پھر یہ کہ میرے خیمے کا دروازہ منظر پر کھلنا چاہئے... اور اگر میرے پاس کافی کا ایک پیالہ ہے... کھانے کو کچھ ہے تو میں تردد کر کے کسی ایسی جگہ جا بیٹھوں گا جہاں "منظر" ہو... چاہے اس جگہ بیٹھ کر خوف سے گھگھی بندھ جائے اور کافی کا پیالہ ہاتھ سے چھوٹ کر کھائی میں جا گرے... لیکن "منظر" ——— تو یہ وہی پچھلی شب والا ٹیلا تھا جہاں سانس روک کر بیٹھنا پڑتا تھا... لیکن آج منظر چمکیلا اور صاف تھا... اور میں ذرا دلیر ہو کر گردن آگے نکال کر نیچے جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا... ظاہر ہے یہاں سے معاملات دھڑام سے نیچے جا رہے تھے... چند جھاڑیاں تھیں اور پھر گلیشیئر میں سے جنم لیتا ہوا دریائے روپل تھا... ٹیلے سے پورا روپل گلیشیئر نظر آ رہا تھا اور یہ تقریباً ایک کلومیٹر کا علاقہ گھیرے ہوئے تھا... اس پر پتھر اور سنگریزوں کے ڈھیروں کے علاوہ بے شمار دراڑیں تھیں اور دو چھوٹی چھوٹی جھیلیں بھی تھیں... اس گلیشیئر سے پرے ظاہر ہے نانگا پربت تھی اور چوٹی کے عین نیچے ہرلنگ کا بیس کیمپ تھا جہاں ہم نہیں جا سکے تھے...

"صاحب..." سلطان کی آواز آئی اور میں نے پیچھے دیکھے بغیر پوچھا کہ کیا ہے؟

"کافی صاحب ———"

"ٹاپ میدان اور شل مکھ دیا میر"

جیسے شوکور میں رات ہوئی تو یکدم ہوئی ایسے وہاں صبح ہوئی تو یکدم ہوئی... ہمارا زرد خیمہ روشنی سے بھرا ہوا تھا اور اس کی زردی سے ہمارے چہرے زرد ہوتے تھے... کیمر سویا ہوا تھا اور راہی باہر جا چکا تھا...

باہر سلطان گدھوں کے ساتھ محو گفتگو تھا... ہو ہو ——— میں نے پوچھا کیا بات کرتے ہو تو کہنے لگا گدھوں کے ساتھ بات نہ کرو تو ناراض ہو جاتے ہیں۔ میں پوچھ رہا تھا کہ رات کیسی گذری...

"ویسے تمہاری رات کیسے گذری؟" میں نے پوچھا۔

"نیند نہیں آئی صاحب... سردی بہت تھا میں نے صبح صبح آگ جلا لیا تھا بالکل مجبور ہو کر تو چاچا آنکھ ملتا باہر آ گیا تھا کہ کیا ہوا ہے..." سلطان، راہی کو جانے کیوں چاچا کہتا تھا اور جب بھی راہی کسی سخت مقام پر کھڑا ہو کر پسینہ پونچھتا یا سستانے کے لیے بیٹھ جاتا تو سلطان کہتا چاچا ڈاؤن ہو گیا ہے...

اور چاچا راہی نانگا پربت کی جانب چہرہ کئے چپ کھڑا تھا اور میں مخل نہ ہوا کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ بھی محو گفتگو ہے۔

شوکور کی اس صبح میں ساڑھے پانچ بجے ہر شے روشن تھی بلکہ تیز روشنی میں تھی... آسمان پر سوائے گہری نیلاہٹ کے کوئی ایک دھبہ بھی نہ تھا، کوئی پرندہ کوئی بادل کوئی کچھ نہ تھا اور اس نیلے اور خالی سمندر میں نانگا پربت کی سب سے اونچی چوٹی ایک سفید بادبانی کشتی کی طرح دکھائی دیتی تھی... میں نے اپنے پورے سفر میں نانگا پربت کی بہترین تصویریں شوکور میں اس روشن صبح میں اتاریں... مجھے اس برف کے قلعے کا ایک ایک حصہ صاف دکھائی دے رہا تھا... وہاں وی لینڈ آئس فیلڈ ہے... کیمپ ٹو سے پہلے... ویلزین باخ آئس فیلڈ ہے کیمپ فور کے پاس... پھر مرکل آئس

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

میں نے ہاتھ پیچھے کیا اور رگ کی گرمی کو ہتھیلی میں محسوس کرتے ہوئے اس پر انگلیاں لپیٹ دیں... محمود آ چکا تھا اور وہ خیمے کی میخیں زمین میں سے نکال رہا تھا... اور ہاں رات کی خوفناک پھڑپھڑاہٹ کے بارے میں کھلا کہ دراصل ایک میخ ڈھیلی ہو کر نکل گئی تھی اور خیمے کا اتنا حصہ کھل کر ہوا میں پھڑپھڑانے لگا تھا...

کافی ختم کر کے میں اپنی آماجگاہ سے نیچے آ گیا... راہی میرے پاس آیا "تھینک یو تارڑ صاحب" اس نے فوجی انداز میں مجھے سیلوٹ کیا۔

"کس بات کا چاچا؟"

"یہ... نانگا پربت دکھانے کا..."

"چاچا ڈاؤن ہو گیا ہے" میں نے سلطان کی طرف دیکھ کر کہا اور سلطان بے حد راضی ہوا اور ہنسنے لگا۔

محمود گدھے پر سامان لاد رہا تھا "صاحب آج تو سفر کم ہے... دو تین گھنٹے میں پہنچ جائے گا... آپ ادھر ہماری بہک میں لھسو کھانا بھی مل جائے گا..."

یہ عجیب بات تھی کہ پنجاب کے دیہات میں مال مویشی کے ساتھ کھیتوں میں جو بیٹھک ہوتی ہے اسے بہک کہتے ہیں اور یہاں نانگا پربت کے دامن میں بھی یہی لفظ استعمال ہوتا تھا۔

"راہی چاچا رات نیند تو ٹھیک سے آئی؟"...

"ہاں... خیمے میں سونے کا پہلا ٹائم تھا میرا... لیکن میں سوتا رہا... صرف یہ ہوا کہ رات کسی وقت میرا پاؤں کسی رسی میں الجھ گیا۔ میں نے آرام سے چھڑانے کی کوشش کی تو وہ ذرا زیادہ پھنس گیا تو میں نے سوچا شائد کسی شے نے پکڑ لیا ہے تو ذرا پرابلم ہو گیا..."

سلطان پھر راضی ہو کر ہنسنے لگا "رات چاچا ڈاؤن ہو گیا"...

ہم روانہ ہونے لگے تو میں نے سلطان سے انڈوں کی پوٹلی کے بارے میں پوچھا... وہ کچھ شرمندہ سا ہوا اور پھر ٹوپی اتار کر بالوں میں کھجلی کر کے کہنے لگا "صاحب ایک ٹوٹ گیا"

"اور باقی رہ گئے چار..." سمیر نے کہا۔

"انشاء اللہ اب بالکل نہیں ٹوٹے گا" سلطان نے اپنے سینے پر زور سے ہاتھ مار کر کہا اور اب یہ اس کی عزت کا سوال تھا۔ اس نے پوٹلی کو ایک شاہی عصا کی طرح اٹھایا اور اسے نظروں کے سامنے رکھ کر چلنے لگا...

"تارڑ صاحب میرے پاس الرجی کی دوا ہے بہت اچھی، آپ کو چاہئے؟"

"نہیں... اور میرے پاس بہت ساری دوائیں ہیں آپ کو چاہئے؟"

"جب چاچا ڈاؤن ہو گا پھر چاہئے ابھی نہیں..." راہی ہنسنے لگا...

سلطان، محمود دونوں گدھے اور سمیر آگے آگے... پھر سلطان اور انڈوں کی پوٹلی... اس کے پیچھے راہی اور سب سے پیچھے ٹیپو سلطان... اس لئے کہ میں ہمہ وقت قمیض شلوار کے ساتھ کپڑے کا ایک بڑا ہیٹ پہنے رکھتا تھا... روپل کے راستے میں جب میں ایک پہاڑی سے نیچے اتر رہا تھا تو راہی نے دور سے مجھے دیکھا اور پھر کہنے لگا "آپ جب ادھر سے نیچے آ رہے تھے تو آپ کا لباس ہوا میں اڑتا تھا اور ہیٹ کا زاویہ ایسے تھا جیسے ٹیپو سلطان کی پگڑی کا ہوتا تھا... تو لگتا تھا کہ بادشاہ سلامت تشریف لا رہے ہیں..." راہی نے یہ بات ہونٹ بھینچ کر اتنی سنجیدگی سے کی تھی کہ میں یہ نہ جان سکا کہ یہ بنگالی بابو مذاق کر رہا ہے یا واقعی سنجیدہ ہے... لیکن جب میں نے راہی کو اچھی طرح جانا تو یہ جانا کہ وہ بڑی معصومیت سے آپ کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ کر آپ کو چاروں شانے چت کر دیتا ہے اور پھر بڑے بھولپن سے چاروں طرف دیکھتا ہے کہ اسے کس نے گرایا ہے...

ہماری کیمپنگ سائٹ کے قریب ہی وہ گلیشیر تھا جس کا ذکر سمیر نے کیا تھا... یہ ایک عام اور بیہودہ سا گلیشیر تھا جس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا سوائے اس کے کہ یہ ایک گلیشیر تھا اور جس پر راہی نے حسب روایت ایک جاپانی سمورائے یا خوفناک قاتل کی طرح کمر پر ہاتھ رکھ کر خلاؤں میں گھورتے ہوئے تصویر اتروائی...

گلیشیر کے بعد پتھروں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا جس میں ذرا احتیاط سے چلنا پڑتا تھا۔ دائیں طرف روپل گلیشیر کے سیاہ ہاتھی سر جوڑے زور لگا رہے تھے اور دھوپ کی وجہ سے برف پگھل رہی تھی اور بڑے بڑے ٹکڑے گونج کے ساتھ نیچے گرتے جا رہے تھے... آسمان میں نیلاہٹ کی بجائے غیر واضح دھند نما بادل پھیل رہے تھے... نانگا پربت کے مختلف حصوں پر الگ الگ بادل دھوئیں کی طرح اٹھنے لگے تھے... پتھروں کے سلسلے کے بعد ایک راستہ سامنے آیا جو جھاڑیوں اور درختوں میں سے گذر کر پہاڑ کے ساتھ اونچا ہو رہا تھا اور مختصر ہو رہا تھا... اتنا مختصر کہ اس پر چلنے کا سوچ کر ہمارے ماتھے پسینے سے بھیگے۔ جہاں سے راستہ اونچا ہوتا تھا وہاں محمود اور گدھے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ "صاحب میں آگے جاتا ہوں، ٹاپ میدان میں

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

گدھوں کے ساتھ۔ آپ آرام کے ساتھ آؤ۔ میں وہاں پہنچ کر آپ کے لئے چائے بکواؤں گا۔۔۔ ٹھیک ہے صاحب؟"

میرے سر ہلانے پر وہ گدھوں کو ہانکتا اس تنگ پگڈنڈی پر چڑھنے لگا اور مجھے ان گدھوں کو ذرا ڈولتے ہوئے چلتے دیکھ کر خدشہ ہوا کہ یہ گریں گے۔۔۔ اور مجھے گدھوں سے زیادہ اپنے سامان کی فکر تھی۔۔۔ ہماری رہائش اور خوراک اور لباس اسی سامان میں تھے۔۔۔ اور اگر گدھا سامان سمیت نیچے روپل گلیشیئر پر گرتا ہے تو پھر وہاں سے سامان واپس لانا ممکن نہ تھا۔۔۔ جب محمود اور گدھے بحفاظت وہاں سے گزر گئے اور ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے تو ہم بھی اس تنگ پگڈنڈی پر چڑھنے لگے۔ یہ راستہ نہ صرف تنگ تھا بلکہ ہموار ہونے کی بجائے اس میں گلیشیئر کی جانب جھکاؤ تھا۔ چنانچہ قدم اٹھاتے ہوئے بدن کا جھکاؤ خواہ مخواہ گلیشیئر کی جانب ہوتا۔۔۔ راستہ اونچا ہوا اور پھریوں دکھائی دیا جیسے اس کے آگے کچھ نہیں ہے۔۔۔ اس مقام پر پہنچے تو راستہ نیچے اترتا تھا لیکن چند میٹر کی ڈھلوان کے بعد اترتا تھا۔۔۔ اس ڈھلوان پر سے ہم کھڑے ہو کر نہیں بلکہ سلطان کا ہاتھ پکڑ کر' بیٹھ کر موٹی بطخوں کی طرح اپنے آپ کو آگے کھینچتے ہوئے اترے۔ اس خطرناک حالت میں بھی ڈھلوان میں سے نکلتے ہوئے گلابی پھولوں کے گچھے خوبصورت لگ رہے تھے۔ تھوڑی دیر رکنے کے بعد ہم اس جگہ کے عین اوپر کھڑے تھے جہاں سے روپل گلیشیئر کا آغاز ہوتا تھا اور ایک تیز نالہ گلیشیئر کے اندر جا رہا تھا۔۔۔ چنانچہ شوکور کے نیچے جو نالہ گلیشیئر میں سے نکلتا تھا وہ یہی تھا اور اس کا منبع روپل گلیشیئر میں تھا۔۔۔ اب آسمان بڑا ہونے لگا اور ہم جس پہاڑ سے چپٹے چلتے تھے اس کی بلندی پرے ہوتی گئی اور کم ہوتی گئی۔۔۔

ہم نے یہیں سے تاپ میدان کی پہلی جھلک دیکھی۔۔۔

ہم پہاڑ سے الگ ہو کر ایک پتھریلی سرزمین پر چلنے لگے جس میں کہیں کہیں نالے عبور کرنے پڑتے تھے۔ روپل گلیشیئر کے اندر جانے والا نالہ ہم سے دور ہو گیا۔۔۔ تقریباً آدھ گھنٹہ چلنے کے بعد ہم تاپ میدان کے قریب پہنچ گئے اور ہم اس کے کنارے پر تھے۔۔۔

اور ہم شاید ۱۹۸۹ء میں وہاں نہیں تھے۔ ہم کسی اور زمانے کے مسافر تھے جو کسی کارواں کے ہمراہ یہاں پہنچے تھے۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ یہ جگہ موجود ہے۔ یہ ہماری منزل نہ تھی۔ بلکہ اسے دیکھتے ہوئے ہمیں یقین تھا کہ ہم دوبارہ یہاں نہیں آئیں گے کیونکہ ایسی جگہیں صرف ایک بار دکھائی دیتی ہیں اور پھر کہیں اور منتقل ہو

جاتی ہیں۔۔۔

تاپ میدان وسط ایشیا کی ایک وسیع چراگاہ کی طرح تھا۔۔۔ اس کے وسیع سبزہ زار میں ایک دریا بہتا تھا اور زمین کے ساتھ لگ کر بہتا تھا اور اس میں چھوٹے نالے اور نالیاں شامل ہوتے تھے۔۔۔ زمین پانی کی بہتات کی وجہ سے اسفنج کی طرح نرم تھی اور اس میں لمبی لمبی گھاس اگ رہی تھی۔۔۔ دریا کے پار پورے تاپ میدان پر سایہ فگن نانگا پربت کا سفید شہر تھا۔۔۔ اس کی چٹانیں اس کی برفیں اور اس کی بلندیاں تھیں اور ان پر دھند تھی۔۔۔ گھاس کے وسیع قطعات میں مویشی چر رہے تھے۔۔۔ اس ڈھلوان پر جس پر ہم چل رہے تھے بلندی کی جانب چرواہوں کے جھونپڑے اور مویشی خانے تھے اور ان کے بچے شور مچاتے بھاگتے چلے جاتے تھے۔۔۔ اور ہمیں حیرت سے دیکھتے تھے۔۔۔ ہم واقعی کسی اور زمانے کے مسافر تھے کیونکہ یہ عظیم منظر قدامت میں رچا ہوا تھا۔۔۔ ایک ایسی چراگاہ جو دنیا کے بلند ترین پہاڑوں میں سے ایک کے دامن میں پوشیدہ ہے۔۔۔ جہاں ایک ایسی وسعت ہے جس کے اندر داخل ہو کر انسان جھجکنے لگتا ہے' قدرے خوفزدہ ہو جاتا ہے اور اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا۔۔۔ مارکوپولو یا ابن بطوطہ ایسے ہی مناظر میں داخل ہوتے ہوں گے۔۔۔ اور تاپ میدان کا یہ منظر ہزاروں برسوں سے ایسے ہی تھا۔۔۔ یہاں کوئی چیز ایسی نہ تھی جو وقت اور عہد کی غمازی کرتی۔۔۔ چرواہوں کے اپنے ہاتھوں سے تعمیر کردہ لکڑی کے مکان۔۔۔ عورتوں اور بچوں کے لباس۔۔۔ ان کے چہروں کی حیرت۔۔۔ دریا اور نالے اور نانگا پربت کی چوٹیاں جن پر دھند اتر رہی تھی۔۔۔ صرف ہم تھے جو اس عظیم چراگاہ میں وقت اور عہد لے کر داخل ہو رہے تھے۔ ہمارے رک سیک' لباس اور شہری چہرے۔۔۔

"رک جاؤ بابا رک جاؤ۔۔۔" راہی سر اٹھائے کبھی نانگا پربت کی برفوں کو دیکھتا تھا اور کبھی اس وسیع میدان کو جس کے کنارے پر ہم چل رہے تھے۔۔۔

ڈھلوان کے اوپر چرواہوں کے جو پانچ سات جھونپڑے تھے ان کے باہر محمود کھڑا ہمیں ہاتھ ہلا رہا تھا۔۔۔ ہم گلیشیئر کے پانیوں کو پھلانگتے اس کی جانب چلنے لگے۔۔۔ اور وہ نیچے آنے لگا۔۔۔ اس کے پیچھے چھوٹے چھوٹے بچوں کا ایک غول تھا جو "مٹھی مٹھی" کا شور مچاتا تھا۔۔۔ ادھر جو کوہ پیما ٹیمیں آتی ہیں وہ عام طور پر مقامی بچوں میں خیر سگالی کے طور پر سویٹس تقسیم کرتے ہیں اور یہ بچے ہمیں بھی غیر ملکی سمجھ رہے تھے۔ اور یہ حقیقت تھی کہ ہم باہر سے آئے تھے۔۔۔ ہم واقعی کسی اور ملک کے تھے۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

محمود نے سرسبز ڈھلوان پر یاک کی اون سے بنا ہوا ایک غالیچہ بچھا رکھا تھا۔ اس پر چائے تھی۔۔۔ اور چائے دانی میں سے بھاپ نکلتی تھی اور ایک گندے دسترخوان میں لپٹے پراٹھے ابھی گرم تھے۔

ہم غالیچے پر بیٹھ گئے۔۔۔ گھاس کی سردی یاک کی اون میں سے سفر کرتی تھی۔ اور اس چراگاہ میں چائے کا ذائقہ کچھ اور تھا اور کہیں اور سے آیا تھا اور پراٹھے کے ساتھ گرم چائے کا ایک گھونٹ نانگا پربت کی سرد ہواؤں کے سامنے بھی بس کچھ اور تھا اور پتہ نہیں کہاں سے آیا تھا۔۔۔

ٹاپ میدان کے درمیان میں جو دریا بہتا ہے وہ بھلنت اور مازینو سے آتا ہے اور اس کا نام "تاپ نی سن" ہے لیکن باہر کے لوگ اسے دریائے روپل کہتے ہیں۔

ٹاپ میدان کے دائیں جانب ترشنگ گلیشیر کی مانند ایک اونچا کنارہ ہے اور اس کے برابر میں جو پہاڑی ہے وہ سمیل کہلاتی ہے۔ یہاں جو چیڑ نما درخت ہیں اور جنہیں جلا کر مقامی چرواہے سردیوں کے لیے کوئلہ بناتے ہیں ان کا نام "چھلی" ہے۔

کسی زمانے میں گریجال موس نامی ایک جانور اس میدان میں پایا جاتا تھا جو عقاب کی مانند تھا۔

اور یہ چوٹی نانگا پربت صرف ہمارے لیے ہے۔ مقامی آبادی اسے "شل کھی دیا میر" کہتی ہے' شل کھی سو چہروں والا پہاڑ۔۔۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کا ایک چہرہ چلاس سے دکھائی دیتا ہے' دوسرا جنگوٹ سے۔۔۔ تیسرا ترشنگ سے۔۔۔ اور۔۔۔ اس طرح اس کے سو چہرے ہیں۔۔۔ یہ پہاڑ مقامی لوگوں کے لیے ایک بڑے بوڑھے کی طرح ہے۔۔۔ ایک مہربان بزرگ ہے جس کے دامن میں وسیع چراگاہیں ہیں جہاں کبھی پانی کی کمی نہیں ہوتی۔ اس کے چشمے لاتعداد ہیں اور اس کی ہوا میں تندرستی ہے۔ شادی کے موقع پر ماں اپنی دولہن بیٹی کی تعریف کرتی ہے تو اسے "میری دیامیر جیسی" کہتی ہے یعنی میری نانگا پربت کی طرح اونچی اور لمبی بیٹی۔

سامنے نانگا پربت کے پہلو میں ایک سرسبز پہاڑ ہے جس کا نام "کھل" ہے جس کے معنی ڈھلوان کھلیان کے ہیں۔ وہاں کاشت کے لیے لوگ جاتے ہیں اور وہیں کھل کے علاقے میں "مسر" بوٹی بہتات میں پائی جاتی ہے۔ اسے خوشبو کے لیے جیب میں رکھتے ہیں اور اگر کپڑوں میں رکھی جائے تو انہیں کیڑا نہیں لگتا۔۔۔ مقامی لوگوں کی اکثریت اپنی چھوٹی موٹی بیماریوں کے لیے جڑی بوٹیاں استعمال کرتی ہے۔۔۔

تو ہم اسی' ٹاپ میدان میں یاک کے بالوں کے ایک غالیچے پر بیٹھے تھے۔ اپنے سامنے کے اس منظر پر نظر رکھتے تھے جو ہمارے نصیب میں تھا اور حلق کو گرمائش دیتی چائے ہمارے بدن میں اترتی تھی۔۔۔ پھر ایک گڑگڑاہٹ ہوئی اور چند بھیڑیں خوفزدہ ہو کر منہ اٹھائے ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔ اس مقام تک نظروں کو پہنچنے کے لیے کچھ وقت لگا' نانگا پربت کی چوٹی کے قریب سے برف کا ایک تودہ ایک طوفان کی صورت نیچے آرہا تھا اور اس کا سفید سفوف دھند کی صورت اٹھ رہا تھا۔۔۔ میں پہلے تو "کہاں ہے۔۔۔ کہاں ہے ابو" کہتا نانگا پربت کے پورے سلسلے پر طائرانہ نظر ڈالتا تھا لیکن پھر اس کی نظریں بھی اس مقام تک جا پہنچیں۔۔۔ جو چٹانیں لمحہ بھر پہلے ننگی تھیں وہ برف سے ڈھکی جا رہی تھیں۔ یہ طوفان پل دو پل کے لیے تھا لیکن باریک برف بہت دیر تک بادل کی صورت چوٹی کے قریب معلق رہی۔۔۔

صاحب آپ ادھر رات گذارو ہمارے جھونپڑے میں۔۔۔ آپ کو کمرہ دیں گے" محمود کی آرزو ہچکچاہٹ کا شکار تھی۔

"ہم کمرے سے بھاگ کر تو ادھر آیا ہے۔۔۔" راہی مسکراتا ہوا کہنے لگا "ہاں اگر بارش ہوا تو پھر ہم بھاگ کر آ جائے گا تمہارے کمرے میں کیونکہ ہمارا ٹینٹ بہت باریک ہے۔۔۔ اچھا تو ادھر اصلی بیس کیمپ کونسا ہے نانگا پربت کا؟۔۔۔"

سلطان ولی حسب عادت زمین پر لکیریں کھینچنے لگا لیکن وہاں نمی بہت تھی "یہ ادھر سب جگہ کیمپ لگتا ہے۔۔۔ جاپانی زیادہ تر ادھر ہیرنگ میں جاتا ہے' اس طرف۔۔۔ اگر گلیشیر سخت ہوا تو آپ کو ادھر بھی لے جائے گا۔ پھر یہ سامنے درختوں کے پیچھے چٹانوں کے بالکل نیچے شی گیری ہے یہاں پر جرمن بھی آکر کیمپ کرتا ہے۔ ادھر لاتو بو میں بھی بیس کیمپ ہے۔ ادھر جاپانی لوگوں کی قبریں بھی ہیں۔۔۔ تو یہ سب جگہ بیس کیمپ ہے۔۔۔"

نانگا پربت کے روپل چہرے یا جنوبی چہرے کی اصل وجہ شہرت چوٹی سے لے کر نیچے بیس کیمپ تک کا وہ چٹانی چہرہ ہے جو ساڑھے چار ہزار میٹر بلند ہے۔۔۔ دنیا میں کسی جگہ کسی بھی پہاڑی سلسلے میں کوئی ایسا مقام نہیں جہاں آپ کھڑے ہوں اور آپ کے سامنے ایک چٹان ساڑھے چار ہزار میٹر تک کی اونچائی کی ہو۔ یہ ایک ناقابل یقین منظر ہے اور کئی سیاح صرف اس راک فیس یا دنیا کی بلند ترین چٹان کو دیکھنے آتے ہیں۔۔۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

ہم ٹاپ میدان میں دنیا کی صاف ترین ہوا کی تازگی میں سانس لے رہے تھے اور یاک کے نمدے پر براجمان اس وسط ایشیائی طرز کی چراگاہ کی وسعت میں تھے اور فراموش کر چکے تھے کہ ہم نے ابھی وہاں سے کچھ دور لاتوبو جا کر کیمپ کرنا ہے ۔۔۔ لیکن ہم نے یہ ارادہ بھی کر لیا کہ کم از کم ایک رات ہم ٹاپ میدان کی چراگاہ میں بھی بسر کریں گے۔

ہم بہت دل گرفتہ ہو کر نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ بیٹھے۔۔۔ یہ کیسی نشست تھی جو یاک کے نمدے پر تھی، گیلی گھاس پر تھی لیکن میرے لیے تخت شاہی سے کہیں شاندار تھی۔۔۔ ہر روز سیاح کسی اور وقت کسی اور عہد میں داخل نہیں ہوتا۔۔۔

"لاتوبو بیس کیمپ نانگا پربت"

لاتوبو جانے کے لیے ہم نے ایک جھولتا ہوا شہتیروں کا پل عبور کیا جو کہ دریائے روپل پر تھا۔۔۔ اور یہاں یہ صرف ایک چھوٹے سے اگرچہ تیز و تند نالے کی صورت میں بہتا تھا۔ یہی نالہ آگے جا کر ٹاپ میدان میں پھیل جاتا ہے۔ یہاں چیلی یا پھلنت کے درختوں کا ایک جھنڈ تھا جس کے اندر ایک راستہ جا رہا تھا۔ کچھ لوگ لکڑی سے کوئلہ بنانے کی خاطر درخت کاٹ رہے تھے۔۔۔ ایک روز میں نے ایک بہت بڑا الاؤ دیکھا جو دہک رہا تھا اور چرواہوں کی کوشش تھی کہ یہ جلد از جلد ٹھنڈا ہو کر کوئلے میں تبدیل ہو جائے کیونکہ اس دوران اگر ہوا تیز ہو جائے تو لکڑی اتنی تیزی سے جلتی ہے کہ راکھ ہو جاتی ہے۔۔۔ میں نے سلطان سے کہا کہ یہاں لوگ درخت کاٹتے رہتے ہیں تو اس طرح یہ ذخیرہ ختم ہو جائے گا۔ کہنے لگا' نہیں یہاں درخت صرف کاٹتے نہیں بلکہ لگاتے بھی ہیں۔ یوں بھی چیلی بہت تیزی سے بڑھتا ہے۔

ذخیرے میں سے گذر کر ہم نیچے اترے اور دائیں جانب نانگا پربت کے نیچے ایک بلند پہاڑی کے دامن میں ہم نے "لاتوبو" کو دیکھا۔۔۔ "لا" کا مطلب ہے نیچے یا نشیب اور "توبو" کے معنی ہیں گھریا چٹانوں سے گھرا ہوا۔۔۔ نشیبی گھریا ایک ایسا نشیب جو چٹانوں سے گھرا ہوا ہے۔ اور یہاں واقعی ٹاپ میدان کی وسعت اور تیز ہوا نہ تھی بلکہ ہم ذرا الگ ہو کر پردے میں آ گئے۔۔۔ اس پھیلاؤ کے بعد ہمیں یہاں تنگی کا احساس ہوا۔۔۔ ہم لاتوبو کو دیکھ کر کچھ مایوس ہوئے۔۔۔ اور ہر وہ شخص ہو گا جو ٹاپ میدان میں سے گذر کر ادھر آئے گا۔

یہاں ایک بڑے پتھر کے قریب جسے ہم نے باباجی کا نام دیا اپنا سامان رکھا۔۔۔ دونوں سلطان خیمہ نصب کرنے لگے۔

خیمے کے حوالے سے ہمارا جغرافیہ کچھ یوں بنتا تھا کہ ہم جس پہاڑی کی اوٹ

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

میں تھے اس کا جنگل خیمے کے قریب تک آتا تھا۔۔۔ پہاڑی نانگا پربت کا ایک حصہ تھی اور یہاں سے نانگا پربت کا دیدار ذرا مشکل سے ہوتا تھا کیونکہ وہ عین ہمارے سروں پر معلق تھی۔ پہاڑی پر بھلنت یا چیل درختوں کا ذخیرہ تھا۔

خیمے کے سامنے "منظر" تھا۔۔۔

ذرا نیچے اتر کر "لاتوبو" کا وسیع میدان تھا جس کے نصف حصے میں گھاس تھی اور بقیہ حصے میں کنکر اور خشک مٹی۔۔۔ ان سے پرے ایک نامعلوم وسعت تھی جس کے اختتام پر برف پوش پہاڑوں کا ایک سلسلہ تھا۔ ان میں روپل پیک اور لالی پیک نمایاں تھیں۔۔۔ یہ نام لالی پیک کیا ہے؟ اس کے بارے میں میں لاعلم ہوں کیونکہ یہ معلومات میں نے سلطان سے حاصل کی تھیں اور جب بھی میں پوچھتا کہ سلطان اس چوٹی کا نام کیا ہے؟ وہ کہتا "لالی پیک"۔۔۔ میں کہتا یہ تو کوئی نام نہیں۔ ایک مرتبہ' پھر کہو تو وہ ایک مرتبہ پھر بڑے واضح الفاظ میں دوہراتا "لالی پیک۔۔۔" اس سارے "منظر" میں جو اصل منظر تھا وہ لاتوبو کے میدان میں کسی دودھیا سانپ کی طرح بل کھاتی ایک ندی تھی۔۔۔ اس کی چوڑائی چار پانچ فٹ سے زیادہ نہ تھی لیکن اس کے پانی ایسے شفاف تھے کہ انہیں دیکھنے کے لیے غور کرنا پڑتا تھا۔۔۔ یہ ندی میدان کے دائیں ہاتھ پر نانگا پربت کے عین نیچے واقع چند گھروں اور مویشیوں کے ایک باڑے پر مشتمل لاتوبو گاؤں کی ایک چٹان کے نیچے سے نکلتی تھی۔

اور یہ ایک قدرتی چشمہ تھا۔۔۔

اور اس ندی کا نام سمٹ ہے۔

لاتوبو کے بچے بڑے پتھر "باباجی" پر براجمان ہمیں دیکھ رہے تھے۔۔۔

خیمہ نصب ہو گیا تو ہم نے اپنا سامان اس میں رکھا۔۔۔ اور پرسکون ہو گئے کہ یہ ہمارے سفر کی آخری حد تھی۔۔۔

سلطان کافی بنانے کے لیے ندی سے پانی لینے چلا گیا۔۔۔

سمیر بھی بے حد خوش تھا۔۔۔ کیونکہ اس نے اتنے دشوار سفر میں میرا ساتھ دے کر اپنی "مردانگی" ثابت کر دی تھی اور دوسری وجہ اس کے پاس تھی اور میں نے اس سے پیشتر اس پر غور نہیں کیا تھا۔۔۔ گھر سے چلتے ہوئے لاہور میں ہمارے سامان کے ساتھ ایک چھوٹا سا پاکستانی پرچم بھی پیک کیا گیا تھا۔ اس پرچم پر "تارڑ" لکھا تھا اور اس کے نیچے میمونہ - سلجوق - قرۃ العین - سمیر اور میرے دستخط تھے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ہم یہ پرچم نانگا پربت کے بیس کیمپ میں لہرائیں گے چنانچہ سمیر نے وہ پرچم

نکالا اور کہنے لگا "ابو ہم بیس کیمپ میں پہنچ گئے ہیں ناں؟"

"بالکل۔۔۔۔"

"اور یہ جو آپ کے اوپر برف کا پہاڑ ہے یہ نانگا پربت ہے ناں؟۔۔۔ تو پھر میں تارڑ خاندان کی جانب سے اپنے خیمے کے اوپر پاکستانی پرچم لہراتا ہوں۔۔۔" اس نے پرچم کو خیمے کے راڈ کے ساتھ باندھا اور پھر ہم دونوں نے مل کر "پاکستان زندہ باد" کا فلک شگاف نعرہ لگایا۔۔۔

"اور اب میں آپ کو ایک زبردست بات بتانے لگا ہوں۔۔۔۔" سمیر بے حد پر مسرت تھا "کیا آپ جانتے ہیں کہ میں نانگا پربت کے بیس کیمپ تک پہنچنے والا سب سے کم عمر پاکستانی ہوں۔۔۔؟" وہ میرے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا اور اس کے پیچھے دنیا کی بلند ترین اور کوہ پیمائی کے حوالے سے دنیا کی مشکل ترین چوٹی کی لازوال برفیں تھیں جن پر دھند اترتی تھی۔۔۔

"کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو۔۔۔؟" مجھ میں بے یقینی تھی۔۔۔

"ہاں۔۔۔۔" اس نے زور زور سے سر ہلایا۔ "ہمارے دونوں سلطان یہ کہتے ہیں کہ مجھ سے چھوٹی عمر کا کوئی لڑکا آج تک ادھر نہیں آیا۔۔۔ صرف ایک آٹھ سالہ بچہ آیا تھا جس کی ماں جرمن تھی اور باپ پاکستانی لیکن وہ خود چل کر نہیں آیا تھا بلکہ پورٹر اسے اٹھا کر لایا تھا اور میں تو خود چل کر آیا ہوں ابو۔۔۔ پھر میں نے راستے میں بہت سارے لوگوں سے پوچھا۔۔۔ آپ کو یاد ہے 'ناپ میدان میں جو بوڑھے ملے تھے جو رسیاں بٹ رہے تھے اور میں ان سے بہت دیر باتیں کرتا رہا تھا۔۔۔ انہوں نے بھی یہی کہا ہے۔۔۔ وہ پچاس برس سے گرمیوں کے موسم میں ادھر آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم سب سے چھوٹے پاکستانی ہو جو ادھر آئے ہو۔۔۔"

ہاں سلطان نے شوکور میں اس قسم کی بات کی تھی۔۔۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا۔۔۔ سمیر نانگا پربت کے روپل سائڈ کے بیس کیمپ تک پہنچنے والا سب سے کم عمر پاکستانی۔۔۔ عمر چودہ برس نویں جماعت کا طالب علم۔۔۔ لیکن یہ ہو بھی تو سکتا تھا۔۔۔

میرے سامنے سمیر کا مسرت سے دمکتا چہرہ تھا۔۔۔ خیمے کے راڈ پر پاکستانی پرچم اور پس منظر میں۔۔۔۔ نانگا پربت!

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"شکاری یار محمد اور لاتوبو کا آخری ہرن اور نانگا پربت کی جھیل"

شکاری یار محمد نے ابھی کل شام لاتوبو کا آخری ہرن مارا تھا....

اور اب وہ درختوں کی شاخوں تلے جھکتا کہیں پھسلتا اور کہیں "احتیاط صاحب" کا مشورہ دیتا اس پہاڑی پر چڑھ رہا تھا جس کے پاؤں میں ہمارا خیمہ تھا اور ہم رک کر جب بھی دیکھتے تو وہ پہلے سے مزید چھوٹا نظر آتا کہ ہم آہستہ آہستہ بلند ہو رہے تھے۔ یہ پہاڑی اتنی چھوٹی نہ تھی جتنی کہ خیمے سے نظر آتی تھی۔

اور ہم پہاڑی پر کیوں چڑھ رہے تھے؟ اس لیے کہ اس کے اوپر جو گلیشیئر تھا نانگا پربت کا ایک حصہ تھا اور اس کے اختتام پر ایک جھیل تھی.... اور جھیل میں کشش ہوتی ہے.... اور میں نے ایک گائیڈ بک میں پڑھا تھا کہ اسے نانگاپربت کی اکلوتی جھیل کہا جاتا ہے۔

ہم شکاری یار محمد سے زیادہ خوش نہ تھے.... اگر وہ لاتوبو کے میدان اور ٹاپ میدان میں چوکڑیاں بھرنے والے آخری ہرن کو ہلاک نہ کرتا تو شاید آج ہم اسے جھیل کنارے پانی پر جھکا ہوا دیکھ لیتے.... اگر نہ بھی دیکھتے تو ہمیں اس کی موجودگی کا احساس رہتا۔ ہم یہ کہہ سکتے تھے کہ لاتوبو میں ہرن پائے جاتے ہیں.... لیکن یار محمد کی بندوق نے ہم سے یہ احساس چھین لیا....

ہم سانس لینے کے لیے رکے۔

یار محمد آج اس وقت ہمارے پاس آیا جب محمود شام کی روٹی لینے کے لیے ٹاپ میدان کی طرف چلا گیا تھا اور سلطان ہمارے کہنے پر دیوسائی میدان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے گیا تھا.... ویسے سلطان اس بات پر راضی تھا کہ وہ دیوسائی عبور کرتے ہوئے ہمارے ساتھ ہو گا.... تو ہم اپنے خیمے کے سامنے بیٹھے تھے.... اور یار محمد آ گیا۔ قمیض شلوار' کوٹ ٹوپی' داڑھی اور بندوق سے لیس.... اسے یقین تھا کہ نانگا پربت کے دامن میں کھل نامی جو چراگاہ ہے اس کے اوپر سنو لیپرڈ یا برفانی چیتا موجود ہے.... اور تب اس نے اپنے تئیں ایک کارنامہ بیان کیا کہ کل میں نے لاتوبو کا آخری ہرن ہلاک کیا تھا....

"یار محمد تم نے اسے کیوں مارا؟ اللہ کی مخلوق تھا اودھر ٹاپ میدان میں چوکڑیاں بھرتا خوبصورت لگتا ہو گا.... تم نے اس کی نسل ختم کر دی"

"نسل بالکل ختم نہیں کی...." یار محمد نے داڑھی پر ہاتھ پھیرا "ابھی وہ مادہ نہیں نر ہرن تھا" "اس کے باوجود وہ دو چار دن تو زندہ رہتا اور اودھر اس سامنے والی ندی کے کنارے شام ڈھلے جب وہ پانی پینے آتا.... تو...."

لیکن یار محمد ہرنوں کے معاملے میں مرد ناداں تھا اور اس پر ہمارا کلام نرم و نازک بے اثر ثابت ہو رہا تھا.... اس کے ذہن میں یہ شائبہ بھی نہ تھا کہ اس نے آخری ہرن کو ہلاک کر کے کوئی جرم کیا ہے.... بلکہ ایک معمولی ہرن کے لئے ہماری بے پناہ فکرمندی اس کی سمجھ سے باہر تھی.... اور جب ہماری فکرمندی اس کے لیے ناقابل برداشت ہو گئی تو کہنے لگا "ضائع تو نہیں کیا ہے.... اس میں سے مشک نافہ نکالا اور پھر گوشت سب کو کھلایا۔ آپ بھی اگر کل شام آتا تو گوشت کھلاتا......"

"اور اس مشک کی تھیلی کہاں ہے؟"

"گھر میں ہے...."

"اسے کیا کرو گے؟"

"تھوڑی سی مشک تو گھر میں رکھے گا خوشبو کے لیے.... پھر تھوڑی سی مشک سے ایک کشتہ بنائے گا اور باقی چار پانچ سو میں بیچ دے گا...."

یار محمد نے نہ صرف ایک ہرن مارا تھا بلکہ ایک ایسا ہرن مارا تھا جسے انگریزی میں "مسک ڈیئر" کہتے ہیں اور بہت نایاب نسل ہے۔ میں نے بچپن میں جغرافیہ کی ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ مسک ڈیئر ہمالیہ کے دامن میں پایا جاتا ہے.... اور نانگا پربت ہمالیہ میں تھی.... یار محمد نے نانگا پربت کا جغرافیہ غلط کر دیا تھا۔

اگر ہم مشک نافہ والے ہرن کا قتل بھول جائیں تو یار محمد بہت نفیس آدمی تھا....

اور ہاں ایسے ہرن کے منہ سے دو سفید دانت باہر نکلے ہوتے ہیں اور یوں شکاری دور سے جان لیتے ہیں کہ اس کے اندر مشک نافہ ہے۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

ہمارا خیال تھا کہ اوپر جھیل ہے تو جھیل کو کوئی چھوٹا موٹا راستہ جاتا ہو گا لیکن یہاں کچھ بھی نہیں جا رہا تھا صرف ہم جا رہے تھے یار محمد کے پیچھے پیچھے اور جھیل دیکھنے کے فیصلے پر پشیمان ہو رہے تھے کیونکہ یہاں بھی درختوں اور جھاڑیوں کے باوجود پاؤں ادھر کی بجائے ادھر پڑنے سے فوری طور پر نیچے خیمے تک پہنچا جا سکتا تھا... بالآخر جھاڑیاں ختم ہوئیں اور ایک خشک کنارا دکھائی دیا اور ہم اس پر بمشکل چڑھے... اور جب کنارے کے اوپر پہنچے تو وہاں بھی معاملات پیچیدہ تھے کیونکہ یہاں بیٹھنے یا شرافت سے کھڑے رہنے کے لیے جگہ نہ تھی... اور وہاں سے دوسری جانب جھیل تھی... اور جھیل تک پہنچنے کے لیے سوائے الٹ بازیاں لگاتے ہوئے لڑھکتے جانے کے اور کوئی طریقہ نہ تھا... کیونکہ بھربھرے پتھر تھے اور راستہ نہ تھا... اور پھر جھیل بھی خیالے رنگ کے پانی کی تھی اور اس کے کنارے خشک تھے... بڑی سخت مایوسی ہوئی کہ نانگا پربت کی اکلوتی جھیل اور اس کی یہ شکل صورت' اس سے تو ہنسٹریال کے نزدیک ایک گاؤں کے جوہڑ زیادہ خوبصورت تھے... لیکن یہاں اس کنارے سے اگر آپ اپنے آپ کو زیادہ دیر تک وہاں معلق رکھ سکیں تو نانگا پربت سے آپ براہ راست مخاطب ہوتے ہیں کیونکہ وہاں یا وہ ہے یا آپ ہیں... ایک گلیشیئر براہ راست نیچے آتا ہے اور پھر آخر میں صرف پتھر رہ جاتے ہیں اور گلیشیئر کے پانیوں سے یہ جھیل وجود میں آتی ہے۔ یہاں ہم نے چند تصویریں بنائیں اور میں نے راہی کو بڑی مشکل سے اس بات پر راضی کیا کہ وہ اپنے معمول کے پوز یعنی اکڑے ہوئے سمورائے جاپانی انداز میں کمر پر ہاتھ رکھ کر نانگا پربت کو گھورتا ہوا تصویر نہ اتروائے کیونکہ اگر اس نے ایسا کیا تو تصویر صرف نانگا پربت کی آئے گی... اور اس کی جو تصویر ہمارے پاس ہے اس میں ہم مسکرا تو رہے ہیں لیکن اندر سے ہماری روح قبض ہو چکی ہے کہ جس مقام پر ہم معلق ہیں اگر ذرا سانس گہرا لیا یا ہوا کا جھونکا آیا تو کہاں جائیں گے۔

نانگا پربت پر ہلکی دھند اور بادل تھے اور یہ بادل پھیلتے ہوئے ہم تک آ رہے تھے...

"اچھا جھیل ہے؟" یار محمد نے پوچھا۔

"ہاں اچھا جھیل ہے—"

"تو پھر واپس چلیں؟"

اب جو میں نے پلٹ کر نیچے لاتوبو میدان کو دیکھا ہے تو روح جو قبض ہونے

سے بچ گئی تھی' فنا ہو گئی... لاتوبو کو جیسے ہم ہوائی جہاز کی کھڑکی سے دیکھ رہے تھے... ہمارا خیمہ ایک زرد دھبہ... ندی ایک سرسبز اور کسی دریا کی خشک گذرگاہ ایسے میدان میں ایک چمکتی لکیر اور ان سے پرے روپل پیک اور لالی پیک... اور ادھر بھی اترائی اتنی ہی جان لیوا تھی جتنی جھیل کی جانب...

"یار محمد تم تو کہتے تھے کہ جھیل کو باقاعدہ راستہ جاتا ہے... اور تم ہمیں اس خوفناک چڑھائی پر سے لے کر آئے ہو... دیکھو ناں ہمارے ساتھ ایک بچہ ہے یہ کیسے اترے گا یہاں سے؟"

اس موقع پر بچہ مسکرایا اور رب اس کا بھلا کرے اس نے یہ نہیں کہا کہ ابو میں تو اتر جاؤں گا آپ اپنی فکر کریں...

"تو پھر ادھر نیچے جھیل کو جاتے ہیں اور اوپر سے جا کر نیچے جائیں گے..." یار محمد نے فیصلہ دیا اور اپنی بندوق کو ٹیکتا ہوا نیچے اترنے لگا... یہاں بھی ٹریکنگ کا وہی اصول لاگو ہوتا تھا کہ بھربھری اور کنکروں والی سطح پر اتنی دیر پاؤں نہ رکھو جتنی دیر میں وہ پھسل جائے... چنانچہ شکاری ان کنکروں پر سکی انگ کرتا ہوا نیچے پہنچ گیا... پھر سمیر' راہی اور آخر میں ... مابدولت!... یہاں مشکل سے جان بچی... کیونکہ قدم رکھتے ہی کنکروں اور پتھروں کے ساتھ آپ کا پاؤں نیچے جاتا ہے اور اگر آپ اپنا بیلنس قائم رکھ سکیں تو سات آٹھ فٹ کے بعد کھڑے ہونے کا موقع مل جاتا ہے ورنہ... ورنہ سا ما لیکم!... جس مقام پر ہم تھے وہاں سے ہم گلیشیئر کی گذرگاہ تک پہنچے اور پھر پانی اور برف سے بچتے جھیل کے پاس آ گئے...

اور یہاں ہم جھیل کے بد رنگ پانیوں اور اس کی شکل کو بھول گئے کیونکہ یہاں صرف آپ کے لیے ایک مکمل تنہائی منتظر تھی... اس تنہائی میں دنیا سے کٹ جانے کا خوف بھی تھا اور اس میں گم ہو جانے کی خواہش بھی... جھیل چونکہ خشک ٹیلوں کے اندر تھی اس لیے یہاں صرف نانگا پربت کو ہی سر اٹھا کر دیکھا جا سکتا تھا۔

اوپر سے کبھی کبھار کوئی بڑا پتھر لڑھکتا ہوا آتا اور جھیل میں گر جاتا... اور یہ پتھر گلیشیئر کی اس گذرگاہ میں سے گرتے تھے جہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم چلتے آ رہے تھے...

دھوپ صرف آخر میں تھی اور باقی پانیوں پر کنارے کا سایہ تھا... دھوپ والا حصہ خیالا تھا اور جہاں سایہ تھا وہاں نیلاہٹ کا شائبہ ہوتا تھا—— اور سائے میں سردی بڑھتی جاتی تھی... ہماری جیکٹس اور اونی ٹوپیاں نانگا پربت سے اترتی ہلکی ہوا

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

کے سامنے ناکافی ثابت ہو رہی تھی۔ یار محمد نے جھیل کے پانی سے وضو کیا اور ایک بڑے پتھر پر چڑھ کر عصر کی نماز پڑھنے لگا۔۔۔ جب وہ سجدے میں گیا تو وہ اکیلا نہ تھا' میرے احساسات اس لمحے میں اس کے ساتھ تھے اور میری پیشانی بھی اس پتھر کو چھو رہی تھی۔۔۔ جھیل پر سکوت تھا اور جب بھی میں گلا صاف کرنے کے لیے کھانستا تو آواز پانیوں پر تیرتی دور تک جاتی۔۔۔ راہی مجھ سے الگ ہو کر اپنے آپ میں گم تھا اور وہ بھی اس تنہائی میں تھا جو مکمل تھی۔۔۔

اوپر پتھروں کے لڑھکنے کی آواز آتی۔۔۔ پھر ایک آدھ پتھر رفتار پکڑتا اور کہیں تھم جاتا۔۔۔ یار محمد ایک مرتبہ پھر سجدے میں گیا تو میں نے اس پر سایہ فگن تیرتی دھند اور بادلوں میں نمودار ہوتی ننگا پربت کی بلندیوں کو سر اٹھا کر دیکھا۔۔۔ یار محمد نے اتنی عظیم اور اتنی بلند چوٹی کو سجدہ نہیں کیا تھا بلکہ اس کو سجدہ کیا تھا جس نے اس چوٹی کو تخلیق کیا۔۔۔ وہ اس سے ذرہ بھر خائف نہ تھا مرعوب نہ تھا۔۔۔ تو پھر اس کے لئے ننگا پربت کی کیا حیثیت ہے۔۔۔

کوہ پیماؤں کے مطابق ایورسٹ کی چوٹی پر پہنچنے کے لیے ایک طویل اور پر خطر راستہ ہے اور وہ دنیا کی بلند ترین چوٹی ہے۔

کے ٹو دنیا کی دوسری بلندی ترین چوٹی ہے اور اس کے بیس کیمپ تک پہنچنے کے لیے پندرہ دن مسلسل سفر کرنا پڑتا ہے۔۔۔ کے ٹو جسے شاہ گوری کے خوبصورت نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔۔۔

ایورسٹ اور کے ٹو کے بعد بلندی کے لحاظ سے کنچن جنگا کا نام آتا ہے۔۔۔ ماکالو اور لوٹسے کا نام آتا ہے۔۔۔ لیکن دنیا کی نویں بلند ترین چوٹی ننگا پربت کوہ پیماؤں کی ذاتی دنیا میں سب سے بلند ہے۔۔۔ کیونکہ ایورسٹ اور کے ٹو کے مقابلے میں ننگا پربت کو سر کرنا زیادہ مشکل ہے۔۔۔ یہ بلند ترین نہیں لیکن دنیا کی خطرناک ترین چوٹی ہے۔۔۔ "دے کلر ماؤنٹین" جس نے انسانوں کو کبھی زیادہ نزدیک آنے کی اجازت نہیں دی۔۔۔ سب سے زیادہ کوہ پیما اور پورٹر اس کی برفوں میں دفن ہیں۔۔۔

کچھ لوگ اسے منحوس چوٹی کہتے ہیں۔۔۔ کچھ کا خیال ہے کہ اس کے نزدیک جانے والے سحر کا شکار ہو جاتے ہیں۔۔۔

باہر کی دنیا کو آٹھ ہزار ایک سو پچیس میٹر بلند ننگا پربت کے وجود کی خبر انیسویں صدی کے نصف میں شلاگن وٹ نامی دو جرمن بھائیوں نے دی۔۔۔ ان میں سے ایک بھائی کاشغر میں قتل کر دیا گیا۔۔۔ ننگا پربت کے قہر کا آغاز۔

۱۸۹۵ء میں برطانوی کوہ پیما اے۔ ایف ممری ننگا پربت کو زیر کرنے کے لیے آیا۔۔۔ اپنے گورکھا پورٹر رگبیر کے ساتھ چوٹی کے نزدیک پہنچا لیکن اسے سر نہ کر سکا۔۔۔ بی اے۔ ایف ممری پراسرار طریقے سے ننگاپربت کے آس پاس گم ہو گیا۔۔۔ کہاں گیا؟ آج تک نہیں معلوم ہو سکا۔

۱۹۳۲ء میں ولی مرکل کی قیادت میں ایک ٹیم آئی۔ ناکام ہو کر واپس چلی گئی' راستے میں مصر کی سیر کے لیے قاہرہ میں قیام کیا۔ ٹیم کا ایک ممبر وینڈ ہرن اہرام مصر میں سے ایک کی چوٹی پر گیا وہاں سے گرا اور فوت ہو گیا۔۔۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بھی ننگا پربت کا ہاتھ تھا جو اہرام تک پہنچ گیا۔

انہی ولی مرکل صاحب کو چین نہ آیا اور ایک مرتبہ پھر ایک مہم کے ساتھ ۱۹۳۴ء میں ادھر تشریف لے آئے۔۔۔ چوٹی کے قریب پہنچ چکے تھے کہ موسم خراب ہو گیا۔۔۔ مرکل کے علاوہ دو کوہ پیما اور چھ نیپالی شرپاؤں کو برف کی قبریں نصیب ہوئیں۔۔۔ کہا جاتا ہے کہ مرکل کا پورٹر گیلے اپنے آپ کو بچا سکتا تھا لیکن اس نے اپنے صاحب کے ساتھ فوت ہو جانا زیادہ پسند کیا۔۔۔

عام طور پر ایورسٹ کو انگریزوں کی چوٹی۔۔۔ کے ٹو کو امریکیوں اور جاپانیوں کی چوٹی اور ننگا پربت کو جرمنوں کا پہاڑ کہا جاتا ہے۔۔۔ اور اسی لیے آدھا جرمنی اس پر دفن ہے۔۔۔ ۱۹۳۷ء میں ڈاکٹر کارلو وائن ایک مہم لے کر یہاں پہنچا۔۔۔ تقریباً بیس ہزار فٹ کی بلندی پر ایک نہایت محفوظ جگہ پر کیمپ لگایا۔ رات کو برف کا ایک بہت بڑا تودہ نیچے گرا اور پوری ٹیم کو اپنی آغوش میں لے کر سرد موت سے ہمکنار کیا۔۔۔ کل سولہ کوہ پیما اور پورٹر کام آئے۔

پال باؤر ۱۹۳۸ء میں ادھر آئے۔۔۔ ان کی مہم بالکل خیروعافیت سے رہی۔۔۔ صرف یہ ہوا کہ چوٹی کی جانب چڑھتے ہوئے یکدم برف کے نیچے سے چار برس پیشتر دفن شدہ مرکل اور ان کا پورٹر گیلے ظاہر ہو گئے۔۔۔ سردی کی وجہ سے ان کی لاشیں بالکل محفوظ تھیں اور لگتا تھا کہ ابھی "گڈمارننگ" وغیرہ کہہ دیں گے۔ انہیں دیکھ کر پورٹر حضرات اتنے خوفزدہ ہوئے کہ انہوں نے صاحب لوگوں کا سامان چھوڑا اور غائب ہو گئے۔

۱۹۳۹ء میں پیٹر اور فشنائٹر نے ایک مہم کی قیادت کی' ناکام رہے' جانی نقصان تو نہ ہوا لیکن دوسری جنگ عظیم چھڑنے کی وجہ سے برطانوی ہمالیہ سے بھاگ کر تبت میں دلائی لاما کے ہاں پناہ گزین ہوئے۔۔۔ پیٹر صاحب کا تعلق ہٹلر کے جرمنی سے

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

تھا۔

اور پھر ۱۹۵۳ء میں ایک اور جرمن ٹیم ڈاکٹر ہرلگ کوفر کے زیر قیادت نانگا پربت کے رائے کوٹ رخ میں فیری میڈو کی جانب سے یہاں پہنچی۔ اس بار بھی موسم انتہائی مخدوش تھا۔ ٹیم کو واپس ہو جانے کا حکم ملا۔ لیکن اس وقت ہرمن بوہل سات ہزار میٹر کی بلندی پر ایک چھوٹے سے خیمے سے چوٹی کا جائزہ لے رہا تھا۔ اور وہاں سے اس نے اپنی کوشش کا آغاز کیا اور تن تنہا کیا۔۔۔ بقول میسنر "یقینی شکست کے سامنے ایک ایسا شخص تھا جو ایک تخیل کے زیر اثر تھا۔ ایک خوفناک مہم جو کوہ پیمائی کے تمام اصولوں کی نفی کرتی تھی اور جس میں کامیابی کا ذرہ بھر امکان نہ تھا۔۔۔ یہ تمام ہمالیائی تجربوں کی نفی تھی اور اس کے باوجود جرمن بوہل نانگا پربت پر قدم رکھنے والا پہلا انسان تھا"

بوہل کے بعد متعدد افراد نے نانگا پربت کو زیر کیا اور ان میں سے کم از کم ایک درجن جرمن تھے اور ان میں سے کم از کم چھ کی موت پر اسرار حالت میں ہوئی۔۔۔

کیا یہ حقیقت ہے کہ نانگا پربت سچ مچ منحوس ہے؟"۔۔۔ میسنر کہتا ہے "یہ کہنا کہ نانگا پربت منحوس ہے انتہائی لغو بات ہے۔۔۔ وہاں کوئی خوفناک دیو نہیں ہے' صرف یہ ہے کہ نانگا پربت ہم فانی انسانوں کی نسبت ناقابل یقین حد تک عظیم ہے"

اور اب ہم کوہ پیمائی کی اس حیران کن داستان کی طرف آتے ہیں جس کے مرکزی کردار تین تھے۔۔۔ دنیا کا مشہور ترین کوہ پیما رائن ہولڈ میسنر اس کا بھائی گنتھر میسنر اور۔۔۔ نانگا پربت۔۔۔

میسنر ایک ایسا کوہ پیما ہے جسے انگریزی زبان میں "آل ٹائم گریٹسٹ" کہا جاتا ہے۔۔۔ ایک محیرالعقول کوہ پیما جس نے دنیا کی تمام تر بلند ترین چوٹیاں آکسیجن کے بغیر سر کیں اور تن تنہا سر کیں۔۔۔

۱۹۷۰ء میں ڈاکٹر ہرلگ کوفر ایک ایسی انتہائی تجربہ کار ٹیم کا لیڈر تھا جس میں دونوں میسنر بھائی شامل تھے۔۔۔ میسنر لکھتا ہے "اس مہم کے پانچ کوہ پیما مرکل گلی تک پہنچ گئے جس کے سامنے چوٹی کا چہرہ ہے۔ جب موسم کی خرابی کی وجہ سے میں نے اکیلے ہی چوٹی تک جانے کا فیصلہ کیا تو میرا بھائی اپنی مرضی سے میرے ساتھ چل پڑا اور ہم دونوں نانگا پربت پر پہنچ گئے چونکہ بلندی کی وجہ سے گنتھر شدید بیمار ہو گیا اس لئے میں نے مجبوراً روپل سائڈ کی بجائے دوسری جانب دیامیر کی طرف اترنا شروع

کر دیا' میرا خیال تھا کہ ہم ادھر سے آسانی سے اتر جائیں گے۔۔۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ ایک المناک فیصلہ ثابت ہو گا۔"

دوسری جانب اترتے ہوئے میسنر کا بھائی گنتھر ایک برفانی تودے کی زد میں آ کر دفن ہو گیا اور میسنر بھوکا پیاسا' سردی کی شدت سے بوکھلایا ہوا نیم پاگل حالت میں نانگا پربت کے دیامیر چہرے میں بھٹکتا رہا۔۔۔ اور بالآخر مانیو چوٹیوں کے دامن میں پہنچ گیا۔۔۔ اس کے ہاتھ پاؤں سردی کی وجہ سے بیکار ہو چکے تھے اور تب کچھ چرواہوں اور کسانوں نے اس کی مدد کی اور گلگت تک پہنچایا۔ کہتے ہیں کہ میسنر جب پاگل پن اور سردی کی شدید کیفیت میں جنگل کے آغاز میں تھا تو اس نے جھونپڑوں پر عورتوں مردوں اور بچوں کے چہرے حرکت کرتے دیکھے جو اسے دیکھتے تھے کہ یہ کون ہے کیا ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ میسنر کے نزدیک دیامیر کا یہ علاقہ جہاں وہ مرتا مرتا بچا تھا اس کا نیا بچپن تھا' اس کی دوسری جائے پیدائش تھی۔۔۔

"اس مہم کے دوران میں موت سے ہمکنار ہوا۔ میری مراد جسمانی موت سے نہیں بلکہ روح کے خاتمے سے ہے۔۔۔ امیدوں اور ارادوں کی موت۔۔۔"

وطن واپسی پر میسنر کو بھائی کی موت کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ اور اس پر طرح طرح کے الزامات لگائے گئے۔ کہا گیا کہ دیامیر کی جانب اترنے کا فیصلہ صرف میسنر کا تھا اور اس کی وجہ سے اس کا بھائی مارا گیا۔

"نانگا پربت کو سر کرنے کے بعد میرا بھائی مجھ سے بچھڑ گیا۔۔۔ میں اکیلا گھر واپس گیا اور میں ایک مختلف انسان تھا۔۔۔ پچھلے برسوں میں مجھے بے شمار الزامات کے جواب دینے پڑے' مجھے اپنا دفاع کرنا پڑا۔۔۔ لیکن اب میرے اندر زیادہ کڑواہٹ نہیں رہی۔ صرف ایک اداسی باقی ہے کہ میں نے اپنے بھائی کو کھو دیا۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں نے نانگا پربت کو سر کر لیا ہے اور اس کے بعد لوگوں کے الزامات کے سامنے شکست خوردہ نہیں ہوا تو مجھے دنیا کی کوئی چیز شکست نہیں دے سکتی۔۔۔ لیکن شائد یہ یقین بھی سراب ہے' اس کے آگے سر جھکانا خود فریبی ہو گی۔ اس لئے میں اس مایوسی کے لئے تیار ہوں جو بہر حال میرے سامنے آئے گی۔۔۔ ایک ایسی مایوسی جو بہر طور انسانی وجود کی قسمت میں لکھی ہے۔۔۔"

رائن ہولڈ میسنر کی ایک کتاب "دی بگ والز" میں اس کے بھائی گنتھر کا ایک خط درج ہے جو اس نے اپنے ماں باپ کو اس مہم کے دوران ٹاپ میدان کے ایک

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

بیس کیمپ سے لکھا... وہ لکھتا ہے "... نانگا پربت کی چوٹی کے اوپر تک برف پگھل چکی ہے اور ٹاپ میدان بالکل سرسبز ہو چکا ہے۔ یہاں ہر جانب پھول ہی پھول ہیں اور کئی جگہوں پر لگتا ہے کہ ہم کسی کے پھولوں بھرے جھونپڑے میں آ نکلے ہیں... یاک کے نیم جنگلی ریوڑ اس رومانوی 'وحشی' پیالہ نما بلند وادی میں گھومتے ہیں اور دبلے اور مریل گھوڑے شدید سردی کے ستائے ہوئے یہاں گھاس چرنے آجاتے ہیں... ٹاپ میدان ایک چراگاہ ہے اور بالکل ہموار ہے۔ درمیان میں درخت ہیں۔ آندھیوں اور برف کے طوفانوں کے نشان اب بھی باقی ہیں۔ ہر دوسرا درخت پتوں کے بغیر ہے اور سوکھا ہوا ہے... ہر شام پورٹر اس قسم کے پانچ چھ درخت جمع کرتے ہیں اور الاؤ جلاتے ہیں... شمال کی جانب ہمارے عین اوپر نانگا پربت کا روپل چہرہ ہے جو قدموں سے چوٹی تک ساڑھے چار ہزار میٹر بلند ہوتا ہے۔ ٹاپ میدان کے مغرب اور مشرق میں گلیشیئر کی دیواریں ہیں اور جنوب میں روپل کی چوڑی وادی پر سایہ کرتی ہے... دھند ٹاپ میدان پر جھکی رہتی ہے اور اکثر بوندا باندی ہوتی رہتی ہے... آج ہم نے دو سو روپے میں ایک یاک خریدا ہے جسے ہم روسٹ کریں گے۔ آپ خط ضرور لکھیں کیونکہ چوتھے پانچویں روز ترشنگ کا ایک کسان ہماری ڈاک لے کر آتا ہے... خدا حافظ"...

گنتھر کا اپنے ماں باپ کو یہ آخری خدا حافظ تھا کیونکہ ٹھیک پندرہ روز بعد وہ نانگا پربت کی برفوں میں گم ہو گیا۔

آج تقریباً انیس برس بعد ہمارے نیچے ٹاپ میدان میں برف پگھل چکی تھی اور ہر جانب ہریاول تھی... یاک یا زو اس رومانوی پیالہ نما وادی میں گھوم رہے تھے اور دو دبلے سے گھوڑے گھاس چر رہے تھے۔ درمیان میں درختوں کا ذخیرہ تھا اور دھند ٹاپ میدان پر جھکی ہوئی تھی...

ہمارے سروں پر نانگا پربت کا روپل چہرہ تھا... ہمارے قدموں سے چوٹی تک ساڑھے چار ہزار میٹر بلند... دنیا کا سب سے بڑا چٹانی چہرہ... یا راک فیس...

پتھروں کے لڑھکنے کی آواز اب بھی آ رہی تھی... کبھی کوئی پتھر رفتار پکڑتا اور پھر کہیں تھم جاتا... نانگا پربت کی اس جھیل کا مقامی نام "سروٹ" ہے...

یار محمد نے سلام پھیرا... دعا کی اور اٹھ بیٹھا... اس نے پتھر سے اٹھتے ہوئے کپڑے نہیں جھاڑے شائد اس لئے کہ وہاں مٹی نہ تھی...

"کوہ پیماؤں کا قبرستان
جہاں ہوا تیز چلتی تھی"

جھیل سے واپسی پر یار محمد کو ایک پگڈنڈی مل گئی اور ہم اطمینان سے نیچے لاتوبو میں اتر آئے... ہمارے خیمے کے سامنے ندی کے ساتھ متعدد زو سر جھکائے گھاس چر رہے تھے اور ان سے پرے لاتوبو گاؤں کے چند بچے گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے... اور کچھ بچے بڑے پتھر پر بیٹھے آپس میں سر جوڑے ہنس رہے تھے... وہ سمیر سے ملنے کے لئے آئے تھے...

لاتوبو میں شام ہو رہی تھی... ڈھلوان پر بنے چرواہوں کے جھونپڑوں کے درمیان میں ایک بہت بڑا باڑا تھا اور چند عورتیں مویشیوں کو اس کے اندر لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں اور وہ اس دوران "ہو ہا ہے ہے" کی وہ زبان بول رہی تھیں جو دنیا بھر کے مویشی سمجھتے ہیں... ان کے چیخنے کی آوازیں مدہم ہو کر مجھ تک پہنچتی تھیں...

سمیر نے لاتوبو کے بچوں کو دوست بنا لیا تھا اور وہ انہیں اپنے واک مین پر مغربی موسیقی سنوا رہا تھا... وہ اپنا ہیڈ فون باری باری ہر بچے کے کان کے ساتھ لگاتا اور اس بچے کے چہرے پر نمودار ہونے والے احساسات سے لطف اندوز ہوتا...

سلطان اسی بڑے پتھر "بابا جی" کی اوٹ میں سگھڑ بیبیوں کی طرح برتن سجائے چولہے میں پھونکیں مار رہا تھا... محمود روٹیوں اور دیو سائی کے بارے میں معلومات کے ساتھ واپس آچکا تھا...

سلطان نے قورمے کے ایک ٹین کو ابال کر جب کھولا تو اس کے تیز مصالحے کی خوشبو لاتوبو کی صاف شفاف فضا میں آگ کی طرح پھیل گئی... راہی جو نیچے ندی تک

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

گیا تھا واپس آیا تو ناک چڑھا کر بولا "تارڑ صاحب پتہ نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ میں شادی پر آگیا ہوں۔۔۔"

"شادی پر؟"

"ہاں۔۔۔ خوشبو ہوتا ہے ناں کھانے کا تو ایسا ہوتا ہے جو ادھر آتا ہے۔۔۔" اس نے پھر فضا میں سونگھا۔۔۔

"جناب راہی چاچا یہ قورمے کی خوشبو ہے۔۔۔ آج شام کھانے پر ملے گا۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ اس میں مرچی ہوگا۔۔۔ ہم نہیں کھائے گا صرف سونگھے گا"

چنانچہ میں نے اور سمیر نے محمود کی لائی ہوئی روٹیوں کے ساتھ تیز مصالحے والا قورمہ کھایا اور خوب کھایا۔۔۔ راہی اپنے پھیکے دال چاول کو حسب سابق نہایت ادب اور سنجیدگی سے کھاتا رہا۔۔۔

اور پھر کھانے کے بعد کافی۔۔۔ ہم سب آہستہ آہستہ آگ کے نزدیک چلے گئے۔ یہاں بڑے پتھر "بابا جی" کی اوٹ میں سردی اور ہوا سے بچاؤ بھی ہوتا تھا۔۔۔

نام چینی کا مگ میری دونوں ہتھیلیوں کے درمیان کافی سے بھرا ہوا اور اس کی حدت میرے بدن میں منتقل کرتا ہوا۔۔۔ سامنے چولہے میں آگ اور کبھی ہوا یکدم تیز ہوتی تو آگ کی گرمی کو لمحہ بھر کے لئے سمیٹ لے جاتی۔۔۔ گڈریئے ابھی تک اپنے مویشی باڑے میں ہانک رہے تھے اور سردی نیچے آ رہی تھی۔۔۔ اور تب دیوسائی کی بات شروع ہو گئی۔۔۔

محمود کے پاس تمام خبریں تھیں "صاحب میں نے یہاں جتنے لوگ ہیں ان سے بات کی ہے۔۔۔ دو چرواہے تو ابھی کل دیوسائی سے اتر کر آئے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ ابھی جو ادھر کالا پانی ہے اس پر پل نہیں بنا اور اس میں سے پیدل گزرنا پڑتا ہے"

"کیا ہم تینوں اس میں سے گزر سکتے ہیں؟"

"اگر آپ ایک دوسرے کو رسے کے ساتھ باندھ لیں پھر آسان ہو جائے گا کیونکہ پانی اتنا تیز ہے کہ ہر سال ایک دو آدمی بہا لے جاتا ہے۔۔۔"

"نہیں۔۔۔" میں نے سر ہلایا۔ "میں سمیر کے ساتھ اس قسم کا رسک نہیں لے سکتا۔۔۔ اسے عبور کرنے کا اور کیا طریقہ ہے؟"

"گھوڑے جناب۔۔۔ آپ کو اگر چار گھوڑے مل جائیں تو آپ سامان سمیت یہاں سے چل کر دیوسائی پار کر کے ادھر سکردو میں اتر سکتے ہیں۔۔۔ لیکن گھوڑے مہنگے ہیں' ایک بوڑھے کے پاس دو گھوڑے ہیں اور وہ ہزار روپیہ فی گھوڑا مانگتا ہے۔ اس

کے علاوہ اس کی شرط یہ کہ آپ اس کے دو آدمی پورٹر کے طور پر ساتھ لے جائیں۔۔۔"

"لیکن ہم تو تمہیں ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔۔۔"

"صاحب آپ جو گھوڑے لے کر جاؤ گے تو وہ ادھر ٹاپ میدان میں واپس لانے کے لئے بھی تو کوئی آدمی چاہئے۔ بوڑھے کو ہم پر اعتبار نہیں۔۔۔ ویسے ایک گھوڑا میرے پاس بھی ہے لیکن ابھی جنگل میں گیا ہے۔ کل آجائے گا۔"

"کیوں راہی۔۔۔ کیا خیال ہے؟"

"آپ باس ہو۔۔۔ ہم کو کیا پتہ کدھر جانا ہے کیسے جانا ہے۔۔۔ جدھر لے جاؤ گے' چلے گا۔۔۔"

"تو ٹھیک ہے۔۔۔ تم چوتھے گھوڑے کا بندوبست کرو لیکن ہم ہر گھوڑے کے ساتھ ایک اور پورٹر لے جانا افورڈ نہیں کر سکتے۔۔۔"

سمیر کے تیکھے نین نقش آگ کی روشنی میں دمکتے تھے "ابو کیا ہم واقعی گھوڑوں پر سفر کریں گے؟"

"ایک خرابی ہے صاحب" سلطان زمین کریدتا ہوا بولا "آپ کا ٹینٹ بیکار ہے جی۔۔۔ اگر ادھر بارش ہو گیا تو ادھر بھی بیکار ہے۔۔۔ اور ادھر دیوسائی پر اگر تو موسم ٹھیک ہے تو پھر شاید گزارہ ہو جائے اور اگر بارش ہو گیا تو پھر بہت مشکل ہے جی اس ٹینٹ میں رات گذارنا۔۔۔ برف ہو جائے گا صبح تک۔۔۔"

"ٹینٹ برف ہو جائے گا؟"

"ہاں ناں۔۔۔ اور اس کے ساتھ جو اس میں سوئے گا وہ بھی۔۔۔"

"اور اگر برف باری شروع ہو گئی تو بالکل خطرہ ہو جائے گا" محمود بولا۔

"تم گھوڑوں کا بندوبست کرو ٹینٹ کے بارے میں پھر سوچیں گے۔۔۔"

"اچھا صاحب میں کل اس بوڑھے سے پھر بات کروں گا۔۔۔" محمود نے سر ہلایا۔ اور پھر کچھ سوچ کر مسکرانے لگا "صاحب آج ادھر ہماری بہک میں جاپانی لوگ آیا میں کیپ سے۔۔۔ آپ کو بولا تھا ناں کہ ان کی ایک لڑکی کا ٹانگ ٹوٹ گیا ہے تو ہم سے چارپائی مانگتا تھا تاکہ اسے اٹھا کر ترشنگ لے جائے۔۔۔ لیکن ادھر پورے ٹاپ میدان میں انہیں چارپائی نہیں ملا"

"کیوں؟"

"ادھر تو بہک ہے صاحب۔ گھر نہیں۔ ادھر چارپائی نہیں لاتا۔۔۔ زمین پر سوتا

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

ہے۔"

"ان جاپانیوں کے پاس سٹریچر نہیں ہے؟"

"خدا معلوم۔۔"

آگ ٹھنڈی ہونے لگی۔ میں نے دیکھا کہ سمیر کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار نوٹتے تھے۔ "تم جاکر سو جاؤ بیٹا"

"نہیں ابو۔۔۔ " اس نے نیند میں ڈوبتے بچے کی ایک بیوقوف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "مجھے نیند تو نہیں آ رہی"

"صاحب آپ ادھر لاتوبو میں کتنے روز ٹھہرو گے؟" سلطان نے پوچھا۔

"تین چار روز۔۔۔"

"صاحب مجھے آپ کے ٹینٹ کا بہت فکر ہے۔۔ ادھر اگر بارش ہو گیا تو بہت سردی ہو گا۔۔ بہت زیادہ سردی ہو گیا تو ہم آپ کو محمود کی بھک میں لے جائے گا۔۔۔ صاحب آپ مانتھو کیوں نہیں گیا؟ ادھر تو جو صاحب آتا ہے ادھر جاتا ہے۔۔۔"

"یہی بات ہے سلطان ہم نے تو مانتھو پاس کا نام ترشنگ میں آ کر سنا۔۔ تم گئے ہو؟"

"ہاں ناں۔۔۔ جاتا رہتا ہے۔۔ دیکھو صاحب اگر تم دیو سائی نہیں جاتا تو پھر ادھر سے مانتھو چلے جاؤ۔۔۔ ترشنگ سے آٹھ کیمپ بنتا ہے۔۔۔ ترشنگ سے روپل۔ لاتوبو۔ مانتھو پاس بیس کیمپ۔ مانتھو ہائی کیمپ، گلیشیر پر۔ مانتھو پاس۔ لویا۔ جنگوٹ۔ چلچلے اور نویں دن آپ شاہراہ ریشم پر نکل آئیں گے بونز برج کے پاس ادھر سے وطن چلے جانا۔۔۔"

"نہیں یہ بہت طویل اور پرمشقت راستہ ہے۔ یوں بھی کوہستان کے علاقے میں ٹریکنگ کے لئے ذرا جرأت چاہئے"

"نہیں صاحب خطرہ نہیں ہے۔۔۔ ذرا سخت لوگ ہیں لیکن خطرہ نہیں ہے۔۔۔"

"ہم دیو سائی جائیں گے۔۔۔ کیوں سمیر؟"

"ہاں آں۔۔۔ ہاں ابو" وہ باقاعدہ اونگھ رہا تھا۔۔

"تو ہم چلتا ہے۔۔۔" سلطان اور محمود اٹھ کھڑے ہوئے۔۔۔ وہ دونوں بھکوں میں رات گزارنے کے لئے جا رہے تھے۔

"باپ رے۔۔۔" راہی جو بہت دیر سے ٹھنڈی پڑتی آگ کی راکھ پر نظر جمائے بیٹھا تھا سر جھٹک کر یکدم بولا "تو ادھر ہم ٹینٹ میں اکیلا ہوگا۔۔۔؟"

"آپ تین ہیں صاحب۔۔" سلطان بولا "لیکن اگر آپ کو ڈر لگتا ہے تو میں ادھر باہر سو جاتا ہوں"

"نہیں نہیں۔۔۔" راہی فوراً سینہ پھلا کر بولا "ڈر تو نہیں لگتا لیکن تم نے بولا تھا ناں کے ادھر بھیڑیا مواقق شیر ہوتا ہے۔۔۔"

"ہوتا ہے پر وہ کھل سے پرے رہتا ہے۔۔۔" اوپر سلطان نے سر اٹھا کر اس بوقلیلے آسمان کو دیکھا جس کی سفیدی اندھیرے میں تیرتے کسی آئس برگ کی طرح نظر آ رہی تھی۔۔

"تو نیچے تو نہیں آتا ناں ادھر۔۔"

"آتا ہے کبھی کبھی۔۔۔" سلطان نے راہی کی فکر مندی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا "لیکن وہ سامنے جاتا ہے لاتوبو کے گاؤں میں۔ ادھر اسے بھیڑ بکری مل جاتا ہے۔۔۔"

"پھر ٹھیک ہے۔۔۔" راہی اطمینان سے مسکرایا "ہم تو بالکل مزیدار نہیں ہے بھیڑ بکری زیادہ مزیدار ہوتا ہے۔۔۔ شیر کو تو پتہ ہوگا"۔۔۔۔

نانگا پربت کے بیس کیمپ میں وہ رات حیرت انگیز طور پر زیادہ سرد نہ تھی۔ ہاں صبح کے وقت ایک پرسکوت یخ ٹھنڈک کچھ دیر ٹھہری رہی اور پھر دھوپ کی پہلی کرنوں کے ساتھ پگھل گئی۔۔۔

میری آنکھ کھلی تو خیمے میں سورج کبھی ایسی زرد اور تیز روشنی تھی۔ خیمے کا پردہ ہٹا ہوا تھا اور اس میں سے لاتوبو کے میدان کی ہریاول، بیچ بہتی سماٹ ندی اور ان سے پرے روپل پیک اور لالی پیک کی برفیں ایک صاف آسمان میں تصویر ہو رہی تھیں۔۔۔

بہت سارے بچوں کی دبی دبی ہنسی میں سمیر کی آواز مجھ تک پہنچتی تھی۔

راہی یوگا کے ایک پوز میں آنکھیں بند کئے اپنے دھیان میں تھا۔۔

میں سستی سے آنکھیں بند کئے لیٹا رہا مگر میرے پپوٹوں پر خیمے کی روشنی زرد تتلی کی طرح بے آواز بیٹھتی تھی۔

راہی کھانسا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ مسکرا رہا تھا۔۔۔ اس سفر کے دوران اسے جب بھی موقع ملتا وہ مجھ سے الگ ہو جاتا۔ وہیں میرے پاس بیٹھا ہوتا لیکن مجھ سے الگ ہو کر اپنے دھیان میں ہو جاتا۔۔۔ "کیا ہو رہا تھا؟"

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"نماز۔۔۔" وہ ہنس کر بولا

"یہ کس وقت کی نماز ہے چاچا؟"

"بس یہ میری نماز ہے۔۔۔"

"کچھ گفتگو وغیرہ ہوتی ہے اوپر والے سے۔۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں لیکن۔۔۔ بس میں رپورٹ دیتا ہوں۔۔۔ رپورٹ لیتا ہوں۔۔۔"

"موسم کی رپورٹ بھی لے لیتی تھی چاچا۔۔۔ ادھر بارش ہو گئی تو یہ خیمہ کاغذ کی طرح گل جائے گا"

"موسم تو دکھائی دے رہا ہے۔۔۔" اس نے روپل پیک اور لالی پیکٹ کے وسیع اور شفاف منظر کی طرف اشارہ کیا "سارے رنگ الگ الگ اور صاف لگ رہے ہیں جیسے اس نے ابھی ابھی اس کینوس پر لگائے ہوں۔۔۔ موسم ٹھیک ہے"

میں کسما کر سلیپنگ بیگ کی کینچلی سے نکلا تو زیادہ چست اور صحت مند محسوس کر رہا تھا۔۔۔ جاگر پہن کر میں خیمے سے باہر آگیا۔ راہی ندی کی جانب چلا گیا۔

بڑے پتھر بابا جی پر سمیر نے موسیقی کی محفل جما رکھی تھی۔۔۔ لاتوبو کے بچے مائیکل جیکسن اور میڈونا کے نغمے سن رہے تھے۔۔۔ جو بچہ واک مین کا ہیڈ فون پہنے ہوئے موسیقی سن رہا تھا وہ باقاعدہ سر ہلا رہا تھا۔۔۔

"ابو یہ جو ہے۔۔۔" سمیر نے مجھے آواز دی "یہ جو موسیقی سن رہا ہے اس کا نام بھی سمیر ہے۔۔۔ لاتوبو کا سمیر۔۔۔"

میں نے سامان کی سب سے اہم پوٹلی اٹھائی اور ندی کی طرف اترنے لگا۔۔۔ ظاہر ہے اس پوٹلی میں دانتوں کا برش اور ٹوتھ پیسٹ بھی تھی۔ البتہ شیونگ کا سامان ابھی بیکار تھا۔ اپنے گالوں پر اگی سخت گھاس ایسی چھوٹی چھوٹی داڑھی پر ہاتھ پھیرنے سے بہت لطف آتا تھا اور تب ہم نے یہ بھی جانا کہ مولانا صاحبان ہمہ وقت اپنی داڑھی کیوں سنوارتے رہتے ہیں۔

سماٹ کے کنارے راہی کھڑا تھا اور پانی کو دیکھ رہا تھا۔۔۔ اور اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کر رہا تھا صرف پانی کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے؟"

"غور کر رہا ہوں۔۔۔ پانی پر"

"کیوں؟"

"یہ کاٹتا ہے۔ منہ ہاتھ دھونے نہیں دیتا۔۔۔ آپ ہاتھ لگاؤ"

میں نے ہاتھ لگایا تو پانی کاٹتا تو ضرور تھا لیکن ترشنگ کا پانی تو پاگل کتے کی طرح کاٹتا تھا۔۔۔ میں نے بمشکل چند چھینٹے اپنے چہرے پر مارے۔۔۔۔ راہی نے اپنے تھیلے میں سے گلاس نکال کر پانی سے بھرا اور پھر اس کا ایک گھونٹ پی کر کھڑا ہو گیا "یہ بھی کاٹتا ہے۔۔۔ اسے آہستہ آہستہ چائے کی طرح پیوں گا"

"کیا پورا گلاس پینا ضروری ہے؟"

"ہاں۔۔۔ میں روزانہ صبح سویرے ایک گلاس پانی ضرور پیتا ہوں۔۔۔ ایک مرتبہ میں کاغان گیا تو ادھر بھی پانی پینا بہت مشکل ہو گیا۔ سوچا کیا کروں۔ پھر میں نے دریا کے کنارے ایک گھوڑے کو دیکھا۔۔۔ وہ پانی پی رہا تھا۔۔۔ لیکن وہ تھوڑا سا پیتا تھا اور پھر گردن اٹھا کر کھڑا رہتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد گردن نیچی کر کے تھوڑا اور پیتا تھا۔۔۔ تو اب میں بھی ایسے ہی کرتا ہوں۔۔۔"

راہی ایک مختلف عادتوں والا مختلف انسان تھا اور بہت اچھا سفری رفیق ثابت ہو رہا تھا۔ بڑے پتھر کے اوپر سمیر نے محفل سجا رکھی تھی اور اس کے نیچے سلطان نے ناشتے کے انتظامات کر رکھے تھے۔۔۔ گرم بھاپ دیتا دودھ اور اس میں کڑکڑاتے کارن فلیکس، بہت ساری چینی اور پھر کافی۔۔۔

"آج قبرستان جائے گا؟" ناشتے سے فارغ ہو کر سلطان نے پوچھا۔

"نہیں نہیں۔۔۔" راہی اپنا دلیہ نگلتے ہوئے بولا۔ "خود نہیں جائے گا۔ کبھی نہیں جائے گا۔۔۔ کوئی زبردستی لے جائے گا تو پھر جائے گا"

"ہم لے جائے گا۔۔۔" سلطان کی سادگی راہی کے مزاج تک نہیں پہنچ پاتی تھی ...

"تو ہم بھاگ جائے گا" راہی کہنے لگا۔

"چاچا ڈاؤن ہو گیا ہے۔۔۔" سلطان تھوڑا سا پریشان ہو گیا۔

"چاچا ڈاؤن نہیں ہو گیا یہ ذرا مسخری کرتا ہے۔۔۔" میں نے اسے تسلی دی "آؤ قبرستان چلیں"

ہم اپنے خیمے سے نیچے اتر کر بل کھاتی ہوئی شفاف سماٹ کے کنارے کنارے چلنے لگے۔۔۔ اور ادھر کو چلنے لگے جدھر سے یہ آ رہی تھی۔۔۔ لاتوبو کے گاؤں کی طرف سے۔۔۔ اگر چند جھونپڑیوں اور مویشیوں کے ایک باڑے کو گاؤں کہا جا سکتا ہے تو۔۔۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

یہ ندی بس وہی تھی کہ جس کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو۔ سمیر اپنی لامبی ٹانگوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے پھلانگ کر کبھی ادھر ہو جاتا اور کبھی قلانچ بھر کر ادھر آ جاتا ... آسمان اتنا نیلا تھا کہ اس کی نیلاہٹ روپل پیک کی سفیدی پر بھی اثر انداز ہو رہی تھی... گاؤں کے قریب بڑے بڑے پتھروں کے اندر کوئی چشمہ تھا اور ساٹ ندی یہیں سے جنم لے رہی تھی... گاؤں سے پرے تھوڑی سی چڑھائی تھی جس کے بعد ایک اور غیر ہموار علاقہ ہمارے سامنے آ گیا۔

"ادھر ٹیم کیمپ کرتا ہے کیونکہ جگہ بہت ہے—"

"سلطان کیا تم بھی کبھی نانگا پربت پر گئے ہو؟" سمیر نے دریافت کیا۔

"ہاں ناں— ادھر... ادھر سے اوپر جاتے ہیں ناں" سلطان نے ایک بے آباد ڈھلوان کی طرف اشارہ کیا "اور پھر ادھر برف کے ساتھ کیمپ ون لگاتے ہیں ... اور وہاں جو بڑا پتھر ہے برف میں تو ادھر کیمپ ٹو لگاتے ہیں... میں کیمپ ٹو تک گیا ہوں"

"اس سے آگے کیوں نہیں گئے؟"

"اس کے لئے کپڑا چاہئے۔ بوٹ چاہئے— میرے پاس نہیں تھا... اس لئے نہیں گیا..."

"ذرا اپنے ٹینٹ کو دیکھو ابو—" سمیر آنکھوں پر ہاتھ رکھے لاتوبو کو دیکھ رہا تھا... اور یہاں سے اس کی وسعت کا اندازہ ہو رہا تھا... یہاں ہوا زیادہ تیز تھی کیونکہ آس پاس کوئی رکاوٹ نہ تھی اور ہم نانگا پربت کے عین سائے میں تھے... ساٹ ندی سے پرے جو ایک زرد دھبہ درختوں میں گم ہوتا لگتا تھا وہ ہمارا خیمہ تھا...

"مانشو پاس بھی ادھر سے جاتا ہے—"

...اور ہم روپل پیک اور لالی پیکٹ کے نزدیک ہو رہے تھے... تھوڑی دیر بعد لاتوبو اوجھل ہو گیا اور ہم ایک ویران اور بے آباد وسعت میں آ گئے جہاں اکا دکا جھاڑیاں تھیں اور زمین میں دبے ہوئے پتھروں کی تختی تھی جو نظر آتی تھی... اور یہیں پر ایک تکونا خیمہ نما پتھر تھا... خاصا بلند اور آس پاس کی تقریباً ہموار لینڈ سکیپ میں انتہائی نمایاں جیسے اسے کسی خاص منصوبے کے تحت وہاں رکھا گیا ہو... دور سے وہ ایک ایسے خیمے کی طرح نظر آتا تھا جو پتھرا چکا تھا۔

"یہ قبرستان ہے—" سلطان نے اشارہ کیا اور خود وہیں رک گیا جہاں تھا... پتھر کا سامنے کا حصہ صاف تھا اور یوں لگتا تھا جیسے زمین میں ایک بہت بڑا کتبہ

گاڑ دیا گیا ہو۔ اس پتھر کے آگے خشک لکڑیاں تھیں۔ چھوٹے پتھروں کے دو تین بے ترتیب مجموعے تھے اور ان میں دو تین سل نما پتھر نمایاں تھے... ان پر جاپانی زبان میں اوپر سے نیچے کچھ تحریر تھا... کیا تحریر تھا؟ یہ صرف وہ جانتے تھے جن کے جاننے والے ان کے نیچے دفن تھے... اس بڑے کتبے کے سائے میں ان کوہ پیماؤں کی قبریں تھیں جو نانگا پربت کو زیر کرنے آئے تھے لیکن خود زیر زمین ہو گئے... اس زمین نے انہیں زیر کر لیا۔

یہاں ہوا تیز چلتی تھی۔

اور دور دور تک کوئی ذی روح نہ تھا۔ صرف نانگا پربت کی برفیں اس سارے منظر پر حاوی تھیں...

ہم ان کے قریب بیٹھے رہے۔ یہ کہاں کے تھے اور کہاں دفن ہیں۔ ٹیڑھے میڑھے سوکھے ہوئے درخت اور ان میں پتھروں کے ڈھیر اور ان پر جاپانی زبان کے حروف... شائد یہ لکڑیاں اور سوکھی جھاڑیاں اس لئے رکھی گئی تھیں کہ مویشی ادھر نہ آئیں...

جہاں میں بیٹھا تھا وہاں سے روپل پیک کی برف تک نگاہ جاتی تھی اور راستے میں پست قد درخت تھے۔ دائیں ہاتھ پر اس مختصر قبرستان کا مشترکہ کتبہ تھا جو ازل سے یہاں شائد اسی لئے تھا کہ ادھر وہ آئیں گے اور دفن ہوں گے تو ان کے نام یہاں لکھے جائیں گے... میں نے قریب جا کر ان ناموں کو دیکھا جو ان کے ساتھیوں نے پتھر کے چہرے پر کھرچے ہوئے تھے۔

AUSTRIA

WASTL ARNOLD

1939 — 1976

PETER FUORRE

1982

S. IIDA

N. YAMADA

Y. TAKAMORI

1983.7.12

JAPAN

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

ان میں سے آرنلڈ کی موت کو میں نے زیادہ محسوس کیا کیونکہ وہ بھی ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوا تھا اور اسے مرے ہوئے تیرہ برس ہو چکے تھے۔۔۔ آخر میں جاپانی آئے تھے چھ برس پیشتر۔ یہ تو درست ہے کہ یہ کہاں کے تھے اور کہاں دفن ہیں لیکن ۔۔۔ اس پہاڑ کے نیچے دفن ہیں جسے زیر کرنے وہ گھر سے نکلے تھے۔۔۔ اگر یہ آسٹریا اور جاپان کے کسی قبرستان میں دفن ہوتے تو کون جانتا کہ یہ نانگا پربت گئے تھے۔۔۔

تنہائی۔ ویرانی اور تیز ہوا اور ہم سے ذرا الگ سلطان ایک پتھر کو سر کے نیچے رکھے آرام کرتا ہوا۔۔۔ لیکن وہ ہمیں بھی دیکھتا تھا۔۔۔ ہم وہاں بہت دیر تک چپ بیٹھے رہے۔۔۔ ہوا کے اس دھیمے شور میں جو نانگا پربت سے اتر کر سیدھا اس کتبے تک آرہا تھا اور یہ کتبہ اس کا راستہ روک رہا تھا۔۔۔

سلطان اٹھ کر ہمارے پاس آ گیا "چلیں صاحب؟ یہ جگہ اچھی نہیں ہے۔ کافروں کی قبریں ہیں۔۔۔"

"تم ان کے لئے دعا نہیں کرتا" راہی نے پوچھا۔

"ناں۔۔۔" سلطان نے تیوری چڑھا کر سر ہلایا "کافر ہے۔۔۔"

"جس جاپانی کے ماں باپ آئے تھے اسے کہاں جلایا تھا؟"

"ادھر۔۔۔" سلطان نے پستہ قد درختوں کے جھنڈ کی طرف دیکھا "ادھر کوئی نہیں جاتا۔۔۔"

"چلیں؟"

"ناں بابا۔۔۔ ادھر ہڈی ہو گا۔۔۔"

کیمر پر یہ ماحول زیادہ اثر انداز ہوا تھا اور وہ خاموشی سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔۔۔ پتھر پر کھرچے ہوئے نام پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔۔۔

"اور ویسے بھی جدھر جاپانی کو جلایا تھا اور ادھر اس قبرستان میں جاپانی آتا ہے۔۔۔" سلطان نے اوپر نانگا پربت کے اس حصے کی طرف دیکھا جہاں کیمپ ٹو لگتا ہے۔

"کونسا جاپانی آتا ہے۔۔۔" راہی قریب آگیا اور اس کی جیکٹ کا کالر تیز ہوا سے پھڑپھڑا رہا تھا۔ "جو ٹیم کے ساتھ آتا ہے؟"

"ناں۔۔۔" سلطان نے سر ہلایا "ادھر اس میدان میں اوپر نانگا پربت کے اس راستے سے جاپانی بھاگتے ہوئے آتے ہیں ادھر۔۔۔"

راہی فکر مند ہو گیا "جاپانی بھاگتے ہوئے آتے ہیں؟ سلطان یہ جاپانی جو بھاگتے ہوئے آتے ہیں تو یہ پہلے اوپر جاتے ہیں اور پھر واپس بھاگتے ہوئے آتے ہیں ناں؟"

"ناں صاحب یہ مرے ہوئے جاپانی ہوتے ہیں جو وہاں سے آتے ہیں ۔۔۔ اور ۔۔۔" سلطان ابھی فقرہ مکمل نہیں کر پایا تھا کہ راہی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر جلدی سے کہا "اوہو سلطان ادھر موسم بہت اچھا ہے۔۔۔ اور تمہارے کتنے بچے ہیں۔۔۔ گائے بھی ہے؟"

سلطان ذرا پریشان ہو گیا۔۔۔ "میں تو جاپانی۔۔۔"

"کوئی جاپانی شاپانی نہیں۔۔۔" راہی نے فوراً کہا۔۔۔ اور تب مجھے احساس ہوا کہ اس ماحول نے جہاں مجھ پر گہرا اثر کیا تھا وہاں راہی کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور وہ ہرگز ہرگز اس ویرانے میں نانگا پربت کی ہوا کے شور اور تنہائی میں مرے ہوئے جاپانیوں کا قصہ نہیں سننا چاہتا تھا۔

"ہاں تو سلطان تم مجھے بتاؤ کہ جاپانی کدھر سے آتے ہیں؟" میں اس روایت کو جاننا چاہتا تھا۔

"صاحب وہ ادھر سے نانگا پربت پر سے اترتے ہیں اور بھاگتے ہوئے اس میدان میں آتے ہیں اور پھر اوپر چلے جاتے ہیں۔۔۔"

"باپ رے۔۔۔" راہی نے یکدم شور مچا دیا اور پھر بلند آواز میں کوئی بنگالی گانا گانے لگا۔۔۔ کہ اے دریا تیرا کنارہ نہیں ۔۔۔

"اور یہ مرے ہوئے جاپانی ہوتے ہیں! ہو سکتا ہے وہی ہوں جو یہاں دفن ہیں؟"

"خدا معلوم ۔۔۔ لیکن صاحب وہ بہت بے چین ہوتے ہیں۔۔۔"

"اور کس وقت آتے ہیں؟ دن کو یا رات کو؟"

"دن کو بھی آتے ہیں صاحب ۔۔۔ لیکن پورا چاند ہو اور بادل نہ ہوں۔۔۔"

"تارڑ صاحب ۔۔۔" راہی نے دھپ سے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیا "ادھر سے چلو۔۔۔"

"ٹھہریں ابو۔۔۔" کیمر میرے پاس آیا اس کے ہاتھ میں تین چار کاسنی رنگ کے پھول تھے "یہاں پھول بہت کم ہیں ۔۔۔" وہ جھکا اور ایک پتھر پر برش اور سیاہی کی مدد سے لکھے گئے جاپانی حروف پر پھول رکھ دیئے۔۔۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

لاتوبو واپسی پر میں جب بھی مڑ کر اس پتھریلے کتبے کو دیکھتا تو وہ تین چار کاسنی پھول مجھے اس لئے نظر آ جاتے کہ ان کے پس منظر میں روپل پیک کی برف تھی... سوکھی ہوئی لکڑیاں تھیں اور پتھر پر جاپانی حرف تھے...

"تاپ میدان کی رات میں الاؤ اور اس کے سائے نانگا پربت پر"

راہی ہم سب سے آگے چل رہا تھا... لاتوبو گاؤں کے قریب پہنچ کر میں اپنے ساتھیوں سے الگ ہو کر ان جہازی سائز پتھروں پر چڑھتا ہوا بلندی کی طرف جانے لگا جن پر لاتوبو کے جھونپڑے بنے ہوئے تھے۔ میں نے ایک دو غار نما کمرے بھی دیکھے اور ان میں وہ آنکھیں بھی دیکھیں جو مجھے چھپ کر دیکھتی تھیں .... راہی اور سمیر مزید کوہ پیمائی کے موڈ میں نہیں تھے اور میں لاتوبو کی بلندی پر پہنچ کر میدان اور سمات ندی کی تصویر اتارنا چاہتا تھا...

جتنی دیر میں میں لاتوبو کے سب سے بلند پتھر پر بنی ہوئی چھوٹی سی مسجد تک پہنچا اتنی دیر میں سمیر راہی اور سلطان میدان عبور کر کے خیمے تک پہنچ رہے تھے... اور میں انہیں یہاں سے ان کی چال سے پہچان رہا تھا... سمیر ایک ہرن اور اونٹ کی ملی جلی چال چلتا تھا... راہی ایک غیر محسوس طریقے سے حرکت کرتا جاتا تھا اور سلطان ایک ٹھہراؤ سے آگے بڑھتا تھا... تصویر اتار کر میں نیچے آیا تو گاؤں کے سامنے ندی کے کنارے چند لوگ آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے... اور ان میں ایک غیر ملکی جوڑا بھی تھا... یہاں پر بہادر جمیل اور سکول ٹیچر محمد افلاطون سے بھی ملاقات ہوئی... گھاس پر دو نیلے رک سیک اوندھے پڑے تھے ... اور یہ فرانس سے آئے تھے... انہوں نے بتایا کہ وہ جنگلوٹ سے پیدل چلتے آ رہے ہیں۔ یعنی بونجی۔ استور۔ گریکوٹ اور ترشنگ سے ہوتے ہوئے یہاں پہنچے ہیں...

"آج آپ کہاں سے آئے ہیں؟ روپل سے؟"

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"نہیں ---" انگریزی چونکہ صرف لڑکی جانتی تھی اس لئے اس نے جواب دیا "ہم ادھر ٹاپ میدان کے دوسری جانب ریسنگ کے بیس کیمپ سے آئے ہیں"

"جاپانیوں کا کیا حال ہے؟"

"ایک لڑکی زخمی ہے۔ شاید آج یا کل ہیلی کاپٹر اسے نکالنے کے لئے آئے ---

"ہم نے تو سنا تھا کہ ریسنگ بیس کیمپ اور ٹاپ میدان کے درمیان جو گلیشیر پڑتا ہے وہ نرم پڑ گیا ہے اور اس پر سے گزرنا خطرناک ہے ---"

"ہوں ---" لڑکی نے سر ہلایا اور پھر اپنے ساتھی کو فرانسیسی میں کچھ کہا جس پر اس نے بھی ہونٹ سکیڑ کر نہایت ڈراؤنی سی شکل بنائی "ادھر سے کوئی نہیں آتا اور ہم اوپر سے روپل جا کر پھر ٹاپ میدان میں نہیں آنا چاہتے تھے اور ہم نے ---- اور یہ حماقت تھی ہم مرتے مرتے بچے

"لیکن وہاں سے گزرا جا سکتا ہے ---؟" مجھ میں اس بیس کیمپ تک جانے کی خواہش سر اٹھانے لگی۔

"ہاں ---- اگر تم اتنے بیوقوف ہو جاؤ جتنے ہم ہیں ---" اس نے ہنس کر اپنے ساتھی کی جانب دیکھا ---- تھوڑی دیر بعد وہ اٹھے اور مازینو پاس کی جانب چلنے لگے ---- ان کے پاس ایک نقشہ تھا اور اس کے مطابق انہیں مازینو کے آس پاس ایک ایسا راستہ ملتا تھا جو سیدھا کیل جاتا تھا ----

جس طرح بغیر خوف کے اور نڈر ہو کے یہ لوگ جنگلوں اور پہاڑوں میں نکل جاتے ہیں یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں --- ہم اپنے ملک میں' اپنے لوگوں میں ڈرے ڈرے پھرتے ہیں اور یہ حضرات ایک رک سیک اٹھا کر ایک نقشہ جیب میں ڈال کر گھر سے نکل کھڑے ہوتے ہیں ----

"آپ کے لئے میں لسی منگواتا ہوں ----" محمد افلاطون نے ایک بچے کو بلا کر کچھ کہا ----

"اگر آپ یہ لسی ہماری کیمپنگ میں بھیج دیں تو میرے ساتھی بھی پی لیں گے ---" میں نے افلاطون سے کہا ---- اور یہ افلاطون بہت اچھا تھا ---- اور اس نے ہمیں مقامی رسوم و رواج سے آگاہ کیا ---- اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ نانگا پربت کی وادیوں میں "لسی" سے مراد گاڑھا دہی ہوتا ہے اور یہ دہی پیٹ کے لئے اور بلندی کی حتی کے لئے تیر بہدف شے ہے۔ میں میدان عبور کر کے جب اپنے خیمے کے تقریباً سامنے پہنچا تو ایک حماقت کا احساس ہوا ---- میرے اور خیمے کے درمیان ندی تھی

اور میں سمیر کی طرح لم ڈھینگ اور چھیلا نہ تھا کہ اسے ذرا کوشش کر کے پھلانگ جاتا ---- لاتوبو گاؤں جا کر اسے عبور کرنا مجھے دشوار لگ رہا تھا کہ کون اتنی دور واپس جائے ---- میں اس کے کنارے کنارے چلنے لگا کہ شائد کوئی ایسا مقام ملے جہاں تھوڑی بہت جسمانی آہ و فغاں سے ندیا پار ہو جائے لیکن افسوس ---- مجھے سمیر نے اپنے پتھر پر بیٹھے ہوئے دیکھا اور ندی کنارے بھٹکتے ہوئے دیکھا اور وہ جان گیا کہ کیا معاملہ ہے ---- وہ بہت جلد میرے قریب پہنچ گیا۔ نیچے ندی کے دوسرے کنارے پر ----

"میرا ہاتھ پکڑ لیں ابو ---" اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا تو لگا کہ کوئی تنومند رسہ ہے جو مجھ تک چلا آتا ہے ---- میں نے اس کا ہاتھ تھام کر چھلانگ لگائی اور اس خدشے کے باوجود کہ اگلے لمحے میں ندی میں ہوں گا ندی کے پار جا گرا۔

سلطان دوپہر کا کھانا تیار کر رہا تھا۔

راہی ایک درخت کی چھاؤں میں لاتوبو کے بچوں کے ایک غول میں بیٹھا ان کے سکیچ بنا رہا تھا ---- اور یہ فرمائشی سکیچ تھے ---- ایک موٹے سے تعویزوں سے لدے بچے کو جب اس نے سکیچ بنا کر دیا اور بچہ اسے لے کر جانے کو تھا تو راہی نے اسے روک لیا "اوئے ٹھہرو اس پر میں نے اپنے دستخط تو کئے نہیں۔ کسی کو کیا پتہ لگے گا کہ یہ کس نے بنایا ہے ---" اور پھر اس نے سکیچ کے نیچے بڑے اہتمام سے "راہی۔ لاتوبو" تحریر کیا ---- اس کا معمول تھا کہ وہ لاتوبو کے بچوں کو جمع کر کے انہیں یوگا کی ورزشیں سکھاتا اور انہیں کہتا "دیکھو تم کل آؤ تو منہ ہاتھ دھو کر آؤ پھر ہم تم کو بسکٹ دے گا۔ صابن نہیں ہے؟ نہیں تو ٹھیک ہے۔ رات کو چہرے پر مکھن لگا کر سو جاؤ ---- مکھن ہے ناں؟ اور پھر صبح اٹھ کر چکنی مٹی کے ساتھ منہ ہاتھ دھو لو تم خوبصورت ہو جاؤ گے ----"

اور یہ حقیقت ہے کہ راہی کی وجہ سے لاتوبو کے بچے باقاعدہ نکھنے لگے تھے' خوبصورت ہو گئے تھے۔ محمد افلاطون لسی کا ایک جگ اٹھائے چلا آ رہا تھا ---- اور اس میں بے حد سفید اور گاڑھی دہی تھی ----

اور تاتو کی طرح اس میں کوئی مکھی سطح پر یا زیر سطح نہیں تھی ---- میں نے اس میں دو گلاس پانی ڈالا اور چند چمچے چینی ملا کر خوب گھولا اور یہ ایک انتہائی شاندار مشروب بن چکا تھا ---- کھانے کے ساتھ میں اور سمیر لاہور کو یاد کرتے غٹ غٹ لسیاں پیتے تھے ---- اور راہی روٹی پر جام لگا کر اس کا رول بنا کر اسے نگلتا تھا اور کہتا تھا "---- ویری گڈ فوڈ"

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

کھانے کے بعد محمود آگیا اور اس کے پاس اچھی خبریں نہیں تھیں۔

"دیو سائی کے لئے گھوڑا نہیں مل رہا صاحب.... اس بوڑھے کے گھوڑے بھی جنگل سے واپس نہیں آئے.... اور ادھر ٹاپ میدان اور لاتوبو میں اور کسی کے پاس گھوڑا نہیں ہے...."

"تو پھر ہم ترشنگ کے راستے رحمان پور پل کے راستے چلم چوکی چلے جائیں گے اور وہاں سے پیدل دیو سائی...."

"اس ٹینٹ کے ساتھ نہ جاؤ صاحب ---" محمود نے سر ہلایا "بڑا پانی بہت تیز ہوتا ہے اگر اس پر پل نہیں تو آپ پار نہیں جا سکتا... کیا کرے گا دیوسائی جا کر.... وہاں کیا ہے' کچھ بھی نہیں"

"ہاں وہاں کیا ہے...." میں نے انتہائی بے بسی کے عالم میں ایک گہرا اور نانگا پربت کی طرح سرد سانس لیا "دفع کرو دیو سائی کو... دنیا میں چند سر پھرے لوگوں کے سوا کون ہے جو دیوسائی گیا ہے اور جو نہیں گئے۔ وہ بھی تو خوش و خرم ہیں اچھی بھلی زندگی گزارتے ہیں.... دفع کرو دیو سائی کے روگ کو..."

راہی اٹھ کر میرے پاس آگیا --- وہ ہمدردی سے ہنسا "مجھے معلوم ہے کہ دیوسائی آپ کے لئے کتنا امپارٹنٹ ہے لیکن.... کیسے جائے گا... چھوڑو نا... دفع کرو"

میں بہت دیر تک چپ بیٹھا رہا.... میں ہر مرتبہ دیوسائی کے لئے گھر سے نکلتا تھا اور اسے دیکھے بغیر کچھ اور دیکھ کر واپس چلا جاتا تھا.... شائد اسے قسمت کہتے ہیں کہ یہ لکھا گیا کہ مجھے وہاں ابھی نہیں جانا...

"صاحب آج رات بھی ادھر رہے گا؟" سلطان میری طرف آ رہا تھا "ادھر نہ چلیں ٹاپ میدان کی طرف.... ادھر سے ہمارا بنک بھی نزدیک ہے اور نظارہ بہت ہے..."

"بالکل ٹاپ میدان ---- کوچ کرو سلطان"

آدھ گھنٹے کے اندر اندر ہمارا خیمہ پیک ہو چکا تھا اور بقیہ سامان رک سیک اور تھیلوں میں ٹھونسا جا چکا تھا۔ محمد افلاطون نے پلاسٹک کین اٹھا لیا۔ ناظم اور بہادر جمیل بھی ہمارے ساتھ تھے.... اور لاتوبو کے بچے جو ہماری روانگی پر خوش نظر نہیں آتے تھے.... یہ دیوسائی کی مایوسی تھی جسے بھولنے کے لئے ہم لاتوبو چھوڑ کر ٹاپ میدان کوچ کر رہے تھے....

ہم ساٹ ندی کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے.... اس سے الگ ہونے سے پیشتر

میں نے جھک کر اس کا خنک پانی پیا....

ہم درختوں کے ذخیرے میں تھے.... پھر ایک تیز نالہ نانگا پربت سے اتر رہا تھا اور ہمارے راستے میں تھا.... کیا ہم نے لاتوبو جاتے ہوئے اسے عبور کیا تھا؟ ضرور کیا ہو گا لیکن ہمیں یاد نہ تھا۔ اب ہم اس پہاڑی کی مخالف سمت میں آ نکلے تھے جس کے پاؤں میں ہمارا خیمہ تھا اور جس کے اوپر سروٹ جھیل تھی.... یہاں بڑے بڑے سفید پتھر تھے اور ان کے آس پاس دلدل نما علاقہ.... یہ سفید پتھر نانگا پربت کی ایک چٹان کے عین نیچے تھے....

"صاحب یہ شی گیری ہے... سب لوگ ادھر کیمپ کرتا ہے...."

میں نے ایک سفید پتھر پر بیٹھ کر شی گیری کا معائنہ کیا.... ہوا سے محفوظ ٹاپ میدان کے ایک کونے میں الگ تھلگ لیکن نانگا پربت کے بالکل نیچے... آپ یہاں سے سر اٹھا کر دیکھیں تو صرف بڑی چٹانیں نظر آتی ہیں اور نانگا پربت ان کے پیچھے رہ جاتی ہے۔ یوں بھی یہ گیلا علاقہ تھا۔

"ادھر چلو جدھر تمہاری بنک ہے جدھر پہلے دن ہم یاک کے نمدے پر بیٹھ کر چائے پیتے تھے...."

"ادھر ہوا بہت ہوگی صاحب...."

"خیر ہے ---"

ہم ذرا آگے گئے تو ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں شوخ رنگوں کے دو رک سیک نظر آئے.... تین پورٹر اسی پتھر پر ستا رہے تھے اور چٹان کے نیچے ایک انتہائی خوبصورت اور تواں نکور خیمہ ایستادہ تھا....

"کون لوگ ہیں؟" میں نے پورٹر سے دریافت کیا۔

"گورے ہیں----" انہوں نے اپنے تئیں مکمل معلومات دے دیں۔

اتنی دیر میں خیمے کا پردہ الگ ہوا اور اس میں سے نہایت صاف ستھرے لیکن تھکے ہوئے اور ذرا بیزار میاں بیوی باہر آئے.... ہمیں دیکھ کر وہ زبردستی مسکرائے۔

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟" سمیر نے آگے بڑھ کر پوچھا....

"اطالیہ... ہم نے مازینو پاس جانا تھا لیکن پچھلے دو دن سے استور روڈ بند تھی اس لئے اب ہمارے پاس وقت نہیں ہے.... ہم یہیں سے واپس چلے جائیں گے اور ہم تین برس سے اس ٹریک کی تیاری کر رہے تھے...." ان کی بیزاری سمجھ میں آتی تھی۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"لیکن اتنی دور آ کر واپس چلے جانا تو بہت دل توڑنے والی بات ہے..."

"ہماری چھٹی ختم ہونے والی ہے اور ہم دیر سے کام پر نہیں پہنچ سکتے..."

انہوں نے ہم سے مقامی قسم کی کچھ معلومات حاصل کیں اور پھر اپنے خیمے میں گھس کر پردے کی زپ بند کر دی... ہمیں بور نہ کیجئے اور اپنا راستہ لیجئے اور ہم نے اپنا راستہ لیا...

ٹاپ ٹی سن یا روپل دریا کے اوپر رکھے ہوئے درختوں کے تنوں پر سے اس مرتبہ ہم بے خطر گذرے... اور دوسری جانب چلے گئے... اب ٹاپ میدان ہمارے سامنے وسیع ہو رہا تھا... جدھر چرواہوں کے گھر تھے ذرا بلندی پر اس ڈھلوان میں نمی بہت تھی اور گھاس کے نیچے پانی تھا اس لئے ہم درختوں کے ذخیرے کے اختتام پر رک گئے اور وہیں خیمہ نصب کرنے کا فیصلہ کر لیا... یہاں زمین سخت گھاس اور چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھی... کہیں کہیں پتھر تھے اور ان کے علاوہ درختوں کے سوکھے ہوئے تنے بے شمار تھے اور کسی تجریدی پینٹنگ کی طرح ایک شاندار پس منظر میں دکھائی دیتے تھے... بائیں جانب یہاں سے بھی روپل پیک نظر آتی تھی... سامنے ذرا نشیب میں دریائے روپل پھیلا ہوا تھا... تقریباً ایک میل کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی چراگاہ دکھائی دیتی تھی اور اس کے ساتھ روپل گلیشیئر کا اونچا کنارہ دکھائی دیتا تھا کنارہ یا دیوار کہہ لیجئے جسے مقامی زبان میں ٹاپ نیں کلک کہتے تھے اور کچھ لوگ اسی گلیشیئر کو جسے پار کر کے ہرنگ ہیں کیمپ جاتے ہیں "کم کھہ" کا نام دیتے ہیں۔ اس دیوار کے ساتھ جو پہاڑی اٹھتی ہے اور نانگا پربت کے تھوڑے سے حصے کو چھپاتی ہے اس کا نام ممیل ہے... اور ممیل سے اوپر کھل کی چراگاہ ہے...

اور دائیں جانب پہاڑوں کا وہ سلسلہ تھا جس کے اندر سے ہم برآمد ہوئے تھے اور ہمارے سامنے ٹاپ میدان پھیلا ہوا تھا... چرواہوں کی بستیوں کے پیچھے بلندی پر برف تھی...

اور ادھر ہوا واقعی بہت تھی اور بہت تیز تھی... اتنے وسیع میدان میں جب وہ نانگا پربت سے نیچے آتی تھی تو بلا روک ٹوک چلتی تھی اور تیز ہوتی چلی جاتی تھی... ہمارے خیمے کا کپڑا اس کے بوجھ سے مسلسل دبتا چلا جاتا تھا۔

"ہم شام کو آئیں گے..." ہمارے مقامی دوست خیمہ نصب کرنے کے بعد چلے گئے... صرف چند بچے رہ گئے جو لاتو کے تھے اور جو نزدیکی پتھر پر بیٹھے آپس میں

چہلیں کرتے تھے... تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی رخصت ہو گئے۔

راہی پتہ نہیں کہاں تھا شاید دریا کی جانب گیا تھا۔

سلطان اور محمود بنک کی طرف جا چکے تھے اور انہوں نے روٹی اور آلو لے کر شام کو لوٹنا تھا...

خیمے کے اندر پچھلے پہر کے سورج کی زردی بہت شوخ اور آنکھوں کے اندر تک جاتی تھی... سمیر چترالی ٹوپی پہنے اپنے سر کے نیچے ہاتھ رکھے سلیپنگ بیگ پر لیٹا خیمے کو تکتا جا رہا تھا... صبح سے اس کی صحت کچھ ٹھیک نہیں تھی... وہ کچھ چپ تھا اور کچھ اس کی آنکھوں میں سرخی بہت تھی... یہاں خیمے کے نیچے اس کا سفید رنگ دمکتا تھا اور وہ چپ چاپ اپنی آنکھیں جھپکتا خیمے کے روشن کپڑے کو دیکھ رہا تھا...

ٹاپ میدان میں دریا بہتا تھا اور بہنے کی ہلکی آواز تھی اور اس کے ساتھ ہوا کی سرسراہٹ بلند ہوتی تھی... میں بھی کچھ سست محسوس کر رہا تھا... میں نے آنکھیں بند کر لیں... خیمے کے اندر ایک پرسکون ٹھہراؤ تھا جیسے اپنے گھر میں ہوتا ہے...

تھوڑی دیر کے بعد میں اونگھ گیا...

میری آنکھ کھلی تو خیمہ بدستور زرد روشنی کی زد میں تھا اور سمیر آنکھیں بند کئے لیٹا ہوا تھا... مجھ میں نیند اور کسل مندی اور تھوڑی سردی تھی۔ کچھ دیر میں نے دریا اور ہوا کے ہلکے شور کو ٹاپ میدان کی تنہائی میں سنا اور پھر اٹھ بیٹھا... میں نے دیکھا کہ سمیر جاگ رہا ہے اور اس کی آنکھیں مزید سرخ ہیں۔ میں نے اس کے گالوں اور ماتھے کو چھوا "کیا بات ہے بیٹے؟"

"کچھ نہیں ابو..." اس نے بالکل کوری اور خالی آواز میں کہا۔

"بخار تو نہیں... تمہارا وجود کچھ گرم ہے..."

"نہیں بس وہی تھوڑا سا زکام ہے جو ہو جایا کرتا ہے..."

"آؤ ذرا دریا تک چلتے ہیں... نانگا پربت بالکل صاف دکھائی دے رہی ہے"

"نہیں ابو..." وہ کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔

خیمے سے باہر۔ اس کے اردگرد... دور دور تک... درختوں اور جھاڑیوں میں... ڈھلوانوں پر اور چراگاہوں میں کوئی نہ تھا... مویشی بھی نہ تھے... جیسے گڈریئے ٹاپ میدان کو خالی کر کے چلے گئے ہوں... ان کے جھونپڑے سرسبز ڈھلوانوں کے ساتھ لگے دکھائی نہ دیتے تھے... میں نے سوچا کہ زرد خیمے اور اس کے پس منظر میں

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

نانگا پربت کی ایک تصویر اتاری جائے اور اس مقصد کے لئے میں خیمے سے ہٹ کر بہت دور تک گیا' چلتا رہا لیکن... یہ ممکن نہ تھا کہ خیمے کے ساتھ نانگا پربت چوٹی تک ایک تصویر میں سما جاتی... ڈھلوان کے ساتھ زمین گیلی تھی اور یہاں دیکھ کر چلنا پڑتا تھا... کہیں کہیں چھوٹی نالیاں بھی چل رہی تھیں... اور پھر آگے جا کر تھوڑی سی ریت نظر آئی... یہاں دریا کی ایک چھوٹی سی شاخ بہتی تھی اور اس کے پار جانا آسان تھا کہ اس میں مناسب وقفوں سے پتھر ابھرے ہوئے تھے' یوں بھی مجھے پار جانا تھا کیونکہ میں نے وہاں سے خاصے فاصلے پر راہی کو سپاٹ کر لیا تھا... دریا کی اس شاخ سے پرے پانی کی وسیع گزرگاہ تھی... پتھر اور کنکر اور کہیں کہیں ریت... دریا کا مرکزی دھارا کہیں درمیان میں بہتا تھا لیکن چھوٹی چھوٹی شاخیں پورے میدان میں ہموار چلتی تھیں... اور پھر قریب آ کر ایک بدن ہو کر روپل گلیشیئر کے نیچے چلی جاتی تھیں... وہی روپل گلیشیئر جس کے اوپر ہم نے کیمپ کیا تھا...

دریا اتنا ہموار تھا کہ یک رنگ کنکروں کے درمیان جہاں وہ بہتا تھا نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے پار جو چراگاہ تھی اس میں دھبوں کی صورت میں چند مویشی نظر آئے... وہ مجھ سے بہت دور تھے' یہیں سے ہیرنگ ہیں کیمپ کو راستہ جاتا تھا...

راہی دریا کے دھارے کے قریب کھڑا تھا... اس کی پشت میری جانب تھی اور وہ سر اٹھا کر نانگا پربت کو انتہائی محویت سے دیکھ رہا تھا... میں قریب ہوا... لیکن اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا نہیں حالانکہ اس نے جان لیا تھا کہ میں وہاں ہوں۔ وہ اسی طرح پورے منظر کو تیز ہوا میں دیکھتا جا رہا تھا...

وہ دیکھتا رہا...

اور میں بھی ٹاپ میدان کے اس وسیع منظر میں گم کھڑا رہا... کسی اور دنیا میں... کتنے الگ اور کتنے مختلف... کیا ہم وہی ہیں' لاہور اور اسلام آباد کی چالاکی اور منافقت اور ریاکاری کے نمائندے... پھنّے خاں... تکبر اور جھوٹ کے بیوپاری... معاشرے کی جعلی اخلاقیات کو تقویت دینے والے... اور جب ہمارے اندر شور ہوتا ہے کہ یہ جھوٹ ہے' یہ جھوٹ ہے تو ہم اس کے سامنے یہ سچ ہے یہی سچ ہے کا لاؤڈ سپیکر لگا دیتے ہیں... کیا ہم وہی ہیں... یا ہم آہستہ آہستہ بدل چکے ہیں... کچھ بونجی کے باہر کی وسیع لینڈ سکیپ میں... کچھ جیپ کے سامنے پرواز کرتے ہوئے چکوروں سے... کچھ ترشنگ کی سرد ہوا میں... کچھ روپل کے گل رنگوں میں اور بہت کچھ

یہاں... ٹاپ میدان میں... اور اگر ہم نہیں بدلے تو یقیناً ہمارے دلوں پر قفل پڑ چکے ہیں۔

میں راہی کے قریب ہوا تو اس نے نانگا پربت سے نگاہیں ہٹا کر میری طرف دیکھا... وہ مسکراہٹ عجیب اور ناقابل بیان تھی جو اس کے چہرے پر تھی... اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں اور مجھے محسوس ہوا کہ اس آبی پردے پر ٹاپ میدان کی وسعت اور نانگا پربت کی بلندی نقش ہے... اور شاید اسی لئے وہ آنکھیں نہیں جھپکتا کہ کہیں یہ تصویر بہہ نہ جائے... میں پھر پیچھے ہٹ گیا... میں مخل ہوا تھا...

"تارڑ بھائی..." اس نے صرف اتنا کہا۔

"کیا ہو رہا ہے راہی چاچا..." میں نے ذرا خوش دلی سے پوچھا۔

"میں ادھر تھا..." اس نے نانگا پربت کی طرف اشارہ کیا "اور پھر دریا کے کنارے اس میدان میں کھڑا اور ادھر ہوا تیز تھا... تو میں اس کو تھینک یو کہہ رہا تھا... شکریہ بولا کہ تم نے مجھے یہ سب کچھ ان آنکھوں سے دکھایا... اور پھر مجھے اتنی ہمت دی' اتنی صحت دی کہ میں یہاں پہنچ گیا... ان دونوں چیزوں کا شکریہ کہا..." وہ پھر مجھ سے الگ ہو گیا اور اوپر دیکھنے لگا...

میں دریا کی گزرگاہ میں چلتا اپنے خیمے تک واپس آ گیا... خیمے کا پردہ گرا ہوا تھا... دھوپ ڈھل رہی تھی... میں نے جھک کر پردہ اٹھایا تو سمیر اسی طرح لیٹا ہوا تھا... اس کا چہرہ دمک رہا تھا اور آنکھیں سرخی میں تھیں اور وہ چپ تھا...

"کیا بات ہے بیٹے؟"

"کچھ نہیں ابو..." اس نے منہ پرے کر لیا...

میں اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس کا سر اپنے بازو پر رکھ کر دوسرے ہاتھ سے اس کے بالوں کو سنوارنے لگا... "کیا بات ہے سمیر... امی یاد آ رہی ہیں؟"

"نہیں..." اس کی آواز مدھم تھی۔

"بھائی جان اور عینی یاد آ رہے ہیں..."

"نہیں ابو..."

"تو پھر کیا ہے بیٹے؟"

اور پھر میرے اس بازو پر جس پر اس کا چہرہ آرام کرتا تھا... ایک نیم گرم

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

گیلاہٹ پھیل گئی... پہلے ایک آنسو... اور میں اسے دیکھ نہیں سکتا تھا صرف اپنے ہاتھ پر محسوس کر سکتا تھا اور پھر ٹپ ٹپ تین چار آنسو... اور وہ میرے بازو سے پھسل کر کہنی تک چلے آئے... میں بالکل بے حس و حرکت بیٹھا رہا... اور پھر میں نے اس کا چہرہ اپنی جانب کئے بغیر اپنی انگلیوں سے اس کی بھیگتی ہوئی آنکھیں تلاش کیں اور ان پر ہاتھ پھیرا... "اداس ہو گئے ہو بیٹے؟"

"نہیں ابو..." وہ اٹھ کر بیٹھ گیا "یہ ٹاپ میدان بہت دور ہے... میں زرشک پہنچوں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا' کم از کم وہاں جیپ تو آتی ہے... یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے"۔

یہ گھر سے دوری کا احساس تھا... یہ گھر سے مکمل طور پر کٹ جانے کا احساس تھا...

میں نے سوچا ہم اگلی صبح واپسی کے لئے خیمہ سمیٹ لیں گے۔

ٹاپ میدان کی وسعت ان چند چہروں میں سمٹ آئی جو خیمے کے قریب ایک بہت بڑے الاؤ کے قریب تھے اور ان پر آگ کی پرچھائیاں حرکت کرتی تھیں۔ بہادر جمیل درختوں کے سوکھے ہوئے تنوں کو دونوں ہاتھوں سے گرفت میں لیتا اور انہیں ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ زمین میں سے نکال باہر کرتا...

یہ تنے سوکھے ہوئے تھے اور ان میں سے پچھلے ہفتے کی بارشوں کی نمی بھی خشک ہو چکی تھی... وہ الاؤ پر تھوڑی دیر تک بے پروائی سے پڑے رہتے اور پھر یکدم جل اٹھتے...

سلطان بیگ سے ایک تازہ روٹی اور ابلے ہوئے آلو لے کر آیا تھا... تازہ روٹی کو میں نے اور سمیر نے پنیو اور سارڈین مچھلی کے ساتھ کھایا اور مشروب کے طور پر سیون اپ کے ٹین کھولے... آج ٹاپ میدان میں ہماری آخری شب تھی اس لئے ہم جشن کے موڈ میں تھے... ابلے ہوئے آلو راہی کے لئے تھے...

"نہ نہ..." راہی یکدم اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اس وقت بہادر جمیل خیمے کے سامنے ایستادہ دو ٹنڈ منڈ تنوں میں سے ایک پر اپنی گرفت مضبوط کر رہا تھا "اس تنے کو نہ اکھاڑو... دیکھتے نہیں خیمے کے ساتھ ان دونوں سوکھے ہوئے درختوں کی کمپوزیشن بنتا ہے... بابا کمپوزیشن خراب نہ کرو..."

بہادر جمیل نے راہی کی طرف منہ کھول کر دیکھا کہ اسے کیا اعتراض ہے اور پھر اس نے اندازہ لگایا کہ اسے جو بھی اعتراض ہے اس کی سمجھ سے باہر ہے اور وہ بس یہی چاہتا ہے کہ اس درخت کو نہ اکھاڑا جائے... اس نے اس تنے کو چھوڑ کر دوسرے تنے پر ہاتھ ڈال دیا...

"نہ بابا... دونوں کمپوزیشن ہیں... کوئی اور درخت لے آؤ"

بہادر جمیل غصے میں نیچے اترا اور دریا کے قریب زمین پر گرے ہوئے ایک بہت بڑے تنے کو گھسیٹتا ہوا لے آیا... "یہ ٹھیک ہے؟"

"ہاں شاباش..." راہی نے سر ہلایا اور پھر متوجہ ہو کر اپنے آلو کھانے لگا... میں اپنے کافی کے مگ پر جھک گیا... دریا اور ہوا کے ساتھ اب آگ کی آواز بھی تھی... اور اس کی گرمی جونہی سرد بدن کو چھوتی سرد ہوا اسے سمیٹ کر لے جاتی...

"مسٹر پلیٹو..." راہی محمد افلاطون کو اسی نام سے پکارتا تھا "آپ ٹیچر ہیں تو کدھر پڑھاتے ہیں؟"

"ہم ادھر پڑھاتے ہیں..." افلاطون نے پہاڑوں کی طرف اشارہ کر کے کوئی عجیب سا نام لیا...

"تو ادھر اس علاقے کا کیا پرابلم ہے؟"

"ادھر جناب بے روزگاری بہت ہے... اسے دور کرنے کے لئے سکول بننا چاہئے... ادھر ہائی سکول صرف استور اور گر یکوٹ میں ہے۔ اور پورے شمالی علاقے میں تین کالج ہیں... سکردو' گلگت اور چلاس... آپ واپس جا کر ادھر بول دینا کہ ادھر ہائی سکول بنا دے..."

"اچھا بول دے گا" راہی نے سر ہلا دیا اور پھر جیسے اسے کچھ یاد آگیا ہو وہ اٹھ کر میرے پاس آگیا "تارڑ صاحب آپ کو الرجی کی دوا چاہئے... نہیں چاہئے؟ اگر ضرورت ہو تو میرے پاس ہے الرجی کی دوا..."

"راہی صاحب میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ مجھے الرجی کی دوا نہیں چاہئے... الرجی ہو تو دوا مانگوں..."

"آپ نے تو میرا دل توڑ دیا... میں خاص طور پر اپنے ساتھ الرجی کی دوا لے کر آیا ہوں... اور آپ لیتے ہی نہیں..." وہ مسکراتا ہوا اپنی جگہ پر واپس چلا گیا۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

میں اپنی ڈائری کھول کر ٹاپ میدان کے بارے میں تفصیلات جمع کر رہا تھا کہ اس پہاڑی علاقے کا کیا نام ہے اور اس گلیشیئر کو کیا کہتے ہیں جب میں نے سر اٹھا کر سلطان سے کہا "سلطان کیا تم نے خود لاتوبو کے قریب جاپانیوں کو نانگا پربت سے اتر کر قبرستان والے میدان میں دوڑتے اور پھر واپس جاتے دیکھا ہے؟"

"ہاں ہاں۔۔۔" وہ پورے یقین سے بولا۔۔۔ "اگر پورا چاند ہو تو وہ آتے ہیں ناں۔۔۔"

"ارے ارے۔۔۔ سلطان۔۔۔" راہی نے بڑی سنجیدگی سے اسے ڈانٹا "نہیں نہیں آپ انہیں نہیں سناؤ۔۔۔"

"نہیں سناؤں گا صاحب۔۔۔" وہ چپ ہو گیا۔

"ویسے آج چاند کی کیا تاریخ ہے؟" راہی نے مجھ سے پوچھا اور اس وقت ہم سب نے پہلی بار آسمان کی طرف دیکھا اور وہاں چاند تھا۔۔۔ مہینے کی پہلی راتوں کا بجھا بجھا چاند جیسے تھکا ہوا ہو۔ لیکن اس میں اتنی روشنی تھی کہ اگر ہمارا الاؤ روشن نہ ہوتا تو ٹاپ میدان اور نانگا پربت ہلکے ہلکے نظر آتے۔۔۔

"شاید آج چاند کی آٹھویں یا نویں ہے"۔

"پھر ٹھیک ہے وہ سالا جاپانی ابھی چودہ تاریخ تک نانگا پربت پر ہی بیٹھا رہے گا نیچے نہیں آئے گا۔۔۔" راہی نے تسلی سے ہاتھ ملے۔۔۔ میری سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آ سکی کہ راہی نانگا پربت سے اترنے والے جاپانیوں کی کہانی سے کیوں اتنا خوفزدہ ہوتا تھا۔۔۔

"ویسے صاحب ادھر اس قسم کی کہانی تو بہت ہے۔۔۔ پری اور چڑیل وغیرہ کی۔۔۔" بہادر جمیل کہنے لگا۔۔۔

"سناؤ۔۔۔" میر نے شرارت سے راہی کی طرف دیکھا۔

"نہیں نہیں کوئی نہیں سناؤ۔۔۔" راہی نے شور مچایا۔۔۔ "رات کے وقت بالکل نہیں سناؤ"

"ایک کہانی تو یہ جو لڑکا تھا تمہارے ساتھ ناظم۔۔۔ اس کے دادا کے بارے میں ہے۔۔۔" محمد افلاطون بتانے لگا "کیوں بہادر جمیل ناظم کا دادا تھا ناں۔۔۔"

"ہاں جی۔۔۔ اور کہانی بالکل سچی ہے"۔

"ناظم کا دادا اس علاقے کا بہت بڑا شکاری تھا۔ اس کے پاس تو شکاری کتے تھے جن کی مدد سے وہ ریچھ کو بھی مار ڈالتا تھا۔ وہ چورت میں رہتا تھا۔ ایک مرتبہ ادھر ٹاپ میدان کی طرف شکار کرنے آیا اور مارخور مارے لیکن شام سے پہلے گھر نہیں پہنچ سکا اس لئے ادھر ہی رات گزارنا پڑا۔ اس نے ہماری طرح ایسے لکڑیاں جلائیں اور بیٹھ گیا۔۔۔ ابھی جلائیں تو روئی آ گئی۔۔۔"۔

"کیا آ گئی؟" اب راہی بھی دلچسپی لینے لگا۔

"روئی۔۔۔ یعنی چڑیل"۔

"اوہ باپ رے۔۔۔" راہی نے خوفزدہ ہونے کی اداکاری کی اور میر کے قریب ہو کر بیٹھ گیا۔

"تو یہ روئی اس کی بیوی کی شکل میں اس کے پاس آئی اور کہنے لگی' تم ادھر بیٹھے ہو گھر کیوں نہیں آتے؟ لیکن ناظم کا دادا پہچان گیا کہ یہ اس کی بیوی نہیں ہے بلکہ روئی ہے کیونکہ اس نے دیکھ لیا تھا کہ اس کے پاؤں پیچھے کی طرف ہیں یعنی وہ چھلاوہ پیری ہے۔ چنانچہ اس نے کہا تم گوشت کھاؤ گی؟ روئی نے کہا ہاں کھاؤں گی۔ ناظم کے دادا نے مارخور کی ایک ٹانگ آگ میں ڈال کر بھونی اور پھر جب روئی اسے نکالنے لگی تو اس نے اسے بالوں سے پکڑ لیا اور مارخور کی ٹانگ کے ساتھ بہت مارا۔۔۔ اتنا مارا کہ روئی کہنے لگی' مجھے مت مارو میں تمہارے ساتھ شادی کر لوں گی۔ ہاں ناظم کے دادا نے ایک چالاکی یہ کی کہ اس نے روئی کے بالوں میں ایک گانٹھ دے دی۔۔۔ اس طرح وہ کہیں نہیں جا سکتی تھی۔ پھر اس نے شکار کا تمام گوشت روئی کے اوپر لادا جس طرح گدھے کے اوپر لادتے ہیں کیونکہ ایک روئی پانچ گدھوں کے برابر بوجھ اٹھا سکتی ہے۔۔۔"۔

ہم سب آگ کے قریب ہونے لگے۔۔۔ ٹاپ میدان کی اس بڑی تنہائی میں اور اس رات میں یہ کہانی ہمیں اپنے بہت نزدیک لگ رہی تھی۔

"۔۔۔ ناظم کے دادا نے روئی کے ساتھ شادی کر لی اور دو سال بعد اس کے ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ جب بیٹی ذرا بڑی ہوئی تو ایک روز بیٹی اور روئی مویشی لے کر گاؤں سے باہر گئے۔ وہاں روئی نے کہا بیٹی ذرا میرے بال تو دیکھ لو۔۔۔ بیٹی نے بال دیکھ کر کہا' اماں ان میں تو گانٹھ ہے۔۔۔ اور اس نے روئی کے بالوں میں لگی گانٹھ کھول دی۔ اس کے کھلتے ہی روئی کی شکل بدل گئی۔۔۔"۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"اوہو۔۔۔ شکل بدل گئی۔ کیسے بدل گئی۔۔۔ کہانی ختم ہو گئی۔۔" راہی نے پوچھا۔

"بس جی شکل بدل کر چیلوں جیسی ہو گئی اور پھر وہ پرواز کر گئی۔۔۔ لیکن جانے سے پہلے اس نے کہا کہ میری طرف سے کلتنگ کو کہہ دو کہ وہ زبان میں بہت تیز ہوں گے اور جب وہ سو ہو جائیں گے تو پھر ان کے ہاں اولاد نہیں ہو گی۔۔۔ کلتنگ بشوم ایک جگہ کا نام بھی ہے چورت کے پاس جہاں ناظم کا دادا شکار کے لئے جاتا تھا۔۔۔ اور آج بھی ان کی نسل کی زبان بہت تیز ہے۔۔۔ کیونکہ روئی نے یہ کہا تھا۔۔۔"

بجھا ہوا چاند آہستہ آہستہ نانگا پربت کے پیچھے ہو رہا تھا۔۔۔ ستارے بھی دکھائی دے رہے تھے۔۔۔ پھر چاند مکمل طور پر نظروں سے اوجھل ہو گیا لیکن اس کی ہلکی روشنائی سے نانگا پربت کا ایک حصہ زیادہ واضح دکھائی دینے لگا۔۔۔ دریا کے بڑھتے ہوئے شور سے لگتا تھا کہ اس کے پانی قریب آ رہے ہیں۔۔۔ لیکن یہ خاموشی تھی جو آوازوں کو بلند کرتی تھی اور قریب لاتی تھی۔۔۔

ایک الاؤ ہم نے فیئری میڈو کی رات میں روشن کیا تھا۔۔۔ اسی پہاڑ کے دوسری جانب۔۔۔ لیکن تب ہم اس کے اتنے قریب نہ تھے کہ الاؤ کی پرچھائیاں برف پر لرزتی دکھائی دیتیں۔۔۔ ہم یہ الاؤ کیوں روشن کرتے ہیں؟

شاید ہمیں اس اندھیرے سے الجھن ہوتی ہے جو ہماری جانب بڑھتا ہے۔۔۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ! تیز ہوا شراروں کو اڑاتی تھی اور وہ عارضی جگنوؤں کی طرح فضا میں بلند ہو کر بجھ جاتے تھے۔۔۔

"گھر لوٹنے والے مویشی"

چرواہوں کے جھونپڑے جو ڈھلان پر تھے ابھی سورج کی آنکھ سے پوشیدہ تھے اسی لئے سائے میں تھے اور ان میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

دھوپ ناپ میدان میں ابھی پوری طرح نہیں پھیلی تھی۔

دریا کے پانی پر جہاں کہیں کرنیں پڑتی تھیں وہ زمین سے الگ دکھائی دیتا تھا۔۔۔

میں اس کی درجنوں چھوٹی چھوٹی شاخیں پھلانگ کر یا ان میں پڑے پتھروں پر چل کر ناپ میدان کے درمیان تک پہنچ گیا تھا اور یہاں دریا کا بڑا دھارا ایک دھیمے شور کے ساتھ بہہ رہا تھا۔۔۔ میں نے جھک کر اپنے چہرے کو اس کے تازہ پانیوں کے ساتھ دھویا اور ان کی خنکی نے میرے ماس کو سرد کیا اور میں زیادہ دیکھنے لگا۔۔۔

صبح کے اس لمحے ناپ میدان کے عظیم پھیلاؤ میں صرف میں تھا۔۔۔ نانگا پربت صاف آسمانوں میں بلند ہوتی تھی۔۔۔ اور پھر میرے سامنے بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اس کے کسی گلیشیئر میں سے اٹھ کر اس کی چوٹی کے گرد لپٹا اور وہیں ٹھہر گیا۔

سیاہ زدہ اور دوسرے مویشی جھونپڑوں سے نیچے آنے لگے۔

میں خیمے کو واپس آیا تو ہمارا سامان پیک ہو چکا تھا اور ایک پرمسرت میر خیمے کے دروازے پر بیٹھا ہوا اپنے جوگرز کے تسمے باندھ رہا تھا۔۔۔ قریب ہی ایک گدھا لاتعلقی سے گھاس چر رہا تھا۔

"صاحب۔۔۔ ایک گدھا ابھی کم ہے۔۔۔"

"تو کدھر گیا؟"

"یہ وہ چالاک گدھا ہے جسے ہم باندھ کر رکھتے ہیں۔ اب وہ جنگل میں چھپ گیا ہے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ آج بوجھ اٹھانا ہے۔۔۔"

"یار سلطان گدھے کو کیسے معلوم ہو گیا کہ آج ہی بوجھ اٹھانا ہے؟"

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"معلوم ہے ناں صاحب۔ گدھا بیوقوف نہیں ہوتا بہت سمجھ والا ہوتا ہے۔۔۔ محمود کا والد اس کے پیچھے گیا ہے' وہ اسے لے کر آئے گا۔۔۔"

پچھلی شب محمود نے ہمیں بتایا تھا کہ اس کا والد واپسی پر ہمارے ساتھ جائے گا کیونکہ اسے ترشنگ سے پیغام آیا تھا کہ ادھر اس کے لئے ایک ٹیم کا بندوبست ہو گیا ہے۔۔۔

پیکنگ مکمل ہو گئی' ناشتہ کر لیا گیا اور پھر ہم جنگل میں چھپے ہوئے گدھے کا انتظار کرنے لگے۔۔۔ اور چونکہ یونہی منہ بند کر کے انتظار کرنا بہت دشوار ہوتا ہے اس لئے ہم نے سلطان سے کہا کہ وہ بے کار نہ بیٹھے اور پیکٹ سے چکن کارن سوپ تیار کرے۔۔۔ چنانچہ ہم گرم چکن کارن سوپ کی چسکیوں کے ساتھ جنگل میں چھپے ہوئے گدھے کا انتظار کرنے لگے۔

چکن کارن سوپ ختم ہوا تو مجھے انڈوں کی پوٹلی کا خیال آ گیا۔۔۔ "سلطان۔۔۔ ہمارے انڈے"

سلطان نے اپنی جیکٹ کی جیب کو تھپکا "ادھر ہے۔۔۔ لیکن صرف دو رہ گیا ہے۔۔۔"

"یاد رکھنا آج شام ہم ان کا آملیٹ بنا کر کھائیں گے۔۔۔ ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے صاحب۔۔۔۔"

ہم ان انڈوں کو ہر جگہ اٹھائے پھرتے تھے لیکن جہاں کہیں کیمپ کرتے انہیں نوش کرنا بھول جاتے اور یہ کم ہوتے جا رہے تھے۔۔۔ میں نے سلطان کو ایک بار پھر تاکید کی کہ سلطان آج شام۔۔۔

"تارڑ صاحب آپ کو الرجی کی دوائی چاہئے۔۔۔" راہی نے بڑے درد بھرے لہجے میں پوچھا۔

"جی نہیں۔۔۔"

"میں تو خاص طور پر اسلام آباد سے لایا تھا۔۔۔ اگر آپ کو ضرورت پڑے تو بلا تکلف مانگ لیجئے گا"

دریا سے پرے' سیل پہاڑی کے پیچھے سے جہاں ہیرنگ بیس کیمپ تھا ایک کھٹ کھٹ کی آواز آئی اور میدان میں پھیلی اور پھر ایک بڑا سارا مچھر نمودار ہوا۔۔۔ سلطان نے آنکھوں کے سامنے چھجا بنا کر ادھر دیکھا۔۔۔ ہم سے کئی کلومیٹر کے فاصلے پر گلیشیر کی دیوار کے پیچھے سے ایک ہیلی کاپٹر ابھر رہا تھا۔ وہ نانگا پربت کی وسیع

دنیا کے پس منظر میں بہت ہی مختی اور نامعلوم سا لگ رہا تھا لیکن اس کی آواز اس کے وجود سے کئی گنا بڑھ کر میدان پر پھیلی تھی۔۔۔۔

"یہ اس جاپانی لیڈی کو لینے آیا تھا جس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔۔۔" ہیلی کاپٹر گلیشیر کی دیوار کے اوپر اڑتا ہوا روپل کی جانب چلا گیا۔

"گدھا آ گیا صاحب۔۔۔" سلطان نے ڈھلوان کی جانب اشارہ کیا۔

یہ گدھا اتنی دور سے سلطان کو جانے کیسے دکھائی دے گیا کیونکہ ہم نے اسے صرف اس وقت دیکھا جب وہ دریا کے کنارے تک آ گیا۔ گدھے کے ہمراہ محمود کا والد تھا۔۔۔ ایک مضبوط جسم کا پستہ قد مشقتی بوڑھا جو ہر بات منہ کھول کر سنتا تھا۔ ہماری زبان سے بالکل ناواقف تھا اور وہ ہمیشہ لاتعلقی سے ہر شے کو غور سے دیکھتا رہتا جیسے کسی نے زبردستی اس کی ڈیوٹی لگا دی ہے کہ ان چیزوں کو دیکھتے رہو اور وہ اس ڈیوٹی سے تنگ آ چکا تھا۔ اس کی واحد خوشی نسوار کی ایک ڈبیہ تھی جسے وہ نکال کر حسب عادت بہت دیر تک دیکھتا رہتا اور پھر ایک چٹکی بھر کر کلے تلے دباتا اور ایک سرخوشی کے عالم میں چلا جاتا۔۔۔ میں نے اس کے ساتھ سفر کے دوران محسوس کیا کہ وہ اپنے گدھے کی رفاقت میں ہی خوش رہتا ہے۔۔۔

"صاحب آپ روانہ ہو جاؤ۔۔۔" سلطان کہنے لگا "ہم سامان لے کر آتے ہیں"۔

ہم تینوں چلنے لگے کیونکہ اب ہم راستہ جانتے تھے۔۔۔ میر ایک ایسے اڑیال کی طرح چلا ہنکیں بھرتا ہوا چلنے لگا جس کا مالک اسے تھوڑی دیر کے لئے پنجرے سے باہر نکالتا ہے۔۔۔ اس کا پورا وجود مکمل خوشی تھا۔

راہی نے میری جانب دیکھا "گھور کھو گئے۔۔۔"

"راہی چاچا کیا کہتے ہو۔۔۔ بنگالی میں کچھ کہتے ہو؟"

"ہاں۔۔۔ بنگالی میں کہتے ہیں کہ گھور کھو گئے۔۔۔ گھر کو لوٹنے والا مویشی ہمیشہ خوش ہوتا ہے۔۔۔ میر کو دیکھو"

ہاں۔۔۔ میر گھر کو لوٹنے والا مویشی تھا۔

آج شام ہم نے روپل میں کیمپ کرنا تھا۔ پہلے ہیرنگ بیس کیمپ جانے کا پروگرام بنا لیکن اس صورت میں روپل مس ہوتا تھا اور ہم روپل کو مس نہیں کرنا چاہتے تھے۔۔۔ نانگا پربت کی چوٹی کے پاس کوئی چھوٹی سی مکھی نما چیز حرکت کرتی تھی۔۔۔ ہم تینوں کھڑے ہو گئے۔۔۔ یہ کیا ہو سکتا ہے؟ پھر احساس ہوا کہ یہ گلگت سے اسلام

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

آباد جانے والا فوکر جہاز ہے... لیکن یہ ادھر ہے دریائے سندھ کے اوپر فیری میڈو کی جانب...

ہم ڈھلوان عبور کر کے وہاں تک آئے جہاں سے پتھر شروع ہو جاتے تھے... میر آگے آگے جا رہا تھا اور میں اسے بار بار روکتا... لیکن وہ اس وقت گھور گھمو گائے تھا۔ جس مقام پر دریائے روپل ٹاپ میدان کی وسعت طے کرنے کے بعد روپل گلیشیئر کے نیچے جاتا تھا وہاں ہم تھوڑی دیر کے لئے رکے۔ یہاں پہاڑ کی ڈھلوان اتنی شدید تھی کہ میں نے اپنی چھڑی زمین پر رکھی تو وہ دو میٹر تک لڑھکتی گئی... نیچے روپل گلیشیئر کے سفید اور سیاہ ہاتھی' درجنوں ہاتھی ماتھے جوڑے زور لگا رہے تھے اور ان کے ٹوٹنے گرنے اور دریا میں لڑھکنے کی خوفناک آوازیں ہمیں ایک مرتبہ پھر دہشت زدہ کرتی تھیں... جب ہمارے گدھے اور پورٹر ہم تک پہنچ گئے تو پھر ٹیم کی صورت میں سفر شروع ہو گیا۔

وہ مقام آیا جہاں ہم نے قیام کیا تھا... میری ڈائری کا پھٹا ہوا ورق پتھروں میں اٹکا ہوا تھا... ہمارے الاؤ کے نشان وہاں ایسے تھے جیسے ہم ابھی اٹھ کر گئے ہوں... اور ہم ابھی اٹھ کر گئے تھے کیونکہ ٹاپ میدان اور لاتوبو ابھی سے گم ہو رہے تھے... یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تھوڑی دیر پہلے ہم وہاں تھے... نانگا پربت کے گرد آج بادل تھے اور اس کا تھوڑا سا حصہ نظر آتا تھا... نیچے بیس کیمپ میں چوٹی کے عین نیچے دھند ٹھہری ہوئی تھی۔

ہم وہاں رکے اور سلطان اوپر سے پانی لے کر آیا۔ اوپر کسی چٹان کے اندر میٹھے پانی کا ایک چشمہ تھا... ایک ہاتھ میں پانی کا کین اور دوسرے میں گلابی رنگ کے پھولوں کا ایک گچھا...

"یہ ٹوپی پر لگاؤ میر صاحب..." میر اکثر گرم پٹھانی ٹوپی پہنتا تھا اور گورے چٹے رنگ روپ کی بنا پر یہ ٹوپی اس پر بجتی بھی بہت تھی... بلکہ دور سے بعض اوقات وہ ترشنگ کا کوئی کسان بچہ لگتا...

"تم لگا دو" اس نے ٹوپی سلطان کو دے دی... اور سلطان نے بڑے اہتمام سے وہ پھول ٹوپی کے ایک جانب اڑس دیئے "انہیں دنوئیں کہتے ہیں ان پھولوں کو... اور جو لڑکا یہ پھول لگائے اس کی شادی جلد ہو جاتا ہے"

شوکور سے ذرا آگے ایک تنگ پگڈنڈی پر چلتے ہوئے میں نے نیچے دیکھا... وہی روپل گلیشیئر اور دریا کا شور اور چٹان میں سے نکلتے ہوئے چند پھول...

"ان پھولوں کا نام کیا ہے سلطان؟"

"بتاتا ہوں... میں لاتا ہوں آپ کے لئے" اس نے پانی کا کین پگڈنڈی پر رکھا اور یکدم نیچے اترنے لگا... اسے ہم نیچے اترنا تو نہیں کہہ سکتے کیونکہ ڈھلوان اتنی تیز اور بھربھری تھی کہ اس نے پگڈنڈی سے پاؤں نیچے رکھا تو نیچے سے مٹی نکل گئی اور وہ ایک ایسی کار کی طرح آگے ہونے لگا جس کی مکمل بریک فیل ہو چکی ہو اور وہ اپنی پہلی رفتار کے زور سے خواہ مخواہ آگے جا رہی ہو۔ میرا تو دم رک گیا' سلطان کیا کر رہا ہے... وہ سیدھا نیچے گلیشیئر میں جا سکتا تھا... لیکن وہ ان پھولوں کے قریب جا کر رکا اور انہیں سمیٹ کر پھر اوپر آنے لگا... اور اوپر بھی وہ اس طرح آیا کہ ایک قدم اوپر اور دو قدم نیچے خواہ مخواہ... "صاحب یہ پھول چری کہلاتا ہے... اسے سر درد کے لئے سونگھتے ہیں... آپ سونگھو"۔

پھر ہم چیڑ کے جنگل میں آ گئے۔ برچ کے ٹیڑھے میڑھے سفید درخت اوپر ڈھلوانوں پر تھے سنو لائن کی قربت میں... یہاں سے ہم نیچے اترے۔ دریائے روپل کا مخدوش پل عبور کیا اور اس جگہ پر جا کر رکے جہاں ہم دوپہر کے کھانے کے لئے ٹھہرے تھے... چیڑ کے بلند درختوں کے سائے میں' ایک بہت بڑی کھوہ... دو پتھروں پر چھت کی طرح رکھی ایک چٹان... ہم نے وہاں آرام کیا' دوپہر کا کھانا کھایا... اور کچھ دیر اس خیال میں رہے کہ یہ جگہ شب بسری کے لئے کتنی پرسکون اور مناسب ہے لیکن پھر ہمیں وادیء روپل کے سو رنگ یاد آئے اور ہم نے ان کی طرف کوچ کیا۔ اس جگہ کو مقامی باشندے پچھاٹ کہتے ہیں۔ یہاں سے ایک بلندی سامنے آتی ہے جس پر ایک کچا راستہ ہے اور وہ راستہ جب اوپر جا کر ختم ہوتا ہے تو اپر روپل سامنے آ جاتا ہے۔

اپر روپل کے گھر اسی طرح ویران تھے... اسی طرح اجڑے ہوئے تھے... ہم ان سے پرے ہو کر کھیتوں میں چلنے لگے... دور ہریاول میں ایک گلابی رنگ کا ٹکڑا ہوا میں پھڑپھڑاتا تھا اور پھر کھیتوں پر ڈھیر ہو جاتا تھا... یہ ہم بہت دیر سے اور بہت دور سے دیکھ رہے تھے اور جب ہم نزدیک ہوتے گئے اور جب اس کے پاس آ گئے تو دیکھا کہ یہ تین پورٹر ہیں' تین غیرملکی سیاح ہیں اور یہ چھ حضرات ایک خیمے کے کپڑے کو اٹھائے ہوئے ہیں اور اسے کھیت کے درمیان میں لگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور یہ کوشش پچھلے نصف گھنٹے سے جاری تھی کم از کم... کیونکہ ہم نصف گھنٹے سے ان کی طرف بڑھ رہے تھے اور دیکھتے دیکھتے گلابی کپڑا ہوا میں پرندے کی طرح اٹھتا ہے اور

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

پھر ڈھیر ہو جاتا ہے۔ ان میں سے ایک پورٹر اپنا محمود تھا۔۔۔ وہ خیمہ چھوڑ کر ہماری طرف آ گیا۔۔۔

"صاحب آپ ذرا اس ٹینٹ کو دیکھو۔۔۔ یہ ہم سے لگ نہیں رہا"

وادی روپل سائے میں آ رہی تھی اور سائے کی وجہ سے اس کے کھیتوں کی ہریاول زیادہ گہری ہو رہی تھی۔ اپر روپل ویران پڑا تھا اور لوئر روپل یہاں سے ابھی دور تھا اور ہمیں وہاں جانا تھا۔۔۔ اور کھیتوں کی گہری ہریاول پر گلابی خیمہ سمٹا ہوا پڑا تھا۔

"کیا مسئلہ ہے؟" میں نے ایک معنک اور دانشور قسم کے سیاح سے دریافت کیا۔

"دنیا مسائل سے بھری پڑی ہے۔۔۔ کم از کم ہم تینوں کی دنیا۔۔۔ ہم سوئٹزرلینڈ سے آئے ہیں اور گلگت پہنچ کر ہم نے یہ خیمہ جی ایم بیگ سے کرائے پر حاصل کر لیا۔۔۔ آج دوپہر ترشنگ پہنچے اور وہاں رکے بغیر سفر شروع کر دیا۔ ہم مازینو پاس جا رہے ہیں۔۔۔ آہ" اس نے مایوسی سے سر جھٹکا "پہلے تو ہم مازینو پاس جا رہے تھے اب پتہ نہیں کہاں جا رہے ہیں۔۔۔ کیونکہ یہاں پہنچ کر یہ خیمہ کھولا ہے اور لگانے کی کوشش کی ہے تو لگتا نہیں ہے۔۔۔ میرا خیال ہے یہ مکمل نہیں ہے۔۔۔"

دوسرا سیاح جو نوجوان تھا کھیتوں میں گھوم کر پھول جمع کر رہا تھا' وہ ہمارے پاس آ گیا "اگر یہ خیمہ نہیں لگ سکتا تو ہم مازینو پاس نہیں جا سکتے۔۔۔ آج کی رات تو ہم کسی جھونپڑے میں گزار لیں گے لیکن یہاں سے آگے کیا ہو گا۔۔۔ میرا خیال ہے کہ ہماری سالانہ چھٹیوں کا بیڑہ غرق ہو چکا ہے اور ہم مازینو کو بھول کر واپس سوئٹزرلینڈ چلے جائیں۔۔۔"

بقیہ دو پورٹر اور ایک سیاح اس دوران خیمے کے کپڑے اور رسیوں اور راڈ کے ساتھ الجھتے رہے کہ کسی طرح سلجھے اور کھڑا ہو جائے۔۔۔ لیکن وہ کھڑا نہ ہوتا تھا بلکہ فوراً ڈھے جاتا تھا۔۔۔ ویسے یہ والا خیمہ تھوڑا پیچیدہ بھی تھا۔

میں نے گلگت واپسی پر جب بیگ صاحب سے ان کے خیمے کی ناموری کے بارے میں پوچھا تو وہ کہنے لگے "میں نے انہیں زور دے کر کہا تھا کہ پہلے اس خیمے کو کھول کر زمین پر لگا لو پھر ساتھ لے جانا لیکن وہ کہتے تھے کہ ہم جلدی میں ہیں اور یوں بھی سوس لوگ خیموں کے بارے میں پاکستانیوں سے زیادہ جانتے ہیں۔۔۔"

دانشور سیاح نے ہمارے گدھوں کے قریب جا کر ہمارے سامان کا معائنہ کیا اور پھر میرے پاس آ کر کہنے لگا "تمہارے پاس بھی تو خیمہ ہے؟"

"ہاں ہے۔۔۔"

"اور ظاہر ہے کہ یہ کھڑا ہو جاتا ہے۔۔۔"

"سو فیصد۔۔۔"

"اور اب تم نانگا پربت سے واپس جا رہے ہو! ٹھیک ہے؟ تو تمہیں اس کی ضرورت نہیں۔۔۔ ہم اس کو خریدنے کے لئے تیار ہیں۔۔۔ قیمت تم بتا دو۔۔۔"

"ہم آج رات وادیٔ روپل میں اور ۔۔۔۔۔۔ اس خیمے میں گزارنا چاہتے ہیں۔۔۔"

"وہ رات یہیں گزار لو۔۔۔ دیکھو اگر ہمارے پاس خیمہ نہیں تو ہم آگے مازینو تک نہیں جا سکتے اور ہمیں یہیں سے واپس گلگت جانا پڑے گا کیونکہ گلگت سے ادھر تو کسی خیمے کے ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔۔ قیمت تم بتا دو"

محمود بھی کہنے لگا کہ صاحب ذرا تیز چل کر شام تک ترشنگ پہنچ جاؤ۔۔۔ اور خیمے کو فروخت کر دو۔۔۔ جو قیمت مانگو گے یہ ہنس کر دیں گے۔۔۔

لیکن میرے لئے روپل میں شب بسری کاروبار سے زیادہ اہم تھی۔۔۔ ہم نے مناسب الفاظ میں معذرت کی اور اپنے گدھے ہانکتے ہوئے پھر چلنے لگے۔۔۔ میں جب بھی مڑ کر دیکھتا گلابی خیمہ سرسبز کھیتوں میں پھڑپھڑاتا ہوا اور گرتا ہوا نظر آتا۔

ہوا چلنے لگی اور کبھی کبھی ایک آدھ بوند بھی گرنے لگی۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

”وادی روپل دیکھنے والے آوارہ گرد کی مسکراہٹ میں فرق ہوتا ہے“

لوئر روپل تک پہنچتے پہنچتے ہوا بھی تیز ہوئی اور سرد بوندیں بھی۔۔۔

میں اپنے آس پاس کو اس نظر سے دیکھتا جا رہا تھا کہ یہاں کس جگہ پر آسانی سے خیمہ لگ سکتا ہے۔۔۔ ایک چھوٹے سے خوبصورت جاپانی طرز کے قدرتی باغ کو دیکھ کر میں رک گیا ”سلطان یہاں؟“

”نہیں صاحب ادھر قریب پانی نہیں ہے“

ہم پھر چلنے لگے۔۔۔

دائیں ہاتھ پر ایک لکڑی کے گھر کے ساتھ سرسبز ڈھلوان تھی اور تین درخت تھے جو ہوا کے زور سے جھولتے تھے۔ درختوں کے نیچے جگہ ہموار تھی۔۔۔ ”یہاں ٹھیک ہے صاحب۔۔۔ بارش سے بچاؤ بھی ہوگا“ سلطان گھر کے اندر جا کر اس کسان خاندان سے اجازت لے آیا تھا اور ان سے رات کے کھانے کے لئے روٹی کا سوال بھی دراز کیا تھا۔۔۔

بابا اپنے گدھے سے سامان اتارنے لگا۔۔۔

روپل کے چند لوگ ہمارے گرد جمع ہو گئے ”یہاں سردی ہوگی باہر۔۔۔“

اور مجھے رہ رہ کر اپنے باریک خیمے کا خیال آنے لگا۔۔۔ وہ بارش کو نہیں روک سکتا تھا۔۔۔ اگر رات کو بارش تیز ہو گئی تو۔۔۔ ہوا میں بھی خاصی خنکی تھی۔۔۔

”یہاں کہیں سکول نہیں ہے۔۔۔“ میں نے ایک نوجوان لڑکے سے پوچھا۔

”ادھر آگے ہے۔۔۔ پر ان دنوں چھٹیاں ہیں اور وہ بند ہے“۔

”اگر وہ بند ہے تو اس کے تالے کی چابی کس کے پاس ہوتی ہے؟“

نوجوان ذرا ہنسا ”بند کر کے کیا کرتا ہے۔ وہ کھلا ہے“۔

”سلطان خان۔۔۔ سامان واپس گدھوں پر۔۔۔ ہم سکول کے قریب خیمہ لگائیں گے“۔

سلطان نے میرا فیصلہ ناپسند کیا ”ادھر ان کو شام کی روٹی کا کہا ہے تو اب چلے جائیں تو اچھا نہیں ہے۔۔۔“

”تم روٹی یہاں لے کر آ جانا۔۔۔ سامان گدھوں پر“

سکول کی عمارت راستے سے ذرا ہٹ کر تھی۔ میں نے برآمدے میں جا کر ایک دروازے کو دھکیلا تو وہ فوراً کھل گیا۔۔۔ ایک بڑا کمرہ، دو کھڑکیاں، کھڑکیوں میں شیشے لگے ہوئے۔۔۔ فرش لکڑی کا جس پر بکریوں کی مینگنیں اور چارہ بکھرا ہوا اور جناب ایک شاندار چھت۔۔۔ شام قریب ہو، ہوا تیز ہو اور سرد ہوا ہو اور بارش کا امکان ہو تو ناٹگا پربت کی وادی روپل میں رات گزارنے کے لئے ایک آوارہ گرد کو اور کیا چاہئے۔۔۔ ایک نہیں تین آوارہ گردوں کو۔۔۔

”یہ اچھا ہے صاحب۔۔۔“ سلطان کا موڈ بھی ٹھیک ہو گیا ”میں اس کو اور اچھا کرتا ہوں“ اس نے چند ٹہنیاں جوڑ کر ایک جھاڑو بنایا اور اس کمرے کو صاف کرنے لگا۔

بابا محمود نے گدھے ان پیک کئے اور پھر نسوار کی چٹکی منہ میں رکھ کر ایک پرامن مسکراہٹ کے ساتھ ہم سے الگ ہو گیا۔

لکڑی کا فرش صاف ہوا تو اس پر خیمے کا کپڑا بچھا کر سلیپنگ بیگ کھول دیئے گئے۔ کچھ سامان کھڑکیوں میں رکھ دیا گیا اور یوں ہم روپل میں بے فکر اور آرام سے ہوئے اور بڑے اطمینان سے ہوئے۔۔۔

کمرے کی ایک کھڑکی پچھلی جانب کھلتی تھی۔۔۔ اس کے دو فریم شیشے سے خالی تھے اور باہر کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔۔۔ ان دو فریموں میں الگ الگ شاید اس وقت کی۔۔۔ خوبصورت ترین تصویریں فریم میں جڑی ہوئی تھیں۔۔۔ ایک فریم میں گلابی پھولوں کا ایک پورا کھیت تھا اور دوسرے فریم میں ایک راستہ تھا جس کے دونوں طرف پھول تھے۔۔۔ یہ دو تصویریں۔۔۔ زندہ تصویریں ہمارے کمرے کی زیبائش تھیں۔ دیواروں پر بچوں نے۔۔۔ دنیا کے تمام بچوں کی طرح چڑیاں اور طوطے بنائے تھے لیکن ان کے علاوہ انہوں نے اپنے خیالات کی ترجمانی بھی کی تھی۔۔۔ دیواروں پر جو فقرے کوئلے سے لکھے گئے تھے وہ کچھ یوں تھے۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

یہ ایک گندا سکول ہے
یہ ایک چھوٹا سکول ہے
مجھے یہ سکول پسند نہیں۔ سکول فضول ہے
اس سے بہتر میرا گھر ہے۔

بچوں نے بطور خاص ایک جیپ اور ایک بس کی تصویر بنائی تھی۔ شاید یہ ان کی خواہش تھی کہ ان کی وادی تک یہ دونوں چیزیں آجائیں۔

سکول کے برآمدے میں روپل کے چند بچوں کے درمیان راہی بیٹھا تھا اور ان کے سکیچ بنا رہا تھا۔۔ میر پھولوں بھرے کھیتوں میں ایک خصوصی مشن کے لئے گیا ہوا تھا۔۔

سکول کے سامنے وہ راستہ تھا جو اپر روپل سے آ رہا تھا اور ترشنگ کو جا رہا تھا۔۔ ترشنگ گلیشیر کی دیوار یہاں سے قریب تھی۔

سلطان نے حسب معمول چولہا گرم کیا اور دال چاول تیار کرنے لگا۔۔۔ اس دوران میں نے ایک مقامی باشندے سے پانچ انڈے اور تھوڑا سا مکھن خریدا تاکہ دال سے پیچھا چھڑا کر آملیٹ چاول کا ڈنر کیا جائے۔۔۔

ہم محفوظ تھے ۔۔۔ اور شائد اسی لئے بارش کا خدشہ بھی ختم ہو گیا اور جو بوندا باندی جاری تھی وہ بھی رک گئی ۔۔۔

اس شام روپل سکول کے برآمدے میں بڑی رونق تھی۔۔۔ وہ گدھے جو پھول چر رہے تھے۔۔۔ سلطان کا دھواں دیتا ہوا چولہا۔۔ راہی کی مصوری ۔ روپل کے بچے ۔۔ اور ان سب کے آس پاس ایک ایسی وادی جس میں سو رنگ تھے اور سب کے سب شوخ تھے اور کھیتوں میں ابھی ابھی ان کی بارش ہو کر رکی تھی۔

ترشنگ جانے والے راستے کے ساتھ ساتھ پانی بھی چلتا تھا۔۔ اور میں نے دیکھا کہ اس راستے پر ابھی شام گہری نہیں ہوئی اور ایک غیر ملکی سیاح چلتا آ رہا ہے اور اس کی چال میں روانی نہیں ہے جیسے وہ رکنا چاہتا ہے' ٹھہرنا چاہتا ہے۔۔۔ اس کے ساتھ ایک مقامی بچہ تھا جو منہ اٹھائے اس کے ساتھ ساتھ چلتا آ رہا تھا۔۔۔ اور میں جان گیا کہ وہ ایک آوارہ گرد ہے اور رات سر پر ہے اور وہ ایک چھت تلاش کر رہا ہے۔

"ہیلو۔۔" میں نے اسے ہاتھ ہلایا "کہاں سے آئے ہو؟"
وہ وہیں رک گیا "جاپان" اس نے جواب دیا اور پھر چلنے لگا۔

"ہیلو۔۔۔ذرا ادھر آؤ"

وہ جھجکتا ہوا آ گیا۔ اس کے کاندھے پر مختصر سا سامان تھا۔۔۔بال لمبے تھے جن کی اس نے چٹیا بنا کر لٹکا رکھی تھی۔۔۔وہ ایک خوش شکل جاپانی تھا۔۔۔

"ہیلو۔۔" اس نے قریب آ کر کہا اور سر ہلا کر مسکرانے لگا "تم یہاں رہتے ہو؟"

"نہیں۔۔۔روپل میں یہ میری پہلی شام ہے۔۔۔ تم کہاں گھوم رہے ہو؟"
"میں ترشنگ سے آ رہا ہوں اور ۔۔۔شام ہونے کو ہے۔۔۔رات گذارنے کے لئے کوئی محفوظ جگہ تلاش کر رہا ہوں۔۔"

"ادھر آؤ۔۔" میں نے اسے اشارہ کیا "ادھر۔۔"

وہ جھجکتا ہوا برآمدے میں آ گیا۔ میں نے کمرے کا دروازہ کھول کر اسے اندر آنے کو کہا۔۔۔ "کیا خیال ہے کیا یہ رات گزارنے کے لئے محفوظ جگہ ہے کہ نہیں؟"

وہ مسکرانے لگا لیکن اسے یقین نہیں آیا۔۔ ایک بے آسرا آوارہ گرد کو جب کسی اجنبی وادی میں شام ہو جائے اور اسے ایک جائے پناہ مل جائے تو اسے فوراً یقین کبھی نہیں آتا۔

"۔۔۔کیا میں یہاں رات گذار سکتا ہوں"
"آپ ہمارے مہمان ہیں ۔۔"

وہ کوزی تھا۔ ایک جاپانی سٹاک بروکر جو ہر برس اپنا تھری پیس سوٹ اتار ایک ڈھیلی پتلون اور جیکٹ پہنتا تھا۔۔۔ اپنی ڈی لکس کار اور خاندان اور جاپان کو چھوڑتا تھا اور قراقرم یا ہمالیہ کی وادیوں میں آوارہ ہو جاتا تھا۔ وہ انگریزی آسانی سے اور بے باکی سے بولتا تھا۔

اس نے ہمارے کمرے میں کھلتے ایک اور دروازے کے اندر جھانکا ۔۔۔۔ یہ سکول کا دوسرا کمرہ تھا۔۔۔ "اگر میں اس کی صفائی کر لوں تو کیا میں اس میں رات گذار سکتا ہوں۔۔"

"کیوں نہیں۔۔"

تھوڑی دیر میں کوزی اس کمرے کو رہائش کے قابل بنا کر اس میں کوزی ہو چکا تھا۔

کھانا تیار ہو چکا تھا۔۔
"کوزی کیا تم کچھ کھانا پسند کرو گے؟"

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"نہیں شکریہ.... میں نے شام کے کھانے کا بندوبست کر رکھا ہے۔" اس نے ٹین کے ایک ڈبے میں سے دو نامکمل بسکٹ نکالے "میرے پاس جوس کا ایک پیکٹ بھی ہے۔"

"تم ان بسکٹوں اور جوس کو کسی مشکل وقت کے لئے بچا رکھو اور آج کی شام ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ۔"

کوزی کے سامنے جب نوڈل سوپ آیا تو اس کے چہرے پر ایک بے چارگی سی پھیلی "یہ آپ میرے ساتھ کیا کر رہے ہیں.... نوڈل سوپ میرا پسندیدہ ہے.... یہاں ہمالیہ کی ایک وادی میں نوڈل سوپ...... میں آپ کا شکر گزار ہوں"

کھانے کے بعد کافی کے لئے ہم برآمدے میں آ بیٹھے.... اندر لکڑی کے فرش پر دو موم بتیاں روشن تھیں.... دروازہ کھلا تھا۔ ہلکی سی روشنی برآمدے تک آتی تھی۔ لیکن اس سے پرے سب کچھ اندھیرے میں گم تھا.... ایک سرد سکوت تھا.... ہاں ایک گہری اور گھنی مہک تھی جو کھیتوں کے سبزے اور جنگلی پھولوں کی نیم خوابیدگی سے اٹھ رہی تھی.... انسانوں کی طرح اکثر پودے رات کے وقت آرام کرتے ہیں۔ ان کے پتے اور پھول نرم پڑ جاتے ہیں اور اس نیم خوابیدگی میں ایک مہک ہوتی ہے۔

جیسے کسی کارواں سرائے میں رات بسر کرنے والے مسافر کھانے کے بعد الاؤ کے گرد بیٹھ کر اپنے سفر کی راحتوں اور صعوبتوں کے قصے چھیڑ دیتے ہیں.... ایسے ہی ہم روپل سکول کے برآمدے میں بیٹھے اور سرد سکوت میں بیٹھے اور پودوں، پتوں اور پھولوں کی نیم خوابیدگی سے اٹھنے والی مہک میں سانس لیتے ایک دوسرے کے سفری تجربے سنتے رہے....

"کھیتوں میں کبھی کبھار ایک سرسراہٹ سی چلتی تھی.... ہوا کا کوئی گمشدہ جھونکا .... جو ہمارے بدنوں کو چھوتا تھا تو ہم اپنے آپ میں سمٹتے تھے۔

اندھیرا مزید گہرا ہو گیا کیونکہ ایک موم بتی مکمل ہو کر فرش پر پھیل کر بجھ گئی....

دوسری موم بتی کے بجھنے کے بعد ہم ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر باتیں نہیں کرتے تھے کیونکہ ہم ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے اس لئے اپنے آپ سے باتیں کرتے تھے....

ہم نے سوچا کہ سکول کے پیچھے جو راستہ ان گھروں کو جا رہا ہے جو پہاڑی کے

ساتھ لگے ہوئے ہیں.... تو اس راستے پر تھوڑی دیر چلنا چاہئے اور روپل کی اس ستھری اور ٹھنڈک والی صبح کو چلنا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ وہ کہاں جاتا ہے.... اور یہی ہماری غلطی تھی.... وہ راستہ تقریباً پاگل پن کو جاتا تھا.... یہ مخبوط الحواس ہونے کا آسان ترین راستہ تھا.... اور ہم اس راستے پر چلے تو بالکل صحیح الدماغ تھے لیکن تھوڑی دور چلے تو قدرے خبطی ہو گئے.... یہاں ایک اور مقام آتا ہے جہاں میں بے بس ہو جاتا ہوں....

اس راستے پر ہم آہستہ آہستہ چلے اور سامنے برف پوش چوٹیوں پر دھند اترتی تھی اور سرد ہوا کھلے گلے کی قمیض میں جا کر بدن پر برف ہونٹوں کی طرح چلتی تھی۔ گھروندے کچے تھے اور کھڑکیوں میں سرخ رنگ کی چادریں دکھائی دے کر اوجھل ہو جاتی تھیں۔ کھیتوں میں صرف یہ کہہ دینا کہ پھول تھے بہت زیادتی ہے۔ ان میں جو رنگ تھے رنگوں کے جو چھینٹے تھے اور ان میں روپل کی وادی کے چھوٹے چھوٹے بچے تھے جو راستے کے ساتھ ساتھ ہمیں دیکھتے ہوئے چلتے تھے۔ ان بچوں کے لباس بے حد دیدہ زیب تھے بلکہ وہی رنگ تھے جو کھیتوں میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں گلدستے تھے جو ہمیں دینا چاہتے تھے لیکن جھجکتے تھے.... ایک پیاری سی روپلی بچی نے جس رنگ کے پھولوں کا انبار تھام رکھا تھا بس اس کی گول ٹوپی میں وہی سب رنگ تھے.... اور جس کھیت میں وہ کھڑی تھی وہاں بھی وہی رنگ تھے.... تو دیکھنے میں دشواری ہوتی تھی کہ ان سب کو الگ الگ کیسے دیکھیں.... میں ان بچوں کو بلاتا تھا لیکن ان میں جھجک بہت تھی.... میں تصویر اتارنے لگتا تو وہ بھاگ جاتے.... پھر اس راستے کے اختتام پر ایک ایسا مقام آیا جہاں ایک شفاف نالی کے گرد گھاس تھی اور گلابی پھولوں کے ڈھیر تھے.... اور دور تک تھے....

مجھے معلوم ہے کہ اس وقت میں مسکرائے چلا جا رہا تھا اور یہ مسکراہٹ ایک خبطی انسان کی تھی.... بس یہی جنتیں تھیں.... یہی جنت کی حقیقت تھی.... ایسی جگہوں پر ہی لا کر تو انسان کو کہا جاتا تھا کہ اگر یہاں واپس آنا چاہتے ہو تو تمہیں مرنا ہو گا.... اور وہ واپس آنے کے لئے مرتا تھا.... لیکن یہاں واپس آنے کے لئے تو زندگی درکار تھی.... اور ہم خود آئے تھے لائے نہیں گئے تھے.... بس یہ ہے کہ جب انسان اپنی نارمل زندگی میں لوٹتا ہے تو اس کی مسکراہٹ میں فرق آ چکا ہوتا ہے.... یہ مسکراہٹ کچھ ہلکی سی حماقت اور پاگل پن کی طرف اشارہ کرتی ہے.... اور اس مسکراہٹ میں

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

دراصل اس مقام پر واپس جانے کی خواہش کرو ٹیں لیتی ہے.... اور اسی لئے ایک دنیا دار اور کامیاب شخص کی مسکراہٹ اور ایک آوارہ گرد کی مسکراہٹ میں فرق ہوتا ہے.... آوارہ گرد وادی روپل کی سرد صبح میں پانی کے کنارے سرد ہوا میں حرکت کرتے پھولوں کے کھیتوں میں ہی رہ جاتا ہے واپس نہیں آتا....

ہم بھی اپنے آپ کو وہیں چھوڑ کر واپس آئے اور بمشکل آئے....

"صاحب کافی ---" سلطان نے دور سے پکارا .... اور پھر کافی کا مگ تھامے ہمارے پاس آگیا۔

"یہ پھول ---- پانی کے کنارے ہوتا ہے اور ہم اسے پانی کا پتہ کہتے ہیں --- شینا زبان میں" اس نے سمیر کی جانب دیکھ کر کہا "بہت مصیبت ہے صاحب .... ادھر فصل لگاؤ تو کھیت میں فصل بہت کم ہوتا ہے اور پھول بہت ہوتا ہے..."

"یہ تو اچھا ہے سلطان---" سمیر مسکراتے ہوئے بولا۔

"اچھا نہیں ہے ناں--- کھانے کو کم ملتا ہے دیکھنے کو زیادہ ملتا ہے تو اچھا نہیں ہے ناں---"

میں نے یکدم سر اٹھا کر سلطان کو دیکھا۔ اس نے کیا پتے کی بات کہی تھی کہ اگر کھیت میں فصل کی نسبت پھول زیادہ ہوں گے تو کھانے کو کم ملے گا اور دیکھنے کو زیادہ ملے گا اور یہ اچھا نہیں ہے...."

"ویسے ادھر جو لوگ روپل میں رہتے ہیں وہ ترشنگ اور چورت والوں کی نسبت زیادہ کھاتے پیتے نہیں ہیں؟" ادھر زمین بہت اچھی ہے اور ادھر زیادہ پہاڑ اور پتھر ہے---"

"نہیں ناں ---" سلطان نے پھر سر ہلایا "ادھر روپل میں بھی تو ہم لوگ ہی ہیں... اپر روپل میں چورت کے لوگ زیادہ ہیں اور لوئر روپل میں ترشنگ والے بہت ہیں .... تمہیں بتایا تھا ناں کہ سردی میں سب ادھر واپس چلے جاتے ہیں---"

جاپانی سیاح کوزی بڑے اہتمام سے بال کھول کر ان میں کنگھی کر رہا تھا اور دور سے دیکھنے والا غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا تھا کہ کوئی سانولی حسینہ ہے جو پانی کے کنارے بیٹھی بالوں کے خم نکالتی ہے.... کنگھی کرنے کے بعد اس نے چھوٹی سے چٹیا بنائی اس کے آخر میں ایک سرخ ربن باندھا اور پھر اپنا تھیلا شانے پر ڈال لیا "تمہیں روپل میں مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی.... میں تم سب کو یاد رکھوں گا" اس نے باری باری

سب سے ہاتھ ملایا۔

"اگر تم ہیرنگ بیس کیمپ جا رہے ہو تو وہاں ان دنوں ایک جاپانی ٹیم کیمپ کر رہی ہے... وہاں تمہیں بہت سارے جاپانی مل جائیں گے"

"نہیں نہیں ..." اس نے بے یقینی سے سر جھٹکا۔

"ہاں... وہاں جاپانی ہیں تم ان سے ملو گے..."

"پھر تو میں بالکل ہیرنگ نہیں جاؤں گا... مجھے یہ خبر دینے کا شکریہ .... کیونکہ جاپانیوں کو تو میں جاپان میں ملتا ہی رہتا ہوں .... یہاں اتنی دور آکر بھی ان کی شکلیں دیکھوں تو کیا فائدہ .... میں ٹاپ میدان جاؤں گا---- سایو نارا"

اور چند لمحوں کے بعد وادی روپل کے درمیان میں جو اکلوتا راستہ نانگا پربت کی جانب جاتا ہے اور جس کے ساتھ پانی بہتا ہے اور گل رنگ کھیت ہیں وہاں کوزی چلتا ہوا دکھائی دیا اور پھر وہ ہماری زندگیوں سے ہمیشہ کے لئے سایو نارا ہو گیا۔

آج پھر روپل سکول کے برآمدے میں بہت رونق تھی.... راہی روپلی بچوں کے شگفتہ چہرے سکیچ کر رہا تھا.... سلطان کارن فلیکس کے لے دودھ گرم کر رہا تھا۔ بابا محمود گھٹنوں پر ہاتھ رکھے اپنے سامنے کے خلا میں گم ایک ٹھہری ہوئی مسکراہٹ چہرے پر سجائے بیٹھا تھا.... وہ بہت کم ادھر ادھر دیکھتا اور جب بھی دیکھتا تو صرف اپنے گدھے کی طرف دیکھتا اور بڑے پیار سے دیکھتا۔

اور ہمیں آج کہیں دور تو جانا نہیں تھا.... صرف گلیشیئر کے پار ترشنگ پہنچنا تھا.... دوڑھائی گھنٹے کا نسبتاً آسان سفر' اس لئے ہم جلدی میں نہ تھے.... ہمارے پاس دنیا جہان کا وقت تھا.... برآمدے میں بیٹھے ہوئے آپ کے سامنے جتنے کھیت تھے وہ سب کے سب کھانے کو کم دیتے تھے اور دیکھنے کو زیادہ اور ہم تو ادھر دیکھنے آئے تھے.... سکول کے سامنے جو فصلیں تھیں ان میں تو مختلف رنگوں کے پھول باآسانی الگ الگ دیکھے جا سکتے تھے....

اور پھر ٹریفک شروع ہو گئی۔

یہ ٹریفک ان غیر ملکی ٹریکرز کی تھی جو آج صبح ترشنگ سے چلے تھے اور مازینو پاس کی جانب جا رہے تھے۔ سکول چونکہ راستے کے ساتھ واقع تھا اس لئے ہر کوئی سانس درست کرنے کی غرض سے ہمارے پاس ٹھہر جاتا اور جو نہ ٹھہرتا اسے سمیر "ہیلو گڈ مارننگ" کہہ کر روک لیتا .... یہ ایک مشغلہ بھی تھا کہ آپ ترشنگ گلیشیئر کی

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

دیوار یا کنارے سے اترتے ہوئے راستہ کو دیکھتے اور غور سے دیکھتے رہئے اور پھر بتائیے کہ یہ جو رنگ ہیں یہ کھیتوں کے ہیں یا قمیضوں 'جیکٹوں اور بلاؤزوں کے ہیں.... اور ان میں قمیضیں کتنی ہیں اور بلاؤز کتنے ہیں....

پہلے جرمنوں کا ایک گروپ نمودار ہوا.... ان میں سے ایک نوجوان بویریا کے کسانوں کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ ایک اور جرمن رنگین پروں والا ہیٹ پہنے آ رہا تھا۔ جرمن خواتین جتنی بھی تھیں ناقابل ذکر تھیں.... پھر دو آسٹریلوی خواتین آئیں.... انہوں نے راستے پر کھڑے ہو کر ہماری طرف غور سے دیکھا اور پھر ان میں سے ایک جھجکتی ہوئی آگے آئی "ڈو یو سپیک انگلش؟"

"انگلش—"سلطان نے ہم تینوں کی طرف اشارہ کیا۔

"یس انگلش...."ہم نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا

"اوہ گڈ—"اس کی جھجک دور ہو گئی "کیا نانگا پربت کے بیس کیمپ کو یہی راستہ جاتا ہے؟"

"یس میڈم—" راہی کر تک جھک گیا "سیدھے چلتے جائیں.... دریائے روپل کے پار چلے جائیں پھر گلیشیئر کے دائیں جانب ایک سفید پہاڑ آئے گا...... بڑا پہاڑ ...... بس یہی نانگا پربت ہو گا"

"تھینک یو—" اس نے نہایت خوش و خرم ہو کر کہا اور پھر اپنی ساتھی سے کہنے لگی "ونفی یہ راستہ کہیں نوٹ کر لو.... کہیں ہم گم نہ ہو جائیں"

تھوڑی دیر ستانے کے بعد وہ پھر اپنے راستے پر تھیں۔

"ابو اکثر ٹریکر جو بوڑھے ہوتے ہیں ان کے دونوں ہاتھوں میں ہائکنگ سٹکس ہوتی ہیں.... کیوں؟"

پتہ نہیں—"

"میرا خیال ہے ایک سٹک تو ہائکنگ کے لئے ہوتی ہے اور دوسری بڑھاپے کے لئے......"

"میرا خیال ہے تم ٹھیک کہتے ہو...." میں نے فوراً اتفاق کرتے ہوئے کہا کیونکہ میں ابھی ایک سٹک کے ساتھ چلتا تھا..... لیکن ان بزرگ قسم کے ہائکرز کو دیکھ کر کم از کم یہ ثابت ہو جاتا تھا کہ صرف ہمت درکار ہے اور اگر آپ چل سکتے ہیں اور سانس لے سکتے ہیں تو آپ کہیں بھی جا سکتے ہیں.... اس دوران تین انگریز سیاح ....

ان میں سے ایک صاحب باقاعدہ ٹویڈ کوٹ اور گرے فلیتن کی پتلون میں ملبوس .... چلتے ہوئے آئے اور راستے پر کھڑے ہو کر ہماری جانب دیکھا۔ ان کے ہمراہ ایک بڑے بدن کی لڑکی بھی تھی.... وہ آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے.... لڑکی کی آواز قدرے بلند تھی اور وہ کہہ رہی تھی کہ پوچھ لینے میں کیا حرج ہے۔ ٹویڈ کوٹ صاحب ہمارے قریب آئے اور کہنے لگے "یہ ہوٹل آپ کا ہے؟"

"یہ سکول ہے—؟" میں نے انہیں بتایا "ہم خود ہائکرز ہیں اور اس میں عارضی طور پر قیام پذیر ہیں—"

ٹویڈ کوٹ نے ہنسنا شروع کر دیا۔ جی بھر کے ہنسنے کے بعد اس نے اپنا رک سیک اتار کر زمین پر رکھا اور لڑکی اور بقیہ انگریزوں کو پاس بلا لیا" کیتھرین کا خیال تھا کہ یہ وے سائڈ ریستوران ہے اور آپ لوگ باہر کھڑے ہو کر گاہکوں کا انتظار کر رہے ہیں... سوری"

کیتھرین ہی بڑے بدن کی لڑکی تھی۔ بہت بڑے بدن کی .... اس نے جین کے ساتھ ایک بہت ڈھیلی اور چوغہ نما قمیض پہن رکھی تھی اور بس.... اور لگتا یوں تھا کہ اس میں دو لدھر بچے گول مٹول سے گھس گئے ہیں اور کشتیاں کرتے ہیں۔

یہ چاروں حضرات جیولوجسٹ تھے اور ہمالیہ کے گلیشیئرز کے بارے میں معلومات اکٹھی کر رہے تھے۔ ٹویڈ کوٹ کا کہنا تھا کہ وہ پاکستان کے شمالی علاقوں میں اتنی باقاعدگی سے آتے ہیں کہ ان کے برطانوی ساتھی جب کبھی انہیں یونیورسٹی میں دیکھتے ہیں تو حیرت سے کہتے ہیں کہ ہیں تمہیں انگلینڈ میں دیکھنا تو خوش قسمتی ہے.... اور یہ کہ کیا کل پاکستان سے آئے ہو یا کل پاکستان جا رہے ہو؟.... چونکہ یہ حضرات اور لدھر بچوں کی مالک خاتون ہمیں ہوٹل کے ویٹر وغیرہ جان کر ادھر آئے تھے اس لئے ہم نے ان کو چائے پلا دی۔

ایک اور گروہ وارد ہوا اور اس کا تعلق مختلف یورپی اقوام سے تھا.... سب کے سب دانتوں کے ڈاکٹر تھے اور دانتوں کے ڈاکٹروں کی کسی کوہ پیما کلب کے رکن تھے....

ان کے بعد ایک جاپانی لڑکی چلی آئی ۔ بالکل تنہا اور بالکل خوش.... سیدھی ہماری پاس آئی سب لوگوں کے ساتھ ہاتھ ملایا اور وہی ہاتھ ہلاتی ہوئی چلی گئی۔

جاپانی لڑکی کے بعد ٹریفک کم ہو گئی اور ساڑھے دس بجے کے قریب بالکل ختم

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

ہو گئی۔۔۔ ترشنگ سے صبح سویرے چلنے والے اور ذرا دیر سے چلنے والے سب کے سب اس وقت تک گزر چکے تھے۔۔۔۔ ہمیں بھی روانہ ہونا تھا۔۔۔ لیکن سوال یہ تھا کہ ترشنگ پہنچ کر ہمیں کیا کرنا ہے۔۔۔ اس موضوع پر مکالمہ ایک مرتبہ پھر سلطان کے ساتھ ہوا۔

"ترشنگ سے گلگت جانے کا کیا طریقہ ہے؟"

"صاحب پہلے تو استور پہنچو۔۔۔۔ گلگت تو بہت دور ہے۔۔۔۔"

"تو استور پہنچنے کا کیا طریقہ ہے؟"

"ترشنگ میں اگر کوئی ایسی جیپ آ جائے جو مسافروں کو چھوڑ کر واپس جا رہی ہو تو اس سے بات کرو"

"کیا ایسی جیپ آتی رہتی ہے؟"

"کیا معلوم! کبھی آتی ہے کبھی ہفتہ ہفتہ نہیں آتی۔۔۔"

یہ "ہفتہ ہفتہ نہیں آتی" سن کر ہم خاصے ٹھنڈے ہو گئے کہ اگر ترشنگ میں ایک ہفتہ انتظار کرنا پڑا تو واقعی ٹھنڈے ٹھار ہو جائیں گے۔

"ترشنگ سے استور جانے کا کوئی اور طریقہ بیان کرو"

"صاحب ادھر ترشنگ سے صبح سویرے ٹریکٹر ٹرالی پر بیٹھ کر رحمان پور کے پل تک چلے جاؤ۔۔۔"

"اور ادھر سے آگے استور کیسے جاؤ؟"

"ادھر تو صاحب دنیا کی ٹریفک گزرتی ہے۔۔۔"

ہمارے ذہن میں کچھ اس قسم کا نقشہ آیا کہ اگر ہم ٹریکٹر ٹرالی پر اچھلتے ہوئے رحمان پور پہنچ جاتے ہیں تو وہاں استور جانے والے ٹریفک کا جم ہو گا اور ہم باآسانی جو جیپ سامنے ہو گی اس میں بیٹھ جائیں گے "تو رحمان پور پل سے ہمیں ہر صورت میں استور جانے والی جیپ مل جائے گی؟"

"خدا معلوم۔۔۔" سلطان نے کندھے سکیڑ کر کہا۔ "کبھی آتی ہے کبھی نہیں آتی۔۔۔"

"اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہمیں ترشنگ سے دیوسائی پار کرنے کے لئے گھوڑے مل جائیں اور۔۔۔۔ اور کوئی اچھا سا خیمہ مل جائے اور ہم سرکرو پہنچ جائیں۔۔۔"

"ہاں ناں۔۔۔" سلطان نے سر ہلایا۔

"تارڑ بھائی۔۔۔" راہی نے جو پیکنگ میں مصروف تھا میری طرف دیکھا "آپ ایک خواب کے پیچھے بہت دور تک جاتے ہیں"

"ہاں ناں۔۔۔۔۔۔" میں نے بھی سلطان نائل میں سر ہلایا۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"ترشنگ ایک تصویر"

ہم نے روپل پل چھوڑ دیا تھا اور ترشنگ جا رہے تھے' بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہو گا کہ ہم نے روپل سکول چھوڑ دیا تھا کیونکہ ہم ابھی اپنے دو پورٹرز اور دو گدھوں سمیت وادیء روپل کے کھیتوں کے درمیان چلے جا رہے تھے۔

سامنے ترشنگ گلیشیر کا بلند کنارا نظر آ رہا تھا.... اور وہ اتنا نزدیک نہ تھا جتنا نظر آتا تھا۔

راستے کے ساتھ لکڑی اور پتھروں کا ایک دو منزلہ گھر تھا جس کے ساتھ وسیع کھیت تھے ۔ چھت پر ایک سفید مینڈھیوں والی بڑی اماں شوخ ٹوپی پہنے بیٹھی تھیں۔ ہمیں بہت دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں لیکن جب ہم نے دیکھا تو انہوں نے نہایت غصے سے منہ پھیر لیا۔ ان کے سامنے ایک دس گیارہ سالہ بچی اور ایک سنہری بالوں والا گول مٹول سا بچہ کھیل رہے تھے.... اس گھر سے ایک نہایت ہنس مکھ بوڑھا باہر آیا۔ اور اس نے ہمیں تحفے کے طور پر پانچ شلغم عنایت کیے۔

آگے روپل کا چشمہ تھا۔ ہم وہاں بیٹھ گئے۔ "آپ یہ کھاتے ہو؟" سلطان نے تھیلے میں سے شلغم نکال کر پوچھا۔

"کیوں نہیں کھاتے ہو.... بالکل کھاتے ہو"

اس نے چاقو کے ساتھ شلغم کو اس طرح چھیلا کہ اس کا چھلکا ایک ستارے کی شکل میں اترا' اس نے چھلکا پھینک دیا.... اور میری نظر اس پر تھی.... میں نے ان علاقوں میں اکثر جگہوں پر راستوں چشموں اور ندیوں کے کنارے اس قسم کے ستارہ شکل کے چھلکے پڑے ہوئے دیکھے تھے۔ اور میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کس چیز کے چھلکے ہیں اور انہیں اتنی مہارت سے کس طرح اتارا جاتا ہے.... سمیر نہایت ذوق و شوق سے شلغم کھا رہا تھا کیونکہ شلغم تازہ تھا اور روپل کے کھیت میں ابھی تھا پھولوں

کے ساتھ ساتھ!

"سلطان ایک اور شلغم —"

"ہاں ہاں —" اس نے دوسرا شلغم بھی اسی نفاست سے چھیلا۔ ایک بار چاقو اس پر رکھا اور تب اٹھایا جب پورا چھلکا ایک خوش نما ستارے کی صورت میں اتر گیا۔ میں بھی شلغم نوش کرنے لگا۔

روپل کی جانب سے تین گدھے چلے آ رہے تھے اور ان کو ایک نوجوان لڑکا ہانکتا چلا آ رہا تھا۔ اور لڑکے کے کاندھے پر چمڑے کا ایک ایسا مشکیزہ تھا جو میں نے اس سے پیشتر ناگا پربت کے دوسری جانب تتوری میں بھی دیکھا تھا اور میں جانتا تھا کہ ایسے مشکیزوں میں دہی ہوتا ہے....

"سلطان — اس میں لسی ہے تو ذرا مانگ لو —"

"ہاں ہاں —" اس نے لڑکے کو روک لیا۔ لڑکے نے بخوشی اپنا مشکیزہ کھول کر ہماری ایک دیگچی میں ڈال دیا.... یہ دہی پانی کے بغیر تھا اور پنیر کی شکل کا تھا۔ لڑکے نے بتایا کہ گھر پہنچنے پر اس کی ماں اس میں پانی ڈال کر لسی بنا لے گی....

وہاں وادی روپل کے چشمے کے کنارے.... اس خشک دہی میں ہم نے چشمے کا خنک پانی ڈالا اور اس میں چینی ملائی اور انہیں ایک ڈوئی کے ساتھ خوب رڑھک کر شاندار لسی تیار کر لی....

"راہی چاچا — پی لو نہایت زبردست مشروب ہے —"

راہی چاچا نے حسب عادت انکار میں سر ہلایا' مسکراتے ہوئے۔

اور جب ہم لسی پی رہے تھے اور شلغم کھا رہے تھے تو ہم نے دیکھا کہ روپل کی جانب سے ایک دبلا پتلا جاپانی لمبے لمبے قدم اٹھاتا چلا آ رہا ہے —

"ابو — جاپانی آ گیا" سمیر نے ہونٹوں سے لسی کی سفیدی پونچھتے ہوئے کہا.... "شی می زو" جاپانی نے اپنا نام سنا تو وہیں منجمد ہو گیا۔ جہاں تھا اور جس حالت میں تھا اور چوکنا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ جیسے اس پر حملہ ہونے والا ہو.... پھر اس کی نظر راستے کے ساتھ پتھروں کے درمیان ابلتے صاف ٹھنڈک والے پانی کے کنارے بیٹھے ان حضرات پر پڑی جو لسی پی رہے تھے اور شلغم کھا رہے تھے.... اور وہ جتنا خوش ہو سکتا تھا اتنا خوش ہوتا ہمارے پاس آ گیا۔

"آہ —" اس نے سر جھٹک کر اپنی خوشی کا اظہار کیا اور سب سے ہاتھ ملایا۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

ظاہر ہے سمیر اسے دیکھ کر بے حد خوش ہو رہا تھا "شی می زو۔۔۔ تم ماشنو پاس ہو آئے؟؟"

"آف۔۔۔ نو پرابلم" اس نے جواب دیا۔

"شی می زو۔۔۔ لسی پیو"

شی می زو کو لسی پلائی گئی جسے اس نے "آو۔ آو" کر کے پیا جیسے کوئی چوزہ پکڑنے کو ہو۔

ہماری گلگت ٹیم ایک مرتبہ پھر مکمل ہو گئی تھی۔

شی می زو کی آمد پر ہم جس والہانہ خوشی اور بے لوث محبت کا اظہار کر رہے تھے اس میں کھوٹ تو نہ تھا۔۔۔ بس تھوڑی سی غرض مندی شامل تھی۔۔۔ اس کے یوں سرراہ مل جانے سے ہماری ایک پہاڑ سی مشکل حل ہونے کو تھی۔۔۔ شی می زو نے چونکہ جیپ بکنگ گلگت ترشنگ اور پھر ترشنگ سے گلگت واپسی کے لئے بھی کروائی تھی اس لئے۔۔۔ کم از کم شی می زو کو لینے کے لئے ایک عدد جیپ تو اس وقت ترشنگ میں موجود تھی یا اس نے بہت جلد آنا تھا۔۔۔ اور ظاہر ہے ہم نے شی می زو کے ساتھ پیار محبت کر کے اس کے ساتھ بیٹھ جانا تھا۔ اپنے حصے کا کرایہ ادا کر کے۔۔۔ چنانچہ ہم نے شی می زو کے ساتھ پہلی بار جو گرمجوشی سے ہاتھ ملایا تو وہ اس کو یوں سرراہ مل جانے کی خوشی میں تھا اور اس کے بعد جتنی بار ہاتھ ملایا وہ گلگت واپسی کے لیے جیپ مل جانے کی خوشی میں تھا۔۔۔ ہم نے جب ایک مناسب وقفے کے بعد یونہی برسبیل تذکرہ اس سے اس جیپ کے بارے میں دریافت کیا جو اسے ترشنگ سے لینے آ رہی تھی تو اس نے کاغذ پر ایک تاریخ لکھ کر بتایا کہ جیپ پرسوں آجائے گی۔۔۔ اور کیا ہم کرایہ ادا کر کے اس میں گلگت تک سفر کر سکتے ہیں؟

"نو پرابلم۔۔۔" اس نے فوری طور پر رضا مندی ظاہر کر دی۔ اب یہ ہمارا فرض تھا کہ ہم اگلے دو تین روز شی می زو کو اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔۔۔

شی می زو کے ساتھ جو پورٹر تھا اس نے ہمیں ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا۔۔۔ یہ وہی پورٹر تھا جسے احسان نے جاپانی کے ساتھ بھیجا تھا۔۔۔

ترشنگ گلیشیر کی دیوار سامنے آ گئی۔۔۔ ہم سانس جمع کر کے اوپر جانے لگے۔۔۔ اور اس موقع پر یکدم مجھے اپنے انڈے یاد آ گئے۔۔۔ "سلطان وہ گلگت والے انڈے کہاں ہیں؟"

"ادھر ہیں صاحب۔۔۔ جیب میں" اس نے اپنی جیکٹ کی جیب کو زور سے تھپکا۔۔۔ "دو ہیں۔۔۔"

اور یہ عجیب بات تھی کہ اس سفر کے دوران ہمیں وہ انڈے صرف اس وقت یاد آتے جب ہم پیکنگ کر رہے ہوتے یا راستے پر ہوتے۔ جب کبھی کھانا وغیرہ پکتا ہم انہیں فراموش کر دیتے۔ بلکہ روپل میں جب ہم نے مقامی طور پر کچھ انڈے خریدے تو اس وقت بھی ان کا خیال نہ آیا۔ "سلطان' ترشنگ پہنچ کر۔۔۔ کل صبح ہم ان انڈوں کا آملیٹ کھائیں گے"

"ہاں ناں۔۔۔" اس نے سر ہلایا اور گدھوں کو بلندی کی جانب ہانکنے لگا۔

ترشنگ گلیشیر کے کنارے پر پہنچ کر ہم رکے۔۔۔ نیچے نانگا پربت سے آنے والا یہ گلیشیر پتھروں اور ملبے کے نیچے سانس لے رہا تھا۔۔۔ جہاں کہیں برف پر ملبہ کم تھا وہاں مٹی گیلی ہو رہی تھی۔۔۔ اور پانی کے چلنے کی آواز گرنے کی آواز ہم تک آتی تھی۔

دیوار سے نیچے اترنے کے لئے وہی راستہ تھا جس پر آتے ہوئے سمیر رک گیا تھا۔۔۔ سلطان سمیر اور گدھے آگے تھے۔۔۔ وہ اتر گئے تو میں نے قدم رکھا۔۔۔ بہت ڈرتے ڈرتے کہ یہاں پاؤں ٹھہرتا نہیں تھا۔۔۔ میں جب اس مقام پر پہنچا جہاں سمیر رکا تھا تو یکدم میری ٹانگوں میں جان نہ رہی' میرے پاؤں جیسے الگ ہو گئے۔۔۔ اور ان کے نیچے سے بھربھری زمین کھسکنے لگی۔۔۔ میرا سر چکرایا اور میں جہاں تھا وہیں پہلے تو ہمت کر کے کھڑا رہا یعنی گلیشیر میں نہیں گیا اور پھر چھڑی کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔۔۔ اور بیٹھا بھی اس طرح کہ میں وہاں زیادہ دیر تک اس پوزیشن میں بیٹھ نہیں سکتا تھا۔۔۔ سمیر نے نیچے پہنچ کر اوپر دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں جان بوجھ کر بیٹھا ہوں۔ یونہی ستانے کے لیے یا ذرا منظر دیکھنے کے لئے۔۔۔ اس نے "ہیلو ابو" کہہ کر ہاتھ ہلایا۔ میں جواباً ہاتھ نہیں ہلا سکتا تھا کیونکہ اس طرح میرا بیلنس خراب ہونے کا خطرہ تھا۔۔۔ میں جہاں تھا وہاں بالکل سانس روکے بیٹھا تھا۔ اس لمحے سلطان نے جو گدھے ہانکتا گلیشیر کے درمیان میں چل رہا تھا پیچھے مڑ کر دیکھا اور پھر مجھے وہاں نہ پا کر اوپر دیکھا۔۔۔ اور اس کی پہاڑی حس نے اسے بتا دیا کہ میں وہاں یونہی ستانے کے لئے یا منظر دیکھنے کے لئے نہیں بیٹھا ہوا۔۔۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ اوپر آ چکا تھا اور اپنا ہاتھ آگے کر کے کہہ رہا تھا "اسے پکڑو اور اٹھو۔۔۔"

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"مجھے اچھا پکڑو۔۔۔" میں نے ہاتھ آگے کیا "میں اٹھتے وقت شائد گر جاؤں۔۔۔"
"تم بسم اللہ کرو۔۔۔"

سلطان نے میرا ہاتھ جیسے شکنجے میں کس لیا۔۔ میں جب اٹھا تو خاصا لڑکھڑایا۔۔۔ اور بمشکل سیدھا ہوا۔۔۔ اور وہاں بیٹھے رہنے کا فیصلہ درست تھا۔۔۔ اگر میں اپنے طور پر اٹھنے کی کوشش کرتا اور اتنا لڑکھڑاتا تو۔۔۔ ظاہر ہے نیچے جاتا۔۔۔

میں نیچے گلیشیر تک پہنچا تو میر فکر مندی کے چہرے کے ساتھ میرا انتظار کر رہا تھا" آپ ٹھیک ہیں ابو؟"

ہم نے گلیشیر عبور کیا۔۔۔ دوسرے کنارے پر چڑھے اور جب اوپر پہنچے تو ہمیں ہمارا پسندیدہ قصبہ ترشنگ نظر آنے لگا۔۔۔ ایک ہموار اور سرسبز علاقہ' پہاڑوں میں پوشیدہ' درمیان میں ایک ویران ٹیلہ جس پر سیاہ پڑتی لکڑی سے بنا ہوا ایک چوکور ڈھانچہ۔۔۔ اور اس بلندی سے بھی پن چکی کی آبشار نظر آ رہی تھی۔۔۔۔

"نانگا پربت ٹورسٹ کاٹج روپل ترشنگ" کے تین نامکمل کمروں کی پتھریلی دیواروں کے ساتھ فرانسیسی سیاحوں کی پاجیرو ابھی تک کھڑی تھی۔۔۔ وہ مازینو پاس سے واپس نہیں آئے تھے۔۔۔ اس بار ہم اپنی پسند کا کمرہ حاصل کر سکتے تھے۔۔۔ یہاں کیفیت ابھی تک وہی تھی۔۔۔ صرف پتھر کی دیواریں 'فرش پر روڑی اور کھڑکیاں شیشوں کے بغیر۔۔۔ لیکن واحد مہمان ہونے کی بنا پر احسان اپنے گھر سے اون کا ایک بڑا کھیس ہمارے کمرے کے فرش پر بچھانے کے لئے آیا۔۔۔ کھڑکیوں پر راہی نے پلاسٹک تان دیا اور فرش پر زرد خیمہ اور اس پر سلیپنگ بیگ۔۔۔ کھڑکی کی سل پر خوراک اور شیو کا سامان وغیرہ سجا دیا گیا۔۔۔۔

اور براہ کرم جوتے باہر اتار کر اندر آئیں۔۔۔ اور تھوڑی ہی دیر میں یہ کمرہ اتنا کوزی اور آرام دہ اور منفرد ہو گیا کہ باہر اگرچہ ترشنگ تھا لیکن باہر جانے کو ہمارا جی نہ چاہتا تھا۔

سلطان ہمارے لیئے آخری کھانا تیار کر رہا تھا۔۔۔ کیونکہ اب ہمیں کسی پورٹر کی ضرورت نہ تھی۔۔۔۔

کھانے کے بعد ہم سب ایک دائرے میں بیٹھ گئے۔۔۔ اور سلطان اور بابا محمود کے دنوں کا حساب ہوا۔۔۔ جو حساب بنتا تھا ہم نے اس میں اپنی خوشی سے اور سلطان کی ان آنکھوں کی وجہ سے جن میں اس سفر کے دوران ہم نے کبھی لالچ کا کوئی شائبہ نہ دیکھا۔۔۔ کچھ زیادہ رقم شامل کی۔۔۔ ٹیم کو اب جس "ایکوپمنٹ" کی ضرورت نہ تھی مثلاً آلو۔ دال ۔ چاول ۔خشک دودھ۔ ایک دیگچی۔ پلیٹیں۔ چائے دانی وغیرہ وہ سب سلطان کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ ہم جب بھی کوئی چیز سلطان کی طرف بڑھاتے کہ یہ تمہارے لئے ہے تو وہ نظریں جھکا کر اسے قبول کرتا۔۔۔

بابا محمود بھی بے حد خوش تھا۔۔۔ اسے بالکل خبر نہ تھی کہ اسے جو رقم دی گئی ہے وہ کتنی ہے اور کس حساب سے ادا کی گئی ہے۔۔۔ لیکن وہ اسے ایک خواہشوں سے بھری مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتا چلا جاتا تھا۔۔۔ مجھے معلوم تھا کہ بابا یہ رقم جوں کی توں اپنے بیٹے کو دے دے گا۔۔۔ کیونکہ اس کے پاس اس کا کوئی مصرف نہ تھا۔۔۔ وہ بوٹوں کے اس جوڑے سے بھی مطمئن تھا جس پر چمڑے کے بڑے بڑے پیوند کسی مقامی موچی نے تھوپ رکھے تھے اور دونوں بوٹ یوں بھی الگ الگ تھے۔۔۔ ان میں تسمے نہ تھے بلکہ انہیں رسیوں اور چیتھڑوں سے کسا گیا تھا۔۔۔ شائد وہ اس رقم سے تسموں کا ایک جوڑا خریدے۔۔۔ لیکن کہاں سے۔۔۔ ہم نے دیکھا کہ بابا محمود اس رقم کو مٹھی میں بھینچے مسکراتا ہوا باہر نکلا ہے۔۔۔ پھر وہ ترشنگ کے اس بازار کے قریب رک گیا ہے جس میں فی الحال دو دکانیں ہیں جن میں سے ایک بند ہے۔۔۔ اور اس کھلی دوکان سے پورے پانچ روپے کی نسوار خریدی ہے اور اس کی چٹکی منہ میں دبا کر شانت ہوتا ہے اور مسکراتا ہوا اس راستے پر اتر رہا ہے جو چورت کو جاتا ہے۔۔۔۔

سلطان بھی خوش تھا لیکن وہ ہم سے الگ ہو جانے پر دکھی تھا۔۔۔ اور بولتا کم تھا۔۔۔ ادھر ادھر دیکھتا تھا۔۔۔ پھر اس نے حسب عادت زمین پر انگلیوں سے لکیریں کھینچتے ہوئے کہا "صاحب۔۔۔ ایک بات ہے۔۔۔"

"کیا بات ہے؟" شائد وہ ادائیگی سے مطمئن نہ تھا میں نے سوچا۔

"آپ کا جیپ تو پرسوں آئے گا۔۔۔ تو آپ کل ادھر میرے گھر آ جاؤ۔۔۔"

"بہت بہت شکریہ سلطان۔۔۔ لیکن مشکل ہے۔۔۔ ہم ذرا ترشنگ میں گھومیں گے اور۔۔۔"

"میرا گھر جو ہے وہ صاحب لوگ کے لئے نہیں ہے۔۔۔ لیکن آپ کھانا کھاؤ جی۔۔۔ گوشت تو نہیں ہے لیکن۔۔۔۔"

"بڑا مشکل ہو گا تمہارا گھر تلاش کرنا۔۔۔ ان پہاڑوں میں۔۔۔" میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس شخص پر چار آدمیوں کے کھانے کا بوجھ ڈالوں یا نہ ڈالوں۔۔۔۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"میں آؤں گا ناں — " وہ یکدم چہکنے لگا " ادھر آؤں گا اور سب کو لے جاؤں گا... کیوں سمیر... " اس نے خاص طور پر سمیر سے ہاتھ ملایا۔

راہی گردن پر ایک انگلی سے کھجلی کرنے لگا — "سلطان... ہم تو مرچ نہیں کھاتا... تو ہم کو کیا کھلائے گا — "

"ہم جانتے ہیں ناں — تھوڑا آلو۔ تھوڑا پیاز اور پانی میں ڈال کر دلیا موافق بنا لو جیسا ہم مویشی کے لئے بناتا ہے تو وہ تمہارے لئے بنائے گا — کیوں نہیں بنائے گا — "

"اب تو جانا پڑے گا — " راہی خوش دلی سے ہنسنے لگا۔

"تو پھر کل آئے گا — " سلطان اٹھ کھڑا ہوا۔ کمرے سے باہر گیا اور فوراً ہی لوٹ آیا اور اس کے ہاتھوں میں انڈوں کی پوٹلی تھی " میں یہ بھول گیا تھا — صاحب ایک رہ گیا ہے "

ہم نے پوٹلی میں سے اس انڈے کو نکال کر ملاحظہ کیا جو گلگت سے چلا تھا اور نانگا پربت سے ہو کر صحیح سالم یہاں تک پہنچ گیا تھا " سمیر اسے تم سنبھال لو... شام کو ہر صورت میں اس کا آملیٹ بنے گا — "

سلطان بھی ترشنگ بازار کی اکلوتی دوکان کے سامنے رکا اور وہاں سے کچھ خریداری کر کے نیچے اتر گیا۔

ہم کمرے سے باہر آئے تو احسان جاپانی کو گھیرے ہوئے تھا اور ان کے قریب وہ پورٹر منہ پھلائے بیٹھا تھا جو مازینو پاس تک اس کے ساتھ گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر جاپانی میرے پاس آ گیا اور اپنی نوٹ بک پر "آہ... نو پرابلم" کہتے ہوئے کچھ لکھنے لگا... ادھر احسان بھی میرے کان کھانے لگا کہ جی یہاں سے مازینو پاس تک اتنے کیمپ بنتے ہیں اور جاپانی پیسے کم دے رہا ہے۔ خاصی تحقیق کے بعد کھلا کہ احسان حسب عادت کچھ بینکی ہیکی کر رہا ہے۔ چونکہ یہ پورٹر اسی کا نمائندہ ہے اس لئے جاپانی سے جتنی زیادہ رقم حاصل کی جائے گی احسان کی کمیشن بھی اتنی زیادہ بنے گی... جاپانی ان دنوں کا حساب کر رہا تھا جو سفر میں گزرے جب کہ احسان اور پورٹر کیمپس کا حساب کر رہے تھے... جہاں کہیں بھی ٹریکنگ کے لے پورٹر حاصل کئے جاتے ہیں پہلے فیصلہ کر لیا جاتا ہے کہ ادائیگی دنوں کے حساب سے ہو گی یا کیمپ کے حساب سے... یعنی اگر تو

مازینو پاس تک چار کیمپ کا سفر ہے اور آپ نے وہ سفر دو دن میں کر لیا ہے تو بھی ادائیگی چار دنوں کی ہو گی کیونکہ پورٹر زیادہ فاصلہ کم مدت میں چلا ہے... لیکن اس کا فیصلہ پہلے کیا جاتا ہے... بہر حال اس جھگڑے کا فیصلہ احسان کے بڑے بھائی محمد اشرف نے کیا جو اتنا دھیما اور شریف اشرف تھا کہ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ احسان کا بھائی ہے...

"اب کیا پروگرام ہے؟" راہی کہنے لگا۔

"ترشنگ کی سفید گلیشیر ٹھنڈک میں اور اس کے کھیتوں میں بے مقصد گھومنا... "

"اچھا پروگرام ہے — لیکن تارڑ بھائی ہم اتنے دنوں سے صرف ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں... پہلے تو مجبوری تھی لیکن اب... کیا آپ میرا شکل سے اکتا نہیں گئے؟"

میں نے راہی کو غور سے دیکھا " میرا خیال ہے تم ٹھیک کہتے ہو... کیا شکل ہے!"

"بالکل — اور آپ کی بھی کیا شکل ہے جو اتنے روز سے دیکھ رہا ہوں تو آج... ہم الگ الگ گھومیں گے... انسان کو کبھی اکیلا ہو کر بھی گھومنا چاہئے... "

راہی پن چکی کی جانب چلا گیا۔

"تمہارا کیا پروگرام ہے؟" میں نے سمیر سے پوچھا۔

"میں تو ابھی آپ کی شکل دیکھ کر نہیں اکتایا ابو — "

"گڈ بوائے — " میں نے خوش ہو کر اسے پیار کرنے کے لئے منہ آگے کیا تو وہ جھکا نہیں بلکہ جان بوجھ کر سیدھا ہو گیا تاکہ میری زد سے باہر ہو جائے۔ میں نے ایڑیاں اٹھا کر اس کے چہرے تک پہنچنے کی کوشش کی لیکن دراز قامت بیٹوں کا سب سے بڑا نقصان یہی ہوتا ہے کہ آپ ان کی مرضی کے بغیر ان کا بوسہ نہیں لے سکتے... اور سمیر شرارت کے موڈ میں تھا... میں نے ذرا روٹھنے کی اداکاری کی تو اس نے جھک کر کہا — "گڈ فادر — "

ہم دونوں چلنے لگے تو جاپانی ہمارے قریب آ کر کہنے لگا "نو پرابلم — " جس کا مطلب یہ تھا کہ ہم کو بھی ساتھ لے چلیں...

اور ہم نے اس پچھلے پہر ترشنگ کی سفید گلیشیر ٹھنڈک میں اور اس کے

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

کھیتوں میں گھومنے کے سوا کچھ نہ کیا۔۔۔

اس ٹیلے پر بھی گئے جہاں مچان نما لکڑی کا چوکور ڈھانچہ ترشنگ کے قدیم باسیوں کی ہڈیوں کی رکھوالی کر رہا تھا۔۔۔ نیچے پورا ترشنگ سائے میں تھا اور دھوپ صرف رائے کوٹ پیک اور آس پاس کی برفیلی چوٹیوں پر تھی۔

ہم نے دریائے روپل تک جانے کی کوشش بھی کی۔۔۔ جو نیچے بلند چٹانوں کے نیچے بہتا تھا۔۔۔

کھیتوں میں جگہ جگہ پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ڈھیر تھے جو بے حد خوش نما لگتے تھے۔۔۔

ہم ترشنگ کو واپس آ رہے تھے جب شام اترتی تھی۔۔۔ اور جب ایک پن چکی کے برابر پرانے گھر کی دیوار پر ہم نے ایک کسان کو دیکھا جو ہمیں دیکھ رہا تھا۔۔۔ جاپانی کی وجہ سے وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ ہم کون ہیں۔۔۔ "السلام وعلیکم۔۔۔" میں نے کہا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔" وہ فوراً باہر آ گیا" چائے پیو گے؟"

"نہیں۔۔۔ آپ پانی پلا دیجئے۔۔۔"

"وہ مکان کے اندر جا کر گلاس لے آیا اور تیز رو نالی پر جھک کر اسے بھر لیا۔۔۔

" ترشنگ کا پانی اچھا ہے صاحب۔۔۔"

اس پن چکی سے پرے۔۔۔ ترشنگ سے ہٹ کر کھیتوں کے بیچ ہمیں پوری دوپہر ایک خوش نما چینی طرز کی عمارت نظر آتی تھی اور ہم نے اس کسان سے پوچھا کہ وہ کیا ہے؟

"وہ تو مسجد ہے صاحب۔۔۔ اور اس کے ساتھ امام باڑہ ہے۔۔۔"

ہم اس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد ترشنگ کی طرف چلنے لگے۔۔۔

"ابو میں مسجد دیکھنا چاہتا ہوں۔۔۔"

شام میں وہ عمارت کھیتوں میں سے اٹھنے والی ہلکی تاریکی میں کم دکھائی دے رہی تھی "خاصی دور ہے۔۔۔"

"زیادہ دور نہیں ابو۔۔۔" اور وہ راستہ بدل کر ہمارے آگے آگے چلنے لگا۔۔۔ جاپانی نے بالکل نہیں پوچھا کہ ابھی ادھر جا رہے تھے تو ابھی دوسری طرف کیوں جا رہے ہو اس نے فوراً کانٹا بدلا اور میرے ساتھ چلنے لگا۔۔۔ یہاں بھی روپل کی طرح ہم

نے پھولوں کے انبار دیکھے جن کے رنگ اترتی شام میں سیاہی مائل ہو رہے تھے۔۔۔ ایک چشمے کے قریب گذرتے ہوئے پانی کی آواز کے ساتھ دو پرندے چہچہائے۔۔۔ پتہ نہیں کہاں چہچہائے۔۔۔ لیکن ان کی آواز میں بہت کشش تھی۔۔۔ وہاں صرف ایک درخت تھا اور ہم اس کے نیچے جا کھڑے ہوئے۔۔۔ وہ یقیناً اس کی شاخوں میں پوشیدہ تھے۔۔۔ وقفے کے ساتھ بولتے اور بہت مٹھاس اور اپنائیت سے بولتے جیسے براہ راست ہم سے مخاطب ہوں۔۔۔ لیکن وہ ہمیں نظر نہیں آئے۔۔۔

اور وہ مسجد زیادہ دور نہیں تھی۔۔۔

کھیتوں میں گھری ہوئی ایک قدیم لداخی طرز کی خاموش عمارت۔۔۔ جیسے بدھ بھکشوؤں کا پوشیدہ مسکن ہو۔۔۔ وہاں کوئی نہ تھا۔۔۔ لیکن وہاں ان دو پرندوں کی آواز پھر سے آنے لگی جنہیں ہم درخت کی شاخوں میں تلاش نہیں کر سکے تھے۔۔۔ عمارت کے ساتھ پانی بہتا تھا' اور بہت خاموشی میں بہتا تھا۔ یہاں دو چھوٹی چھوٹی عمارتیں تھیں۔۔۔ دونوں کے دروازے بند تھے۔۔۔ ہم نے ان میں سے ایک کا پرانا دروازہ دھکیلا۔۔۔ ایک تاریک کمرہ بلکہ سیاہ پوش کمرہ۔۔۔ لکڑی کے تنوں اور شہتیروں کی چھت۔۔۔ عباس علمدار کے علم۔۔۔ جلی ہوئی موم بتیاں۔۔۔ اخباروں میں سے تراشیدہ امام خمینی کی تصویریں۔ ایک کونے میں پندرہ بیس لالٹینیں رکھی ہوئی تھیں۔۔۔ ان دنوں محرم کے دن تھے اور ہر شب وہاں غم حسین کو دل سے لگانے والے جمع ہوتے تھے۔۔۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔۔۔ دوسرے کمرے کے آگے ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا۔۔۔ اس کے دروازے کی کنڈی لگی ہوئی تھی۔۔۔ میں نے کنڈی اتار کر اندر جھانکا۔۔۔ یہ ایک مختصر سی مسجد تھی۔۔۔ ایک مختصر سا کمرہ جس کے فرش پر کھالیں بچھی تھیں۔۔۔ کھڑکیوں کے شیشوں میں سے تھوڑی سی روشنی اندر آتی تھی اور یوں تھوڑی دیر بعد اشیاء تاریکی سے نکل کر واضح ہونے لگتی تھیں۔۔۔ جانوروں کی کھالوں کی گرم مہک' خاک کربلا کی ٹکیاں' قرآنی آیات کے کتبے' مرجھائے ہوئے جنگلی پھولوں کے دو ہار جو محراب میں پڑے تھے۔۔۔

"یہاں تو نماز پڑھنے کو جی چاہتا ہے ابو۔۔۔" سمیر آہستہ سے کہنے لگا اور میرا بازو تھام لیا۔

اور وہاں اس نیم تاریک' کھالوں کی گرم مہک والے شام کی خنکی میں سرد ہوتے ہوئے کمرے میں ایک عجیب ٹھہراؤ تھا۔۔۔ جیسے ہم دونوں باپ بیٹا وہاں آ گئے

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

ہوں جہاں ہمیں آنا تھا... میں دنیا کی کئی معروف اور محبوب مسجدوں میں گیا ہوں... ان کی عظمت اور تاریخ نے مجھ پر اثر کیا ہے... ان کے ماحول نے مجھے بہت کچھ کہا... لیکن ترشنگ کی اس ۲۰ x ۱۰ فٹ کی مسجد نے اور اس میں بچھی زوہ اور بھیڑوں کی کھالوں کی گرم مہک نے مجھے کچھ نہیں کہا' صرف جھکنے کو کہا...

ہم نے باہر آ کر مسجد کے ساتھ بہتے ہوئے گلیشیئر کے پانی سے وضو کیا...

سر جھکائے' آنکھیں بند کئے اور ہاتھ باندھے ہم زوہ کی کھالوں پر کھڑے ہو گئے۔

ناک میں کھالوں کی مہک تیز ہو جاتی جب ہم سجدے میں جاتے۔

جب میں نے سلام پھیرا تو مجھے صرف نانگا پربت کی برفیں نظر آئی تھیں...

ہم ترشنگ جا رہے تھے تو کھیتوں میں تاریکی تھی لیکن ہم راستے سے آگاہ تھے...

"مزا آ گیا ابو..." سمیر نے میرا بازو تھام کر کہا۔

"نانگا پربت ٹورسٹ کاٹیج رویل ترشنگ" میں بڑی گہما گہمی تھی... فرانسیسی سیاح مازینو پاس سے واپس آ چکے تھے اور اپنی کامیابی کی خوشی میں جشن منا رہے تھے... چند موم بتیاں جو ریت کے ڈھیر کے اوپر رکھے ہوئے ایک تختے پر روشن تھیں' خالی بوتلیں اور ڈبے' پاکستانی موسیقی' فرانسیسی میں لوک گیت' دمکتے چہرے اور ستاروں بھری آنکھیں... اور خوشی اور مستی میں قلانچیں بھرتا ہوا احسان...

ہمارے کمرے میں راہی چاچا بیگ صاحب کے دیئے ہوئے بچے سٹوو پر رات کا کھانا تیار کر رہا تھا... "آپ کے لئے بہت زبردست ڈنر بنایا ہے تارڑ بھائی... بہت زبردست سرپرائز جانتے ہو کیا بنایا ہے!... دال اور چاول..."

"واقعی یہ بہت زبردست سرپرائز ہے..." میں ہنسنے لگا "لیکن اس کے ساتھ تو ہم ایک انڈے کا آملیٹ کھائیں گے... سمیر بیٹا انڈہ پیش کیا جائے"

سمیر نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر انڈوں والی پوٹلی نکالی اور میرے سامنے رکھ دی... پوٹلی کچھ بیٹھی بیٹھی لگ رہی تھی... کیونکہ ہمارا آخری انڈہ بھی ٹوٹ چکا تھا...

کھڑکی کی سل پر روشن موم بتی آدھی جل چکی تھی... سمیر اور جاپانی سو چکے تھے... فرانسیسیوں کی آوازیں بھی کم کم آتی تھیں۔ احسان کمرے میں داخل ہوا' جھکا

ہوا' کچھ سونگھتا ہوا۔

"کیا بات ہے احسان؟"

"کچھ نہیں..." وہ نہایت معصومیت سے مسکرانے لگا...

"کچھ تو ہے..."

"میرے پاس تو کچھ نہیں ہے" اس نے اپنی جیبیں الٹ کر دکھائیں...

"تو پھر کوئی اور بات ہے"۔

"نہیں... کوئی اور بات بھی نہیں..." اس کی مسکراہٹ مزید پھیل گئی... پھر اس نے پورے کمرے کا ایک طائرانہ جائزہ لیا اور کہنے لگا "آپ کے پاس پینے کے لئے کچھ ہے؟"

"کیوں نہیں احسان بھائی..." راہی اپنے سلیپنگ بیگ میں سے باہر آ گیا "بہت ہے پینے کے لئے"

"اچھا..." احسان خوش ہو گیا "ملے گا؟"

"کیوں نہیں ملے گا" راہی نے پلاسٹک کین اٹھا کر اسے تھپکا "بہت ہے" اور پھر تام چینی کے مگ میں پانی بھر کر اس کی جانب بڑھا دیا۔ احسان نے بھرے ہوئے مگ کو انتہائی اشتیاق سے دیکھا اور پینے سے پیشتر اسے سونگھا' کچھ شک میں مبتلا ہو کر ہماری جانب دیکھا اور پھر جلدی سے ایک گھونٹ بھرا... اور اس ایک گھونٹ سے احسان کی سرخوشی یکدم بجھ گئی... اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور بیٹھی ہوئی آواز میں بولا "یہ تو پانی ہے..."

"اور کیا چاہئے احسان..." میں اس کی مایوسی سمجھتا تھا۔

اس نے پھر ادھر ادھر سونگھا... "یہ بو کیسی ہے؟"

راہی نے ناک سکیڑ کر تھوڑی دیر غور کیا... یہ بو... اوہو احسان بھائی یہ تو ہم سٹوو پر جب کھانا پکا رہا تھا' دال چاول' تو تھوڑا سا سپرٹ ادھر بوتل سے گر گیا تھا... یہ سٹوو سپرٹ سے جلتا ہے تو اس کا بو ہے... آپ کیا سمجھا؟"

"کچھ نہیں..." احسان سر جھکائے مایوسی میں غرق باہر چلا گیا...

ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگے۔

موم بتی کی موم سل پر پھیل چکی تھی... اور بجھنے کو تھی... ترشنگ میں پہلی شب کی نسبت آج ہمیں زیادہ سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی' شاید ہم موسم کے

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

عادی ہو رہے تھے۔

ترشنگ کی واحد دوکان کے اندر میں نے گول نسواری آئینے کو اپنے سامنے کیا... اسے فوراً اٹھایا لیکن پشت پر کچھ نہ تھا... پھر اٹھا کر سامنے کیا...

دوکان میں روشنی کم تھی۔ گول نسواری آئینہ میرے ہاتھ میں تھا اور اس میں ایک سفید داڑھی والا وحشی سا شخص مجھے دیکھ رہا تھا اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں سرخی تیرتی تھی... پھر وہ سفید ریش بابا مسکرانے لگا اور اس کے دانت چمکنے لگے... میں بے اختیار ہو کر ہنسنے لگا کہ یہ میں ہوں' چندرہ روز کی کوہ نوردی نے مجھے کیا بنا دیا ہے' میں اپنے آپ کو پہچان نہیں رہا تھا... میں نسواری آئینے کو روبرو لا کر اپنی ایک جھلک دیکھتا اور ہنسنے لگتا...

جاپانی نے مجھے غور سے دیکھا اور پھر مسکرانے لگا جیسے قہقہوں کا سبب جانتا ہو۔

"میں بابا ہو گیا ہوں..." میں نے اپنی سفید داڑھی کو پیار سے تھپکتے ہوئے کہا۔

"بابا..."

"آہ... بابا" جاپانی نے سر ہلایا "نو پرابلم"

"پورٹر سلطان کے کوہستانی گھر میں"

میں ترشنگ کی واحد دوکان میں سلطان کے بچوں کے لئے ٹافی کے پیکٹ اور نسواری آئینے خرید رہا تھا۔

اور پھر ہم سلطان کے کوہستانی گھر کی جانب چلتے تھے۔

جاپانی اور سمیر آگے آگے چل رہے تھے... سلطان درمیان میں اور وہ ہمیں ترشنگ میں لینے آیا تھا اور اس کے پیچھے میں اور راہی...

ترشنگ سے نیچے اتر کر نالہ عبور کر کے اب ہم دوسری پہاڑی پر چڑھ رہے تھے...

"تارڑ بھائی کل ہم واپس چلے جائیں گے" راہی کہنے لگا۔

"ہاں... اگر جاپانی کی جیپ آ گئی تو..."

"لیکن آپ نے تو مجھے ڈریکولا بنا دیا ہے... میری نسل تبدیل کر دی ہے"

میں نے اس پر راہی کی جانب دیکھا اور چونک کر دیکھا کہ یہ چاچا کیا کہہ رہا ہے لیکن وہ سر جھکائے متانت سے چلتا جاتا تھا "ہاں میں ٹھیک کہتا ہوں... میں بالکل نارمل نسل کا انسان تھا... اسلام آبادی انسان جو اپنے کام سے کام رکھتا تھا لیکن آپ نے مجھے ڈریکولا بنا دیا..."

"وہ کیسے؟" مجھے پوچھنا ہی پڑا۔

"یہ جو ڈریکولا ہوتا ہے تو اس میں ایک خاص بات ہوتی ہے۔ اور وہ یہ کہ جب بھی وہ کسی دوسرے نارمل انسان کو کاٹتا ہے تو دوسرا انسان بھی ڈریکولا بن جاتا ہے' اس کی نسل بدل جاتی ہے... اس سفر کے دوران' ادھر ترشنگ میں اور ٹاپ میدان میں... میری نسل بدل گئی... آپ کے پہاڑوں کے عشق نے مجھے بھی کاٹ لیا... اب

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

میں نارمل انسان نہیں رہا۔۔۔ آپ کی نسل کا ہو گیا ہوں۔۔۔"

"یعنی میں ڈریکولا ہوں۔۔۔؟ یہ میری تعریف ہو رہی ہے؟"

"آپ سمجھتے ہیں ناں کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔۔۔" اور راہی بے حد سنجیدہ تھا "دیکھیں جب آپ کسی شخص کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے گرد خوب گھماتے ہیں' چکر دیتے ہیں۔۔۔ اور پھر اس کا ہاتھ چھوڑ دیتے ہیں تو اس کے بعد بھی اسے چکر آتے رہتے ہیں۔۔۔ مجھ کو آپ نے ہاتھ پکڑ کر گھمایا چکر دیئے۔۔۔ اور اب جب میں واپس جاؤں گا تو وہاں بھی مجھے چکر آتے رہیں گے"۔

ہم آہستہ آہستہ ترشنگ سے بہت بلند ہو چکے تھے۔ پوری وادی کا منظر ہم پیچھے چھوڑتے چل رہے تھے۔۔۔ اور جب بھی مڑ کر دیکھتے' وہ منظر زیادہ وسیع ہو چکا ہوتا۔۔۔ ترشنگ کی ہریاول' برف پوش پس منظر اور کھیتوں میں مکان اور ان سے پرے ایک لداخی طرز کی چھوٹی سی عمارت۔۔۔ روپل دریا کی گذرگاہ کی بلند دیواروں کے کنارے۔۔۔ اور ان کناروں کے درمیان میں جو بے حد پر کشش اور سرسبز میدان تھا اور وہاں ایک چھوٹا سا گاؤں بلندی پر براجمان تھا تو اس کا نام رائے پور تھا۔

اب سلطان ہمارے ساتھ چل رہا تھا۔۔۔ اور ہمارے پوچھنے پر کہ تمہارا گھر یہاں سے کتنی دور ہے وہ ماتھے پر بل ڈال کر مسکراتے ہوئے کہتا "ادھر ہی ہے۔۔۔"

سلطان کے گھر کی جانب چلتے ہوئے ہمیں اپنے گھر یاد آ گئے۔۔۔ راہی کہنے لگا "کل میں سکیچ کرتے ہوئے بنگالی گانا گا رہا تھا کہ دریا تیرا کنارہ نہیں ہے۔۔۔ تو یہ میں تب گاتا ہوں جب میں گھر کے لئے اداس ہو جاتا ہوں۔۔۔ لیکن تارڑ بھائی ادھر جو بلندی ہے اس کی وجہ سے گانا ٹھیک طرح سے نہیں گایا جا سکتا۔ ادھر آکسیجن کم ہے اس لئے جب بھی تان لگاتا ہوں۔ آ۔۔۔ آ۔۔۔ تو میرا سانس ختم ہو جاتا ہے۔۔۔ دو کی بجائے صرف ایک "آ" کرتا ہوں اور خلاص۔۔۔ شاید اسی وجہ سے ادھر نانگا پربت کی وادی میں کلاسیکی موسیقی کا کوئی فیوچر نہیں۔۔۔"

بائیں جانب بہت ہی بلند چٹانیں تھیں اور وہ ہم پر جھکی ہوئی تھیں' ان چٹانوں میں سے گھاس نکلتی تھی۔۔۔ گھاس میں کبھی کبھار کوئی شے حرکت کرتی۔۔۔ راہی رک گیا "باپ رے۔۔۔ یہ کوئی جانور ہے۔۔۔ غور سے دیکھو"

سلطان آگے جا کر کھڑا ہو گیا "کیا دیکھتے ہو؟ اوپر مت دیکھو۔۔۔ اوپر ہمارا عورت لوگ گھاس کاٹتا ہے"۔

یہ عورت لوگ بہت بلندی پر تھا اور سردیوں کے لئے گھاس کاٹتا تھا۔

راستہ ختم ہو گیا اور ہم کھیتوں کے درمیان میں چلنے لگے۔۔۔ یہ "تناکے" کا علاقہ کہلاتا تھا۔ خشک پہاڑ کی آخری بلندی سے ذرا پہلے سلطان کا گھر تھا۔۔۔ روپل سکول جتنا صاف ستھرا' پتھروں اور لکڑی سے تعمیر کردہ۔ ذرا نیچے لکڑی کا سٹور تھا اور اس کے ساتھ مویشیوں کا باڑہ تھا۔۔۔ یہ باڑہ اندر سے بے حد تاریک تھا اور اس کی آخری کوٹھڑی بے حد تنگ اور بغیر ہوا کے تھی۔۔۔ شدید سردیوں میں مویشیوں کو اس کوٹھڑی میں رکھا جاتا تھا۔۔۔ گھر کے ساتھ کھیت تھے۔۔۔ سلطان کا گھر ہماری توقعات کے برعکس خاصا شاہانہ تھا۔۔۔ برآمدے میں ایک دروازہ کھلتا تھا اور ہم اس کے راستے ایک چھوٹے سے صاف ستھرے کمرے میں داخل ہوئے جسے خصوصی طور پر ہمارے لئے تیار کیا گیا تھا۔۔۔

فرش پر ایک دھاری دار اونی دری بچھی تھی۔ دیواروں کے ساتھ تکیے لگے ایک جانب چھینٹ کی رضائیاں ترتیب سے رکھی تھیں۔ درمیان میں ایک پرانا ٹیپ ریکارڈر بجنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کھڑکی میں دو اگر بتیاں جل رہی تھیں۔ وہ پہلے سلطان کے ایک چاچا جی اور ایک مقامی سکول ٹیچر تشریف لا چکے تھے۔ جب ہم آرام سے بیٹھ گئے تو سلطان کے بچے کمرے میں آ گئے۔۔۔ انہیں آج خصوصی طور پر خوب مل مل کر نہلایا گیا تھا اور وہ صاف ستھرے کپڑوں میں باقاعدہ دمک رہے تھے۔۔۔ سلطان کی سب سے چھوٹی بچی اتنی گول مٹول چٹی گوری اور پیاری تھی کہ اسے دیکھتے ہوئے لگتا تھا کہ ہم شاید کسی دودھ یا گرائپ واٹر کا اشتہار دیکھ رہے ہیں۔ جب میں نے انہیں وہ تحفے دیئے جو میں نے ان کے لئے ترشنگ میں خریدے تھے تو وہ عام بچوں کی طرح بے صبرے اور ندیدے بالکل نہ ہوئے بلکہ تحفوں کو سینے سے لگائے آرام سے ایک کونے میں بیٹھ گئے۔

سلطان کی نظریں مجھ پر تھیں۔ وہ میرے چہرے سے اندازہ لگا رہا تھا کہ اس کے گھر کو میں پسند کر رہا ہوں یا نہیں "صاحب ٹھیک ہے ناں؟"

"ہاں سلطان۔۔۔ لیکن یہ ٹیپ ریکارڈر ذرا بند کر دو"

ٹیپ ریکارڈر بند ہوا تو ایک خنک خاموشی جیسے اندر آ گئی۔۔۔

سلطان کا چاچا باتیں کرنے لگا۔۔۔ صاحب ادھر اس پہاڑ پر ۱۵ دسمبر سے اپریل تک برف ہوتا ہے اور بہت ہوتا ہے۔ جتنا زیادہ برف ہوتا ہے ہم اتنا زیادہ خوش ہوتا ہے۔۔۔ ادھر ہم زیادہ تر مٹر' آلو' پھلیاں اور دال کاشت کرتا ہے آپ نے دیکھا کہ ابھی اگست کا مہینہ ہو گیا لیکن ہمارا گندم پکا نہیں شاید اس مرتبہ بالکل نہ پکے کیونکہ اس

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

سال سردیاں لمبی ہو گئی تھیں۔۔۔"

"سردیوں میں آپ لوگ گھر سے بالکل باہر نہیں نکلتے؟" میر نے پوچھا۔

"کیوں نہیں نکلتے۔۔۔ باہر جا کر مویشی کو دیکھتے ہیں۔ چارہ ڈالتے ہیں۔ پانی لاتے ہیں۔۔۔"

میں نے ذرا مقامی ثقافت کے بارے میں اپنے علم میں اضافہ کرنا چاہا اور ان سے شادی بیاہ کی رسوم کے بارے میں پوچھا' خاص طور پر موسیقی کے بارے میں۔۔۔

"شادی پر پہلے ہم ڈھول بجاتے تھے۔۔۔" سلطان کا چاچا کہنے لگا "اب منع ہے"

"کس نے منع کیا؟"

"اس نے۔۔۔" چاچا نے سکول ٹیچر کی طرف اشارہ کیا "اس نے کہا یہ اسلام میں نہیں کہ ڈھول بجاؤ۔۔۔" اس فقرے کے خاتمے پر سکول ٹیچر نے میری جانب فاتحانہ نظروں سے دیکھا اور میں نے جواب میں نہایت مدبرانہ انداز میں سر ہلایا۔۔۔

گفتگو کے دوران سلطان بڑے اہتمام سے کھانا لگا رہا تھا۔

"کھاؤ ناں صاحب۔۔۔" اس نے ذرا شرمندہ ہو کر دعوت دی۔

اور یہ کھانا شاہراہ ریشم سے اس طرف ہمارا بہترین کھانا تھا۔۔ دیسی انڈوں کا مکھن سے تیار کردہ آملیٹ' خمیرے پراٹھے' گول کیک نما کی روٹی اور گاڑھی میٹھی لسی۔۔۔ یہ سب کچھ ہمارے لئے تھا اور راہی کے لئے ایک کٹورے میں آلو اور پیاز کا پھیکا حلوہ نما کھانا اور اسے راہی نے بڑے شوق سے دھیرے دھیرے کھایا۔

جب میں تین پراٹھوں کے بعد لسی کا چوتھا گلاس غٹا غٹ پی رہا تھا تو راہی کہنے لگا "آج میں اپنا پرہیز ختم کر کے اس لسی کو ٹرائی کروں گا جو آپ بہت شوق سے پیتا ہے۔۔۔"

"بسم اللہ" میں نے لسی کا ایک گلاس اسے تھما دیا۔ راہی نے ایک گھونٹ بھرا' کچھ دیر سوچ میں رہا پھر ایک اور قدرے پر اشتیاق گھونٹ بھرا اور پھر پورا گلاس پی گیا "تارڑ بھائی یہ تو گھول ہے"

"یہ کیا ہے؟"

"گھول۔۔۔" راہی نے دہرایا "تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ یہ گھول ہے۔۔۔"

"مجھے معلوم ہوتا کہ یہ گھول ہے تو میں تمہیں بتاتا کہ یہ گھول ہے۔۔۔ لیکن

راہی چاچا کیا واقعی یہ گھول ہے؟"

"ہاں۔۔۔ ہم اسے گھول بولتے ہیں۔۔۔"

دیسی انڈے' مکھن' خمیرے پراٹھے اور گھول۔۔۔ اور سلطان کے اس پہاڑی گھر کے خنک کمرے میں خاموشی اور لمبی لمبی جمائیاں اور نیند سے بوجھل آنکھیں۔۔۔ ہم بڑی مشکل سے اٹھے اور بڑی مشکل سے باہر برآمدے میں آ گئے۔۔۔ دوپہر ڈھل چکی تھی۔۔۔ چٹانوں میں عورت لوگ گھاس کاٹنے کے لئے کبھی دکھائی دیتی تھیں اور کبھی گم ہوتی تھیں۔۔۔ اور ایک ہلکی خنک ہوا نانگا پربت کی جانب سے ہم پر اترتی تھی۔۔ اور ہم اس کے ساتھ سلطان کا بے پناہ شکریہ ادا کرنے کے بعد ترشنگ کی طرف اترنے لگے۔۔۔ اس نانگا پربت کی جانب سے اترتی ہوا کے ساتھ۔۔۔ ترشنگ کی طرف اترنے لگے۔

اس شام میں اور میر ایک مرتبہ پھر اپنے کمرے سے نکل کر کھیتوں کی ٹھنڈک میں گئے۔۔۔ اور اس جانب چلے جہاں ایک ایسا درخت تھا جس پر دو پرندے چہچہاتے تھے اور نظر نہیں آتے تھے۔ اس درخت کے آگے ہریاول میں گھری ہوئی پانی کے کنارے ایک عمارت تھی لداخی طرز کی۔۔۔ جو ہمیں سلطان کے گھر سے بھی دکھائی دیتی تھی اور ہم نے وہیں فیصلہ کیا تھا کہ آج شام ہم ضرور وہاں پہنچیں گے۔۔۔

مغرب کا وقت تھا۔ ہم نے خنک پانیوں کے ساتھ وضو کیا اور کمرے کے اندر جا کر ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔۔۔ تھوڑی دیر بعد ایک چینی شباہت کے بابا جی آئے اور اپنی ٹھوڑی سے لٹکتی ہوئی داڑھی سنوارتے آئے۔۔۔ وہ مسجد میں آئے اور ہمیں دیکھ کر ذرا ٹھٹھک گئے۔۔۔ کہ ہم اجنبی شکلوں کے تھے اور نیم تاریکی میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔۔۔ ہم نے سلام کیا تو وہ مسکرانے لگے۔۔۔ وہ مؤذن تھے۔۔۔

تھوڑی دیر میں مسجد بھر گئی۔۔۔ اور اسے بھرنے کے لئے دس پندرہ نمازی کافی تھے۔۔۔ یہ لوگ اندر آتے اور کسی کھال پر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگتے۔۔۔ اور اکثر بلند آواز میں پڑھتے۔ شام کی خنکی میں کھالوں کی گرم مہک میں اس مختصر عبادت گاہ میں۔۔۔ کوئی ہاتھ باندھے پڑھ رہا تھا اور کوئی ہاتھ چھوڑ کر۔۔۔ زیادہ تر بابے لمبے چوغوں میں تھے اور چینی لگ رہے تھے۔۔۔

میں نے خیریت سے گھر واپسی کی دعا کی۔۔۔ اور کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشوں

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

میں سے نانگا پربت کی سفیدی جیسے مسجد میں آتی تھی اور اس کی تاریکی کم کرتی تھی۔۔۔

ہم اندھیرے میں چلتے ترشنگ کو جا رہے تھے۔۔۔ اور خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔۔۔

ایک پگڈنڈی پر دو لالٹینیں حرکت کرتی ہوئی ہماری جانب آ رہی تھیں۔ ہم قریب ہوئے۔۔۔ سیاہ لباس میں دو لڑکیاں۔۔۔ انہوں نے راستہ دیکھنے کے لئے لالٹینیں اپنے چہروں کے برابر کر رکھی تھیں اور روشنی کس کی زیادہ تھی یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا۔ انہوں نے ہمیں یکدم سامنے پا کر حیرت اور ڈر سے اپنی زبان میں کچھ کہا اور پھر راستہ بدل کر کھیتوں کے اندر چلی گئیں۔۔۔ وہ مسجد کی جانب رواں تھیں اور مجلس میں شرکت کے لئے جا رہی تھیں۔۔۔

ترشنگ کے قریب چند اور لوگ ملے۔۔۔ وہ بھی لالٹینیں اٹھائے مسجد کی جانب جا رہے تھے۔۔۔ ان میں سے ایک نوجوان ہماری طرف آ گیا' لالٹین اٹھا کر ہمارے چہروں کے برابر کی اور کہنے لگا "صاحب گلگت سے آپ کی جیپ آ گئی ہے۔۔۔ ڈرائیور آپ کا انتظار کر رہا ہے"۔

رات ترشنگ میں چاند کی ایسی چاندنی تھی کہ اڑتا ہوا کوا سفید روئی کی پونی کی طرح سفید ہوتا تھا۔۔۔

ایسی چاندنی تھی کہ کمرے سے باہر نکلو تو لگتا تھا کسی عظیم تھیٹر کا سیٹ ہے جسے روشن کر دیا گیا ہے۔۔۔ ترشنگ کی کچی گندم کے خوشے الگ الگ نظر آتے تھے۔

"خوبصورتی کا خوف اور راما جھیل"

سلطان ہمیں الوداع کہنے آیا اور روانگی کے وقت مطلع ابر آلود تھا۔

ہم رحمان پور پل کے پار ہوئے اور جیپ ایک چوڑے راستے پر اترتی جا رہی تھی جب ہم نے دیوسائی سے اترتے تیز نالے کو دیکھا۔۔۔ صاف شفاف آسمانوں سے اترتا انہیں کے رنگ کا پانی۔۔۔ اور یہ نالہ اتر رہا تھا اور اس کے پہلو میں راستہ اٹھ رہا تھا اور چلم چوکی کے راستے دیوسائی کو جا رہا تھا۔

ہمارے سامنے ایک راستہ تھا جو دیوسائی کو جاتا تھا۔

"رحمت خان جیپ روک دو۔۔۔"

ڈرائیور نے بریک پر پاؤں رکھ دیا۔۔۔ دیوسائی کے نالے کا شور جیپ میں دندنانے لگا "بات کیا ہے صاحب؟"

"کچھ نہیں۔۔۔" میں جیپ سے اتر کر کچے راستے پر کھڑا ہو گیا اور بلند پہاڑوں پر اٹکے ہوئے آسمان کے ایک چھوٹے سے حصے کو دیکھنے لگا جو یقیناً دیوسائی کے اوپر تھا۔۔۔ میں دیوسائی سے آنے والے پانیوں کو ایک دیوانے کی طرح گھور رہا تھا۔۔۔ یہ وہاں سے آ رہے ہیں جہاں میں جانا چاہتا تھا۔۔۔ جہاں خانہ بدوشی کرنے کی غرض سے میں گھر سے نکلا تھا۔۔۔ اس بار بھی اور اس سے پچھلے برس بھی۔۔۔ اور اب راستہ میرے سامنے تھا۔۔۔ اگر میں اور میر یہاں جیپ میں سے اپنا سامان اتروا لیں تو کیا ہو گا۔۔۔ شاید شام سے پیشتر ہمیں کوئی اور جیپ چلم چوکی لے جائے۔۔۔ شاید وہاں سے ہم دیوسائی کے لئے پورٹر حاصل کر لیں۔۔۔ شاید وہاں موسم اچھا ہو اور ہمارا نازک خیمہ شب بسری کے لئے کافی ثابت ہو۔۔۔ شاید۔۔۔ یہ پانی سیدھا دیوسائی سے آ رہا ہے' نیلا ایسا نیلا کہ بے شک اس میں کپڑے نیلو نیل کر لو۔۔۔ اور یہ راستہ دیوسائی کو جا رہا

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

ہے۔۔۔ اور اگر ہم یہاں اتر جائیں تو شاید شام تک ہمیں چلم چوکی کے لئے کوئی سواری نہ ملے۔۔۔ اور شاید ہمیں کوئی پورٹر نہ ملے۔۔۔ اور شاید دیوسائی پر طوفان آیا ہوا ہو۔۔۔ شاید۔۔۔ اور اس صورت میں ہم وہاں اس مقام پر بے یارو مددگار پڑے رہیں گے اور کئی دنوں کی مشقت کے بعد گلگت واپس پہنچیں گے۔۔۔ اور اب ہم سیدھے گلگت جا رہے تھے۔۔۔ لیکن یہ راستہ دیوسائی کو جا رہا ہے۔۔۔ اور اگر میں بائیں ہاتھ مڑ جاتا ہوں تو اس سے دور ہوتا جاتا ہوں۔۔۔ شاید کبھی نہ آنے کے لئے۔

راہی پائدان پر پاؤں رکھے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ میری محبت کو سمجھتا تھا۔۔۔ سمیر اپنی پٹھانی ٹوپی کو ماتھے پر کھینچ کر دیوسائی کے نالے کو دیکھ رہا تھا۔۔۔ اور وہ بھی جانتا تھا۔ "چلیں صاحب۔۔۔" ڈرائیور نے ہم سب کو یوں چپ کھڑے دیکھ کر کہا۔۔۔ وہ نہیں جانتا تھا۔

"راہی اگر میں یہ کہوں کہ ہم اس جیپ کو یہیں چھوڑ دیں اور۔۔۔ دیوسائی کے لئے قسمت آزمائی کریں تو تم کیا کہو گے؟"

"میں بالکل تمہارے ساتھ ہوں مائی فرینڈ۔۔۔ آپ سوچ لیں۔۔۔ ویسے آپ دیوسائی کے بارے میں بہت جذباتی ہیں۔۔۔ پھر سہی۔۔۔ یہ قسمت بھی ہوتا ہے اور اگر قسمت بار بار کہے کہ نہیں جاؤ۔۔۔ تو نہیں جاؤ۔"

"اور اگر میں پھر بھی جانا چاہوں تو؟"

"میں بھی چلوں گا۔۔۔ آپ فیصلہ کر لو ہم ڈرائیور سے کہہ دیں گے کہ ہمارا سامان کھول دے اور جاپانی کو گلگت لے جائے۔۔۔"

میں تقریباً پانچ منٹ تک وہیں کھڑا رہا۔۔۔ راستے کو اوپر جاتے اور پانیوں کو نیچے آتے دیکھتا رہا۔۔۔ "ہاں۔۔۔ اگر قسمت بار بار کہے کہ نہیں جاؤ۔۔۔ تو نہیں جاؤ" میں نے سمیر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور جیپ میں بیٹھ گیا۔

جیپ دیوسائی کے نالے کے اوپر سے گذری تو میں نے اس کی طرف دیکھا نہیں۔۔۔ ونڈ سکرین کو گھورتا رہا۔۔۔ پھر بھی اس کی ٹھنڈک مجھ تک آئی۔

اور یہاں سے گریگوٹ دور نہ تھا اور وہاں دھوپ بہت تیز تھی۔ ہم رکے بغیر آگے نکل گئے اور جب وہ مقام آیا جہاں سے ایک راستہ اوپر استور کو جا رہا تھا اور نیچے استور نالے کے ساتھ ساتھ پکی سڑک بونجی کو جا رہی تھی تو ہماری جیپ استور کے لئے اونچی ہونے لگی۔۔۔ استور کی جو تصویر میرے ذہن میں تھی وہ بہت مختصر تھی۔۔۔ اونچائی پر چند عمارتیں اور ویرانی۔۔۔ لیکن استور اس تصویر سے بہت وسیع تھا۔

سڑک کے دونوں جانب سرسبز کھیت اور باغ تھے اور استور کے مرکز میں متعدد چھوٹے چھوٹے بازار تھے۔۔۔

ہم ستانے کی غرض سے ٹورسٹ کاٹج میں چلے گئے۔۔۔ اور کاٹج میں فی مربع فٹ کے حساب سے شمالی علاقہ جات میں سب سے زیادہ مکھیاں پائی جاتی ہیں۔ یا شاید اس دوپہر وہ خصوصی طور پر مجھے دیکھنے کے لئے آ گئی تھیں' اس کے باوجود یہ کاٹج غیر ملکی ٹورسٹوں کی پسندیدہ رہائش گاہ ہے۔۔۔ ویٹر نے پنکھا لگایا تو مکھیوں کی تعداد میں کم از کم پانچ فیصد کمی ہو گئی۔۔۔

ہم یہاں بیٹھے اپنے ڈرائیور کا انتظار کر رہے تھے۔۔۔ اور ڈرائیور پٹرول کی تلاش میں گیا تھا۔۔۔ یہ نہیں کہ ہمارے پاس گلگت تک کے لئے پٹرول نہیں تھا۔۔۔ گلگت تک کے لئے تھا۔۔۔ راما لیک تک جانے اور واپس استور تک آنے کے لئے نہیں تھا۔۔۔

بہت عرصہ پیشتر ایک سفر کے دوران ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ تم شمالی علاقوں میں کہاں کہاں گئے ہو۔ میں نے بتایا تو کہنے لگے "تم راما لیک تک نہیں گئے" میں نے عرض کیا کہ نہیں ابھی اتفاق نہیں ہوا۔ اس پر وہ صاحب باقاعدہ خفا ہو گئے اور بقیہ سفر کے دوران مجھ سے کلام تک نہ کیا۔۔۔

جب ہم بونجی سے آگے استور کے تنگ درہ نما راستے میں داخل ہوئے تھے اور جب ہم استور کے نیچے سے گزرے تھے تب۔۔۔ مجھے بار بار ان کا خیال آتا تھا۔۔۔ اور راما لیک کی بے پناہ خوبصورتی کے ان تذکروں کا خیال آتا تھا جو میں نے ٹورسٹ گائڈز میں پڑھ رکھے تھے۔۔۔ گھنے جنگلوں اور وسیع سبزہ زاروں میں گہری جھیل جس پر نانگا پربت کی برفیں جھکی ہوئی ہیں اور جو پاکستان کی خوبصورت ترین جھیل ہے۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور آج صبح ترشنگ سے روانگی کے فوراً بعد میں نے پہلے تو ڈرائیور کے ساتھ تعلقات خوشگوار کئے کہ۔۔۔ واہ واہ ڈرائیور تو وہ ہے جو استور روڈ پر مسافر کو جھٹکا نہ لگنے دے اور ہمیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے جیپ ایک ہی جگہ کھڑی ہے اور میں نے اپنی زندگی میں تم جیسا باکمال پہاڑی ڈرائیور کم ہی دیکھا ہے بلکہ دیکھا ہی نہیں۔۔۔ وغیرہ وغیرہ اور پھر یونہی لاپروائی سے پوچھنا شروع کر دیا کہ اچھا ہم گلگت کتنے بجے پہنچ جائیں گے؟ اگر ہم استور جا کر اوپر راما لیک تک ہو آئیں جو صرف دس بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے تو کیا اس صورت میں ہم شام سے پہلے گلگت پہنچ سکتے ہیں؟۔۔۔ ظاہر ہے عام ڈرائیور تو نہیں پہنچا سکتا اور اگر ہم راما لیک تک ہو آئیں تو سو روپیہ ٹپ تو معمولی بات ہے اور جو کتاب لکھی جائے گی اس میں نام آنا تو بہت ہی معمولی بات

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

ہے۔۔۔

ڈرائیور موم ہونے لگا۔۔۔ کتاب میں نام کے حوالے سے کم اور ٹپ کے حوالے سے ذرا زیادہ۔۔۔ "ہمیں صرف ترشنگ سے گلگت لانے کا آرڈر ہے۔۔۔ اور پھر پٹرول بھی صرف گلگت تک کا ہے اور اگر استور میں سے پٹرول مل جائے۔۔۔ اور وہاں بہت مہنگا ہوتا ہے۔۔۔ اور اگر۔۔۔"

قصہ مختصر ڈرائیور پٹرول کی تلاش میں گیا ہوا تھا اور ہم استور کے ٹورسٹ کاٹیج میں اپنی خنک چائے کو مکھیوں سے بچاتے اس کا انتظار کر رہے تھے۔۔۔

آزادی سے پیشتر گلگت اور شمالی علاقوں کو سری نگر سے جو سڑک ملاتی تھی وہ استور سے ہی گزرتی تھی۔ یہاں کے لوگ اس سڑک پر سفر کرتے ہوئے ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں کاروبار یا تعلیم کے لئے پہنچتے تھے۔ گلگت میں پہلی جیپ ۱۹۳۳ء میں اسی راستے سے آئی۔۔۔ سطح سمندر سے آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہونے کے باوجود اس دوپہر استور میں گرمی تھی اور پنکھے چل رہے تھے۔

اور بالآخر ہم نے ڈرائیور کو استور بازار میں آتے دیکھا اور اس کے ہاتھ میں جو پٹرول کین تھا اسے وہ ذرا زور لگا کر اٹھائے ہوئے تھا "مل گیا ہے۔۔۔ لیکن ذرا گندہ ہے"

ہم نے پٹرول ملاحظہ کیا تو وہ صاف ستھرے کیچڑ کے رنگ کا تھا۔۔۔ لیکن ڈرائیور نے ہمیں تسلی دی کہ یہ جیپ کو چلائے گا۔

جیپ استور بازار میں سے نکلی اور پھر اس نے اپنی بوتھی روتے ہوئے کتے کی طرح آسمان کی جانب کر لی۔۔۔ اس کی اس حرکت کے نتیجے میں ہم بھی سامنے دیکھنے کی بجائے منہ کھولے آسمان کو دیکھتے تھے اور اس طرح بیٹھے تھے جیسے دندان ساز کی کرسی پر مریض منہ چھت کی طرف کئے بیٹھتا ہے۔۔۔ اور یہ ساری کاریگری اس سڑک کی تھی جس پر ہماری جیپ چل رہی تھی۔۔۔ اور چل تو کیا رہی تھی' دھچکے کھا رہی تھی' پہلے گیئر میں ہونک رہی تھی اور اس کے ٹائروں کے گھسنے سے ربڑ کی بو فضا میں پھیل رہی تھی۔۔۔ میں نے اتنی یکدم اونچائی والی سڑک آج تک نہیں دیکھی تھی۔ ہمیں یقین نہیں آتا تھا کہ ایک عام سی جیپ ہم پانچوں سواروں سمیت کیا اس سیڑھی پر چڑھ جائے گی جسے یہاں کے لوگ سڑک کہتے ہیں۔۔۔ اور یقین کیجئے وہ بہت مشکل سے چڑھتی تھی اور ہم ہمہ وقت واپس لڑھک جانے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔۔۔ اور یہ راستہ کسی پہاڑ یا جنگل میں نہیں تھا بلکہ آبادی میں سے گزرتا تھا۔۔۔ آس پاس کھیت' فارم

اور بازار تھے۔۔۔ اس جیپ رائڈ نے ہماری ہڈیاں پسلیاں کر دیں اور پسلیاں ہڈیاں کر دیں۔۔۔ جب آبادی ختم ہوئی تو سڑک ذرا بہتر ہو گئی۔۔۔ اور درخت گھنے ہونے لگے اور ان چیڑ کے درختوں میں سے کہیں کہیں برفوں کی ٹھنڈک نظر آنے لگی۔۔۔ پھر راما کا چھوٹا سا ریسٹ ہاؤس نظر آیا۔۔۔ اور اس کے سامنے ایک اتنا ہی چھوٹا سا ہیلی پیڈ۔۔۔ راما ریسٹ ہاؤس کے بعد ہم ایک کھلی اور خنک اور وسیع کینیڈین سٹائل کی لینڈ سکیپ میں آ گئے۔۔۔ ایک پتھروں میں بہتی گلیشیئر کے سرمئی رنگ کے پانی کی ندی اس لینڈ سکیپ کی وسعت میں پھیلی ہوئی تھی۔اس کے کنارے پر ملحقہ جنگلوں سے لائے ہوئے بے شمار شہتیر تھے جنہیں ایک ٹریکٹر ٹرالی پر لادا جا رہا تھا۔۔۔ اس ندی کے پار ایک چڑھائی تھی اور ایک چھوٹی سی خنک پہاڑی تھی۔۔۔جیپ اس خنک پہاڑی پر چڑھنے لگی۔۔۔ پہلے پانی کا ایک چھوٹا سا ذخیرہ آیا' برفیلا اور نیلا اور اس کے بعد راما لیک سامنے آ گئی۔۔۔

یہ ایک ویران اور لبوتری سی جھیل تھی جس کے پس منظر میں نانگا پربت کے سلسلے کی چند برف پوش چوٹیاں اور گلیشیئر تھے لیکن اس منظر کا کچھ حصہ ایک لمبی ٹیلا نما خنک پہاڑی نے چھپا رکھا تھا جس کے نیچے گڈریوں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی۔۔۔ جو ذرا غور کرنے سے نظر میں آتی تھی۔بائیں ہاتھ پر بلند پہاڑیاں تھیں جو سردیوں میں کسی گلیشیئر کے نیچے دبی رہتی تھیں اور وہ گلیشیئر اب پگھل کر اپنے پیچھے کنکر اور پتھر بکھرے ہوئے چھوڑ گیا تھا۔

ہاں ہم تھوڑے سے مایوس ہوئے۔۔۔ شاید ہم ترشنگ' روپل اور تاپ میدان کے بعد یہاں آئے تھے اس لئے۔۔۔ یا ہم جلدی میں تھے اور ہمارا ڈرائیور جیپ کا ایکسلیٹر دبا دبا کر ہمیں خبردار کر رہا تھا کہ ابھی ہم نے واپس استور جانا ہے' اصل سفر تو ابھی وہاں سے شروع ہو گا۔۔۔ شاید اس لئے! میرا خیال ہے یہ جھیل "آئے اور دیکھ لیا" والوں کے لئے نہیں تھی۔ یہاں ویرانی اور فاصلہ تھا اور اسے جاننے کے لئے اس کا حصہ بننا یہاں شب بسر کرنا شرط تھا۔

اس جھیل میں خوبصورتی اتنی نہ تھی' خوبصورتی کا خوف بہت تھا۔۔۔ یہاں انسان ایک ڈر میں رہتا ہے اور ہمہ وقت آس پاس دیکھتا ہے کہ کہیں بلند پہاڑوں میں سے۔۔۔ برفوں میں سے۔۔۔ ٹیلوں اور پتھروں کی اوٹ سے ہمیں کوئی دیکھتا ہے۔۔۔ وہ کون ہے جو ہم پر نظر رکھتا ہے۔۔۔ یہاں ایک غیر حقیقی ماحول کا احساس ہے۔۔۔ اس جھیل کی خاموشی اور برفانی پس منظر حقیقت سے دور خیال میں لگتے ہیں۔ آپ جھیل

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

کے پانیوں کے قریب جاتے ہیں تو ایک خاص زاویے سے وہ آئینہ ہو جاتے ہیں.... ان پر اردگرد کی برفیلی بلندیاں نقش نظر آتی ہیں.... ایک اور مقام سے پوری جھیل گہرے سنہرے رنگ کے آئینے میں بدل جاتی ہے.... اگر آپ اپنے دھیان میں ہوں تو چلتے چلتے آپ جھیل کے پانی کو سبز زمین جان کر اس پر پاؤں رکھ سکتے ہیں.... شاید حقیقت سے یہی دوری آپ کے اندر خوف بھر دیتی ہے کہ یہاں کچھ ہونے والا ہے' ہم مخل ہوئے ہیں.... یہ بستی یہ جھیل کسی اور کے قبضے میں ہے....

راما ایک جس خنک ٹیلے کے پیچھے پوشیدہ ہے ہم اسے عبور کر کے ندی کے کنارے جنگل میں آئے تو ہم نے بہت بہتر محسوس کیا.... ہم خوش تھے کہ ہم نے راما جھیل دیکھ لی ہے.... اور ہم خوش تھے کہ ہم اس کی گرفت میں سے نکل آئے ہیں....

"دھندلاتی ہوئی' ایک خیال میں........ نانگا پربت"

استور واپسی پر جیپ نے اپنی بوتھی ہڈیاں تلاش کرنے والے کتے کی طرح زمین کے ساتھ لگا دی اور اگر ہم اپنے آپ کو قائم نہ رکھیں تو بآسانی ونڈ شیلڈ میں سے لڑھک کر اپنی ہی جیپ کے آگے آ سکتے ہیں.... استور' راما جھیل روڈ کی اترائی' چڑھائی سے بھی زیادہ ناقابل یقین تھی.... استور بازار سے گزر کر ہم دو کلومیٹر نیچے استور نالے تک آئے اور پھر اس کے ساتھ ساتھ سفر کرنے لگے.... تھوڑی دیر میں نالہ نظر سے گم ہوا اور ہم استور روڈ کی بھول بھلیوں میں گمشدہ بچوں کی طرح کھو گئے.... وہی درہ نما تنگی' خنکی' کچا راستہ اور چٹانوں کے ایک طویل غار جس میں آپ جا رہے ہیں اور آہستہ آہستہ سمت کا اندازہ ختم ہو جاتا ہے.... اور یہ احساس بھی ختم ہو جاتا ہے کہ آپ کہاں سے آ رہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں.... بس ایک سفر ہے.... ایک موڑ کے بعد سڑک دور تک بل کھاتی نظر آ رہی تھی.... اور وہاں ہم سے تقریباً سو میٹر کے فاصلے پر سڑک کے اوپر ایک کچا اور بھربھری چٹان میں سے دھول کا ایک چھوٹا سا بادل نمودار ہوا اور نیچے آنے لگا.... ڈرائیور نے جیپ روکی تو وہ دھول سڑک پر اتر رہی تھی اور اس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کنکر نیچے آ رہے تھے' ان کے علاوہ ایک آدھ پتھر بھی تیزی سے گرتا ہوا سڑک پر آتا اور نالے میں چلا جاتا.... دھول کا پھیلاؤ بڑھتا جا رہا تھا.... ڈرائیور جیپ سے اتر کر اس بادل کے قریب گیا' چند لمحوں کے لئے اوپر دیکھتا رہا اور پھر واپس آ گیا۔

"صاحب ادھر ابھی سلائیڈ ہونے والا ہے.... اگر ہو گیا تو ہم آگے نہیں جا سکیں گے' رات ادھر ہو گی.... شاید سڑک بند ہو جائے...."

"پھر؟"

"جس طرح اوپر سے کنکر آ رہا ہے ہمارا تجربہ ہے کہ سلائیڈ تھوڑی دیر بعد نیچے

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

آئے گی ابھی اوپر وہ مٹی اور پتھر ہل رہا ہے جو نیچے آئے گا۔۔۔ آپ پسند کرو تو ہم گذر جائیں؟"

"کیا ہمارے گذرتے وقت اوپر سے سلائیڈ آ سکتی ہے؟"

"آ تو سکتی ہے۔۔۔ تو آپ فوراً بولو دیر ہو رہی ہے"

"تم کیا کہتے ہو۔۔۔"

"ہم تو کہتے ہیں چلو اللہ کا نام لے کے۔۔۔"

"تو چلو۔۔۔"

سمیر نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔۔۔ "آپ فکر نہ کرو ابو۔۔۔"

جیپ کی لائٹس آن تھیں۔۔۔ ہم سڑک کے اس حصے میں سے گذرنے لگے جس پر دھول اتری ہوئی تھی۔۔۔ اوپر سے گرنے والے کنکر جیپ کے بانٹ پر اولوں کی طرح گرتے ہوئے شور کر رہے تھے۔۔۔ ہم نے تھوڑی دیر دھول کو برداشت کیا پھر ہم سانس نہ لے سکے اور کھانسنے لگے۔۔۔ ڈرائیور کو سڑک نظر نہیں آ رہی تھی اور وہ صرف اپنے تجربے کی بنا پر گرنے سے بچ رہا تھا۔ یوں بھی سڑک پر اوپر سے خاصی مٹی آ چکی تھی اور اس میں ٹائر پھنس جانے کا خطرہ بھی تھا۔۔۔ اور یہ صورت حال تباہ کن ثابت ہو سکتی تھی کہ آپ ایک لینڈ سلائیڈ کے عین نیچے جیپ میں بیٹھے ہوئے ہیں اور باہر بھی نہیں نکل سکتے۔۔۔

دھول کے اس بادل میں سے نکل کر جب ہم تازہ ہوا اور صاف سڑک پر آئے تو سب لوگ کھانس رہے تھے۔۔۔

شاید اس خوفناک تجربے کا اثر زائل کرنے کے لئے۔۔۔ مشکل علاقے کی اس لینڈ سلائیڈ کے بعد استور روڈ پر اس پچھلے پہر جب روڈ پر صرف ہماری جیپ تھی اس روڈ پر اتنے چکور ہمارے سامنے آئے کہ ان کا شمار ممکن نہ تھا۔۔۔ اور جیپ کے آگے آگے جیسے ہمیں خوش کرنے کو پرواز کرتے تھے۔۔۔ پھر استور نالے پر ٹکڑیوں کی صورت میں اڑتے تھے۔۔۔ اور پھر ہمیں ایسا لگا جیسے ہم کہیں نہیں جا رہے' یہ سفر نہیں ہے بلکہ ایک کھیل ہے جس میں ہم جیپ میں سوار بے شمار چکوروں کا پیچھا کر رہے ہیں اور وہ ہم سے کھیل رہے ہیں۔۔۔ راہی' جاپانی' سمیر اور میں۔۔۔ ہم سب ہنس رہے تھے اور مشکن لینڈ سلائیڈ کو بھول چکے تھے۔۔۔ اور ہماری آنکھیں صرف چکوروں پر تھیں۔۔۔

روڈ ٹو استور از فل آف چکورز۔۔۔ نو پرابلم۔

اور پھر ڈھلتی دھوپ میں ہمیں اپنے سامنے ایک دروازہ نظر آیا جو باہر کی دنیا میں کھلتا تھا۔۔۔ استور کے بورڈ کے سامنے پل تھا۔ ہم اس پل پر گئے تو استور روڈ سے ہمارا رابطہ ختم ہو گیا۔ منظر وسیع ہو رہا تھا۔ استور نالہ دریائے سندھ میں اندر تک جاتا تھا ایک گہرے اور خاموش ملاپ کے لئے۔۔۔

ہم استور کے درے سے باہر آ چکے تھے۔۔۔ جیپ میں زیادہ روشنی تھی' زیادہ ہوا تھی اور زیادہ آسمان تھا۔۔۔ بونجی زیادہ دور نہ تھا۔۔۔ اور اس سے پرے گلگت تھا۔

اور پھر ہم ایک بہت ہی وسیع لینڈ سکیپ میں مختصر ہوتے چلے گئے۔۔۔

ہماری حیثیت کم ہوتی چلی گئی اور پھر جیسے ایک چیونٹی جو ہماری جیپ تھی کسی بے انت ویرانے میں رینگ رہی تھی۔۔۔ آخر میں قراقرم بلند تھے۔۔۔ اتنے زیادہ بلند کہ وہ ایک دو دفعہ دیکھنے سے نظر نہیں آتے تھے۔۔۔ انہی بلندیوں میں شاہراہ ریشم کا فیتہ تھا اور اس کے نیچے سندھ تھا۔۔۔ یہاں ہوا بلا روک ٹوک چلتی تھی اور پوری لینڈ سکیپ میں شور بھرتی تھی۔۔۔

کسی نے ڈرائیور کو رکنے کے لئے کہا تھا۔۔۔ ہم باہر آ گئے۔۔۔ جیپ کا رخ بونجی کی طرف تھا۔۔۔ لیکن ہم ادھر سے آئے تھے' خشک چٹانوں کی اس عظیم اور دہشت ناک دیوار میں سے جن کے اندر ایک راستہ تھا جو تاریک چٹانوں کے اندر ہی اندر استور تک جاتا تھا' ترشنگ تک جاتا تھا۔۔۔ ہم اس دنیا سے باہر آ چکے تھے۔

جیپ اس وسیع اور ویران لینڈ سکیپ میں ایک چوڑے اور ہموار کچے راستے پر کھڑی ہے۔۔۔ راستے کے کنارے پر جاپانی اور راہی کھڑے ہیں۔۔۔ سمیر ان کے درمیان میں ہے اور یہ تینوں ویرانے کی وسعت سے پرے' خشک پہاڑوں کے پار بادلوں میں گم ہوتی ان برفوں کو دیکھ رہے ہیں جن کا نام نانگا پربت ہے۔۔۔ وہ یہاں سے بہت دور ہیں اور ان کی شباہت دھندلی ہے۔۔۔ راہی اور جاپانی اسے اپنے کیمروں کے لینز میں دیکھ رہے ہیں اور نانگا پربت کی اس آخری جھلک کی تصویر اتار رہے ہیں۔۔۔ اور سمیر اسے صرف اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔۔۔ اور میں ان سے کچھ فاصلے پر کھڑا انہیں اور نانگا پربت کو دیکھ رہا ہوں۔۔۔ اب تو وہ بہت دور ہے' ہماری پہنچ سے باہر۔۔۔ دھندلاتی ہوئی۔۔۔ ایک خیال میں۔۔۔ لیکن اس کے نیچے کہیں ترشنگ تھا۔۔۔ وادی روپل تھی اور ٹاپ میدان تھا۔۔۔

"نانگا پربت کی چوٹی کے اوپر تک برف پگھل چکی ہے اور ٹاپ میدان بالکل سرسبز ہو چکا ہے۔ یہاں ہر جانب پھول ہی پھول ہیں اور کئی جگہوں پر لگتا ہے کہ ہم

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

کسی کے پھولوں بھرے جھونپڑے میں آ نکلتے ہیں۔ یاک کے نیم جنگلی ریوڑ اس رومانوی' وحشی' پیالہ نما' بلند وادی میں گھومتے ہیں اور مریل گھوڑے شدید سردی کے ستائے ہوئے یہاں گھاس چرنے آ جاتے ہیں۔ ٹاپ میدان ایک چراگاہ ہے اور بالکل ہموار ہے.... ہمارے عین اوپر نانگا پربت کا روپل چہرہ ہے جو قدموں سے چوٹی تک ساڑھے چار ہزار میٹر بلند ہوتا ہے.... دھند ٹاپ میدان پر جھکی رہتی ہے اور اکثر بوندا باندی ہوتی رہتی ہے...."

"ہم نے یہیں سے ٹاپ میدان کی پہلی جھلک دیکھی۔

ٹاپ میدان وسط ایشیا کی ایک عظیم چراگاہ کی طرح تھا۔ اس کے وسیع سبزہ زار میں ایک دریا بہتا تھا اور زمین کے ساتھ لگ کر بہتا تھا اور اس میں چھوٹے نالے اور نالیاں شامل ہوتے تھے.... زمین پانی کی بہتات کی وجہ سے اسفنج کی طرح نرم تھی اور اس میں لمبی لمبی گھاس اگ رہی تھی۔ دریا کے پار' پورے ٹاپ میدان پر سایہ فگن نانگا پربت کا سفید قہر تھا.... اس کی چٹانیں' اس کی برفیں اور اس کی بلندیاں تھیں اور ان پر دھند تھی.... گھاس کے وسیع قطعات میں مویشی چر رہے تھے۔ اور ٹاپ میدان کا یہ منظر ہزاروں برسوں سے ایسا ہی تھا.... اور شاید ۱۹۸۹ء میں ہم وہاں نہیں تھے ہم کسی اور زمانے کے مسافر تھے جو کسی کارواں کے ہمراہ یہاں پہنچے تھے۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ یہ جگہ موجود ہے۔ یہ ہماری منزل نہ تھی بلکہ اسے دیکھتے ہوئے ہمیں یقین تھا کہ ہم دوبارہ یہاں نہیں آئیں گے کیونکہ ایسی جگہیں صرف ایک بار دکھائی دیتی ہیں اور پھر کہیں اور منتقل ہو جاتی ہیں...."

تیسرا سفر

۱ - ہوشے۔ ۹۲ کلومیٹر (جھیل کچورا۔ جھیل صدپارہ۔ وادئ خپلو۔ وادئ ہوشے) ۲۳۱

۲ - وادئ شگر ۳۷۱

۳ - دیوسائی اے دیوسائی ۳۸۵

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

ہوشے ۴۳ کلومیٹر

(جھیل کچورا۔ جھیل صدپارہ۔ وادی خپلو' وادی ہوشے)

ایک کوہستانی راستہ تھا۔ اس پر ایک ویگن دھول اڑاتی اس جانب جھکتی جاتی تھی جس جانب نیچے بہت نیچے شیوک تھا اور دریائے شیوک میں اوپر سے کنکر گرتے تھے جو ویگن کے ٹائروں تلے آ کر تیروں کی طرح تیزی سے نکلتے تھے اور ویگن میں وادی خپلو کو جانے والے سوار تھے... اور تیز دھوپ میں ویگن کے جھٹکوں کو دانتوں تلے ہونٹ دبا کر برداشت کرنے کی کوشش میں مجھے شیوک پر ایک پل نظر آیا اور اس پل کے ساتھ کچے راستے کے کنارے سال خوردہ لکڑی کے ایک تختے پر "ہوشے۔ ۴۳ کلومیٹر" لکھا نظر آیا... اور ہم بہت آگے جا چکے تھے... لیکن یہ "ہوشے۔ ۴۳ کلومیٹر" کا ڈبا کہیں فیڈ ہو گیا...

اس برس میں بلتستان کے سفر کے بعد فیبری میڈو گیا... پھر لاہور واپس آیا اور ایک معزز شہری کی طرح' ایک معزز بیل کی طرح زندگی کے کنویں میں سے رزق کا پانی نکالنے کے لئے آنکھوں پر کھوپے چڑھائے سر جھکائے زور لگاتا ایک دائرے میں چلنے لگا... اور اس دائرے میں چلتے چلتے جہاں مجھے دیوسائی میدان کی برفیں پگھلتی دکھائی دیتیں اور ان میں سے تیز و تند اور نیل گھلے سرد پانیوں کے نالے نیچے اترتے نظر آتے' ادھر استور سے آگے گریکوٹ کے ساتھ جہاں سے ایک راستہ نالے کے ساتھ اوپر چلم چوکی کو جا رہا تھا' دیوسائی کے میدانوں کو جا رہا تھا... تو اس کے ساتھ کبھی کبھی مجھے "ہوشے۔ ۴۳ کلومیٹر" کا بورڈ بھی نظر آ جاتا.... لیکن یہ ہوشے ہے کیا؟" مجھے کچھ معلوم نہ تھا... لیکن مجھ میں یہ خرابی تھی کہ وہاں پل کے پار ایک ویران کوہستانی راستہ کہیں جا رہا تھا اور وہ ہوشے جا رہا تھا۔ اور ہوشے پتہ نہیں کیا تھا تو مجھے جاننا چاہئے تھا کہ وہ کیا ہے' کہاں ہے... کیا میرے لئے بھی ہے...؟

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

پھر کسی نے بتایا کہ ہوشے مشہور برفپوش چوٹی مشہ بروم کے دامن میں واقع ایک چھوٹا سا گاؤں ہے اور وہاں صرف کوہ پیما اور ٹریکر حضرات ہی پہنچ سکتے ہیں.... اور ہوشے کے لوگ صدیوں سے بلندیوں پر الگ تھلگ ہیں اور وہ بہت سادہ ہیں اور پیار کرنے والے ہیں.... اور سادہ اتنے ہیں کہ اسی وادی کے ایک گاؤں میں چند حضرات نے آکر اعلان کیا کہ قیامت تو اگلے جمعہ کو آ رہی ہے ابھی ابھی اطلاع آئی ہے اس لئے آپ لوگ جو کچھ آپ کے پاس ہے ہمیں عنایت کر دیں تاکہ ہم اسے محفوظ کر لیں.... تو وادئ ہوشے کے ان سادہ دل بندوں نے جو کچھ ان کے پاس تھا قیامت کی اطلاع دینے والے ان نیک حضرات کے سپرد کر دیا اور خود بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے لگے.... تو ان بندوں کو دیکھنا بہت ضروری تھا۔

میں ایک مرتبہ پھر سکردو میں تھا.... اس ہوا میں تھا جو سکردو کی وادی میں دیوسائی میدانوں سے اترتی تھی۔ سیاچین سے آتی تھی، بیافو اور بالتورو کی ٹھنڈک سے آتی تھی اور سندھ کی وسیع گزرگاہ پر پھیلتی تھی اور یہ ہوا اتنی شفاف اور سروبوسوں ایسی تھی کہ یہ بدن پر ننگے پاؤں چلتی تھی اور زندگی ہی زندگی تھی.... اور اس مرتبہ میرے ساتھ سلجوق، میر، عینی اور میمونہ بھی تھے کہ یہ ان کا "سال" تھا— میرے اور میرے خاندان کے مابین ایک معاہدہ طے پا چکا تھا جس کی رو سے گرمیوں میں ایک برس تو میں اپنی من مرضی سے شمالی علاقے کے پہاڑوں میں دھکے کھا سکتا تھا لیکن دوسرے برس مجھے اہل خانہ کو بھی اس جنگل خواری میں شریک کرنا ہوتا تھا۔ اور یہ ان کا "سال" تھا۔ بلتستان میرے لئے اجنبی نہ تھا.... لیکن پچھلی بار وادی شگر سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ دیوسائی میدانوں تک رسائی نہیں ہو سکی تھی اور .... کہیں "ہوشے - ۳ کلومیٹر" کا بورڈ بھی آویزاں تھا....

سکردو ایئرپورٹ کی ریتلی وسعت میں جہاز رکا....

ایئرپورٹ سے باہر آئے اور بیس کلومیٹر دور سکردو شہر کے لئے کسی سواری کے لئے نظریں دوڑائیں تو نظروں کے سامنے خواجہ مہرداد کا مہرباں چہرہ آگیا جو حسب معمول کسی رشتے دار، دوست یا مہمان کو وصول کرنے کے لئے تیوڑی چڑھائے باہر آنے والے مسافروں کو بڑی ناگواری سے دیکھ رہے تھے، ہمیں دیکھا تو کچھ دیر اپنی ناگواری برقرار رکھی پھر قدرے مسکرا کر کہنے لگے "آپ نے تو شائد ابھی چند روز بعد آنا تھا اور کار پر آنا تھا—"

میں نے عرض کیا کہ آنا کار پر تھا بلکہ کار پر ہی آ رہے تھے کہ گوجرانوالہ کے

نواح میں کار کا وہیل بیلنس خراب ہو گیا اس لئے جہاز پر آنا پڑا....

"اچھا—" انہوں نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا "اب ہمارا بینک بیلنس خراب ہو جائے گا.... آپ جو آ گئے ہیں.... ویسے آپ کے لئے ایک آرامدہ کمرہ بالتورو ریسٹ ہاؤس میں بک ہو چکا ہے اور انہوں نے کروایا ہے.... ان سے ملئے"

ہم ان سے ملے.... اور یہ ایک صحت مند گورے چٹے چھوٹے خوبصورت ہاتھوں والے گڈا نما شخص تھے...." یہ وزیر قلب علی ہیں.... کھاپلو کے انجینئر ہیں...."

"جناب السلام و علیکم...." قلب صاحب نے اپنا پیارا سا ہاتھ آگے بڑھا دیا "بوہت خوشی ہوئی.... آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو ہم آپ کے بھائی ہیں، مسلمان بھائی ہیں...." قلب علی یہ پیشکش اپنے قلب سے ہی کر رہے تھے یہ ہم نے بھی محسوس کیا۔

اس دوران ایک درمیانے قد کے بڑے اکڑوں اور سمارٹ سے میجر صاحب کھٹ سے میرے قریب آئے اور کاشن دینے کے انداز میں زور سے کہنے لگے "سر...."

میں نے کہا، "جی فرمائیے"

انہوں نے ایک مرتبہ پھر دروازہ یکدم زور سے بند کرنے کے انداز میں کہا "سر"

میں اس بار چپ رہا تو کہنے لگے "سر تارڑ صاحب.... میرا نام میجر جمیل عباسی ہے سر.... ایئرپورٹ پر اپنے سی ون تھرٹی جہاز کو دیکھنے آیا تھا، یہاں سپلائی ڈپو کا انچارج ہوں میرے لائق کوئی خدمت..."

میں نے بتایا کہ فی الحال خواجہ صاحب اور وزیر صاحب میری خدمت کر رہے ہیں اور مجھے مزید خدمت گزاروں کی ضرورت نہیں....

"سر—" میجر عباسی نے سر جھٹک کر کہا، اپنا رخ بدلا اور میری بیگم کو ایک زور دار "سر" کہنے کے بعد اس کے ساتھ محو گفتگو ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد بیگم میرے پاس آئیں اور کہنے لگیں "یہ میجر عباسی تو بہت ہی نائس چیز ہیں۔ کہتے ہیں کہ میرے بال بچے ایک شادی کے سلسلے میں ایبٹ آباد گئے ہوئے ہیں میرا گھر خالی پڑا ہے آپ لوگ پلیز میرے گھر میں قیام کریں۔"

"ابھی تیس سیکنڈ پہلے ملاقات ہوئی ہے اور ہم دندناتے ہوئے پورا خاندان ان

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

کے گھر میں قیام پذیر ہو جائیں ؟...." میں نے غصے سے کہا" پتہ نہیں کس قسم کے فوجی ہیں.... اور یہ بالکل مناسب نہیں "

"اتنے بے وقوف قسم کے فینوں کے ساتھ آپ گذارہ کر لیتے ہیں یہ بے چارہ تو بہت نائس قسم کا فین ہے۔"

میں نے بے چارے فین کی طرف دیکھا تو وہ بچوں کے ساتھ گپ لگا رہا تھا اور بچوں کے قہقہوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ کافی فرینک ہو چکا ہے۔

چنانچہ .... اس صبح سکردو جاتے ہوئے ہم تھوڑی دیر کے لئے میجر صاحب کے خالی گھر میں رکے.... یہ ایک خاص قسم کا بلتی سرکاری گھر تھا جس کے صحن سے برفپوش پہاڑ نظر آتے تھے اور اس کی دیواروں کے ساتھ خوبانی کی بھری ہوئی شاخیں جھکی ہوئی تھیں....

"سوری میجر صاحب لیکن ہم ریسٹ ہاؤس میں ہی قیام کریں گے...."

"سر---" میجر صاحب نے فوراً کہا اور پیچھے ہو گئے۔

اس دوپہر ہم خواجہ مرداد کے باغ نما گھر میں کھانے کے لئے مدعو تھے.... سکردو کی وہ ٹھنڈک والی خوش چلن ہوا جو جھیل صدپارہ کی جانب سے آتی تھی اور اس ہوا میں ایک رہائش گاہ جو تختہ در تختہ نیچے جاتی تھی.... ایک تختے پر بادام اور خوبانیوں کا ایک مختصر باغ' اس کے نیچے ٹماٹروں کے پودے' ایک تختے میں کھیروں اور خربوزوں کی بیلیں اور ان کے آس پاس پھولوں کی کیاریاں اور ذرا جنگلی گھاس اور ایک سرد پانیوں کی چھوٹی سی نہر.... میں نے خواجہ صاحب کو مسلسل حسد کی نگاہوں سے دیکھا....

ہم بالتورو ریسٹ ہاؤس میں واپس آئے تو میجر عباسی بھی نازل ہو گئے "سر.... میں نے آپ سے پوچھے بغیر جھیل کچورا کے کنارے آرمی ہٹ میں آپ کے لے دو کمرے ریزرو کروا لئے ہیں.... آپ ذرا چل کر دیکھ لیجئے اگر پسند آ جائے تو ٹھیک ہے ورنہ سکردو واپس آ جایئے گا...."

مجھے معلوم تھا کہ جھیل کچورا جا کر واپس کون آتا ہے....

ہم عباسی کی آرام دہ فوجی جیپ میں بازار جانب اترے تو سامنے "کے ٹو موٹل" کا بورڈ نظر آ گیا.... "عباسی صاحب ذرا اوپر چلئے"

عباسی نے جیپ موڑ کر اس راستے پر ڈال لی جو ہماری نظروں کے سامنے سیدھا ہو رہا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے جیپ چڑھے گی نہیں بلکہ پچھلے پاؤں اترنے لگے گی....

اوپر دریائے سندھ کو جھانکتی ہوئی ایک بلندی تھی جہاں سے وادیء سکردو کا پھیلاؤ وسیع ہوتا دکھائی دیتا تھا' وہاں کے ٹو موٹل کی عمارت تھی....

اس موٹل میں دنیا کے چار کونوں سے خواہشیں اور حسرتیں آتی ہیں.... ان بلندیوں اور برفانی ویرانوں اور چٹانوں اور چوٹیوں کو دیکھتی ہیں جن پر وہ اپنے نقش پا ثبت کرنا چاہتی ہیں.... یہاں سے ہر برس بے شمار مہم جو اور کوہ نورد نکلتے ہیں.... اور کچھ بڑھی ہوئی داڑھیوں اور جلی ہوئی رنگت اور برفوں کی ٹھنڈک سے جلے ہوئے چہرے لے کر واپس آتے ہیں تو ان کی خواہشیں پوری ہو چکی ہوتی ہیں' وہ دنیا کی کسی عظیم چوٹی کو زیر کر کے آتے ہیں' کسی طویل ترین گلیشیئر کا سفر مکمل کر کے لوٹ آتے ہیں--- اور کبھی کسی ہیلی کاپٹر میں ان کی لاشیں آتی ہیں.... اور کبھی نہیں بھی آتیں کہ وہ برفوں کی کئی کلومیٹر گہرائی کے اندر گرتے ہیں اور وہیں منجمد ہو جاتے ہیں.... اور کئی بار کئی برسوں کے بعد برفیں پگھلتی ہیں تو یہ مردہ کوہ پیما دکھائی دینے لگتے ہیں.... کے ٹو موٹل میں خواہشیں اور حسرتیں آتی ہیں.... یہاں شائد دنیا کے عظیم ترین کوہ پیما اور مہم جو آتے ہیں.... اس کا ماحول مہماتی ہے.... اس کے سبزہ زار میں خیمے نصب ہوتے ہیں اور کسی نہ کسی مہم کا سامان بڑے بڑے نیلے ڈرموں میں پیک ہو رہا ہوتا ہے.... اس کے برآمدوں میں اور ڈائننگ روم میں جو گفتگو ہوتی ہے وہ صرف پہاڑوں اور ان پر جاتی مہموں کے بارے میں ہوتی ہے... کون کہاں جا رہا ہے۔ راستہ کونسا ہے اور کون کہاں گیا اور لوٹ کر نہیں آیا.... اس کے سٹنگ روم کی دیواروں پر ۱۹۸۳ء سے اب تک جتنی مہمات یہاں سے پہاڑوں میں گئی ہیں ان سب کے کارڈ نقشے اور تصویریں چسپاں ہیں.... یہاں پر میسنر کا ایک کارڈ بھی موجود ہے جس پر اس کے دستخط ہیں .... ایک خاتون کوہ پیما کا یہ شکوہ بھی درج ہے کہ میں کے ٹو کی چوٹی پر اس لئے نہیں جا سکی کہ کوئی بھی ٹیکسی مجھے وہاں لے جانے کے لئے تیار نہیں ہوئی ....

کے ٹو موٹل مہمات کا عجائب گھر ہے.... اور میں وہاں اس لئے جا رہا تھا کہ مجھے وہاں سلمان رشید جیسے عجیب و غریب شخص سے ملاقات کی امید تھی.... سلمان نے ایک عظیم ٹریکنگ مہم کا جو منصوبہ بنایا تھا اور وہ لاہور میں اکثر میرے کان کھاتا رہتا تھا کہ بھائی جان میں ایک خچر خریدوں گا' اس کے ساتھ دوستی کروں گا اور پھر میں گوجر خانہ بدوشوں کے کسی ایسے قافلے کے ساتھ شامل ہو جاؤں گا جو کیل آزاد کشمیر کے راستے دیوسائی کے میدانوں کو جاتے ہیں اور وہاں سے خوردوپن گلیشیئر اور بیافو گلیشیئر اور پھر وادیء شمشال .... اور تین ماہ کی اس خانہ بدوشی کے بعد میں انگریزی

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

میں ایک کتاب لکھوں گا جو یورپ میں شائع ہو گی اور پھر..... سلمان ایک باتونی بے چین اور بے بس شخص تھا... اس کے اندر کوئی غیر مرئی طاقت تھی جو اسے بے بس کرتی تھی... اس میں کوئی گمشدہ روح تھی کسی جنگلی انسان کی جو راستہ بھول کر آبادی میں آ گیا تھا اور واپس جانا چاہتا تھا...

سلمان رشید اپنے تازہ استرا شدہ سر کی گولائی پر ہاتھ پھیرتا' اس کے لمس سے لطف اندوز ہوتا کے ٹو موٹل سے باہر نکل رہا تھا جب اس نے مجھے دیکھا اور ایک پرمسرت لہجے میں چیخا... "او بھائی جان..." میرے پاس کہانیاں ہیں..."

"فی الحال ہمارے ساتھ جیپ میں بیٹھ جاؤ ہم کچورا جا رہے ہیں' راستے میں کہانیاں سنیں گے..."

بھائی جان شبنم بھی آئی ہوئی ہے سکردو... مجھے ملنے کے لیے"

شبنم ایک اور بے بس روح ہے اور سلمان کی بیوی ہے...

"اسے بھی ساتھ لے آؤ..."

ہم کچورا جا رہے تھے اور سلمان اپنی کہانیاں بیان کر رہا تھا... ہم کچورا کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے اور سلمان اپنی کہانیاں بیان کر رہا تھا... "بھائی جان میں درہ بابو سر کو عبور کر کے چلاس کے راستے استور پہنچا اور پھر دیوسائی کراس کرنے کے لئے چلم چوکی تک آیا... لوگوں نے کہا دیو سائی پر تیس تیس فٹ برف ہے یعنی جون کی ۲۶ تاریخ کو اور چھور پاس پر تو کوڑ فٹ برف ہے لیکن میں اپنے دو عدد پورٹرز کے ساتھ چل پڑا... دیو سائی بالکل صاف تھا بھائی جان... البتہ پانی بہت تھا۔ مجھے پانچ ندیاں عبور کرنا پڑیں اس طرح کہ میں ان کے کنارے کنارے چلتا ان کے منبعوں تک پہنچا اور سے دوسری جانب آیا۔ وہ کراسنگ جس میں دو دن لگتے تھے اس میں چھ دن لگے... دیو سائی ایک ایسا وسیع و عریض بیابان ہے بھائی جان کہ جو انسان کے رومانوی کو جگانے کے ساتھ ساتھ ایک عجیب اور گہرے خوف کا احساس بھی دلاتا ہے۔ ان چھ دنوں میں میں نے اپنے پورٹرز کی شکل کے سوا اور کوئی انسانی چہرہ نہیں دیکھا... ابھی تک پھول نہیں کھلے تھے' صرف چھ قسم کے پھول دیکھے... اب میں وادی ء شمشال کے پورٹرز کا بندوبست کر رہا ہوں جو مجھے بیافو اور برالدو کے راستے سیدھا شمشال پہنچا دیں... بھائی جان میرے ساتھ شمشال چلیں..."

سلمان اپنی کہانیاں بیان کرتا رہا... شبنم اسے ڈبڈباتی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

آرمی ہٹ کے سامنے ایک سرسبز لان تھا' ذرا نیچے جھیل تھی اور اس میں دو کشتیاں ساکن کھڑی تھیں اور سامنے شنگریلا ہوٹل کی تبتی عمارت تھی اور اس کا سرخ عکس پانی میں ٹھہرا ہوا تھا اور جب یہ سب کچھ تھا تو شام ہو رہی تھی...

جھیل کچورا کے کنارے اگلے دو روز ایک آئیڈیل ہالیڈے کے طور پر گزرے... بچے پیڈل بوٹ میں سوار ہو کر جھیل کے درمیان میں چلے جاتے اور کشتی کے کناروں پر ٹھوڑیاں ٹکائے پانی کی ٹھہری اور شیشہ گہرائی میں اگے ہوئے پودوں کو حرکت کرتے دیکھتے رہتے اور ان میں تیرتی ٹراؤٹ مچھلیوں کو سبز کائی میں گم ہوتے دیکھتے... میں اور میمونہ کنارے کے ساتھ بندھی ایک کشتی میں بیٹھے رہتے اور وہ باتیں کرتے رہتے جن کے لئے میدانوں میں ہمارے پاس وقت نہ تھا۔ جھیل کے پانی ہمارے سامنے رنگ بدلتے رہتے... ایک شام شنگریلا کے عارف اسلم نے ہمیں اپنے ریستوران میں کھانے کے لے مدعو کیا... اور اگلی صبح پھولوں سے سجا ہوا تازہ سرخ اور بادامی چیریوں کا ایک بھرا ہوا تھال بھیجا... یہ سکردو میں موسم کی آخری چیریاں تھیں۔

ہماری ایک دوپہر کچورا گاؤں سے پرے خوبانی کے باغوں کے اختتام پر واقع اپر کچورا جھیل کے کنارے گزری... جھیل کے پانی جیسے تھے ہی نہیں اور ان کی جگہ ایک شفاف سا پردہ تھا جس میں سے بڑے بڑے پتھر اور درختوں کے تنے نظر آتے تھے... اتنے شفاف پانیوں کو دیکھ کر ہم نہ رہ سکے اور کنارے کے درختوں کے سہارے پانی میں اتر کر اس کی خنکی سے اپنے شہری بدنوں کو آشنا کیا اور کپکپایا... میں نے بچوں کو اس صبح کے بارے میں بتایا جب ہم پہلی بار ادھر آئے تھے اور سینکڑوں مچھلیاں سطح آب سے نمودار ہو کر اس پر گرتی تھیں اور ان کے گرنے سے جو دائرے پھیلتے تھے تو کناروں تک آتے تھے... ہاں اس بار یہ محسوس ہوا کہ کچورا گاؤں اور اس کے آس پاس کے بچے اور عورتیں سیاحوں کی کثرت کی وجہ سے بھکاری ہو چکے ہیں اور اکثر بچے تہذیب کی حدوں کو پار کر کے سیاحوں کا پیچھا کرتے ہیں... اپر کچورا کے راستے میں ہر ہتھیلی پھیلی ہوئی نظر آئی اور افسوس اس لئے ہوا کہ بلتی بنیادی طور پر بے حد سادہ اور پر وقار لوگ ہیں... جھیل سے واپسی پر بارش شروع ہو گئی اور ہم بھیگتے ہوئے آرمی ہٹ میں داخل ہوئے...

اسی آرمی ہٹ کے ایک کمرے میں ایک تحصیل دار صاحب فروکش تھے'

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

راولپنڈی سے مجبوراً کسی سرکاری کام سے ادھر آئے تھے۔ سانس کے مریض تھے اور ہم نے انہیں جب بھی دیکھا ایک سٹول پر چڑھ کر شہتوت کے گھنے پتوں میں سر چھپائے پھل فروٹ کھاتے دیکھا... وہ بہت دیر تک کسی سفید اور رسیلے شہتوت کو باقاعدہ آہیں بھرتے ہوئے دیکھتے رہتے اور پھر یکدم اسے انگلیوں میں دبوچ کر نوش کر جاتے... ایک روز پنڈی واپسی کے لئے ایئرپورٹ گئے' وہاں معلوم ہوا کہ جہاز آیا تھا لیکن موسم کی خرابی کی وجہ سے وادی کاغان سے ہی واپس چلا گیا ہے چنانچہ واپس آ گئے اور جیپ سے اتر کر سیدھے شہتوت کے درخت کے پاس گئے' سٹول پر چڑھے اور شہتوت کھانے میں مشغول ہو گئے۔

کچورا گاؤں سے اوپر ایک کچا جیپ ٹریک وادی سوکھ کو جاتا ہے... اور وہاں ایک پہاڑی نالے کے کنارے ایک چھوٹی سی کوہستانی بستی ہے... ایک خوبصورت گاؤں جہاں بہت کم لوگ جاتے ہیں... ہم نے کچھ لمحے وہاں بھی گذارے۔

ان دو دنوں میں جھیل کچورا نے ہم پانچوں کی وہ بے چینی چھین لی جو ہم شہروں سے لائے تھے۔ اس تناؤ کو ختم کیا جو میکانکی زندگی کا تحفہ تھا اور پھر ہمیں اس کی جگہ نیلا شفاف سکون دیا اور پانیوں پر درختوں کے سبزے کا ٹھہراؤ دیا...

اور پھر ہم ایک جھیل کے کنارے سے اٹھے تو دوسری جھیل کے قریب پڑاؤ ڈال لیا... اور یہ جھیل صدپارہ تھی۔ سکردو سے تقریباً دس کلومیٹر کی دوری پر... اس راستے پر جس پر سفر جاری رہے تو جھیل کے بعد صدپارہ گاؤں آتا ہے اور پھر بالآخر دنیا کا بلند ترین میدان دیوسائی...

میں پچھلے برسوں میں دو مرتبہ اسے دیکھنے کی آس میں آیا تھا اور کبھی اس کی برفیں نہیں پگھلتی تھیں اور کبھی میرا خیمہ اس قابل نہ تھا کہ اس کی آب و ہوا کی شدت کو برداشت کر سکتا... اور میں جتنے دن صدپارہ جھیل کے کنارے رہا اسی راستے کو دیکھتا رہا جو پہاڑوں میں سے اٹھتا ہوا بلندی پر کسی نامعلوم چوٹی کے عقب میں بادلوں میں روپوش ہوتا تھا...

کچورا ایک نرم مزاج پر سکون اور تصویروں والی جھیل ہے... ہم صدپارہ نالے کے ساتھ چڑھتے جب جھیل کے قریب ہوئے تو جیپ سے اترتے ہی صدپارہ کے اس چشمے کا پانی جی بھر کر پیا جس میں سونے کے ذرات کی آمیزش ہے اور جسے میں نے صدپارہ گولڈ کا نام دیا تھا۔

جھیل کنارے عیسٰی اور جعفر کا ایک چھوٹا سا "سیٹ اپ" ہے... پہلے ایک خیمہ ہوا کرتا تھا جہاں عیسٰی سیاحوں کے لئے چائے اور بسکٹ کا بندوبست رکھتا تھا... اب وہاں ایک ریستوران ہے' فرانسیسی کھڑکیاں جھیل کے پانیوں پر کھلتی ہیں اور آپ تلی ہوئی ٹراؤٹ مچھلی نہایت نامناسب قیمت پر نوش کر سکتے ہیں...

صدپارہ کے پی ٹی ڈی سی موٹل میں ہماری پہلی رات تھی... اور ہم یہاں کے ڈُو کے موٹل انعام صاحب کی مہربانی سے آئے تھے۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں جب ہم کھانا کھا رہے تھے تو باہر ہوا بے حد تیز ہو رہی تھی اور جھیل کے پانی سمندر کی طرح شور کر رہے تھے۔

میں نے دیکھا کہ عینی کی آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں اور وہ بار بار کھانستی ہے... تھوڑی دیر میں اسے تیز بخار ہو چکا تھا اور اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی... ہمارے پاس اسپرین تھی جس کی دو گولیاں اس نے بمشکل نگلیں۔ رات کے گیارہ بجے تو وہ ایک نیم ہذیانی کیفیت میں تھی اور جانے کہاں کہاں کی اور کیا کیا باتیں کر رہی تھی اور روتی چلی جا رہی تھی کہ ابو مجھے سانس نہیں آ رہا... مجھے ٹھنڈے پسینے آنے لگے' باہر ہوا بہت تیز تھی اور سردی تھی اور سکردو ایک خطرناک فاصلے پر بہت دور تھا... ہم سب عینی کے گرد بیٹھے اسے دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے اور لالٹین کی روشنی میں اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا... اس دوران عیسٰی بھی آ گیا۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا لفافہ تھا "صاحب اس میں کچھ دوائیاں ہیں انگریز ٹورسٹ چھوڑ گئے تھے... آپ دیکھ لو" میمونہ نے ان پر ایک نظر ڈالی اور سر ہلا دیا "نہیں... ان میں سے کوئی بھی مناسب نہیں"

"صاحب بی بی کو اگر سکردو لے جانا ہے تو میں جیپ کا انتظام کر لوں گا آپ فکر نہ کرو" میں نے میمونہ کی طرف دیکھا "نہیں ابھی نہیں۔ اس سرد ہوا میں اسے ایکسپوز نہیں کیا جا سکتا..."

ہمارے پاس تھوڑا سا گڑ تھا... کھانے کے بعد ہم اسے سویٹ ڈش کے طور پر کھاتے تھے... میمونہ نے اسی گڑ سے شربت بنایا اور پھر اسے گرم کر کے عینی کو پلا دیا... اور اس کے ساتھ مزید دو گولیاں بھی کھلا دیں... مجھے اس رات بہت ڈر لگا۔ عجیب بے بس کر دینے والی صورت حال تھی... شائد اس صبح جب ہم اپر کچورا سے واپسی پر تیز بارش میں بھیگے تھے اسی کا اثر تھا... یہ تیز بخار اور رکتا ہوا سانس...

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

تھوڑی دیر بعد عینی اونگھنے لگی۔۔۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور دیر تک اس چہرے کو دیکھتا رہا جو میری اولاد تھا میرے لئے پوری کائنات تھا۔ صبح کی سفیدی پھیلی تو عینی کا بخار اتر چکا تھا اور وہ اطمینان سے سو رہی تھی۔۔۔

اب میں سونا چاہتا تھا کہ سمیر اور سلجوق آ گئے۔۔۔ سمیر کے ہاتھوں میں ایک فشنگ راڈ تھا "ابو حسین کہتا ہے کہ اگر آپ اس وقت صد پارہ گاؤں کی جانب جانے والے پہاڑی راستے پر چلتے ہوئے اس مقام تک پہنچ جائیں جہاں دیو سائی سے آنے والے چھوٹے نالے جھیل میں داخل ہوتے ہیں اور وہاں اس ڈوری کو ڈال دیں تو ٹراؤٹ مچھلیاں آپس میں لڑ لڑ کر بے حال ہو جائیں گی کہ پہلے میں کانٹے کو منہ ماروں گی اور۔۔۔ چلیں ابو؟"

ہم صد پارہ گاؤں جانے والے پہاڑی راستے پر چل رہے تھے۔۔۔ جھیل کے پانی بھی ساتھ تھے۔۔۔ پھر وہ پیچھے رہ گئے۔ نیچے جنگلی گھاس اور جھاڑیوں کا ایک نیم ریتلا میدان تھا جس میں چھوٹے چھوٹے نالے بہہ رہے تھے اور جھیل میں شامل ہو رہے تھے۔ ہم نیچے اتر گئے۔۔۔ یہ ایک نہایت تنہا اور خوبصورت علاقہ تھا اور ہمارے آگے پوری جھیل پھیلی ہوئی تھی۔۔۔ کناروں کے قریب سفید پانی تھے اور وہ پرے ہوتے تھے تو نیلے ہوتے چلے جاتے تھے۔ دائیں جانب پہاڑ میں وہ راستہ تھا جس پر ہم آئے تھے اور جو۔۔۔ دیوسائی کو جا رہا تھا۔

سمیر نے فشنگ راڈ اٹھایا اور اسے گھما کر ڈوری دور تک پھینکی اور کنڈی پانی کے نیچے جانے لگی اور اس کے ساتھ ہی وہ چرخی گھما کر ڈوری لپیٹنے لگا۔۔۔ وادی کاغان کے علاقے سوچ میں دریائے کنہار کے پانیوں میں سے ایک چاندی رنگ کی وزنی ٹراؤٹ سمیر نے ہی تو شکار کی تھی اور آج بھی وہ بے حد مطمئن تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ منہ لٹکائے ہوئے میرے پاس آیا "ابو میں کانٹے کے ساتھ آٹا لگا کر ڈوری پھینک رہا ہوں جب کہ ٹراؤٹ مچھلی تو صرف چمکتے ہوئے اور لشکتے ہوئے ٹکڑوں کی طرف آتی ہے۔۔۔ ہمارا بیٹ ٹھیک نہیں' چمکتا ہوا دھات کا بیٹ چاہئے۔۔۔"

"یہ تمہیں پہلے سوچنا چاہئے تھا۔۔۔"

"اب کیا کریں یہ حسینی کی غلطی ہے۔۔۔ اس نے راڈ دیا تھا۔۔۔" اس نے پھر سے ڈوری کو پانی میں پھینکا اور بے دلی سے چرخی گھمانے لگا۔

ہمارے آس پاس کچھ نہ تھا سوائے آسمان کے' پانی کے پھیلاؤ کے' چھوٹے

چھوٹے برفانی نالوں کے اور اس راستے کے جو اوپر جا رہا تھا۔۔۔ اور اس شفاف وسعت میں صرف ہم سانس لیتے تھے اور خنک ہوا ہمیں وہ تازگی دیتی تھی جو کسی یخ بستہ جھیل کنارے کی گھاس تب محسوس کرتی ہے جب وہ ہوا کے زور سے جھک کر سرد پانیوں میں ڈوبتی ہے۔

ہم واپس آئے تو تھکے ہوئے تھے اور بے حال تھے لیکن بے حد خوش تھے۔۔۔ لان میں خوبانی کے درخت تلے عینی ایک کرسی پر بیٹھی تھی اور میمونہ اس کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔۔۔ ہیلو ابو۔۔۔" اس کے لبوں پر وہ مسکراہٹ آئی جو ابو کے دل کے اندر تک اتر جاتی ہے۔۔۔

اسی شام بلکہ شام سے ذرا پہلے جھیل سے اوپر آنے والے راستے پر ایک باریش نوجوان چلا آتا تھا اور میری طرف چلا آتا تھا۔ یہ محمد علی چنگیزی تھا جو ہمالیہ ٹریک اینڈ ٹورز نامی ایک ادارہ چلاتا تھا۔ بے حد ملنسار اور خوشگوار عادتوں والا نوجوان۔۔۔ کے ٹو موٹل میں ملاقات ہوئی تو کہنے لگا "ان دنوں میں ازابیل شاہ کے ساتھ ٹریکنگ کر رہا ہوں' وہ پاکستان کے مختلف ٹریکس کے بارے میں کتاب لکھ رہی ہیں۔۔۔" میں ازابیل کا بے حد معترف تھا کیونکہ اس نے پاکستان کے بارے میں چار کتابیں تصنیف کی تھیں اور بے حد محبت کے ساتھ تصنیف کی تھیں۔ ازابیل کا کہنا تھا کہ پاکستان ایشیا کا ایک ایسا راز ہے جو اب تک چھپا رہا ہے۔۔۔

چنگیزی میرے قریب پہنچا "صاحب ازابیل آئی ہوئی ہیں۔۔۔ میں نے آپ کا ذکر کیا تو وہ آپ سے ملاقات کی خواہش مند ہیں۔۔۔"

صد پارہ جھیل کے کنارے سفید بالوں والا ایک عمر رسیدہ شخص جھیل سے اوپر ان بادلوں کو دیکھ رہا تھا جن سے پرے دیوسائی کے میدان تھے۔۔۔ وہ انہیں دیکھتا اور پھر اپنے گھٹنوں پر رکھے کینوس پر رنگ لگاتا۔۔۔ وہ جھیل کو پینٹ کر رہا تھا۔ ازابیل شوخ رنگ کے کپڑوں میں اور رنگین عینک گلے میں لٹکائے اس شخص پر جھکی تھی۔۔۔

"اوہ ہیلو میں ازابیل ہوں۔۔۔" اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ آپ ازابیل ہیں اور میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے ملک کے بارے میں اتنی اچھی کتابیں لکھیں۔۔۔"

"آپ کا ملک اتنا اچھا ہے کہ اس کے بارے میں اس سے بھی اچھی کتابیں لکھی جانی چاہئیں۔۔۔ میں آئرش ہوں سوئزرلینڈ میں رہتی ہوں لیکن مجھے پاکستان زیادہ

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

پسند ہے۔۔۔ آپ آندرے روش کو جانتے ہیں؟" اس نے کینوس پر جھکے بوڑھے کی طرف دیکھ کر پوچھا اور پھر کہنے لگی "آندرے ایک اور شخص ہے جو پاکستان کے پہاڑوں کا شیدائی ہے۔ یہ پہلی بار ١٩٣٢ء میں سری نگر کی جانب سے کنکور دیا کے علاقے میں گیا تھا اور اس مہم کا مقصد یہ تھا کہ پوشیدہ چوٹی یا ہڈن پیک کو دریافت کیا جائے۔۔۔ اس کے بعد سے آج تک وہ باقاعدگی سے ان علاقوں میں آتا ہے اور پہاڑوں اور کوہ پیمائی کے بارے میں تیرہ کتابوں کا مصنف ہے۔ یورپ میں بے حد مشہور ہے۔۔۔ اس برس ہم دونوں کے ٹو کے بیس کیمپ تک گئے تھے اور ابھی وہیں سے واپس آ رہے ہیں۔۔۔"

"بابا جی کی موجودہ عمر کیا ہے؟"

"آندرے چوراسی برس کا ہو چکا ہے۔۔۔"

"تو یہ کے ٹو کے بیس کیمپ تک کیسے چلا گیا؟"

"بس اس نے ہمت کی ۔۔۔ کچھ پورٹرز نے مدد کی لیکن واپسی بذریعہ ہیلی کاپٹر ہوئی۔۔۔"

"کے ٹو کے بیس کیمپ تک جانے کی خواہش تو میرے دل میں بھی ہے لیکن ۔۔۔ میرا خیال تھا کہ میں اس پندرہ دن کے طویل اور پرخطر راستے کے لیے ذرا عمر رسیدہ ہوں۔۔۔"

ازابیل ہنسنے لگی "اب تم جان گئے ہو گے کہ اگر تم میں ہمت ہے تو تمہارے پاس ابھی بہت برس ہیں کے ٹو کے بیس کیمپ تک جانے کے لیے۔ بس اپنے آپ کو ذرا سنبھالنا پڑتا ہے' دریائے برالدو کے اوپر چٹانوں کے ساتھ رینگتے ہوئے اگر تم بلندی سے گھبرا جاؤ تو بس سیدھے دریا میں۔۔۔"

اس دوران چنگیزی نے آکر اطلاع کی کہ کیمرہ یونٹ جھیل کے قریب باباجی کا منتظر ہے۔

"رابرٹ سکاور ایک بہت ہی مشہور آسٹرین کوہ پیما ہے۔ وہ ایک ٹیلی ویژن ادارے کے لئے آندرے کا انٹرویو لے رہا ہے۔۔۔ تم بھی آؤ۔۔۔ کم آن آندرے۔۔۔"

آندرے اپنی پینٹنگ میں بے حد محو تھا' اس نے سر اٹھا کر ازابیل کی طرف دیکھا کہ کیا یہ بہت ہی ضروری ہے کہ میں جھیل کی تصویر بنانا چھوڑ دوں اور کیمرے کے سامنے بیٹھ کر انٹرویو دوں؟ ازابیل نے ایک مرتبہ پھر کہا "وہ انتظار کر رہے ہیں آندرے"

"میری پینٹنگ کو کوئی ہاتھ نہ لگائے۔۔۔" آندرے نے سب لوگوں سے کہا اور پھر چنگیزی کا سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

جھیل کنارے ایک بڑے پتھر پر آندرے بیٹھا ہوا تھا اور کیمرے میں آنکھ لگائے خوش شکل رابرٹ کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا "مجھے پاکستان سے بے حد محبت ہے اور یہ محبت ١٩٣٢ء میں شروع ہوئی۔۔۔ میں بلند ترین چوٹیوں پر پہنچا۔۔۔ کتابیں لکھیں اور ان سفروں کے دوران فلمیں بنائیں۔۔۔ میرا کیمرہ صرف قدرتی مناظر کو دیکھتا تھا۔ بادل ۔ سورج کا طلوع اور غروب ۔۔۔ خاص طور پر طلوع کے وقت پہاڑوں میں ایک عجیب کیفیت ہوتی ہے ۔۔۔ میں اس عمر میں بھی ان مناظر کو دیکھتا ہوں تو میرا دل خوشی سے بھر جاتا ہے۔۔۔۔"

رابرٹ نے ایک اور سوال کیا "کیا آپ کو مہم جوئی سے بے حد دلچسپی تھی اس لیے آپ ١٩٣٢ میں موجودہ پاکستان میں آئے؟"

"نہیں بالکل نہیں ۔۔۔۔" آندرے کہنے لگا اور جھیل کے پانیوں سے اس نے اپنے پاؤں کو بچایا "میں نوجوان تھا۔ بیکار تھا۔ پیرس کے ایک اخبار میں ایک اشتہار شائع ہوا کہ ہمالیہ کی نامعلوم وادیوں میں جانے کے لئے جسمانی طور پر مضبوط نوجوان درکار ہیں۔۔۔ بس میں نے سوچا کہ کچھ پیسے بنائے جائیں اور پھر میں زوجی لاء درے کے راستے ادھر آگیا۔۔۔"

شام گہری ہو رہی تھی اور خنکی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میں آندرے کی پرمسرت شخصیت کو دیکھ رہا تھا کہ وہ کس طرح اس عمر میں پوری طرح زندہ ہے اور ہم کس طرح اس عمر میں کتنے مردہ ہو چکے ہیں۔۔۔

انٹرویو سے فارغ ہو کر آندرے میری جانب آگیا "مجھے ازابیل نے تمہارے بارے میں بتایا ہے ۔۔۔ تم میری طرح کے شخص ہو ۔۔۔ آؤ باتیں کریں"۔۔۔ اور آندرے کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ اس کی زندہ دلی اور زندگی کو آخری سانسوں تک پرمسرت رکھنے کا جذبہ میرے اندر بھی سرائت کر رہا ہے۔۔۔

"اور اگلے برس تم کونسی چوٹی پر پہنچو گے آندرے؟"

"ہا۔۔ میں اسی چوٹی پر پہنچوں گا اگلے برس۔۔۔" اس نے انگوٹھے سے آسمان کی طرف اشارہ کیا اور ہنسا "وہ چوٹی جس پر پہنچ کر تم واپس نہیں آسکتے۔۔۔ لیکن فی الحال

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

مجھے سکردو پہنچنا ہے"

ہم موئل کے ساتھ اوپر پارکنگ تک جانے والے راستے پر چلنے لگے... یہاں شدید چڑھائی تھی۔ آندرے سانس لینے کے لئے رکا۔

"یہ چڑھائی تو کچھ بھی نہیں ہے آپ تو نانگا پربت تک جا چکے ہو..." ازائنل نے مذاق سے کہا۔

"میں تمہیں تجربے کی بات بتاؤں---" وہ ہانپتا اور مسکراتا ہوا بولا "چاہے وہ سیڑھیاں ہوں یا نانگا پربت' چڑھائی ہمیشہ تھکا دیتی ہے"

وہ کچھ دیر موئل کے لان کے قریب میمونہ اور بچوں کے ساتھ گفتگو کرتا رہا اور پھر ازائنل کے سہارے آہستہ آہستہ اوپر چلا گیا... شاید اگلے برس یا اس سے اگلے برس وہ چوٹی جس پر پہنچ کر تم واپس نہیں آ سکتے...

اور ہم خپلو جا رہے تھے۔

بلند راستے' نشیب میں پھیلا ہوا سندھ' بہت دور گلیشیر اور ان کے نیچے سرسبز وادیاں' آبشار جو طویل فاصلے کی وجہ سے رکے ہوئے لگتے تھے...

ہم سندھ کو عبور کر کے دوسری طرف گئے اور دریائے شیوک کے ساتھ ساتھ سفر کرنے لگے۔

جمیل صدپارہ میں دو روزہ قیام کے بعد ہم سکردو لوٹے تو قلب علی کہنے لگے' جناب اب کہاں جائیں گے؟ جہاں جائیں گے آپ میری پاجیرو ویگن پر جائیں گے... نہیں نہیں آپ انکار کریں گے تو مجھے بہت دکھ ہو گا... کسی کو دکھ دینا یوں بھی گناہ ہے اور اگر بلتستان کی سیر کے لئے پاجیرو مل رہی ہو تو انکار بہر طور گناہ کبیرہ میں شامل ہو گا... چنانچہ ہم مرتکب نہ ہوئے... پاجیرو کا ڈرائیور مست علی دیکھنے میں بھی مست لگتا تھا لیکن اپنے کام میں اول نمبر تھا...

پچھلی شب بالتورو ریسٹ ہاؤس میں کرنل سکندر نے ایک پر تکلف کھانے کا بندوبست کیا۔ سیاچین سے واپس آنے والے چند نوجوان افسروں سے ملاقات ہوئی' ان کی آنکھوں میں ابھی تک وحشت اور فاصلے تھے' وہ ہر آہٹ پر چونک جاتے۔

جہاں آبادی آتی ویگن جو کے سنہرے کھیتوں میں سے گذرتی... کٹائی شروع تھی... کہیں تھریشر نظر آ جاتے ... تمام لوگ کھیتوں میں تھے... کہیں زدہ جو کی سنہری

بالیوں پر چل رہے تھے اور انہیں "گاہ" رہے تھے اور ایک جگہ ہم نے چار خوبصورت گھوڑوں کو انہی بالیوں پر ایک دائرے میں دلکی چال چلتے دیکھا...

ایک نوجوان لڑکی جو کے دانوں کو ایک ترنگلی سے ہوا میں اچھال رہی تھی۔ سنہری بھوسہ اس کے چہرے پر گرتا تو کچھ دیر کے لیے بالکل دکھائی نہ دیتا کیونکہ اس کی رنگت بھی سنہری تھی۔ شاید اس لڑکی کی عمر عینی جتنی تھی... عینی نے اسے حیرانی اور خوف سے دیکھا "ابو یہ لڑکی اتنی چھوٹی سی ہے اور اتنا مشکل کام کر رہی ہے..."

"اور یہ پڑھتی بھی ہو گی اور ماں کا ہاتھ بھی بٹاتی ہو گی... اور عینی اگر آپ کے دادا جان ہل کی ہتھی چھوڑ کر تعلیم حاصل نہ کرتے اور پھر شہر میں پوری زندگی رزق حلال کے لئے اتنی شدید جدوجہد نہ کرتے تو آج میں بھی کسی بیل کے پیچھے "ہو ہو" کر رہا ہوتا اور تم گندم کے دانوں کو ترنگلی کی مدد سے ہوا میں اچھال رہی ہوتیں... اس لڑکی کی طرح..."

"میں لاہور واپس جا کر دادا جان کو تھینک یو کہوں گی..." عینی ہنسنے لگی۔

ہم ایک پل کے قریب سے گذرے... پل کے پار ایک راستہ کہیں جا رہا تھا... ہم سفر کرتے رہے... اور پھر مجھے یاد آیا کہ میں نے اس پل کو پہلے کہیں دیکھا ہوا ہے... ظاہر ہے میں دو برس پیشتر بھی اسی راستے سے خپلو گیا تھا اس لیے دیکھا تو ہو گا لیکن نہیں... اسے میں نے کسی اور طرح دیکھا تھا... یہ وہی پل تھا جس کے ساتھ "ہوشے ۳۲ کلومیٹر" کا سال خوردہ بورڈ لگا ہوا تھا... لیکن اس بار بورڈ وہاں نہیں تھا یا وہاں تھا لیکن میری نظروں سے اوجھل رہا... اور وہ راستہ ہوشے کو جا رہا تھا... اور سکردو سے روانگی کے وقت میں نے قلب علی کو کہا تھا کہ میں خپلو کے بعد ہوشے جانا چاہتا ہوں اور انہوں نے نہایت خوش ہو کر کہا تھا ہاں ہاں جائیں لیکن وہاں ٹھہریں گے کہاں؟ چھوٹا سا پہاڑی گاؤں ہے۔ میں ایک مرتبہ گیا تھا اور اپنے کسی دور کے رشتے دار کے پاس ٹھہرا تھا... لیکن ادھر پسو بہت تھا' بہت کاٹتا تھا... آپ جائیں لیکن اسی روز واپس آ جائیں...

تو ہم سب خپلو جا رہے تھے... لیکن میں ہوشے جا رہا تھا... اور ہوشے کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہ تھا کہ وہاں تک کا جیپ ٹریک کیسا ہے؟ وہاں پہنچنے میں کتنا عرصہ لگتا ہے اور کیا مست علی اپنی مستی کے باوجود ہمیں وہاں تک لے جا سکتا ہے؟

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

ابھی شام ہونے کو تھی اور ہم خپلو پہنچ گئے....

یہاں شیوک کا پاٹ چوڑا ہو جاتا ہے اور اس کے پانی آپ کے ساتھ ساتھ بہنے لگتے ہیں.... ریتلے راستے پر شہتوت اور خوبانیاں اور ان پر آپ کی ویگن کے ساتھ.... خپلو کی وادی نظر نہیں آتی.... کیونکہ اس کا منظر صرف بلندی سے سامنے آتا ہے۔ اسے دیکھنے کے لیے آپ کو اس کے اندر جانا پڑتا ہے' اوپر بازار کی طرف پڑتا ہے۔

خپلو کے اکلوتے ریسٹ ہاؤس میں ایک بہت بڑے اخروٹ کے درخت کے نیچے گھا نچے سب ڈویژن کی پولیس ہمارا انتظار کر رہی تھی.... ہمیں خوش آمدید کہنے کے لئے.... ایس پی میر افضل خان پرانی فلموں کے کسی ہیرو کی طرح خوش شکل اور ان کے ڈی ایس پی شگری صاحب.... اگلے دو روز ہم پولیس کے زیر نگرانی رہے.... اور بہت مزے میں رہے....

خپلو پہلے بھی دل کو لگا تھا' اب کے کچھ اور زور سے لگا بلکہ دل کے آس پاس کہیں مقیم ہو گیا.... ہم بلندی پر جہاں برفیلے پانیوں کا شور بہت ہوتا ہے وہاں خانقاہ چقچن دیکھنے کے لیے گئے.... اور پھر وہیں سے اوپر ایک چراگاہ تک گئے جہاں سے وادی خپلو اور دریائے شیوک قدموں میں بچھے نظر آتے ہیں اور سامنے پہاڑوں پر پچھلی رات کی تازہ برف دھوپ میں پگھلتی ہے۔

اس بار میں نے پہلی بار خپلو کے ایک پرانے محلے میں قدیم وضع کے پتھریلے مکانوں اور غار نما گلیوں کے قریب خانقاہ معلٰی کو دیکھا.... عینی اور سمیر اس کے دیوہیکل بلند ستونوں کو بانہوں میں لینے کی کوشش کرتے رہے.... وہ دونوں اس قدیم عبادت گاہ میں نفل پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے تو گویا بے شمار ستونوں کے درمیان وہ بھی دو مئودب مگر چھوٹے چھوٹے ستون تھے۔

خپلو کے راجاؤں کے محل کے خنک باغ میں سیب سرخ تو ہو چکے تھے لیکن ابھی پکنے میں کچھ دیر تھی' اور چیری کے دونوں درختوں میں آخری دنوں کے پھل تھے.... چشمے کے کنارے راجہ ذکریا کا پولو کا گھوڑا ہمیں حیرت اور شک سے دیکھ کر بدن تھرتھراتا تھا.... میرے دل کے آس پاس جہاں کہیں خپلو مقیم ہے وہاں جو سرسبز خنک نہروں اور گلاب کے جنگلی پھولوں والا ٹکڑا ہے وہ اسی محل کے باغ کا ایک حصہ ہے۔ دو ملازم چیری کے درختوں پر چڑھ کر انہیں اس طرح ہلاتے ہیں جیسے ہم بیری کے درخت کو جھنجھوڑ کر بیر گراتے ہیں.... یہاں گھاس کو پانی دیا ہوا ہے اور سرخ یاقوت چڑیاں اس کے ٹھنڈے سبزے میں ٹپاٹپ برستی ہیں۔

میں سلجوق اور سمیر بیٹھک میں بیٹھے ہیں اور میز پر عزوق اور چیری کے تھال ہیں - راجہ محبوب علی خان بھی ہمیں ملنے کے لیے آ گئے ہیں۔ وہ مجھ سے میرے والد چوہدری رحمت خان تارڑ کی صحت کے بارے میں پوچھتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اس محل میں جو بہت سارے پھول ہیں ان کے بیج انہوں نے ہماری فرم سے لگا کر بوئے تھے۔

میمونہ اور عینی زنان خانے میں نرگس ذکریا اور ان کی پھوپھی رانی سے محو گفتگو ہیں۔

محل سے اترتے ہوئے بازار کے آغاز میں وہ مسجد ہے جس کے اندر جا کر قسم اٹھا لینے والے پر کسی قسم کا شک نہیں کیا جاتا۔

بازار کے اوپر دیکھیں تو بلندی پر ایک سرسبز وادی نظر آتی ہے۔

اور اوپر سے آنے والی ندی کے پل کے آس پاس اہل خپلو چھوٹی موٹی گپ شپ اور تفریح کے لیے آ بیٹھتے ہیں....

بازار میں ہی خپلو کا ڈاکخانہ ہے.... ہم نے اس کے اندر ایک بنچ پر بیٹھ کر لاہور خط لکھے.... اور یہاں سے بھی صرف بلند پہاڑ نظر آ رہے تھے.... پوسٹ ماسٹر ایک نہایت محبت والے شخص جو ہمیں دیکھ کر بے حد خوش ہوئے .... ان کے پاس پوری وادی کے لیے صرف دو پوسٹ مین تھے.... کچے فرش اور پتھریلی دیواروں والا چھوٹا سا دالان نما ڈاک خانہ .... اور اسے دیکھ کر سلجوق نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہنے لگا "ابو انسان کو خپلو کے اس ڈاکخانہ میں پوسٹ ماسٹر ہو جانا چاہئے بس...."

اور وہاں واقعی ایک عجیب ٹھہراؤ تھا۔ پرانی میزوں ' ٹوٹی ہوئی دو کرسیوں ' الماریوں میں رکھے لفافوں اور خطوط کے درمیان ایک عجیب ٹھہراؤ تھا اور پہاڑوں سے ٹھنڈک اس کے اندر تک آتی تھی۔

اور آخری شام میر افضل خان کی جانب سے خپلو کے ریسٹ ہاؤس میں ایک دعوت کا اہتمام تھا.... میر صاحب اس خپلوی ڈنر کے لیے باقاعدہ ڈریس اپ ہو کر آئے یعنی نیلا بلیزر۔ گرے پتلون اور سرخ رومال وغیرہ.... ان کے ہمراہ شگری صاحب تھے جن کی نظریں صرف "صاحب" کے لیے تھیں.... جب تک وہ نہ مسکراتے شگری صاحب بھی ہونٹ بھینچ کر رکھتے.... محکمہ زراعت کے ایک باریش افسر

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

امان اللہ خان بھی تشریف لائے۔۔۔ وہ بھی والد صاحب کو جانتے تھے اور گوا لمنڈی کی کشمیری چائے کو یاد کر کے ٹھنڈی آہیں بھرتے تھے۔۔۔ راجہ خپلو کے محل کے اوپر ایک سرسبز ڈھلوان جو نظر آتی ہے اس کا تذکرہ ہوا تو امان صاحب کہنے لگے "وہاں تو میرا آلو ہے۔۔۔"

"آپ کا آلو ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں تارڑ صاحب ۔۔۔ آپ بھی میرا آلو دیکھیں تو حیران رہ جائیں۔۔۔ میں آج بھی اپنا آلو دیکھ کر آیا ہوں۔ بلتستان میں اور کس کا آلو ہے؟ صرف میرا آلو ہے اور کیا آلو ہے۔۔۔ اور ایسا آلو ہے کہ ۔۔۔" امان صاحب نے بلتستان میں آلو کی ایک نئی قسم متعارف کروائی تھی جسے وہ بڑے فخر سے "میرا آلو" کہتے تھے۔

"تو کل صبح آپ سکردو واپس جائیں گے؟" میر صاحب نے چائے کے بعد دریافت کیا۔

"کل صبح ہم ہوشے جائیں گے۔۔۔"

"ہوشے؟" میر صاحب نے ذرا تفتیشی انداز کی سختی سے کہا "وہاں کیا کریں گے جا کر؟"

"یہ تو وہاں جا کر پتہ چلے گا۔۔۔" "ویسے آپ ہوشے گئے ہیں؟"

"میں؟" میر صاحب کھانسے "یہ تو میرے علاقے میں۔۔۔ کیوں بھی شگری ہم ہوشے تو نہیں گئے؟"

"نہیں جی۔۔۔" شگری صاحب فوراً کھڑے ہو گئے۔۔۔

"کیوں شگری وہاں تک کا راستہ کیسا ہے؟"

"پتہ نہیں سر۔۔۔ ٹھیک ہو گا سر۔۔۔ میں کسی سے پتہ کروں گا سر۔۔۔"

"آپ شگری کو ساتھ لے جائیں۔۔۔" میر صاحب بولے "یہ آپ کا مناسب بندوبست کر دے گا۔۔۔"

"آپ فکر نہ کریں ہم پولیس کی حفاظت کے بغیر بھی پہنچ جائیں گے۔۔۔ یوں بھی خپلو میں شگری صاحب کی ضرورت ہو گی۔۔۔"

میر صاحب نے ایک گہری گونج والا قہقہہ لگایا "تارڑ صاحب یہاں تو سرے سے پولیس کی ہی ضرورت نہیں۔۔۔ کرائم ریٹ زیرو ہے۔۔۔ بہت شریف لوگ ہیں۔۔۔ پولیس تو یہاں انگلیاں چٹخاتی رہتی ہے یا پھر سوشل ویلفیئر کے کاموں میں مصروف رہتی

ہے۔۔۔ کسی مجرم کو دیکھنے کے لیے ہمیں بلتستان سے باہر جانا پڑتا ہے۔۔۔ یہاں ایک پولیس افسر آئے تو انہیں ایک مقام کے بارے میں بتایا گیا کہ اسے قتل گاہ کہتے ہیں۔ ایک اور جگہ دکھائی اور بتایا کہ اس کا نام بھی قتل گاہ ہے۔۔۔ پولیس افسر ہنس کر بولے: اوئے قتل وتل کسی کو کرتے نہیں ہو اور جگہ کا نام قتل گاہ رکھ دیا ہے۔۔۔ سکردو جیل کی یہ حالت ہے کہ قیدیوں کی نسبت سٹاف زیادہ ہے۔۔۔ تارڑ صاحب پولیس والوں کے مورال کے لیے بہت برا علاقہ ہے یہ۔۔۔" بجلی چلی گئی' ریسٹ ہاؤس سے باہر گھپ اندھیرا تھا۔ شیوک کے پانیوں کی سرسراہٹ بے حد مدھم تھی۔ البتہ مشنری ڈاکٹر سٹورت کے مکان کی کھڑکیوں میں روشنی تھی کیونکہ اس نے چھت پر شمسی توانائی کا ایک یونٹ نصب کر رکھا تھا۔

میں ایک بار پھر کہوں گا کہ خپلو میرے دل کے آس پاس کہیں مقیم ہو گیا تھا۔۔۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اوپر خپلو کی ڈھلوانوں پر تھوڑی سی زمین ہو' جس میں ایک مخصوص بلتی طرز کا مٹی اور لکڑی کا مکان تعمیر کیا جائے' جس کی کھڑکیاں چھوٹی اور چھتیں شہتیروں والی اور نیچی ہوں اور ان میں آتش دان ہوں۔۔۔ اور خوبانی کے دو درخت ہوں' ایک سیب کا اور ایک چیری کا۔۔۔ کچھ سبزیاں اور اوپر سے آتی برفیلی پانی کی ایک نالی شور مچاتی اس زمین میں سے گزرے۔۔۔ اور اس مکان میں بیٹھ کر انسان کتابیں پڑھے اور وہ تمام ناول اور افسانے لکھے جو اس نے لکھنے ہیں۔۔۔ اور اسے اپنی روزی کے لیے فضول قسم کے مضامین اور کالم نہ لکھنے پڑیں اور ٹیلی ویژن پر کام نہ کرنا پڑے۔۔۔ کیا یہ ممکن ہے۔۔۔ نہیں یہ ممکن نہیں کیونکہ خپلو میرے دل میں مقیم ہو سکتا ہے لیکن میں خپلو میں مقیم نہیں ہو سکتا۔۔۔

اور اگلی سویر ہم نے ہوشے جانا تھا۔

خپلو ریسٹ ہاؤس سے اترتے راستے کے کنارے سیبوں کے چار پانچ درخت پھل سے لدے ہوئے تھے' ان کے نیچے سفید سیب بچوں کی گمشدہ گیندوں کی طرح بکھرے پڑے تھے۔ مست علی نے ایک سیب اٹھا کر اسے غور سے دیکھا اور واپس پھینک دیا "ابھی کچے ہیں صاحب۔۔۔"

میں مست علی کے بارے میں تھوڑا فکرمند تھا۔ قطب علی صاحب نے بتایا تھا کہ ڈرائیور بہت اچھا ہے لیکن صرف یہ ہے کہ قدرے بہرا ہے بلکہ بہرا تو نہیں ذرا کم سنتا ہے اور جب کم سنتا ہے تو مسکراتا ہے اور شاید اسی لیے مست علی ہر وقت

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

مسکراتا رہتا تھا اور ہم سمجھتے تھے کہ مست الست ہے اس لیے مسکراتا ہے اور میں فکر مند اس لیے تھا کہ وہ بھی آج تک ہوشے نہیں گیا تھا اور ہوشے کے راستے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

ہم خپلو سے صبح چھ بجے نکلے۔ ایک غیر محتاط اندازے کے مطابق ہمیں تین سے چار گھنٹے کے اندر ہوشے پہنچنا چاہئے تھا۔

ہم ابھی سیاچین جانے والی سڑک پر شیوک کے کنارے سورمو کی جانب جا رہے تھے۔

سورمو کے قریب دریا اور پھیل گیا۔۔۔ اور دریا کے خشک ریتلے جزیروں سے پرے جو خشک پہاڑ تھے ان کے سنگم پر صاف نیلے شفاف آسمان میں مشہ برم دکھائی دینے لگی۔ وہ حیرت انگیز حد تک سوئٹزرلینڈ کی بلند ترین چوٹی میٹرہارن سے مشابہ تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہو گا کہ میٹرہارن مشہ برم سے مشابہ تھی کیونکہ یہ اس کی نسبت کہیں بلند تھی۔

میں بچوں سے مخاطب ہوا "ہمیں وہاں جانا ہے۔۔۔"

"کہاں؟ مشہ برم پر؟" عینی نے چونک کر کہا۔

"اس کے عین نیچے ہوشے کا گاؤں ہے وہاں۔۔۔ ابھی ہم دریا پار کریں گے اور سیدھے اس چوٹی کی جانب سفر کرنے لگیں گے۔۔۔"

مست علی نے پاجیرو روک دی۔

وہ صرف مسکرایا اور نیچے اتر گیا۔۔۔ اس نے چاروں ٹائروں کو زور دار ٹھڈے رسید کئے اور پھر پچھلے ٹائر کے قریب بیٹھ گیا۔ میں نیچے اتر کر اس کے پاس چلا گیا۔

"کیا ہوا؟"

اس نے مجھے ایک زور دار مسکراہٹ سے نوازا اور سٹپنی نکال کر پنکچر شدہ ٹائر بدلنے لگا۔۔۔ بچے بھی باہر آ گئے اور کسی ویران جزیرے میں شکستہ کشتی پر پہنچنے والے مسافروں کی طرح ادھر ادھر گھومنے لگے۔۔۔ کیا ہم سٹپنی کے بغیر ہوشے تک سفر کرنے کا خطرہ مول لے سکتے تھے؟ اگر ہم خپلو واپس جا کر پنکچر لگواتے تھے تو ہم اتنا وقت ضائع کر دیتے تھے کہ ہوشے نہیں جا سکتے تھے۔

"پھر مست علی؟ اب کیا ہو گا؟" میں نے ذرا بلند آواز میں پوچھا۔

اس نے مسکرانا بند کر دیا "کچھ نہیں ہو گا صاحب' اللہ مالک ہے۔ ہم ہوشے جائیں گے۔۔۔"

میں نے بھی سوچا کہ اگر خدانخواستہ اس پہاڑی سفر کے دوران ایک اور ٹائر پنکچر ہو جاتا ہے تو ہم پاجیرو میں شب بسر کر سکتے تھے کیونکہ خوراک ہمارے پاس تھی اور علاقہ بھی محفوظ تھا۔۔۔ اور اسی دوران مست علی پنکچر شدہ ٹائر گلے میں ڈال کر خپلو یا سکردو تک ٹریکنگ کرتا ہوا جا سکتا تھا اور دو چار دن کے اندر اندر پنکچر لگوا کر واپس آ سکتا تھا۔۔۔ نو پرابلم۔

ہم سورمو میں سے گزر گئے۔۔۔ ابھی بہت کم لوگ بیدار ہوئے تھے۔

سورمو سے آگے چند لوگ سڑک کے کنارے جھکے ہوئے تھے۔ نیچے ایک خطرناک ڈھلوان پر ایک ٹرک اوندھا پڑا تھا۔۔۔ معلوم ہوا پچھلی شب نیچے گیا تھا اور ڈرائیور کا کچھ پتہ نہیں۔۔۔ بچوں نے اسے بے حد دلچسپی سے دیکھا اور میں نے بچوں کو بے حد خوف سے دیکھا۔۔۔ راستے کی خطرناکی ایک سرد لہر کی طرح میری ریڑھ کی ہڈی میں اترنے لگی۔

راستہ چٹان کے ساتھ چمٹنے لگا اور دریا نیچے چلا گیا۔ جیپ کا بانٹ اونچا ہونے لگا اور ہموار ہوا اور نیچے دریا پر ایک پل نظر آیا "یہ سورمو پل ہے ہم اس کے پار جائیں گے۔۔۔" مست علی نے یہ الفاظ کہے اور پھر یکدم سڑک چھوڑ کر جدھر کھائی تھی ادھر سٹیئرنگ گھما دیا۔۔۔ اور تب اس لمحے میرا دل رکا کیونکہ آگے کچھ بھی نہ تھا۔۔۔ یہ لمحہ شاید ایک سیکنڈ کا تھا یا اس سے ذرا طویل لیکن مجھ پر جیسے گزرا وہ میں جانتا ہوں یا وہ شخص جانتا ہو گا جس کی جیپ ایک پہاڑی راستے پر چلتے چلتے یکدم ہوا میں جاتی ہے اور پھر گہرائی میں جاتی ہے۔۔۔ بادی النظر میں سڑک چٹان کے ساتھ جا رہی تھی اور ہمیں بھی اس پر رہنا چاہئے تھا لیکن مست علی سٹیئرنگ گھما چکا تھا۔ اس ایک لمحے میں میرے آگے صرف آسمان تھا اور نیچے گہرائی تھی اور جیپ ہوا میں تھی۔ اور پھر اس سے اگلے لمحے۔ جیپ نیچے ہوئی اور اس کے اگلے ٹائر ایک ایسے ڈھلوان کچے راستے پر جا لگے جو سڑک پر سے بالکل نظر نہیں آتا تھا۔۔۔ ہم نیچے اترے اور پل کے پار چلے گئے۔ چیک پوسٹ پر میر افضل کا فون آ چکا تھا اس لیے ہمیں دوسری طرف جانے دیا گیا۔۔۔ وہ راستہ جسے ہم نے چھوڑا تھا سیاچین کے پڑاؤ دم سم اور گوسو کی طرف جاتا تھا اور یہ راستہ۔۔۔ ہوشے کی طرف جانا چاہئے تھا۔۔۔ شیوک کے دوسری جانب پہنچ کر میں نے مست علی سے کہا "جیپ تھوڑی دیر کے لیے روکو مجھے ایک گھونٹ پانی دو اور

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

آئندہ پاجیرو کو اس طرح یکدم کسی ایسے راستے پر نہ موڑنا جو مجھے نظر نہ آتا ہو..."
مست علی مسکرانے لگا۔

سور مو پل سے پرے راستہ ذرا بہتر ہوا' قدرے مخدوش ہوا اور ہم اس پر تنہا سفر کرتے تھے ادھر کھیت کم تھے اور ہریاول زیادہ نہ تھی۔ ہم دریائے شیوک کے اس جانب آ چکے تھے... راستہ ذرا بلند ہوا اور پھر ایک دوراہا دکھائی دیا۔ ایک راستہ نیچے ایک خاصے بڑے گاؤں کو جا رہا تھا...

"کدھر صاحب!" مست علی مسکرایا۔

"مجھے کیا پتہ کدھر صاحب... میرا خیال ہے ہمیں سیدھا جانا ہے..."

گاؤں میں اترتے راستے کو چھوڑ کر ہم سیدھے چلے گئے... لیکن بہت کم مدت کے لئے ہم سیدھے رہے اور پھر ایک دو مرتبہ الٹے ہوتے بچے کیونکہ سڑک پر جا بجا پتھر اور کنکر تھے اور کہیں کہیں گڑھے بھی تھے... مست علی نے پاجیرو روک دی اور مسکرائے بغیر سڑک کو غور سے دیکھا اور پھر مجھے غور سے دیکھا اور کہنے لگا "یہ راستہ ختم ہو چکا ہے اس پر جیپ وغیرہ کئی مہینے سے نہیں چلا..."

"اس کا مطلب ہے ہم ہوشے نہیں جا سکتے؟"

مست علی مسکرایا اور پھر سڑک کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ نیچے گاؤں میں صبح ہو رہی تھی اور ایک نوجوان لڑکی چھت پر خوبانیاں پھیلا رہی تھی۔ مست علی نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے پکارا... آواز اس تک پہنچی لیکن وہ جان نہ سکی کہ یہ کدھر سے آئی ہے۔ اس نے چاروں طرف دیکھا لیکن ہماری جانب اوپر نہیں دیکھا اور پھر سے خوبانیاں پھیلانے لگی... مست علی نے ایک مرتبہ پھر "ہو ہو" کیا اور اس لڑکی نے اوپر ہماری جانب دیکھا۔ یقیناً پہلی نظر میں اسے سلیٹی رنگ کے پہاڑ ہی دکھائی دیئے ہوں گے کیونکہ وہ ہم سے خاصے فاصلے پر تھی اور پھر اسے ایک چھوٹی سی جیپ اور اس کے مسافر دکھائی دیئے ہوں گے... مست علی نے شائد ہوشے کے راستے کے بارے میں پوچھا اور وہ نیچے چلی گئی۔ تھوڑی دیر میں ایک مقامی کسان ہماری جانب آ رہا تھا۔ وہ سڑک کے عین نیچے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اور مست علی اس سے باتیں کرنے لگا... معلوم ہوا کہ اوپر والی سڑک ایک عرصے سے متروک ہو چکی ہے اور ہوشے کے لئے گاؤں کے پار جا کر دوسرے راستے پر چلنا ہو گا۔

"اس سے پوچھو اس گاؤں کا نام کیا ہے؟"

مست علی نے پوچھا اور یہ بالے گان تھا۔

پاجیرو نیچے اتری اور گاؤں میں آ گئی' کھیتوں اور آب پاشی کی نالیوں کو روندتی پاجیرو کے انجن کی آواز بالے گان کی صبح میں بے حد بدصورت تھی...

گاؤں کے اختتام پر ایک بڑا نالہ تھا... جو ہوشے سے آ رہا تھا۔ اس پر ایک معلق پل تھا جسے ہم نے عبور کیا اور دوسری جانب چلے گئے۔

اب ہمیں شے برم کی طرف سفر کرنا تھا۔

یہاں راستہ تھوڑی دور تک راستہ رہا اور پھر چٹانوں کا ڈھیر ہو گیا... سینکڑوں بڑے بڑے پتھر اور انہی پتھروں پر چل کر اگر آ سکو تو آؤ۔ جیپ تقریباً بے قابو ہو رہی تھی اور مست علی بڑی مشکل سے سٹیئرنگ کو سنبھال رہا تھا جو کہ ہاتھ سے چھوٹا جاتا تھا... انجن اور باڈی سے شکست و ریخت کے نغمے پھوٹ رہے تھے اور یہ نغمے خوفزدہ کرتے تھے کہ اگر اس جیپ میں یہاں کسی قسم کی فنی خرابی ظہور پذیر ہو گئی تو ہم کیا کریں گے۔ جیپ جو بے اختیار ہو کر جھٹکے مارتی اچھلتی تھی اسی ردھم میں ہم سب کی پسلیاں بھی جھٹکے کھاتیں ایک دوسرے میں الجھتی جا رہی تھیں۔ جب راستے کا یہ پتھر ٹکڑا ختم ہوا تو مست علی نے جیپ روک کر ماتھے سے پسینہ پونچھا۔

"مست علی کیا تم کبھی اتنے خراب راستے پر اس پاجیرو کو لائے ہو؟"

"نہیں صاحب"

"اور کیا یہ پاجیرو ایسے راستے پر چلنے کے قابل ہے؟"

"نہیں صاحب..."

"اب اگر کوئی اور ٹکڑا اسی نوعیت کا ہمارے راستے میں آیا تو ہم واپس ہو جائیں گے"

"جی صاحب..."

تقریباً ایک فرلانگ کے کچے اور بہتر راستے کے بعد اسی نوعیت کا ایک اور پتھر پتھر راستہ ہمارے سامنے تھا۔

"کیا کریں صاحب؟" مست علی بولا۔ اور کہنا وہ یہی چاہتا تھا کہ اب واپس چلیں صاحب؟

"کیا خیال ہے؟" میں نے مونا سے مشورہ کیا "جیپ ان پتھروں پر چلی جائے گی..."

"چلی تو جائے گی لیکن... ٹوٹ نہ جائے..."

ہم سب نیچے اترنے لگے تو مست علی نے روک لیا "اگر آگے جانا ہے تو بیٹھے

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

رہو۔ جیپ خالی ہو گی تو زیادہ اچھلے گی"

ہم پھر سے براجمان ہو گئے اور جیپ اور سٹیئرنگ اور مست علی اور ہم سب پھر سے بے اختیار ہو گئے اور ہم بات کرتے ہوئے بھی ڈرتے تھے کہ کہیں زبان دانتوں تلے آ کر کٹ نہ جائے اور اس کے باوجود میمونہ کہنے لگی "اگر قطب علی اس وقت اپنی پیاری پاجیرو کو یوں جھٹکے دار ڈانس کرتے دیکھ لیں تو وہ قطب ساکن ہو جائیں۔۔۔"

یہ آزمائش جب اختتام کو پہنچی تو ہم نے جیپ سے باہر نکل کر اپنی ہڈیوں اور جوڑوں کو کھینچ تان کر ان کے اصل مقام پر بٹھایا۔

اور پھر ہم نے دیکھا کہ یہاں سے شہ برم زیادہ صاف نظر آتی تھی اور ہم اپنی یہ چھوٹی سی کلفت بھول گئے۔ اب یہ بلند برفانی چوٹی ہماری ونڈ شیلڈ کے ایک حصے میں ایک تصویر کی طرح آویزاں ہو گئی' یہاں سے ہوشے تک اسے مسلسل نظر آتے رہنا تھا۔ سفر پھر سے شروع ہو گیا۔ ایک بہت وسیع سرسبز ڈھلوان تھی جس پر دو پگڈنڈیاں تھیں اور ان پر جیپ کے ٹائر تھے اور ان کے درمیان گھاس تھی باقاعدہ سڑک نہیں تھی۔ اور اس ڈھلوان پر لمبی لمبی قد آدم گھاس لہراتی تھی اور اس گھاس میں کہیں کہیں بڑے پتھر جو آرائشی لگتے تھے۔ خاصے فاصلے پر نیچے ہوشے کا نالہ تھا اور اس کے پار تیکھی نوکیلی برفوں سے اٹی چٹانیں تھیں اور ان میں کہیں کوئی وادی تھی جہاں لوگ تھے۔ جو شائد اپنے گھروں سے ہمیں دیکھتے تھے لیکن ہم انہیں یا ان کے گھروں کو یہاں سے نہیں دیکھ سکتے تھے' صرف چٹانوں کے نیچے سبزے کی ایک لکیر نظر آتی تھی جہاں کوئی وادی تھی۔ راستہ یہاں تقریباً ہموار تھا۔ اوپر سے کوئی چشمہ اگر راستے میں آ جاتا تو ہم جیپ روک کر اپنے آپ کو تروتازہ کر لیتے۔

اس وسیع ڈھلوان پر سفر کرتے ہوئے ایک کیفیت تھی جو مسلسل تھی اور اس کیفیت میں جب جیپ کا انجن بند ہوتا تو ایک مکمل تنہائی ہوتی' سرسراتی بلند گھاس کی خاموشی ہوتی اور ہم باتیں کرتے تو ہماری آواز ہمیں بھی سنائی دیتی۔ تقریباً تمام پہاڑی راستے دریاؤں اور نالوں کے ساتھ چلتے ہیں اس لیے وہاں پانی کا شور بھی ساتھ چلتا ہے لیکن ہوشے روڈ کا یہ حصہ مختلف تھا۔ نالہ بہت دور نیچے تھا اور ہم اوپر بلندی پر سرسراتی گھاس اور پھولوں میں تھے۔ ہوشے کے لیے سکردو یا خپلو سے باقاعدہ جیپ سروس نہیں ہے۔ صرف کارگو جیپیں سامان سے لدی اپنی من مرضی سے چلتی ہیں اور وہ دن میں دو چار چلتی ہوں گی کہ راستے پر گھاس اسی لیے اگی ہوئی تھی کہ ٹائر اسے مسلسل مسلتے نہیں۔

ایک خوف یہ بھی دل میں تھا کہ ابھی ہم نے ہوشے پہنچنا ہے۔ وہاں تھوڑی دیر کے لیے رک کر پھر اسی راستے سے نیچے بالے گون تک آنا ہے اور پھر شیوک کے اسی کنارے پر سفر کرتے ہوئے کیرس اور ماچلو کے راستے سکردو پہنچنا ہے اور تاریکی سے پیشتر پہنچنا ہے۔۔۔

سرسبز ڈھلوان کی جگہ خشک پہاڑیاں نظر آنے لگیں۔۔۔ راستہ سمندری لہروں کی طرح اوپر نیچے ہونے لگا اور بہت خطرناک انداز میں ہونے لگا۔

ہم نے پہلی بار اس راستے پر دو جیپوں کو دیکھا جن کے مسافر کولہوں پر ہاتھ رکھے کھڑے تھے اور وہ غیر ملکی کوہ نورد یا ٹریکر تھے۔ ایک جیپ کا ڈرائیور اس کے نیچے گھسا ہوا تھا۔ ابھی ہم کچھ فاصلے پر تھے کہ ایک خاتون نے دیوانہ وار ہاتھ ہلا کر روک لیا حالانکہ وہ ہاتھ نہ بھی ہلاتی تو لوگ رک جاتے۔ جین اور کھلی شرٹ اور سر پر اس نے دوپٹہ سا لپیٹا ہوا اور اس نے کھڑکی میں سے سر اندر کیا اور مست علی سے کہنے لگی اور اس خوبصورت نرمی سے کہنے لگی جو فرانسیسی لہجے میں انگریزی بولنے سے آتی ہے یعنی ایک سازش بھری جنسی سرگوشی کے انداز میں کہ ہماری جیپ خراب ہو چکی ہے اس لیے تھوڑی دیر کے لیے پلیز ادھر رک جائیے کیونکہ راستہ تنگ ہے اور راستے میں ہماری جیپ ہے اور پلیز آپ مائنڈ تو نہیں کریں گے۔۔۔ مست علی حسب معمول مسکراتا رہا لیکن کچھ بہ انداز دگر مسکراتا رہا اور میں اسے دیکھتا رہا اور وہ واقعی بے حد خوبصورت تھی اور پرکشش بھولپن اس کے چہرے پر تھا۔ خاصی دیر کے بعد اسے احساس ہوا کہ مست علی صاحب اس کی بات نہیں سمجھ رہے۔ تب اس نے مجھ سے رجوع کیا۔۔۔ اور شائد میں بھی اسی طرح مسکرانے لگا جیسے مست علی مسکرا رہا تھا اور پھر مجھے محسوس ہوا کہ موٹا نے بھی بہ انداز دگر مجھے گھورا ہے اور تب میں نے اس بی بی سے عرض کیا کہ جی ۔۔۔ ہم مائنڈ کرنے والے کون ہوتے ہیں اور ہم یہیں رک جائیں گے۔۔۔ بدقسمتی سے ان لوگوں کی جیپ فوراً ہی درست ہو گئی اور ہمیں ان کے قریب سے گذرنے کا راستہ مل گیا۔۔۔ رنگ برنگ رک سیک اور نیلے ڈرم جن میں کوہ پیما اپنا سامان پیک کر کے ان پر نمبر لگا دیتے ہیں۔۔۔ اور اس سامان میں وہ جو حشر سامان تھے۔۔۔

کے ٹو موٹل سکردو میں پہنچنے والے بیشتر ٹریکر ہوشے ہوشے کرتے پھرتے ہیں کیونکہ ادھر ہوشے سے پرے بلتستان کے چند بہترین اور خوبصورت ترین ٹریکس یا راستے ہیں۔ گنڈالو کی چوٹی کو بھی یہیں سے راستہ جاتا ہے اور اس برفپوش چوٹی کو سر

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

کرنا اتنا آسان ہے کہ اس کے اوپر اکثر ٹریفک جیم ہو جاتا ہے اور اوپر آنے والے چوٹی پر براجمان کوہ پیماؤں سے درخواست کرتے ہیں کہ براہ کرم ذرا جگہ خالی کر دیں تاکہ ہم بھی تاریخ میں نام لکھوا لیں کیونکہ ہمارے پیچھے ایک اور ٹیم چلی آ رہی ہے۔

ہوشے کا نالہ پرے ہو گیا اور اس کا شور بھی گم ہو گیا۔ پھر ایک زبردست چڑھائی آئی اور اس کے ساتھ چشموں کے چلنے کا شور آیا۔ جب ہم اوپر پہنچے تو پہاڑوں میں گھرے جو کے سرسبز کھیت دکھائی دیئے۔ ان کھیتوں کے آغاز میں چند پتھریلے مکان تھے اور ان کے سامنے کسی ایسے قبیلے کے لوگ تھے جو پتھر کے زمانے کا تھا۔۔۔ ہم پجارو سے اترے تو ابھی کانوں میں سفر کی گونج سفر میں تھی۔ تاریک کوٹھڑیوں کے سامنے خشک دھول آلود دھوپ سے روشن راستے پر ہوشے کے باسی زندگی کے کاموں میں مصروف تھے۔ انہوں نے ہمیں دیکھا تو ہم سے ذرا پرے ہوئے' ذرا ٹھٹکے جیسے کوئی معصوم جانور خطرناک انسان کو دیکھ کر ٹھٹکتا ہے۔۔۔ ان کے چہرے اور ہاتھ سیاہ تھے اور یہ اس دھوئیں کی سیاہی تھی جو ان کی بند کوٹھڑیوں میں پھیلتا ہے اور وہ شدید سردی سے بچاؤ کے لئے ناکافی آگ پر جھکے موسم سرما گزارتے ہیں۔ ان کے سروں پر قدیم وضع کی اونی بلتی ٹوپیاں تھیں۔ دو بوڑھی عورتیں ٹاٹ میں لپٹی ہوئی بے دانت مسکراہٹوں سے ہمیں دیکھتی تھیں اور شائد پچھلے برس کی جو کی فصل کو چھاجوں میں اچھال کر اسے صاف کرتی تھیں۔ میں نے ان کے قریب ہونے کی کوشش کی لیکن وہ "انگریز۔ انگریز" کہتی ہوئیں کوٹھڑیوں میں گھس گئیں۔۔۔ ہوشے ایک ایسا پڑاؤ ہے جہاں پاکستانی کم ہی آتے ہیں اور بعد میں مست علی نے بتایا کہ میمونہ اور عینی شائد باہر کی دنیا کی پہلی خواتین تھیں جو انہوں نے دیکھیں اور باہر کی دنیا سے مراد پاکستان کے وہ حصے ہیں جہاں سے ہم آئے تھے۔ چنانچہ ان کے "انگریز۔ انگریز" کہنے پر میمونہ بیگم بے حد تپ پا ہوئیں کہ ہم مسلمانوں کو موئے انگریزوں سے ملا رہے ہیں۔ اس نے ایک بڑی اماں کا کندھا پکڑ کر خوب زور سے ہلایا اور کہنے لگی "ہم پاکستانی ہیں۔ مسلمان۔۔۔ مسلمان۔۔۔ تم کیا ہو؟"

بڑی اماں نے بے یقینی سے میمونہ کو دیکھا اور اس کی آنکھیں عمر اور موسموں کی شدت سے سرخ دلدل میں بدل چکی تھیں اور پھر اس نے ناک صاف کرتے ہوئے کہا "مسلمان۔۔۔" اس پر میمونہ نے اپنی مسلمانی مکمل طور پر اسٹیبلش کرنے کے لیے کلمہ سنایا اور آیت الکرسی کا ورد کیا۔ بس یہ وہ طلسم تھا جس نے ہوشے کے تمام دروازے ہم پر کھول دیئے۔۔۔ سب لوگ بے دھڑک ہمارے پاس آنے لگے بچے

ہمارے گرد ہو گئے نوجوان لڑکیاں دروازوں کی اوٹ سے ہمیں دیکھنے لگیں اور چند بزرگوں نے آگے بڑھ کر ہم سے ہاتھ ملایا۔۔۔ جیسے ہم ان کے رشتے دار تھے۔۔۔ اور ہم ان کے رشتے تھے۔

شمال میں کھیتوں کے عجیب منظر بنتے ہیں۔ وادی خپلو اور دریائے شیوک کے کنارے جو کی فصل کٹ چکی ہے اور اس کی چھڑائی جاری ہے' ہوا میں سنہری تنکے اڑتے ہیں۔ ذرا بلندی پر آ جائیں تو جو اگرچہ پک چکا ہے لیکن ابھی کٹائی ہو رہی ہے اور یہاں ہوشے میں یہی فصل ابھی سرسبز تھی اور یہاں کے مکین دعا کرتے تھے کہ جلدی سے یہ پک جائے ورنہ سردیوں کا آغاز ہو گیا تو فصل ضائع چلی جائے گی اور ایسا کئی بار ہو جاتا ہے کہ گرمیاں اتنی مختصر ہوتی ہیں کہ خوشے ہرے ہی رہتے ہیں اور دانے پکتے نہیں۔۔۔

"مشہ برم ان" ہوشے کا پہلا ہوٹل ہے۔۔۔ چار کمرے ایک ڈرائنگ روم اور دیگر ضروریات کے لیے ہوشے کے کھیت۔۔۔ چاروں کمرے مقفل تھے کیونکہ ان میں قیام پذیر غیر ملکی کوہ نورد اوپر گئے ہوئے تھے۔ ڈائننگ روم میں سٹیل کا فرنیچر تھا جو باآسانی نیچے سے اوپر یہاں تک ٹرانسپورٹ ہو جاتا ہے۔ دیواروں پر بے شمار تصاویر تھیں۔ ان میں روز علی بھی تھا جو میسنر کے ساتھ یورپ گیا تھا۔۔۔ یورپ کے بڑے شہروں میں ہوشے کا روز علی کھڑا مسکراتا تھا' کبھی میسنر کے ہمراہ اور کبھی کسی حسین کوہ پیما خاتون کے ساتھ۔۔۔ جس کی آنکھیں کہتی تھیں کہ اگر کوہ نہ ہوں تو پھر بھی پیمائی تو کرنی ہے۔۔۔ یہ ہوٹل روز علی کی ملکیت تھا۔۔۔ اور یہاں ہم نے بلتستان کی بہترین چائے پی۔۔۔

ہوشے کو بین الاقوامی شہرت اس کے سب سے چھوٹے باسی "لٹل کریم" نے دی۔۔۔ "لٹل کریم" کو لٹل کریم اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ حقیقتاً لٹل ہے۔۔۔ یعنی تقریباً ۵ فٹ ۲ انچ کی قامت کا ایک ایسا پورٹر جس کی جرات اور قوت برداشت داستانوں کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ کچھ عرصہ پیشتر فرانسیسی ٹیلی ویژن نے اس کی زندگی پر ایک فلم تیار کی۔۔۔ لوگ اسے خصوصی طور پر دیکھنے جاتے ہیں اور غیر ملکی کوہ پیما ٹیموں کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ لٹل کریم کو اپنی ٹیم میں شامل کر سکیں۔۔۔

"لٹل کریم کہاں ہے؟" ہم نے مشہ برم ان کے ویٹر سے پوچھا۔

"وہ اوپر گیا ہے" اس نے جواب دیا۔

ایک تازہ تازہ صاف ستھرا ہو کر آنے والا نوجوان' لباس ' لبنی مارکیٹ میں

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

مٹرگشت کرنے والے نوجوانوں ایسا ' بال بنے ہوئے اور بڑی احتیاط سے چلتا میرے پاس آیا اور بڑی بے اعتنائی سے بولا "آپ لاہور میں گلبرگ کی فردوس مارکیٹ کے قریب رہتے ہیں ناں؟ میں نے آپ کو وہاں دیکھا ہے.... میں بھی وہیں اپنے بھائی کے پاس رہتا ہوں اور انگلش میڈیم سکول میں پڑھتا ہوں....."

جا تیرا ستیاناس ہو جائے.... میں نے دانت پیستے ہوئے زیرلب کہا.... اس نوجوان نے اس بلند اور دشوار راستے والی غیر معروف وادی کے سارے رومان کو تباہ کر دیا تھا.... یعنی ہم بتول کے مارو مار کرتے ہوشے جا پہنچے ہیں اور وہاں ہمیں لاہور کے ہمسائے مل جاتے ہیں.... بہرحال میں نے اس نوجوان کا دل رکھنے کی خاطر اس کے لباس کی تعریف کی اور رخصت کر دیا۔ ہم گاؤں سے نکل کر تھوڑی دور تک ان پگڈنڈیوں پر گئے جو اوپر جاتی تھیں.... کھیت میں کام کرنے والی ایک عورت میمونہ سے باتیں کرنے لگی "میرا رنگ بھی تمہارے جیسا ہے.... میرے پاس صابن ہوتا تو میں بھی منہ ہاتھ دھوتی.... نیچے سے آئی ہو؟ سنا ہے سکردو بہت بڑا شہر ہے.... نہیں میں تو کبھی ہوشے سے نیچے نہیں گئی ہاں اوپر جاتی ہوں گھاس کاٹنے کے لیے...." یہ تینوں بچے تمہارے ہیں؟ اتنے بڑے بڑے ہو گئے ہیں تو ان کا شادی کیوں نہیں بنایا....؟"

بلتستان میں نہایت کم عمری میں شادی کر دی جاتی ہے اور بلتیوں کے لیے یہ بات باعث حیرت تھی کہ اتنے بڑے بڑے بچوں کی ابھی شادی کیوں نہیں بنائی.... بھلا پہلے ماں باپ تو شادی اچھی طرح بنا لیں پھر بچوں کو بھی دیکھا جائے گا۔

ہوشے روائتی معنوں میں ایک خوبصورت گاؤں نہیں ہے....

پتھروں کی چند دیواریں ' کوٹھریاں ' ایک ہوٹل ' دو دوکانیں جو بند رہتی ہیں حالانکہ ان کے دروازوں پر "چوبیس گھنٹے کھلی رہتی ہے" لکھا ہوتا ہے ' ایک مختصر سا سرسبز رقبہ اور ان سے پرے دو خشک پہاڑ جن میں سے مشہ برم کی چوٹی دکھائی تو دیتی ہے لیکن یہ منظر بھی دل میں ناگہاں اترتا نہیں.... اور ہاں پتھر کے زمانے کے لوگوں کی طرح خوفزدہ اور دروازوں کے پیچھے پوشیدہ ہوتے ہوئے اہل ہوشے جن کے لباس کسی میوزیم میں رکھنے کے لائق ہیں....

تو پھر جو لوگ ہوشے کو دیکھتے ہیں اور اسے ہوش ربا کہتے ہیں اور بار بار یہاں واپس آتے ہیں وہ یہاں کیا دیکھتے ہیں؟.... شائد یہ موجودہ وقت سے پہلے کا گاؤں ہے ' یہاں جو ہوا ہے اسے بیسویں صدی کی ہوا نہیں لگی ' ہوشے انسانی تہذیب کی آخری حد سے ذرا آگے ہے.... اور اسی لئے یہاں آ کر کچھ گھبراہٹ سی محسوس ہوتی ہے کہ

یہ ہماری بستیوں سے الگ ہے.... اور یوں بھی ہوشے تو صرف آغاز ہے ان حیرت ناک مناظر کا جوان بھورے پہاڑوں سے پرے مشہ برم کی وادیوں میں ہیں....

عینی ایک پتھریلی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی ' دیوار پر جتنے بھی کپڑے سوکھ رہے تھے سب سرخ رنگ کے تھے۔ دروازے میں سے ایک ہوشین لڑکی جھانکتی تھی اور شرما شرما کر عینی کی طرف دیکھتی تھی اور عینی اسے اپنے پاس بلاتی تھی ا وہ آتی نہیں تھی۔

سمیر اور سلجوق "چوک" میں بیٹھے ایک قلیلہ سے بابا جی سے باتیں کر رہے تھے۔ بابا جی اونی دھاگے کا ایک گولا اپنے سر کے گرد اس طرح تھے جیسے گویا گھماتے ہیں اور یوں وہ دھاگہ بٹ رہے تھے۔

میمونہ "کے ٹو شاپ ہوشے" کے بورڈ کے نیچے کھڑی اس پر لکھی عبارت پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی "خوش آمدید۔ کوہ پیمائی کی مہم کے لیے۔ ٹریکنگ پارٹی۔ کے ٹو شاپ ہوشے۔ کوہ پیمائی کا سامان۔ بیگ پیک۔ خیمے وغیرہ یہاں کرائے پر دستیاب ہیں۔ انگلش اور پاکستانی کھانے بھی ملتے ہیں"......

مست علی مشہ برم ان کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے سگریٹ پیتا تھا اور مسکراتا تھا۔

ہماری آمد سے ہوشے میں جو ارتعاش پیدا ہوا تھا وہ ختم ہو کر نارمل ہو گیا تھا.... ہم اب اجنبی نہ تھے.... ہمیں جی بھر کے دیکھنے کے بعد ہوشے کے لوگ اپنے اپنے کاموں میں پھر سے مصروف ہو چکے تھے۔

اوپر پہاڑوں میں سے ایک جوڑا نیچے آیا.... وہ بلجیئم کے رہنے والے تھے۔ لڑکی نے سر پر پگڑی سی باندھ رکھی تھی اور شلوار قمیض میں خوب لپٹی لپٹائی تھی۔ لڑکا بھی صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس تھا۔ وہ دونوں جب لاہور میں مجھ سے ملنے کے لیے آئے تو اتنے اچھے نہ لگے.... وہ صرف وہیں اچھے لگتے تھے مشہ برم کے پس منظر کے ساتھ ہوشے میں....

ہر انسان کی شخصیت میں اس کی اپنی لینڈ سکیپ ' پس منظر اور آب وہوا بھی شامل ہوتے ہیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ شمال کے کسی دور افتادہ قصبے یا وادی کے مکیں کو میں نے اپنا کارڈ دیا اور ان میں سے کوئی ایک بھی لاہور میں میرے گھر تک پہنچ جاتا ہے اور مجھے ہمیشہ حیرت ہوتی ہے کہ وہاں میرے ڈرائنگ روم میں وہ کتنا معمولی سا انسان ہو جاتا ہے بلکہ انسان بھی نہیں کوئی چیز کوئی شے ہو جاتا ہے جو میرے

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

صوفے پر پڑی ہے۔۔۔ صرف اس لیے کہ وہ اپنی لینڈ سکیپ سے نکل کر باہر آ جاتا ہے' اپنے پس منظر کے بغیر ہوتا ہے۔۔۔ وہاں فیئری میڈو میں رائے کوٹ گلیشیئر کے اوپر ایک کچے خطرناک راستے پر پھونک پھونک کر قدم رکھنے والا کوئی اور ہوتا ہے۔۔۔ وادئ روپل میں خنک شام میں پھولوں کے ایک کھیت کے کنارے چپاتیاں بنانے والا شخص کوئی اور ہوتا ہے۔۔۔ نانگا پربت کے نیچے ٹاپ میدان کی وسعت میں مجھے چائے کا ایک پیالا تھماتا ہوا پورٹر بس وہیں اچھا لگتا ہے۔۔۔ اپنے پس منظر میں اپنی ہوا اور اپنی لینڈ سکیپ میں۔

ہمیں علم نہ تھا کہ ہوشے میں شب بسری کے لیے اب ایک عدد ہوٹل تعمیر ہو چکا ہے اور اگر ہم رات ٹھہرنے کا ارادہ کر لیں تو کم از کم اس کے ڈائننگ روم میں کچھ سلیپنگ بیگ ڈالے جا سکتے ہیں۔ ہمیں علم ہوتا تو ہم ہوشے میں ضرور ایک رات بسر کرتے۔۔۔

کیرس میں میر صاحب کے حکم سے تیار کردہ کھانا ہمارا منتظر تھا۔

سکردو میں بھی اطلاع ہو چکی تھی کہ ہم آج شام تک پہنچ جائیں گے۔۔۔

اور اگر ہم نہیں پہنچتے۔۔۔ تو جیسا کہ یہاں کا دستور ہے آپ کی جیپ کی تلاش شروع ہو جاتی ہے۔ ہمیں ہوشے سے جانا ہی تھا۔

مست علی ہمیں بتا رہا تھا کہ ماچلو کے آگے سڑک ایک دریا میں سے گزرتی ہے۔۔۔ اور شنید ہے کہ اس میں ان دنوں پانی زیادہ ہو جاتا ہے اور اگر ایسا ہوا تو ہمیں خپلو واپس جا کر پھر سکردو جانا پڑے گا۔۔۔

شہ بروم کی برف پہلے ہماری ونڈ سکرین میں دکھائی دیتی تھی اور اب وہ پاجیرو کے عقبی شیشے میں سے نظر آتی تھی کیونکہ ہم ہوشے سے نکل رہے تھے۔

اونچی گھاس اور بڑے پتھروں والا راستہ اب سائے میں آ چکا تھا اور وہاں خنکی تھی۔ ونڈ سکرین پر بلند گھاس کے سرسبز بال پریشان ہو کر بکھرتے چلے جاتے تھے۔

بلندیوں کی سرد مہک تیز ہو رہی تھی۔

ایک طویل سفر کے بعد ہم ایک کچے راستے سے نیچے اتر رہے تھے' نیچے دریائے شیوک پر ایک پل تھا جس کے دوسری جانب سکردو جانے والی سڑک تھی۔ ہم پل کے پار ہوئے اور سکردو روڈ پر آئے وہاں جدھر سے ہم آئے تھے ادھر ایک سنگ میل پر لکھا تھا۔۔۔ ہوشے ۹۳ کلومیٹر۔

"وادئ شگر"

وہاں خشک بھوری چٹانوں پر دھوپ تانبے کی طرح ٹھنڈی ہو کر ڈھلتی تھی اور بڑے بڑے پتھروں اور خشک گھاس اور جھاڑیوں پر پہلے تھی اب نہیں تھی لیکن اس کی ہلکی سی روشنی ابھی ان پر باقی تھی۔۔۔ دھوپ ڈھلتی تھی لیکن بلند ہوتی تھی۔

ہماری جیپ وادئ شگر کے راستے پر تھی۔

ہم دریائے سندھ کو عبور کر کے دوسری جانب ایک لق و دق صحرائی لینڈ سکیپ میں کچھ دیر سفر کرتے رہے اور اس پر ہمیں کسی عظیم صحرا کا شائبہ ہوا لیکن ریت کے یہ ٹیلے جیپ کے ٹائروں تلے بہت دیر تک نہ رہے اور ہم خشک پہاڑوں میں اٹھتی ایک سڑک پر آ گئے۔۔۔ میں حسب عادت کھڑکی سے باہر "منظر" کو دیکھ رہا تھا اور وہاں بھوری چٹانوں پر دھوپ ڈھلتی تھی اور اس کی زردی میں سیاہی گھلتی تھی۔ اور ان چٹانوں کو میں دیکھتا رہا اور پھر میں نے انہیں سانس روک کر غور سے دیکھا کہ ان چٹانوں میں وہاں جہاں سے دھوپ جگہ چھوڑ رہی تھی وہاں چٹانوں کی چوٹیوں کے آس پاس دھوپ میں بھی اور سائے میں بھی کوئی شے حرکت میں تھی۔ ایسی حرکت جو شارپ فوکس کی اس ڈھلتی دھوپ کی بھوری تصویر کو آؤٹ آف فوکس کر رہی تھی۔۔۔ اور اس شے کا رنگ ذرا الگ ہوا اور وہ بھی بھورے رنگ کی چٹانوں ایسی۔۔۔ اور ایک نہ تھی۔۔۔ اور وہاں یکدم زندگی تھی۔

"عباسی جیپ روک دو۔۔۔" میں نے ذرا آگے ہو کر سرگوشی کی۔

جیپ رک گئی۔ ہم سب باہر آ گئے

"وہاں چٹانوں کے قریب۔۔۔" میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔۔۔

کہاں؟ کہاں۔۔۔ سب کی نظریں بھوری لینڈ سکیپ پر سفر کرتی تھیں۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"وہاں ابو..." عینی نے ذرا بلند آواز سے کہا اور گردن نیچی کر کے سلجوق کو کہنے لگی "بھائی جان چھ ہیں ـــــ"

سمیر نے ان کو دیکھ لیا تھا لیکن وہ بالکل خاموش تھا' اس کی حیرت اس کے لبوں پر تھی۔ وہ چھ شاندار بھورے اڑیال تھے اور ڈھلتی دھوپ میں یوں ساکت کھڑے تھے جیسے وہ کسی قدیم دیومالائی یادگار کے لیے تراشے گئے ہوں۔ انہی پتھروں سے جو ان کے آس پاس تھے۔

ہمیں معلوم تھا کہ ہماری ذرا سی حرکت سے وہ چوکنے ہو جائیں گے۔۔۔

اس وسیع لینڈ سکیپ میں صرف ڈھلتی دھوپ تھی' ایک پہاڑی راستہ تھا اس پر ایک جیپ تھی اور جیپ کے مسافر تھے اور ان سے تھوڑی دور بلندی پر چھ اڑیال تھے اور یہ ساری تصویر فی الحال مکمل طور پر فوکس میں تھی اور اسے بہرطور جلد ہی آؤٹ آف فوکس ہونا تھا اور ہم نے طے کر لیا تھا کہ کم از کم ہم اس تصویر کو آؤٹ آف فوکس نہیں کریں گے اور ہم آنکھیں بہت دیر کے بعد جھپکتے تھے۔

جانور اپنے قدرتی ماحول میں کتنا شاندار اور اوریجنل لگتا ہے اس کا احساس پہلی مرتبہ ہوا۔

اور پھر ہم میں سے کسی کے کھانسنے کی آواز ان تک پہنچی۔ انہوں نے فوراً ہماری جانب گردنیں گھمائیں اور پھر کچھ دیر کے لیے اسی حیرت سے ہمیں دیکھا جس حیرت سے ہم انہیں دیکھتے تھے اور پھر انہوں نے چند قلانچیں بھریں اور ۔۔۔۔ چٹانیں اور بھوری گھاس خالی ہو گئی۔۔۔۔

"چلیں؟" عباسی نے کہا۔۔۔۔"وہ تو چلے گئے"

"یہ تمہارا خیال ہے۔۔۔۔ وہ یہیں ہیں ہمارے پاس اور رہیں گے ـــــــ"

جیپ ایک مرتبہ پھر راستے پر بلند ہونے لگی۔

وادیٔ شگر سکردو سے زیادہ دور نہیں ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ دریائے سندھ کے دوسری جانب جو پہاڑ ہیں ان کے سائے میں شگر ہے۔ اور یہ وہی راستہ ہے جو کے ٹو کے بیس کیمپ تک جاتا ہے اور اگر موسم خراب نہ ہو تو آپ پندرہ دن کے سفر کے بعد پہاڑوں کے اس اہرام کو دیکھ لیتے ہیں۔ ایک بزرگ محقق نے شمالی علاقہ جات پر جو کتاب لکھی ہے اس میں انہوں نے ہمیں بتایا ہے کہ شگر سے انہوں نے کے ٹو پہاڑ کے نظارے کئے اور اس برفپوش چوٹی کو بہ نفس نفیس دیکھا۔۔۔۔ بزرگ محقق کی عقابی نظروں نے اس نظارے کو شگر سے ہی دیکھ لیا جو عوام الناس کو پندرہ

دن کے سفر کے بعد دیکھنا نصیب ہوتا ہے۔

شگر سے آگے داسو ہے اور اس سے پرے اشکولی کا خوبصورت گاؤں ہے۔۔۔ فی الحال وہاں تک جیپ نہیں جاتی۔۔۔

بھورے پہاڑ زیادہ بلند نہ تھے۔ راستہ ہموار ہو گیا۔

پہاڑوں کے دوسری جانب نیچے وادیٔ شگر دکھائی دی۔ عباسی نے جیپ روک دی۔

"تارڑ بھائی یہاں آپ دیکھیں بھی اور سنیں بھی ـــــ"

اور یہاں ہم ڈھلتی شام کے سائے میں تھے اور نیچے بہت نیچے دریائے شگر پھیلا ہوا تھا اور وہاں سے اس کے بہاؤ کا شور سفر کرتا ہوا اوپر ہم تک پہنچتا تھا تو مدھم سرسراہٹ میں بدل جاتا تھا۔ لیکن لگتا یوں تھا جیسے دریا کا پھیلاؤ ٹھہرا ہوا ہے۔ ہر شے رکی ہوئی ہے۔۔۔ اور ہوا میں ایک گہرا سکون ہے۔۔۔

وادیٔ شگر کے کھیت اور درخت سائے میں جا چکے تھے۔

نیچے دریا کے کنارے ایک گھر تھا۔۔۔ اور ہم دیکھ سکتے تھے کہ اس کے آس پاس دور دور تک کوئی آبادی نہ تھی۔۔۔ یہ وہی گھر تھا جس کی ہر شخص کو تمنا ہوتی ہے اور وہ نہیں ملتا اور اگر مل جائے تو وہ اس میں رہ نہیں سکتا کیونکہ وہ شہر کے شور کا عادی ہو چکا ہوتا ہے۔

جیپ نیچے اترنے لگی۔

وادیٔ شگر کے کھیت بے حد وسیع تھے۔ ٹریکٹر بھی دکھائی دیتے تھے۔

ایک راستہ سیدھا داسو کی جانب چلا گیا اور ہم ریسٹ ہاؤس کی جانب مڑ گئے۔

اور شگر کا ریسٹ ہاؤس۔۔۔

دو کمرے ۔ اترتی ہوئی شام ۔ نالے کا شور اور اس نالے میں وہ پتھر جن کے بارے میں ایک لاہوریئے دوست نے کہا تھا کہ جناب شگر کے دریا کے پتھر تو حیرت زدہ کر دیتے ہیں اور واقعی ان کے رنگ انوکھے تھے۔

اور اس ریسٹ ہاؤس کے سبزہ زار میں ایک غریب الوطن سیاح سر جھکائے ہمیں دیکھتا تھا اور شکایت بھری نظروں سے دیکھتا تھا کیونکہ ہماری آمد سے پیشتر وہ ریسٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں مقیم تھا' سارا دن خوبانیاں کھاتا تھا اور رات کو لالٹین کی روشنی میں فرانسیسی شاعری پڑھتا تھا۔ فرانسیسی اس لیے کہ وہ خود فرانسیسی تھا۔ اور اب ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار نے اسے نکال باہر کیا تھا کہ سکردو سے صاحب

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

آ رہے ہیں اور بکنگ کروا کے آ رہے ہیں لیکن تم فکر نہ کرو جب وہ اپنے کمروں میں سو جائیں گے تو میں ڈرائنگ روم کے صوفے پر تمہیں بستر بنا دوں گا۔ لالٹین پاس رکھ دوں گا اور تم فرانسیسی شاعری پڑھتے رہنا۔

سلجوق نے اپنی فرانسیسی کے چند فقرے اس پر آزمائے اور پھر ناک چڑھا کر کہنے لگا۔ فضول سا فرانسیسی ہے خود اپنی زبان بھی نہیں سمجھتا۔۔۔

سمیر نے اس پر "یو فرینڈ می فرینڈ" والی انگریزی آزمائی اور دونوں فرفر گفتگو کرنے لگے۔ میمونہ اور عینی شگر نالے کے کنارے ایک پتھر پر براجمان تھیں اور میرے بلانے پر بمشکل متوجہ ہوتیں اور بہروں کی طرح خوش دلی سے مسکرانے لگتیں کیونکہ ان تک میری آواز نہیں پہنچتی تھی' وہاں جہاں وہ تھیں صرف پانی کا شور تھا۔

عباسی کمروں کا معائنہ کر رہا تھا اور چوکیدار کے ساتھ مذاکرات کر رہا تھا۔

وادی شگر ذرا اداس اور بند سی لگتی تھی۔۔۔ جیسے اس میں بھید بہت ہوں۔

عباسی چوکیدار کے ہمراہ میرے پاس آیا "تارڑ بھائی یہ کہتا ہے کہ اسسٹنٹ کمشنر فدا حسین دو مرتبہ آ چکے ہیں اور آپ کے لیے پیغام دے کر گئے ہیں کہ۔۔۔"

دو برس پیشتر جب میں خان اور نظامی کے ہمراہ پہلی بار بلتستان آیا تھا تو خواجہ مرداد کے حوالے سے فدا حسین سے خپلو میں ملاقات ہوئی تھی اور وہ ان دنوں خپلو کے اے سی تھے۔ میں انہیں اپنی آمد کے بارے میں سکردو سے اطلاع دے چکا تھا۔

رات کا کھانا ان کے ہاں تھا اور بلتی مہمان نوازی کی روایات کی پاسداری کے ساتھ تھا۔۔۔ شگر کی خوبانیوں کا ذائقہ بے حد شاندار تھا۔

واپسی پر اگرچہ سلجوق کے ہاتھ میں ٹارچ تھی لیکن وہ اس کی روشنی راستے کی بجائے درختوں اور پرانے مکانوں پر رکھتا تھا اور ہم ٹھوکریں کھاتے چلتے تھے۔ چوک کے قریب سکھوں کا ایک ویران گوردوارہ تھا۔

ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں فرانسیسی سیاح لالٹین کی روشنی میں کچھ کھانے کی کوشش کر رہا تھا۔۔۔ ایک بڑے سے پیالے میں کوئی نامعلوم محلول تھا جس کا چمچہ بھر کر وہ منہ میں ڈالتا اور پھر دیر تک اس کے ذائقے پر بڑی سنجیدگی سے غور کرتا۔۔۔ ہمیں دیکھ کر وہ بلاوجہ شرمندہ ہوا اور کہنے لگا "میں کسٹرڈ کھا رہا ہوں۔۔۔"

"اس کا ذائقہ کیسا ہے؟" سلجوق نے پوچھا۔

اس نے پھر ایک چمچہ محلول منہ میں ڈالا اور پھر منہ بنا کر نہایت فکرانگیز لہجے میں بولا "سٹرینج کسٹرڈ۔۔۔"

"کیوں؟" سمیر مسکرا رہا تھا۔

"میں نہیں جانتا لیکن میں نے ایسا کسٹرڈ ساری عمر نہیں کھایا۔۔۔ سٹرینج کسٹرڈ!" معلوم ہوا کہ فرانسیسی کئی روز سے اس ریسٹ ہاؤس میں مقیم ہے اور چوکیدار اسے طرح طرح کے "انگریزی" کھانے بنا کر کھلاتا رہتا ہے۔ آج اس نے اسے خصوصی کسٹرڈ بنا کر کھلایا تھا جو بقول اس کے تمام انگریز لوگ اور امریکی لوگ بہت شوق سے کھاتے ہیں اور جب بھی ٹیمیں ادھر سے ادھر کی طرف جاتی ہیں تو وہ سب صرف شگر ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار کے ہاتھوں کا بنایا ہوا کسٹرڈ کھانے کے لیے ادھر رک جاتے ہیں۔۔۔

"چوکیدار نے کہا تھا کہ یہ فروٹ کسٹرڈ ہے لیکن یہ صرف سٹرینج کسٹرڈ ہے۔۔۔"

اس نے سر ہلایا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ چوکیدار سراسر ایک پرائیویٹ ترکیب کے تحت کسٹرڈ بناتا ہے یعنی پانی میں آٹا گھول کر اس میں تھوڑی سی چینی ملاتا ہے اور پھر اسے ابال کر فروٹ کسٹرڈ کے طور پر پیش کر دیتا ہے۔۔۔

نالے کے شور کے باوجود رات پرسکون گزری اور گہری نیند میں گزری۔۔۔ لیکن اس گہری اور پرسکون نیند میں بھی ڈھلتی شام میں بھوری چٹانوں میں وہ چہ مجھے نظر آئے۔۔۔ لیکن وہ حرکت نہیں کرتے تھے' پتھر ہو چکے تھے۔۔۔ وہ میرے ساتھ ہی چلے آئے تھے لیکن پتھر ہو چکے تھے۔۔۔

اس ٹھنڈک والی صبح میں شگر کے بازار کے پس منظر میں سفیدے کے درخت بلند ہوتے تھے اور ان کے عقب میں پہاڑ تھے اور ان پر کہیں کہیں برف تھی۔

ہمارے ساتھ محمد حسن قانون گو تھے۔۔۔ مقامی محقق اور لوک داستانوں کی بہ ذات خود ایک داستان۔۔۔ تنومند جسم' باریش اور بارعب۔۔۔ ہمنگوے کے بلتستانی بھائی لگتے تھے۔۔۔ فدا حسین خود مقدمے نپٹانے میں مصروف تھے اس لیے محمد حسن آج کے دن کے لیے ہمارے گائیڈ تھے۔

شگر کی مہشیشلٹی یہاں کا زہر موہرہ پتھر ہے جس سے تراشیدہ پیالے' انگوٹھیاں اور چھوٹے چھوٹے کھلونے بازار میں فروخت ہوتے ہیں۔

"یہ زہر موہرہ پتھر کہاں سے ملتا ہے؟" میں نے ایک دوکاندار سے پوچھا۔

"اوپر سے۔۔۔" اس نے کہا۔

"اوپر کہاں سے؟"

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"اوپر وہاں سے ——" اس نے اوپر اشارہ کیا۔

"آپ بتائیں حسن صاحب؟"

حسن صاحب کھانسے "بس یہ اوپر سے ہی ملتا ہے.... کہتے ہیں کہ دشوار گذار راستے ہیں پر خطر چٹانیں ہیں اور وہاں کہیں یہ ملتا ہے اور جس کسی کو ملتا ہے وہ بتاتا نہیں تو بس یہ اوپر سے ہی ملتا ہے"۔

بازار کے قریب نالے کے پار شگر کی مشہور خانقاہ تھی....

تبتی طرز تعمیر کی یہ عظیم خانقاہ صرف اس لیے دکھائی دیتی ہے جب آپ اس کے پر شکوہ چناروں کے پاس سے گذر کر اس کے قدموں میں پہنچتے ہیں اور تب آپ کو احساس ہوتا ہے کہ یہ شاہکار عمارت کتنی بلند اور کتنی پروقار ہے۔ کتنے جنگل اس کی تعمیر میں کام آئے ہوں گے' کتنے پر ہیبت درختوں کے دیوہیکل تنے اس کے ستون بن کر کھڑے ہیں' اور سینکڑوں برسوں سے کتنے لاکھوں لوگ اس کے پاکیزہ ٹھہراؤ میں اس کے فرش پر جھکے ہوں گے.... کیرس۔ خپلو اور شگر کی ان عظیم خانقاہوں کا بیان ممکن نہیں لیکن یہ عبادت گاہیں صداقت اور اپنی منفرد کوہستانی خوبصورتی میں بادشاہی مسجد لاہور اور مسجد قرطبہ سے کم نہیں.... تقدس صرف شان و شوکت سے ہی ظاہر نہیں ہوتا بلکہ اس کا پیمانہ وہ احساس ہے جو کسی عبادت گاہ میں داخل ہوتے ہوئے آپ کے روم روم میں پھوٹتا ہے۔

اس کے صحن میں وہ عالی شان چنار ہیں جنہیں اس خانقاہ کے ساتھ قومی ورثہ قرار دیا جانا چاہئے لیکن ایسا کون کرے' کوئی سکردو آئے اور پھر شگر آئے تو ایسا کرے.... میں ایک مرتبہ پھر ان چناروں کی وجاہت اور بلندی کو بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ یہ قدرت کا شاہکار ہیں۔ میں دوبارہ صرف ان چناروں کو دیکھنے کے لیے شگر جا سکتا ہوں۔

"ان چناروں کی عمر کیا ہو گی حسن صاحب؟"

"تقریباً پانچ سو برس ——"

کسی قدیم عمارت کو دیکھ کر ہم کہتے ہیں کہ اس کے درودیوار نے تاریخ کے کیسے کیسے ادوار دیکھے ہوں گے جب کہ سنگ و خشت دیکھ نہیں سکتے' البتہ درخت دیکھتے ہیں کہ وہ زندہ ہوتے ہیں' اور چنار کے پتے تو خزاں میں حنائی ہتھیلیوں کی طرح سرخ ہوتے ہیں تو شگر کے ان شاندار چناروں نے کیا کیا نہ دیکھا ہو گا....

"اور جب چنار کی عمر پانچ سو برس سے تجاوز کر جاتی ہے تو اس میں آگ لگ جاتی ہے ——" حسن صاحب داڑھی میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"ہم نے یہ تو سنا تھا بلکہ کسی حد تک مشاہدہ بھی کیا ہے کہ خزاں میں چنار پتوں کی سرخی اتنی تیز ہوتی ہے کہ آگ کا گماں ہوتا ہے لیکن کیا یہ سچ ہے؟"

"جی بالکل ——" حسن کہنے لگے "میں ابھی مسجد کے راستے میں آپ کو ایک چنار دکھاؤں گا جس میں آگ لگی ہوئی ہے"

اور مسجد کے راستے میں وہ چنار تھا۔ اس کی ٹہنیاں سوکھ چکی تھیں اور پتے پژمردہ تھے اور تنا کھوکھلا ہو رہا تھا۔ حسن صاحب نے اس کے تنے میں جھانکا اور کہنے لگے "خود دیکھ لیجئے"

تنے کے اندر لکڑی کو گھن لگ چکا تھا اور وہ مردہ تھی.... "آگ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہی گھن جو لگتا ہے جس کی وجہ سے چنار مرجاتا ہے اس کو آگ لگنا ہی کہتے ہیں.... اور یہ قدرت کی طرف سے ہوتا ہے کہ پانچ سو برس کی عمر کے بعد چنار مرجاتا ہے ——"

دھوپ تیز تھی اور راستوں میں دھول تھی لیکن اس دھوپ اور دھول میں گرمی کی بے چینی نہ تھی بلکہ ٹھنڈ کا شائبہ تھا۔

ایک چبوترے پر سالخوردہ لکڑی کی قدیم آرائش میں گارے اور پتھروں کا ایک بڑا چوکور کمرہ' اس میں خوشنما لیکن موسموں کی شدت سے اپنے گل بوٹوں سے خالی لکڑی کی چوکور کھڑکیاں' ایک کونے میں ایک چھجے کے آثار' ایک چندہ بکس اور اس کے اوپر بورڈ "چندہ بکس برائے مرمت مسجد".... اور یہ سب کچھ تیز دھوپ میں۔

اور یہ مسمار ہوتی مسجد بلتستان کی قدیم ترین مسجدوں میں سے ہے اور صرف چند ہزار روپے سے اس کی مرمت ہو سکتی ہے یہ مستحکم ہو سکتی ہے۔

پرانا دروازہ گر گیا تو اس کی جگہ ایک نیا نکور دروازہ تو لگ گیا.... لیکن باقی عمارت سے الگ اور بے جوڑ۔

ہم سب جوتے اتار کر اندر چلے گئے۔ کتنی قدیم؟ پانچ سو برس.... تو جتنی عمر چنار کی کیا اتنی ہی مسجد کی ہونی چاہئے.... اس مسجد کی لکڑی کو بیچ بیچ گھن لگ چکا ہے

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

اور یہ صرف چند برس تک ہی دکھائی دے گی۔۔۔ کھڑکی کی سل پر ایک بڑی ساری گٹھڑی دھری تھی جس میں سے بھورے کاغذ دکھائی دیتے تھے۔۔۔ یہ ہاتھ سے لکھے ہوئے قرآن پاک کے اوراق تھے جو لوگ مسجد میں رکھ جاتے تھے۔ ہم نے حسن صاحب کی اجازت سے ان میں سے چند اوراق بطور تبرک چن لئے۔

مسجد کے سامنے پرانی لکڑی کا ایک ڈھانچہ تھا جس کے شہتیر گرے ہوئے تھے اور ڈھانچے کے درمیان میں زمین دھنسی ہوئی تھی اور اس میں بھی لکڑی کے ٹکڑے اور شہتیر گرے ہوئے تھے۔

"یہ ایک مسلمان بزرگ کی قبر ہے۔۔۔۔" حسن صاحب نے قریبی درخت کے سائے میں ہو کر چہرے سے پسینہ پونچھا۔ "اب ڈھے چکی ہے' آپ اگر اندر جا کر اس گڑھے میں جھانکیں تو شائد بزرگ بھی نظر آ جائیں"

یہاں بھی دھوپ تھی اور کسی قدیم مقبرے کا ڈھانچہ تھا' صرف شہتیر رہ گئے تھے اور قبر کی جیومیٹریکل شکل باقی تھی اور یقیناً بزرگ کے آثار بھی جھانکنے سے شائد دکھائی دے جاتے۔

"یہ بزرگ پہلے ایک بدھ راہب تھے۔ ان کا نام شرنگ زانگ سپا تھا اور وہ پورے لداخ اور تبت میں اپنی پارسائی اور نیکی کی وجہ سے جانے جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ہمہ وقت "یاستو" کی تسبیح کیا کرتے تھے جو بدھ مذہب کا کوئی منتر ہے اور ایک روز کیا ہوا کہ ان کی زبان سے "یاستو" کی بجائے "یاصمد" جاری ہو گیا۔ اور اسی شب انہیں خواب میں رسول کریمؐ کی زیارت ہوئی اور انہیں بتایا گیا کہ شگر میں ایک مسلمان ولی اللہ تشریف لائیں گے اور تم ان کے ہاتھوں اسلام قبول کر لینا۔۔۔ چند روز بعد سید علی ہمدانی شگر تشریف لائے اور اس بدھ راہب نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔ اس قبولیت کے بعد ان کی پارسائی اور نیکی میں اضافہ ہوا اور وہ ایک مسلمان بزرگ کی حیثیت سے پورے علاقے میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے۔۔۔ یہ ان کی قبر ہے"

شگر کے اتنے بڑے بزرگ کی قبر کا کوئی پرسان حال نہیں۔

"اور یہ پتھر۔۔۔" حسن صاحب جس پتھر پر ایک پاؤں رکھ کر کھڑے تھے اسے جھک کر چھوتے ہوئے بولے "یہ پتھر بھی قبر ہے۔۔۔ ایک ایسے راجہ کی جو رعایا کے بچوں کو کھا جایا کرتا تھا۔۔۔۔"

عینی نے ایک جھرجھری لی اور میرا ہاتھ تھام لیا "کیا سچ ابو؟"

"ہاں بیٹے۔۔۔" حسن صاحب بولے "یہ علاقے تمام دنیا سے کٹے ہوئے تھے یہاں بہت ظلم ہوئے۔ اگرچہ یہ ایک لوک کہانی ہے لیکن۔۔۔ وہ راجہ ایسے ہی تھے۔ اور پھر دیکھ لو ان ظالم راجاؤں کی قبروں کے نشان بھی باقی نہیں۔۔۔"

حسن صاحب نے بتایا کہ پرانے وقتوں میں یہاں راجہ کا مقبرہ تھا۔ اور جب مقبرہ ڈھے گیا تو لوگ اس کے پتھر اٹھا کر لے گئے۔ اور باقی بس یہی ایک پتھر ہے۔۔۔

"ذرا اوپر دیکھیں۔۔۔۔"

ہم سب نے نہایت فرمانبرداری سے اوپر دیکھا۔۔۔ خشک پہاڑ جو ہم پر جھکے ہوئے تھے اور تیز دھوپ میں تھے۔

"وہاں بلندی پر جو دیواروں کے آثار ہیں یہ شگر کا قلعہ تھا اور اس کے ساتھ راجہ کا محل تھا۔ یہاں جہاں ہم کھڑے ہیں رعایا کا اجتماع ہوتا اور سب لوگ اوپر پہاڑ کی طرف دیکھتے جہاں محل تھا اور وہاں سے راجہ اترتا تھا۔ کیسے اترتا تھا؟ محل سے لے کر یہاں تک بکری کے بالوں کا ایک موٹا رسہ باندھا گیا تھا۔ راجہ ایک ڈولی میں سوار ہوتا اور اس ڈولی کے اوپر ایک کنڈا لگا ہوتا یعنی ایک ہک۔۔۔ اور اس ہک کو رسے کے اوپر لگا دیا جاتا اور راجہ صاحب کی ڈولی بڑی تیز رفتاری سے نیچے یہاں تک آ جاتی۔۔۔ راجہ اپنی رعایا کی شکائتیں سنتا اور پھر اسی ڈولی کے ذریعے واپس اپنے محل میں چلا جاتا۔۔۔۔"

اس میں ایک بہت اہم سوال ہے انکل حسن۔۔۔۔ "سلجوق نے عینک درست کر کے اوپر اس چوٹی کو دیکھا جہاں محل کے آثار تھے" یہ تو درست ہے کہ راجہ صاحب ڈولی میں سوار ہو کر رسے پر ہک لگا کر پھسلتے ہوئے نیچے آ جاتے تھے لیکن وہ یہاں سے بلندی کی طرف خود بخود کیسے چلے جاتے تھے؟"

"بیٹے آپ نے شائد کہیں بلتستان یا ہنزہ کے علاقے میں دریاؤں اور ندیوں پر بنے ہوئے "جھولا برج" دیکھے ہوں؟ یعنی دریا کے اوپر ایک رسہ اور اس کے ساتھ لٹکا ہوا ایک جھولا جس پر دو شخص بیٹھ سکتے ہیں اور پھر وہ اپنے آپ کو جھلاتے ہوئے پار چلے جاتے ہیں۔ یا پھر ایک جانب کنارے پر بیٹھا ہوا شخص اس جھولے کے ساتھ بندھے ہوئے رسے کو کھینچ کر اسے چلاتا ہے۔۔۔۔ بس یہی سسٹم یہاں بھی رائج تھا۔ جب راجہ صاحب رعایا سے فارغ ہو جاتے تو اوپر محل میں منتظر ان کے کارندے اس

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

رسے کو کھینچتے جو ڈولی کے ساتھ بندھا ہوتا تھا اور یوں ڈولی اور راجہ صاحب اوپر محل میں۔۔۔"

"ہوں" میر نے سر ہلایا۔ "عجب لطف تھی اس زمانے کی۔۔۔"

شگر نالے کے پار ایک نسبتاً نئی خانقاہ تھی اور اس کی چھت پر تبتی شکل کا ایک ستارہ تھا۔ خانقاہ ویران تھی۔ ایک جھکا ہوا بلتی آیا اور اس نے ہمیں کافر جان کر شور مچا دیا۔ حسن صاحب نے اسے تسلی دی لیکن اس کی تسلی نہ ہوئی کیونکہ وہ بار بار چٹکی بجا کر رقم کا مطالبہ کر رہا تھا اور ہم صرف اسے مسکراہٹ دیتے تھے اور وہ کہتا تھا کہ یہ کافر ہیں میں انہیں خانقاہ میں نہیں جانے دوں گا۔۔۔

خانقاہ چٹانوں کے اوپر آسمان کو اٹھتی بلندی کے عین نیچے تھی۔۔۔ اور اسی بلندی پر قدیم محل اور دفاعی حصار کے آثار تھے۔

محمد حسن گویا شگر کے شہرزاد تھے کہ ایک کہانی ختم ہوتی اور وہ دوسری داستان شروع کر دیتے۔

"وہاں وہ شہزادی رہتی تھی جو مرنے کے بعد اب بھی اہل شگر کی خوشیوں میں شریک ہوتی ہے۔"

"مرنے کے بعد بھی؟" عینی کا منہ کھل گیا۔

"امپاسبل" میر نے کندھے جھٹکے۔

محمد حسن کسی ثمرقندی داستان گو بوڑھے کی طرح مسکرائے "لداخ کا بدھ راجہ شگر کی مسلمان شہزادی کے ساتھ شادی خواہش مند تھا چنانچہ وہ بارات لے کر یہاں پہنچ گیا۔ شگر کا راجہ اس کا ماتحت تھا لیکن اس نے پس و پیش کی۔ لداخی راجہ نے دھمکی دی کہ اگر شہزادی کی شادی اس کے ساتھ نہ کی گئی تو وہ شگر کے محل کے اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔

"پتھر سے پتھر بجا دے گا چاچا جی۔۔۔" سلجوق نے سر ہلاتے ہوئے کہا "یہاں اینٹ کہاں۔"

"تو جناب۔۔۔ سلجوق صاحب آپ بیچ میں مت بولئے ورنہ میں داستان بھول جاؤں گا۔۔۔"

"سوری انکل۔۔۔"

ظاہر ہے مسلمان شہزادی لداخ کے گنجے اور بچی داڑھی والے راجے سے

شادی کرنے پر رضامند نہیں تھی چنانچہ وہ اپنے ایک بزرگ استاد کے پاس گئی جس نے اسے ایک وظیفہ بتایا۔

ادھر لداخی راجہ کی بارات آئی۔۔۔"

"راجہ کی آئے گی بارات۔۔۔؟"

"ہاں عینی بی بی ادھر راجہ کی بارات آئی۔ ادھر وہ شہزادی مصلے پر بیٹھی اور سجدے میں چلی گئی۔ جب بہت دیر تک نہ اٹھی تو سہیلیاں اس کے قریب گئیں تو وہ ۔۔۔"

"مر چکی تھی۔۔۔" عینی فوراً بولی۔

"نہیں۔۔۔ غائب ہو چکی تھی اور وہاں صرف اس کا سرخ جوڑا اور زیور پڑے ہوئے تھے۔۔۔ اور اب یہ شہزادی شگر آتی رہتی ہے۔ جب کہیں شادی ہوتی ہے تو وہ سرخ جوڑے میں دکھائی دیتی ہے ہنستی ہوئی اور جب کہیں کوئی فوتیدگی ہوتی ہے تو وہ روتی ہوئی آتی ہے۔۔۔"

"حسن صاحب آپ نے کبھی اس شہزادی کو دیکھا؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے تو نہیں لیکن کئی ایسے بزرگ ہیں جنہوں نے اسے دیکھا۔۔۔"

"آخری مرتبہ کب نظر آئی تھی؟"

"تقریباً دس بارہ برس پیشتر۔۔۔"

"خدا کرے آج تو نہ آئے۔۔۔ اور کل ہم چلے جائیں گے۔۔۔" عینی ذرا ڈری ہوئی تھی۔

"اور اب ہم شگر کا کونسا قابل دید مقام دیکھیں گے؟" میر نے پوچھا۔

"اب ہم وہ پتھر دیکھیں گے جو پریاں اٹھا کر لائی تھیں۔۔۔"

"سچ مچ کی پریاں؟" عینی پھر بول اٹھی۔

"یہ ایک بیوقوف بچی ہے۔۔۔" سلجوق نے منہ دوسری جانب کر کے انگلی عینی کی کنپٹی کے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"نہیں جی یہ ایک بیوقوف بچی ہرگز نہیں ہے۔ ادھر بلتستان میں پریاں ہوتی ہیں' کیوں انکل۔۔۔"

"بالکل ہوتی ہیں۔۔۔" حسن صاحب داڑھی پر ہاتھ پھیر کر بولے۔

ہم ایک خاموش سے محلے میں گئے اور قدیم طرز کے چند چھوٹے چھوٹے مکان

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

دیکھے۔ کھڑکیاں کشمیری طرز کی تھیں اور ان کے قدیم دیواروں سے الگ ہونے کو تھے۔ یہیں پر وہ تین چار پتھر تھے جنہیں پریاں اٹھا کر لائی تھیں۔

"بڑے زور آور لوگ باہر سے بھی آئے اور ان کو اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکے۔۔۔" حسن صاحب سلجوق کو دیکھتے ہوئے مسکرائے "اسی لیے تو ہم کہتے ہیں کہ انہیں پریاں لائی تھیں۔۔۔

عباسی نے ایک پتھر کو جھک کر چھوا' تھوڑی دیر جھکا رہا اور پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔

"ابو وہ پھر آگیا۔۔۔" عینی ہنستی ہوئی میرا بازو تھام کر بلکہ جھنجوڑ کر کہنے لگی "ایک اور آگیا۔۔۔"

"ہاں ابو وہی ہے۔۔۔" سمیر کی باچھیں کھل گئیں اور سلجوق بھی سر ہلاتا مسکراتا ادھر دیکھنے لگا جدھر وہ تھا۔

اور وہ جب بھی دکھائی دیتا انتشار کا باعث بنتا۔ جو کچھ ہو رہا ہوتا وہ چوپٹ ہو جاتا۔ گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ کر کہیں اور چلا جاتا اور ہم سب صرف اور صرف اس کی جانب متوجہ ہو جاتے۔۔۔ وہ سکردو میں کم ملتا ہے۔ جوں جوں آپ سکردو سے دور ہوتے ہیں اور تہذیب کے جعلی دائرے سے پرے ہوتے ہیں وہ نظر آنے لگتا ہے لیکن زیادہ تعداد میں نہیں بس کبھی کبھی۔ وہ خپلو میں بھی ملتا ہے' ہوشے میں کافی دکھائی دیتا ہے اور یہاں شگر میں اسے ہم نے پہلی بار دیکھا۔

پستہ قد۔ گرم پرانے کپڑوں میں لپٹا ہوا۔ سر پر اونی بندر ٹوپی۔ ہاتھ اور پاؤں چھوٹے بچوں ایسے خوب گلپلے سے۔ وہ زیادہ تیز نہیں چلتا کیونکہ اس کی ٹانگیں چھوٹی ہیں۔۔۔ چہرہ گولائی کی جانب اور اس میں نہایت مسکین آنکھیں۔۔۔ اور تھوڑی پر چند بال لٹکتے ہوئے۔۔۔ لیکن اس کی سب سے بڑی دو علامتیں ہیں' ایک تو اس کا سدا اپنے آپ سے بہت ہی خوش مسکراتا ہوا چہرہ اور دوسری یہ کہ اسے دیکھتے ہی آپ اسے گدگدی کرنا چاہتے ہیں کیونکہ وہ اتنا پیارا اور بھولا سا ٹیڈی بیئر لگتا ہے۔۔۔ اس سے پیشتر کہ میں بچوں کو منع کرتا وہ اس تک پہنچ چکے تھے اور اس کے ساتھ حرکتیں کرنے میں مشغول تھے۔ اور وہ تو شاید انہی کے انتظار میں تھا۔ میں نے حسن صاحب سے اس بابے کے بارے میں پوچھا۔ ان کی معلومات کے مطابق یہ منگول بابے ہیں' ٹھگنے اور بھولے بھالے اور تھوڑے سے مخبوط الحواس بھی ہیں۔ مجھے حیرت صرف اس بات

پر ہے کہ میں نے اس نسل کا کوئی جوان کہیں نہیں دیکھا۔ لگتا ہے جیسے یہ بابے کہیں پیدا نہیں ہوتے بلکہ یکدم نمودار ہو جاتے ہیں۔۔۔ بہرحال اس منگول بابے کی آمد سے ہماری تھکن دور ہو گئی۔ میں نے بچوں کو واپس بلایا تو سمیر کہنے لگا "ابو صرف ایک مرتبہ اور گدگدی کر لوں بابا جی کو۔۔۔"

"کر لو۔۔۔"

وہ بھاگتا ہوا گیا اور بابا جی کو گدگدی کی۔ باباجی اور زیادہ مسکرانے لگے۔۔۔

عینی کا خیال تھا کہ ہمیں کم از کم ایک منگول بابا کو بہلا پھسلا کر لاہور لے جانا چاہئے۔۔۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ ایسے بابا لوگ شہر کی ناخوش اور لالچ بھری ہوا میں زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکتے۔

بچے بڑی مشکل سے بابا جی سے الگ ہوئے۔ اور وہ الگ ہوئے تو میجر عباسی بابا جی کو گدگدیاں کرنے لگا اور میں نے اسے ڈانٹا تو وہ بھی "سر" کہہ کر پرے ہو گیا۔

شگر کے سب سے پرانے محلے میں جولاہوں کے چند گھر ہیں۔۔۔ اور یہ جولاہے بھی پستہ قد ہیں اس لیے اپنے مکانوں کی چھتیں چھ فٹ کی بلندی پر ہی ڈال لیتے ہیں۔ تاریک گھروں کے اندر رہائشی کوٹھڑیاں تھیں جن میں شائد بچے تھے شائد مال مویشی تھے اور پھر گرم کمبل اور دریاں بنانے کی کھڈیاں تھیں۔

ایک کھڈی پر ایک چھوٹا سا خوفزدہ جولاہا جھکا ہوا تھا۔۔۔ اور کوٹھڑی میں روشنی کے لیے صرف ایک سوراخ تھا۔ وہ ہمیں اپنا بہترین کمبل دکھانے کے لیے آگیا۔ ایک کچی دیوار کے پیچھے اس کی بوڑھی جولاہی ہمیں دیکھتی تھی اور وہ اپنے خاوند سے بھی بالشت بھر چھوٹی تھی۔

"فوٹو فوٹو۔۔۔" میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے بلایا اس کے سرخ اور پھولے ہوئے مسوڑھوں میں صرف دو چار دانت باقی تھے۔ وہ اپنے چہرے کو ان ہاتھوں سے چھپاتی تھی جن سے وہ ابھی ابھی آٹا گوندھ رہی تھی۔

خوفزدہ جولاہے نے کمبل بازو پر لٹکایا اور تصویر کے لیے تیار ہو گیا۔ جولاہی نے دانت نکال دیئے۔

ریسٹ ہاؤس واپسی پر ہم ایک کوٹھڑی نما مسجد کے قریب سے گذرے۔ کچی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے دو تین منگول بابے۔ چند بوڑھی عورتیں اور ایک دو نوجوان۔۔۔ خستہ حال اور مٹی سے اٹے ہوئے۔۔۔ ایک دور دراز وادی میں بدحالی اور عسرت میں

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

جلا.... یہ مقام شگر کے بے کار لوگوں کے لیے بیٹھک کا کام دیتا تھا۔

اسی راستے میں شگر کے راجہ کا محل پڑتا تھا۔ بلند چناروں کے ساتھ ایک قدیم حویلی نما عمارت جس کا دروازہ بند تھا۔ مجھے متجسس پا کر حسن بولے "تارڑ صاحب راجاؤں کا محل ہے اور ان کے کتے بھی تگڑے اور خطرناک ہوتے ہیں۔ ادھر آ جائیے"

ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں فرانسیسی سیاح اپنے آگے رکھی تپائی پر جھکا تھا' کچھ کھاتا تھا اور پھر بہت دیر تک چھت کو دیکھتے ہوئے اسے نگلتا تھا۔

"ہیلو-----" سلجوق اس کے پاس گیا "کیا کھا رہے ہو؟"

"اوہ پلاؤ-----" وہ چونکا "چوکیدار نے مجھے پلاؤ پکا کر دیا ہے"

"کیسا ہے؟"

اس نے پلیٹ میں ڈھیر ملغوبے میں سے بمشکل ایک چمچ بھرا اور منہ میں رکھ کر حسب معمول سوچ میں مبتلا ہوا اور پھر کہنے لگا "سٹرینج پلاؤ-----"

وہاں خشک بھوری چٹانوں پر دھوپ تانبے کی طرح ٹھنڈی ہو کر ڈھلتی تھی اور بڑے بڑے پتھروں اور خشک گھاس اور جھاڑیوں پر پہلے تھی اب نہیں تھی لیکن اس کی ہلکی روشنی ابھی ان پر باقی تھی.... دھوپ ڈھلتی تھی لیکن بلند ہوتی تھی۔

ہماری جیپ وادی شگر کے آخری منظر سے نیچے آ چکی تھی۔

خشک بھوری چٹانوں کو ہم سب نے بہت دیر تک خاموشی سے ایک تسلسل کے ساتھ غور سے دیکھا لیکن وہاں کچھ نہ تھا.... آج وہ وہاں نہیں تھے اور ہمارے دل میں خیال آیا کہ کیا وہ پہلے وہاں تھے؟.... اس چینی فلسفی کی طرح جو ساری عمر یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اس نے یہ خواب میں دیکھا تھا کہ وہ تتلی بن چکا ہے یا وہ تتلی تھا اور اب خواب دیکھ رہا ہے----- ہم یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ وہ چھ شاندار بھورے اڑیال جو کسی دیومالائی یادگار کی طرح دھوپ میں تراشے ہوئے لگتے تھے.... کیا ہم نے دیکھے تھے؟.... یا پھر وہ ہم تھے' وہاں چٹانوں میں اور ڈھلتی شام میں اور ہم نے ایک پہاڑی راستے پر ایک جیپ کے قریب کھڑے چھ مسافروں کو دیکھا تھا....

"دیوسائی اے دیوسائی"

دیوسائی کی برفیں کب پگھلیں گی؟

وہ میدان دوسروں کو راستہ دے دیتا ہے لیکن میں جب بھی ادھر کا قصد کرتا ہوں تو کبھی----- ابھی دیوسائی پر برف نہیں پگھلی----- صدپارہ سے دیوسائی ٹاپ تک جانے والی سڑک نالے میں گر چکی ہے----- کالا پانی پر ابھی پل تعمیر نہیں ہو سکا اور اسے عبور نہیں کیا جا سکتا----- آپ کا خیمہ بہت باریک ہے صاحب' ادھر برف گرے گا تو تم مر جائے گا-----

پندرہ سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر دیوسائی میدان میں ایسے پھول ہیں جو کم لوگوں نے دیکھے ہوں گے اور ریچھ ہیں جو مچھلیوں کا شکار کرتے ہیں اور وہاں تیز اور سرد ہوائیں چلتی ہیں.... اور کیسے پتہ چلتا ہے کہ دیوسائی کی برفیں پگھل چکی ہیں.... اور اسے عبور کیا جا سکتا ہے۔ صدیوں سے شاید ہزاروں برسوں سے بکروال یا چرواہے اس میدان میں نشوونما پانے والی لمبی گھاس اور ہریاول کے لئے اپنے جانوروں کے ہمراہ ادھر آتے ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ آگے برف ہے تو وہ برف کی حد پر قیام کرتے ہیں اور پھر جوں جوں برف پگھلتی ہے اور پیچھے ہٹتی ہے وہ اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے ہیں اور پھر ایک روز صدپارہ گاؤں کے قریب اتر کر سکردو کے بازار میں پہنچ جاتے ہیں اور ان کو دیکھ کر لوگ جان جاتے ہیں کہ دیوسائی میدان میں برف پگھل چکی ہے.... راستے کھل گئے ہیں۔

اگر آپ دیوسائی کو عبور کرنا چاہتے ہیں تو آپ سکردو سے صدپارہ گاؤں جاتے ہیں اور پھر وہاں سے دیوسائی اور دوسری جانب چلم چوکی کے راستے استور پہنچ جاتے ہیں۔ اسی راستے پر آپ استور سے سکردو کی جانب آ سکتے ہیں۔

میں نے دونوں جانب سے اسے دیکھا تھا----- اسے نہیں بلکہ ان راستوں کو

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

دیکھا تھا جو اوپر جا رہے تھے اور میں ان پر نہیں جا سکتا تھا۔ ان نیلو نیل پانیوں کو دیکھا تھا جو اس کی برفوں میں سے نکل کر نیچے آ رہے تھے... صدپارہ نالہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سرواو نے کہا تھا' تارڑ صاحب یہ آپ کے دیوسائی سے آ رہا ہے۔

ادھر استور کی جانب ترشنگ سے واپسی پر میں نے جیپ اس مقام پر روک لی تھی جہاں سے ایک راستہ چلم چوکی کو جا رہا تھا اور ایک نالا نیلے پانیوں کا نیچے آ رہا تھا... اوپر دیوسائی تھا اور میں وہاں جانا چاہتا تھا لیکن میرا خیمہ کمزور تھا اور میرے خوبصورت بیٹے سمیر کے چہرے پر گھر کی اداسی لمحہ بہ لمحہ گہری ہو رہی تھی اور کالے پانی پر ابھی تک پل نہیں تھا.... اگر قسمت بار بار کہے کہ نہیں جاؤ.... تو نہیں جاؤ۔

جب بھی میں نے قصد کیا خواہش کی..... میں نہ جا سکا۔

اس بار میرا کوئی ارادہ نہ تھا..... میرے ساتھ میرا خاندان تھا.... میں نے بالکل خواہش نہ کی اور... اس کے باوجود وہ ہمہ وقت میرے ذہن پر سوار تھا... سکردو ایئرپورٹ سے شہر جاتے ہوئے میں نے نظر ادھر رکھی جدھر وہ وادی تھی اور جس کی جھیل کنارے وہ راستہ تھا جو اوپر اٹھتا ہوا دیوسائی کو جاتا تھا... ہم نے صدپارہ جھیل کے ہوٹل میں قیام کیا اور اوپر گاؤں کی جانب مچھلیاں پکڑنے کے لئے گئے تو میں نے ان درجنوں چھوٹے چھوٹے نالوں کو حاسد نظروں سے دیکھا جو اوپر دیوسائی سے آ رہے تھے... ان کا پانی یخ تھا اور ہاتھ نہ لگانے دیتا تھا...

سکردو بازار سے بالتورو ریسٹ ہاؤس جاتے ہوئے ایک مقام پر سڑک کے پہلو میں گھاس کا ایک قطعہ ہے اور ایک چھوٹا سا چشمہ اس کے سبز رنگ میں سفید پارے کی طرح چمکتا ہے جب بھی سورج عین سر پر ہوتا ہے اور یہاں سے ہم جب بھی گزرے کچھ لوگ خیمہ زن تھے اور ان کے آس پاس تھیلوں اور بوریوں میں بندھا ہوا سامان تھا اور ان کے سیاہ مویشی "زوہ" تھے جو اپنے گھنے اور لمبے لٹکتے بالوں کے ساتھ سر جھکائے کھڑے ہوتے... یہ لوگ کچھ گھبرائے ہوئے لگتے اور جیپ کی آواز سن کر ہمیشہ چونک جاتے... اور یہاں صرف مرد ہوتے... کبھی اس مقام پر بالکل ویرانی رہتی اور کبھی خوب گہما گہمی ہو جاتی... "ہاں آں...." ایک روز خواجہ سرواو نے سٹیئرنگ پر ہاتھ مار کر بلند آواز میں نعرہ لگایا "تارڑ صاحب آپ جانتے ہیں یہ کون لوگ ہیں؟ جناب یہ گلتری سے آتے ہیں... اور دیوسائی میدان عبور کر کے آتے ہیں"

"تو برف پگھل چکی ہے؟"

"اگر یہ یہاں ہیں تو برف پگھل چکی ہے... یہ لوگ گلتری سے آتے ہیں کئی روز کی کوہستانی مسافت کے بعد' یہاں اپنی بھیڑیں اور مویشی فروخت کر کے آٹا' گھی' چاول' نمک اور چینی وغیرہ خرید کر واپس چلے جاتے ہیں۔ اگر آپ ان کے کسی زوہ پر سوار ہو جائیں تو کل تک انشاءاللہ دیوسائی تک پہنچ جائیں گے..... اگر حکم کریں تو بات کروں؟" خواجہ صاحب صریحاً زیادتی کر رہے تھے اور مجھ غریب کو چھیڑ رہے تھے۔

اس شام بالتورو ریسٹ ہاؤس میں ہمارے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور میجر عباسی اسے کھٹکھٹا کر کہہ رہا تھا "تارڑ صاحب اجازت ہے؟"

اور اس کا ایک قدم کمرے میں آ چکا ہے تو میں کہتا ہوں "نہیں

سر--" وہ فوراً پیچھے ہو کر "شن" ہو جاتا ہے لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اسے کمرے کے اندر آنے کی اجازت کیوں نہیں ملی۔

میں خود راہداری میں آ جاتا ہوں "ایک مشورہ کرنا ہے تمہارے ساتھ---"

اور ہم دونوں ریسٹ ہاؤس سے باہر سڑک پر آ جاتے ہیں۔ دھوپ میں تیزی ہے اور ہوا میں آکسیجن کم ہے۔

"کیا ہم دیوسائی پر جا سکتے ہیں؟"

"سر---" وہ پھر سے "شن" ہو گیا۔

"ریلیکس یار---"

"جناب میں دو برس سے سکردو میں ہوں اور پرزور کوشش اور خواہش کے باوجود دیوسائی پر نہیں جا سکا... سنا ہے مشکل کام ہے... آپ جانا چاہتے ہیں؟"

"آپ ایک ریچھ سے پوچھتے ہیں کہ وہ شہد کھانا پسند کرے گا اور ایک ہاتھی سے پوچھتے ہیں کہ کیا وہ گنے کھائے گا----"

"آپ جناب حکم کریں کہ مجھے کیا کرنا ہے؟"

"دو خیمے' سلیپنگ بیگ' رک سیک' کھانا پکانے کا سامان' پورٹر' کچا راشن' کافی چائے' دوائیاں... اور پورٹر ایسا جو دیوسائی کو جانتا ہو---"

"جناب خیموں کے لئے میں ابھی بلتستان ٹورز کے محمد اقبال سے رابطہ کرتا ہوں... سلیپنگ بیگ بھی مل جائیں گے سیاچین والے... اور دوائیاں...."

اس کے بعد ایک بخار آلود بھاگ دوڑ شروع ہو گئی... میں نہیں جانتا تھا کہ

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

اس کا انجام کیا ہو گا۔ فی الحال منصوبہ یہی تھا کہ ہماری ٹیم چار ممبروں پر مشتمل ہو گی' عباسی' سلجوق' سمیر اور میں.... اور کم از کم دو پورٹر.... اور اب مسئلہ صرف یہ تھا کہ دیوسائی ٹاپ تک پہنچا کیسے جائے....

ہم قلب علی صاحب کے دفتر چلے گئے' وہ بلتستان کی سڑکوں کے انچارج تھے' انہیں تو معلوم ہو گا کہ سکردو سے اوپر دیوسائی جانے والی سڑک جیپوں کے لئے کھل گئی ہے یا ابھی زیر مرمت ہے۔

"اوہ تو یہ ہے تارڑ صاحب....." قلب علی حسب معمول بے حد مسرور اور دنیا سے خوش تھے "کہ.... جب ادھر برف اور گلیشیئر ختم ہو جاتا ہے تو ہم روڈ کلیئر کرنے کے لئے آدمی روانہ کر دیتا ہے.... ابھی وہ گئے ہیں لیکن تین چار دن سے پتہ نہیں کہ کہاں سے روڈ کلیئر کر دیا لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ صدپارہ گاؤں سے آگے نالے پر جو پل ہے روڈ وہاں تک بالکل کلیئر ہے...."

"اور اس سے آگے؟"

"اس سے آگے تو پیدل جانا ہو گا۔ جیسے گلتری والے آتے جاتے ہیں...."

"کیسے جائیں گے جناب ...." عباسی مسکرانے لگا "ادھر چڑھائی ہے بہت زیادہ.... چار پانچ ہزار فٹ کی چڑھائی ہے...."

"ویسے صدپارہ گاؤں کے پل تک آپ میری جیپ لے جائیں۔ اسے وہاں چھوڑ کر اوپر جائیں۔ ادھر رات کریں اور اگلے دن نیچے ادھر تک آ جائیں جدھر آپ جیپ چھوڑ کر گئے تھے تو ادھر ڈرائیور موجود ہو گا۔ میں آپ کو پاجیرو اس لئے نہیں دے رہا کہ راستہ تنگ ہے اور پاجیرو چٹانوں سے لگے گی...."

"قلب علی صاحب میں اپنے قلب کی گہرائیوں سے آپ کا مشکور ہوں...." میں نے اٹھتے ہوئے کہا "اور عباسی...."

"سر...."

"دیوسائی ڈیش کے لئے ہنگامی بنیادوں پر تیاری شروع کر دی جائے...."

جھیل صدپارہ سے نکلنے والے نالے کے پانی دیوسائی کی برفوں کے تھے اور ان میں تندی اور شدت تھی اور وہ ملک شیک میں اچھلتے جھاگ اڑاتے دودھ کی طرح سفیدی میں اچھلتے ہوئے نیچے آ رہے تھے اور ہم اس کے کنارے پر رینگتی راکی جیپ

میں اوپر جا رہے تھے' اوپر جدھر سے وہ آ رہے تھے۔

صدپارہ کی وادی پر شام کا گمان ہوتا تھا لیکن یہ سویر تھی جو بلند پہاڑوں کے عقب میں تھی اور اس کی روشنی ابھی اندر نہیں آئی تھی۔ ہمارے بدن جیکٹوں میں لپٹے سرد ہوا سے محفوظ تھے اور چہرے اس سرد ہوا کی کاٹ سے زندگی کے قریب ہوتے تھے' سردی سے آنکھوں میں نمی تیرتی تھی۔

ایک سفید راکی جیپ' ڈرائیور سمیت سات افراد.... عباسی' سلجوق' سمیر' پورٹر علی.... اور پورٹر حسین.... اور ان سات افراد کے آس پاس اور اوپر نیچے دیوسائی ڈیش کا سامان.... خیمے' رک سیک' تھیلے.... کمبل وغیرہ وغیرہ.... اور ہم سب اس سامان میں گل محمد تھے اور ہل نہیں سکتے تھے.... ایک دوسرے کو سن سکتے تھے' دیکھ نہیں سکتے تھے....

جیپ صدپارہ جھیل کے قریب ہو گئی.... اس کے ساکن پانیوں میں دائرے پھیلتے تھے.... ان مچھلیوں کے جو ہماری قسمت میں نہ تھیں.... اور پھر جھیل کا وہ کنارا آ گیا جس میں چھوٹے چھوٹے نالے ایک وسیع ریتلے علاقے میں سے گزرتے پانی میں گر رہے تھے' جہاں چند روز پیشتر ہم نے مچھلیاں پکڑنے کی کوشش کی تھی۔

"سر جی ناشتہ نہ کر لیں....." یہ کہیں دبکے ہوئے عباسی کی آواز تھی "میں پراٹھے پکوا کر لایا ہوں...."

"تمیں؟... انہیں کھائے گا کون؟"

"کام آئیں گے سر.... خود نہ کھا سکے تو کسی ریچھ کو کھلا دیں گے سر.... تو رک جائیں ناشتے کے لئے؟"

"نہیں ابھی نہیں...."

اور میں رکنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ مجھے اب بھی خدشہ تھا.... کوئی ہمارا پیچھا کرتا ہوا سکردو سے آئے گا اور کہے گا ٹھہرو تم دیوسائی نہیں جا سکتے.....

آج صبح منہ اندھیرے یوسف حسین آبادی آ گئے "تارڑ صاحب میں نے سنا ہے کہ آپ بچوں کے ساتھ دیوسائی جا رہے ہیں....."

"جی .... بچی تو نہیں جا رہی سلجوق اور سمیر جائیں گے اور ماشاء اللہ جوان ہیں...."

"دیوسائی اچھی جگہ نہیں ہے تارڑ صاحب....." یوسف گہری تشویش کے ساتھ کہنے لگے "خطرناک ہے.... بری جگہ ہے.... اور وہاں سردی بھی بہت ہے۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

بلندی کی وجہ سے بھی انسان بیمار پڑ جاتا ہے.... آپ نہ جائیے...."

اس بیان کے بعد میں اندر سے اتنا مضبوط نہ رہا جتنا کہ پہلے تھا.... اگر سکردو کا ایک باسی یہ کہتا ہے کہ دیوسائی بری جگہ ہے تو.... "تیاری مکمل ہے.... جیپ میں سامان پیک ہو چکا ہے' بیسر اور سلجوق نے کل کے تو موٹل کے باہر خیمے ایستادہ کر کے انھیں چیک کر لیا تھا اور.... بہرحال یہ ضروری تو نہیں کہ ہم ٹاپ تک جائیں' بس جہاں تک آرام سے اور حفاظت سے جا سکے جائیں گے...."

یکدم میرے بدن میں چلنے والی چیزیں رک گئیں اور خاموشی ہو گئی۔ جیپ رک چکی تھی۔ سب لوگ اتر گئے.... ہمارے عین نیچے صدپارہ گاؤں صبح کی پہلی دھوپ میں تھا....

پورٹر علی نے اپنا سامان اٹھا لیا "میں یہ سامان چھوڑ کر آتا ہوں صاحب.... بال بچے کو بتاتا ہوں کہ میں ایک رات کے لئے دیوسائی جا رہا ہوں۔ ابھی آتا ہوں"۔

وہ ڈھلوان راستے پر نیچے گاؤں کی جانب اترنے لگا۔

علی کسی غیر ملکی مہم کے ہمراہ بالتورو گلیشیئر کے علاقوں میں تھا اور اب اس مہم کے ارکان کی ڈاک وصول کرنے کے لئے سکردو آیا تھا.... سکردو آیا تو ہم نے اسے قابو کر لیا کیونکہ وہ صدپارہ کا باسی تھا اور دیوسائی کو جانتا تھا....

صدپارہ جھیل کے پانیوں کو ہم بہت دور چھوڑ آئے تھے۔ وہ یہاں سے ایک چھوٹے تالاب کی طرح دکھائی دیتی تھی جس میں اس کا سبز جزیرہ ایک ساکن کشتی تھا۔ پس منظر میں برفپوش چوٹیاں مکمل دھوپ میں روشن ہو رہی تھیں۔

ڈرائیور نے جیپ کا ہارن زور زور سے بجایا.... اور نیچے صدپارہ گاؤں کی ایک چھت پر ایک بوڑھی عورت نے سر اٹھا کر ہماری جانب دیکھا لیکن اسے اتنی دور سے ہم کہاں نظر آتے ہوں گے۔

"سر جی یہاں بڑی آسانی سے ناشتہ کر سکتے تھے...." عباسی نے شکایت آمیز لہجے میں کہا "پراٹھے ٹھنڈے ہو گئے ہوں گے"

ڈرائیور نے ایک مرتبہ پھر ہارن بجایا۔

یہاں میں نے محسوس کیا کہ ہوا میں آکسیجن کم ہے.... اور ادھر ادھر گھومنے سے سانس چڑھنے لگتا ہے۔

علی اپنا کمبل اور کچھ سامان اٹھائے اوپر آ رہا تھا۔

"واہ...." عباسی نے اس کا چھوٹا سا رک سیک چیک کیا "باہر کا ہے؟"

"جی صاحب ایکسی ڈیشن کا ہے"۔

ایک مرتبہ پھر ہم جیپ میں پیک ہوئے اور سفر شروع ہو گیا۔

ایک نالہ اوپر سے اتر رہا تھا اور ہم اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی سڑک پر چل رہے تھے۔ دونوں جانب بلندی عمودی تھی اور اس لئے دھوپ ابھی یہاں نہیں آئی تھی۔

نالے کے پانی نیلے تھے اور نیلو نیل تھے اور دیوسائی سے آ رہے تھے....

ہم راستے کی خطرناکی کے لئے ذہنی طور پر بالکل چوکنے تھے۔ ہم نے اس کے پرخطر ہونے کی ساری داستانیں سن رکھی تھیں۔ ان میں سے ایک اس کیمرہ مین کے بارے میں تھی جو کسی ڈاکومنٹری فلم کے یونٹ کے ہمراہ جیپ پر دیوسائی جا رہا تھا۔ جیپ جھول رہی تھی اور ڈھلوانوں پر سے کھسکتی ہوئے نیچے آتی تھی اور مزدور فوری طور پر اسے تھام لیتے تھے۔ کیمرہ مین نے بہت ضبط کیا اور آخرکار چھلانگ مار کر اتر گیا اور کہنے لگا "میں.... میں ملازمت سے استعفیٰ دیتا ہوں۔ اب اور اسی وقت" ڈائرکٹر نے بہت سمجھایا لیکن وہ مرد دانا ڈٹا رہا کہ مجھے حق حاصل ہے کہ میں جب جی چاہے استعفیٰ دے دوں اور وہ میں نے دے دیا۔ اس پر ڈائرکٹر صاحب نے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے اپنے ذاتی ذخیرے میں سے ایک بوتل ام الخبائث کی نکالی اور کیمرہ مین کو حکم دیا کہ بس غٹ غٹ کر کے اسے اپنے اندر انڈیل لو.... کیمرہ مین نے ڈائرکٹر کی ڈائریکشن پر عمل کیا جس کے نتیجے میں وہ خاصا خربود ہو گیا اور ایک بے پرواہ کیفیت میں جھومنے لگا۔ اس سے پوچھا گیا کہ اب تو دیوسائی روڈ پر سفر کرتے ہوئے ڈر نہیں لگے گا؟ اس نے کہا بالکل نہیں.... میں جیپ میں سوار ہو جاتا ہوں لیکن اس سے پیشتر میری آنکھوں پر ایک پٹی کس کر باندھ دی جائے تاکہ....

لیکن ہم ابھی کسی ایسے حصے سے نہیں گذرے تھے جہاں آنکھوں پر پٹی باندھ کر سفر کرنے کی نوبت آئے۔

اور پھر وہ پل آ گیا.... پرانی روڈ سیدھی جا رہی تھی اور نئی روڈ پل کے پار تھی۔

ہم ادھر سائے میں تھے اور معلق پل کے دوسری جانب چٹانیں دھوپ میں تھیں.... اوپر سے ایک قافلہ اتر رہا تھا۔ دس بارہ "زوہ" جن پر سامان لدا ہوا تھا اور ان کے ہمراہ انھیں ہانکتے ہوئے گلتری کے باشندے.... زوہ جیپ کے قریب آتے تو اس کی شکل دیکھ کر بدک جاتے....

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

پل چونکہ بھاری ٹریفک کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اس لئے ہم ٹریفک کو ہلکا کرنے کے لئے جیپ سے اتر گئے۔

پل کے پار اوپر اٹھتے پتھریلے راستے پر چھ سات مزدور کام کر رہے تھے... اپنے محکمے کی جیپ دیکھ کر وہ قدرے پریشان ہو گئے۔ ان کا باس جو ایک بزرگ مزدور تھا ہمارے پاس آگیا۔

"سلام صاحب۔۔۔"

"یہ روڈ ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے صاحب۔۔۔"

"کہاں تک ٹھیک ہے؟ دیوسائی تک؟"

"نہیں صاحب۔۔۔ بس یہاں سے تھوڑی دور تک ٹھیک ہے... ایک ہفتہ میں ہم روڈ کلیئر کر دیں گے پھر دنیا جہان کا جیپ اوپر آجائے گا۔۔۔ آپ واپس چلے جاؤ پھر آجانا۔۔۔"

ہم دوبارہ جیپ میں سوار ہو گئے... اور تب کچھ کچھ ذائقہ ہم نے اس کی خطرناکی کا چکھا... جیپ کے ٹائر کنارے کی جانب کھسکتے اور پھر جیسے ہم لڑھکتے ہوئے پھر واپس آجاتے... ایک مقام پر ایک بڑا پتھر راستے میں پڑا تھا... اسے ہم سب نے مل کر نالے میں لڑھکایا اور یہ جانا کہ کسی بھی پتھر کو لڑھکاتے ہوئے یہ خیال رکھتے ہیں کہ جب پتھر لڑھکنے کو ہو تو اس سے پرے ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ کا ہاتھ اس پر ہو گا تو وہ آپ کو بھی ساتھ لے جانے کی کوشش کرے گا۔

جیپ پہلے جھجکی' پھر ایک ہی جگہ پر زور لگانے لگی... ہم نیچے اتر گئے... راستہ نالے میں گرا ہوا تھا اور صرف چند پتھر ایسے تھے جن پر سے ہم قدرے احتیاط سے پیدل گذر سکتے تھے... پورٹرز سامان اتارنے لگے۔

یہ جگہ دیوسائی نالے کے قریب تھی۔ سامنے دو گلیشیئر نظر آرہے تھے' ایک تو راستے میں تھا اور ہمیں اسے عبور کرنا تھا اور دوسرا ڈھلوان پر پڑا تھا۔ اس مقام پر نالہ تقریباً ہموار چلا آتا تھا اور اس کی گہرائی ان پتھروں کی نصف تھی جو اس میں سے ابھرے نظر آتے تھے اور یہ پتھر زیادہ بڑے نہیں تھے۔ جہاں پتھر تھے وہاں ان سے ٹکرا کر گذرنے والا پانی سفید نظر آتا تھا اور دوسری جگہوں پر وہ ہموار اور آسمانی نیلا تھا۔

پورٹر علی اور حسین نے اس بکھرے ہوئے سامان کو رسوں کی مدد سے دونوں رک سیکوں کے اوپر نیچے مضبوطی سے باندھا اور کچھ اشیاء بازوؤں سے لٹکا لیں۔ سامان پہلی نظر میں اتنا زیادہ دکھائی دیتا تھا اور اتنا بکھرا ہوا تھا کہ ہمیں یقین نہ آیا کہ اسے صرف دو رک سیکوں میں سمیٹا جا سکتا ہے اور اسے صرف دو پورٹر اٹھا سکتے ہیں لیکن بلتی پورٹر کا یہی کمال ہے... آپ اسے پورا گھر پیک کرنے کو دے دیں اور وہ اپنی کوہستانی فراست کو کام میں لاتے ہوئے اسے ایک رک سیک میں پیک کر دے گا... اور اسے اٹھا بھی لے گا... سلجوق کے پاس ایک چھوٹا سا رک سیک بھی تھا جس میں کیمرہ ریڈیو اور چند گرم کپڑے تھے۔ عباسی نے بھی کچھ اشیاء کاندھے پر ڈال لیں' البتہ میرے پاس صرف ایک سٹک تھی... ہائکنگ سٹک اور اس کے سوا مجھے صرف اپنا بوجھ اٹھانا تھا...

جیپ ڈرائیور کو بتایا گیا کہ اسے کل چار بجے اسی مقام پر پہنچنا ہے اور ہر صورت میں پہنچنا ہے اور اگر ہم یہاں نہیں پہنچے تو فوری طور پر سکردو جا کر قلب علی کو اطلاع کرنا ہے کہ دیوسائی کے مسافر نیچے نہیں اترے۔

یہاں جیپ کو واپس موڑنے کا مسئلہ درپیش ہوا۔ راستہ اتنا چھوٹا تھا کہ اسے موڑا نہیں جا سکتا تھا چنانچہ بہت دور تک بیک کرنے کے بعد عباسی کی ہدایات کے مطابق اسے بمشکل دیوسائی نالے میں گرنے سے بچا کر موڑ لیا گیا...

جیپ ڈرائیور نے صدپارہ میں رات بسر کرنا تھی۔

جونہی جیپ نظروں سے اوجھل ہوئی ہم جیسے ایک اجنبی سیارے پر تھے... دیوسائی نالے کا ہلکا شور... اس کی نیلاہٹ... نالے کے ساتھ چٹانوں میں کھدا ہوا جیپ ٹریک جو اوپر ویرانی کی جانب جا رہا تھا اور وہ آسمان جو ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا... یہاں سے اس آسمان کا بہت چھوٹا سا حصہ پہاڑوں کے اوپر نظر آتا تھا لیکن ہم نے ایسا نیلا شیشہ آسمان پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس آسمان کو جہاں سنگلاخ چوٹیاں چھوتی تھیں وہاں سے وہ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا...

اور یہاں ایک تیز خوشبو تھی۔ یہ ان پودوں اور جھاڑیوں میں تھی جو دیوسائی نالے کے ساتھ جھکے ہوئے تھے۔

ہاں ہم جیسے ایک اجنبی سیارے پر تھے اور تنہا تھے...

پورٹرز نے سامان اپنے جسم پر لادا اور سر جھکا کر چلنے لگے... اور پھر ہم چاروں مناسب فاصلہ دے کر ایک دوسرے کے پیچھے پیچھے... یہ طے تھا کہ کوئی بھی شخص اپنے آپ کو بہادر اور دوسروں سے باہمت ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرے گا...

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

اتنی دور تک چلے گا جتنی دور تک اس کا سانس اس کا ساتھ دیتا ہے اور پھر آرام کرے گا۔۔۔ ہم پہاڑوں سے مقابلہ کرنے نہیں آئے ان کی تعظیم کرتے ہوئے انہیں دیکھنے اور محسوس کرنے آئے ہیں۔۔۔

دھوپ یہاں بھی تیز تھی۔۔۔

میں نے اس جیپ روڈ پر پہلا قدم اٹھایا جو دیوسائی کو جا رہی تھی اور پھر میرے لبوں پر ایک بے اختیار مسکراہٹ پھیلی' میں ایک احتیاط پسند دیوانے کی طرح آہستہ سے ہنسا۔۔۔ بالآخر میں دیوسائی کے راستے پر تھا۔

ہم چٹانوں کے سائے میں آرام کرنے کے لئے ٹھہرتے تو فوراً ہی ٹھنڈک محسوس ہوتی۔۔۔ اور دھوپ میں شدت تھی۔۔۔

دونوں جانب پہاڑ تھے جو بہت بلند نہ تھے۔ درمیان میں دیوسائی نالہ اور اس کے کنارے کے ساتھ سلجوق لمبی لمبی پلا ہنگیں بھرتا ہوا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ عباسی تھا۔۔۔ ان سے پیچھے پورٹر تھے۔ پھر سمیر تھا جو تیز مہک والے پھولوں کو غور سے دیکھتا اور پھر چلتا تھا۔

میں سمیر کے بارے میں فکرمند تھا۔۔۔ حال ہی میں اس کے ٹانسلز کا آپریشن ہوا تھا اور سرجن نے ہدایت کی تھی کہ اسے مکمل صحت یابی سے پیشتر زیادہ بلند مقامات پر نہیں جانا چاہئے۔ بظاہر تو وہ اس آپریشن سے شفایاب ہو چکا تھا لیکن میں پھر بھی فکرمند تھا۔۔۔ اس کی صحت کم از کم قابل رشک نہ تھی۔

دیوسائی نالہ چند دیو زاد چٹانوں میں سے آبشار کی صورت میں نیچے گرتا تھا اور اس کا پانی ایک بڑے تالاب میں جمع ہو کر پھر نیچے جاتا تھا۔۔۔

وہ فاصلے کم ہونے لگے جنہیں طے کر کے میں سانس لینے کے لئے رکتا تھا۔۔۔ ہوا میں مکمل سانس نہیں لیا جاتا تھا۔ اس میں آکسیجن اتنی کم تھی کہ دو بار ہوا اندر کھینچنے سے ایک بار کا سانس مکمل ہوتا تھا اور اس کے علاوہ ہوا میں خنکی تھی۔۔۔

تمام لوگ مجھ سے بہت آگے نکل گئے۔۔۔ اور میں اس مکمل تنہائی میں خوش تھا اور آہستہ آہستہ چلتا تھا اور آسمان میرے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ دیوسائی تک اس راستے کی سب سے بڑی نشانی بھی یہی ہے کہ یہاں آپ آسمان کے قریب ہوتے چلے جاتے ہیں۔۔۔ اور پھر جو پہاڑیاں نظر آتی ہیں وہ بھی زیادہ بلند نہیں ہوتیں اور ان کی ڈھلوانوں پر گھاس اور جھاڑیاں نیچے تک آتی ہیں اور اس میں کہیں کہیں انٹرنیم کی شکل کے زرد لمبے سٹوں والے پھول نظر آتے ہیں۔۔۔ ان کی مہک تو ہوا میں ہمہ وقت

موجود ہوتی ہے لیکن ڈھلوانوں کے قریب وہ جھونکوں کی صورت نیچے آتی ہے۔ ایک ایسی ہی سرسبز ڈھلوان میں زرد اور جامنی پھول پتھروں میں سے باہر آتے تھے اور یہاں ان کی مہک تیز تھی اور یہیں میں ستانے کے لئے بیٹھ گیا۔۔۔ اس سے آگے راستہ ایک سیڑھی کی طرح بلند ہو رہا تھا اور دیوسائی کا نالہ اسی حساب سے نیچے گہرائی میں جا رہا تھا۔۔۔

عباسی نے پیچھے دیکھا۔۔۔ مجھے دور ایک ڈھلوان کے نیچے دیکھا اور وہ ہانپتا ہوا میرے پاس آگیا "سر جی آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟"

"میں عیش کر رہا ہوں عباسی۔۔۔" میں نے پاؤں پسار کر اپنے سر کے نیچے بازو کا تکیہ رکھا اور نیلا آسمان جیسے میری آنکھوں پر چھا گیا۔

"یہ بڑی کٹی چڑھائی ہے سر جی۔۔۔ یہاں تو جوان لوگوں کو آکسیجن کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔۔۔ ویسے آپ بالکل ٹھیک ہیں ناں؟" وہ فکرمند تھا' کیونکہ میرے برس اس کے برسوں سے کہیں زیادہ تھے اور اس کا خیال تھا کہ میں اس چڑھائی سے اور مشقت سے بیزار ہو چکا ہوں اور مجھ میں چلنے کی سکت باقی نہیں ہے۔

"دیکھو عباسی۔۔۔" میں نے اس موڑ کی جانب اشارہ کیا جو خاصی بلندی پر تھا اور جس پر آسمان جھکا ہوا تھا "وہاں۔۔۔ اس سے پرے دیوسائی ہے۔۔۔ اور وہاں' میں تمہارے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہاں میں نے ہر صورت پہنچ جانا ہے۔۔۔ اسی طرح دم لیتے ہوئے اور آرام کرتے ہوئے میں نے پہنچ جانا ہے۔۔۔ گلگت سے اسلام آباد جانے والے فوکر جہاز کی گمشدگی سے چند روز پیشتر اس کے پائلٹ کیپٹن زبیر نے مجھ سے کہا تھا کہ تارڑ صاحب دیوسائی ایک ہوس ہے۔۔۔ ایک بار دیکھو تو دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔۔۔ وہاں اگرچہ موت بھی ہے لیکن ایک ایسی تنہائی ہے جو بیان نہیں کی جا سکتی۔۔۔"

"کیپٹن زبیر آپ کے دوست تھے؟"

"نہیں۔۔۔ پچھلے برس گلگت جانے کے لئے میں پی آئی اے کے ناردرن ایریا آفس میں گیا اور وہاں زیدی صاحب نے بتایا کہ ہمارے کیپٹن زبیر کو بھی آوارہ گردی کا بہت شوق ہے۔۔۔ آپ کی طرح۔۔۔ اس شام میں نے کیپٹن زبیر کو فون کیا۔۔۔ اور پھر تقریباً ہم روزانہ فون پر شمالی علاقوں کے بارے میں اپنے اپنے تجربات بیان کرتے لیکن۔۔۔ عجیب اتفاق ہے ہم مل نہ سکے۔ کبھی ان کی فلائٹ ہوتی اور کبھی میں لاہور واپس آ رہا ہوتا۔ ایک روز طے پایا کہ ہم اگلے ہفتے شام کو ملیں گے اور اکٹھے کھانا

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

کھائیں گے۔۔۔ اور صرف ایک روز پیشتر گلگت سے واپسی پر ان کا جہاز لاپتہ ہو گیا۔۔۔ بعض اوقات مجھے خیال آتا ہے کہ وہ اکثر دیوسائی پر سے گذرتا تھا ہو سکتا ہے وہاں اس نے کریش لینڈنگ کی ہو اور وہ ابھی تک۔۔۔"

میرے چہرے کا پسینہ خشک ہو چکا تھا اور ہوا سرد لگ رہی تھی۔۔۔ میرا بدن ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ میں اٹھ بیٹھا۔ "میں بھی دیوسائی کی ہوس میں آیا ہوں اور اسے دیکھے بغیر نہیں جاؤں گا۔۔۔ تم چلو"۔

"پانی چاہئے سر۔۔۔"

"ہاں ایک گھونٹ پانی ضرور چاہئے۔۔۔"

عباسی میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"نہیں۔۔۔" میں رک گیا "تم آگے چلو۔۔۔ تم میرے ذہن پر بوجھ ہو گے۔ میں سوچوں گا تم میری وجہ سے آہستہ چل رہے ہو اور میں اپنی مرضی کے خلاف تمہارا ساتھ دینے کے لئے تیز چلوں گا اور یہ اچھا نہیں ہو گا۔۔۔ تم چلو میں آ جاؤں گا"۔

"سر۔۔۔" عباسی نے مجھے یقیناً مخبوط الحواس جانا کیونکہ اس کی مسکراہٹ یہی کہتی تھی اور پھر وہ چھڑی ٹیکتا مجھ سے آگے نکل گیا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ تنہائی میرے لئے کتنی بڑی نعمت ہے۔۔۔ میں اس کے لئے کتنا ترستا ہوں۔۔۔ بس یہی لمحے ہیں پورے برس میں جن میں میں آزاد ہوتا ہوں اور پورے اور مکمل سانس لیتا ہوں۔۔۔ ان لمحوں میں' جب اس ٹھنڈک سے بوجھل ہوا میں صرف میں ہوں جو سانس لیتا ہوں یا وہ پرندے جو ان جھاڑیوں اور گھاس میں ہوں گے جو ڈھلوانوں پر ہے۔ اور میرے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں۔۔۔ کوئی بل نہیں' کوئی سکرپٹ نہیں' میری جیب میں گھر کے' خاندان کے کاموں کی کوئی فہرست نہیں اور مجھے کل کی فکر نہیں۔۔۔ میرے ہاتھ میں ایک واکنگ سٹک ہے اور میں اپنی من مرضی سے چل رہا ہوں اور بلندی پر اگنے والے پھولوں کی عجیب سی مہک اور دیوسائی نالے کا ہلکا سا شور۔۔۔

مجھ سے چلا نہیں جا رہا۔۔۔ میں پھر بیٹھ جاتا ہوں۔

پانی ختم ہو گیا ہے اور پورٹر ابھی فلاسک تھامے نیچے نالے تک گیا ہے۔

اور یہیں سے یہ پتھریلا راستہ ایسے اوپر اٹھتا ہے جیسے اس جہاں سے اٹھتا ہے۔۔۔ سلجوق کے قدم اس طرح اٹھ رہے ہیں جیسے وہ کسی زینے پر چڑھ رہا ہے۔۔۔

اور یہ ٹیلے آسمان تک پہنچنے کا زینہ ہے۔

ہمیں اس راستے پر چلتے ہوئے ساڑھے تین گھنٹے گذر چکے تھے۔۔۔

آسمان قریب ہو رہا تھا اور ہم آسمان کے قریب ہو رہے تھے۔۔۔ منظر ذرا کھلنے لگا تھا۔

پورٹرز علی اور سمیر راستے کے ایک بلند موڑ پر کھڑے ہاتھ ہلا رہے تھے اور مجھے بلا رہے تھے لیکن فاصلے اور نالے کے شور کی وجہ سے ان کی آواز مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔۔۔ اس کے باوجود میں جان گیا کہ ان کی نظریں دیوسائی پر ہیں اور وہ ٹاپ پر پہنچ گئے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد سلجوق اور عباسی بھی ان کے پاس پہنچ گئے انہوں نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر مجھے آوازیں دینے لگے اور ان کی آوازیں تیز ہوا کے ساتھ میرے قریب آتیں اور پھر فوراً ہی مدھم ہو جاتیں۔۔۔ دیو۔۔۔ سائی سائی۔۔دیو۔۔۔سائی۔

میں سر جھکا کر چلتا رہا اور زینہ بہ زینہ بلند ہوتے راستے پر چڑھتا رہا۔۔۔ اور وہ سب اس موڑ پر میرا انتظار کر رہے تھے۔

سامنے دیوسائی تھا۔

جہاں ہم تھے وہاں تک پتھر تھے' پتھریلی چٹانیں۔۔۔ لیکن ان کے بعد گھاس کے وسیع ٹیلے تھے' چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور ان پر کہیں کہیں برف کی لکیریں تھیں اور ان میں سے دیوسائی نالہ راستہ بناتا آ رہا تھا۔ یہ منظر انگلستان یا سکاٹ لینڈ کی کنٹری سائڈ ایسا تھا۔۔۔ ان پہاڑیوں میں کہیں بھی کوئی ایک پتھر' ایک جھاڑی یا ایک درخت نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہاں سوائے گھاس کے' سطح مرتفع میدان کے اور اس پر جھکے ہوئے عجیب و غریب شکلوں کے بادلوں کے اور کچھ نہ تھا۔۔۔ اور یہاں سے بس یہی کچھ نظر آ رہا تھا۔۔۔ اور ہاں اس منظر میں کشش نہ تھی بلکہ ایک دل پر بیٹھنے والے خوف کا خدشہ تھا۔۔۔ لیکن اس منظر نے ہمیں حیران کیا۔۔۔ اس بلندی پر یہ سرسبز اور وسیع لینڈ سکیپ۔۔۔

"یہی دیوسائی ٹاپ ہے؟"

"جی صاحب۔۔۔" علی بولا "ابھی ہم اور چلیں گے تو دیوسائی کے کنارے تک پہنچ جائیں گے۔۔۔ وہاں جا کر یہ راستہ ہموار ہو جائے گا۔۔۔ اور ادھر صدپارہ گاؤں کی "مہک" ہے۔۔۔ پھر ادھر کیمپ کر سکتے ہیں۔۔۔"

"نہیں۔۔۔" میں نے سانس کھینچتے ہوئے کہا "ابھی صرف دو بجے ہیں۔۔۔ ہم

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

مزید تین گھنٹے دیوسائی کے اندر چلیں گے اور پھر کیمپ کریں گے..."

"ابو لنچ نہیں کریں گے؟" سلجوق نے پوچھا...

اب ہم ساتھ ساتھ چلنے لگے کیونکہ چڑھائی ختم ہو چکی تھی اور جیپ روڈ تقریباً ہموار تھی... ہمارے دائیں جانب جو چٹانیں تھیں وہ ختم ہو گئیں اور بائیں جانب منظر وسیع ہوتا گیا اور ہم دیوسائی کے کنارے پر تھے...

ایک گرد آلود راستہ پہاڑوں میں دور تک جاتا دکھائی دیتا تھا... اور یہ پہاڑیاں بہت چھوٹی تھیں اور جیسے کوئی ماڈل ہو... اور ہمیں سانس لینے میں دشواری پیش آ رہی تھی... ہم دنیا کے بلند ترین میدان میں تھے۔

پورٹرز نے رک سیک اتار کر زمین پر رکھے۔ عباسی نے پراٹھوں کا پلندہ کھولا... علی نیچے اترا... اور وہاں نیچے ایک بہت بڑی "ہبک" تھی جس میں ہزاروں مویشی تھے' ان میں بھیڑیں اور زوہ شامل تھے۔ چند کوٹھڑیاں تھیں اور جس علاقے میں مویشی قیام کرتے تھے وہاں زمین چٹیل اور گھاس سے خالی تھی... یہ ہبک خاصی دور تھی اور جہاں ہم تھے وہاں سے مویشی چیونٹیوں کی طرح رینگتے دکھائی دیتے تھے... میں نے ایک پراٹھے پر اچار کی ایک قاش رکھی اور ذرا ہٹ کر گھاس پر بیٹھ گیا... میں تھک چکا تھا اور چند قدم چلنے سے ہانپ گیا تھا... تھوڑی دیر بعد علی نیچے ہبک سے چائے کی ایک کیتلی لے کر آ گیا... یہ دیوسائی کی بہترین چائے تھی لیکن ہم اسے بمشکل نگل سکے کیونکہ اس میں دھواں تھا اور بھیڑوں کا دودھ تھا' ان کے بال تھے اور ان کی بو تھی... یوں بھی ہماری بھوک ختم ہو چکی تھی اور خوراک کو دیکھ کر دل اچاٹ ہوتا تھا۔ بدن اندر سے خالی محسوس ہوتا تھا اور چلنے پھرنے اور اٹھنے بیٹھنے سے دل بیزار ہوتا تھا... یہ بلندی کا کرشمہ تھا کہ بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے... میں نے علی کو اپنے قریب بلایا "تم دیوسائی کو اچھی طرح جانتے ہو... کیا یہاں کوئی ایسا مقام ہے جہاں سے پورے دیوسائی کا منظر نظر آتا ہو؟..."

"جی صاحب... ادھر وہ جو ٹیلا ہے ادھر چوٹی پر سب سے اچھا نظارہ ہے..."

"اور کیا ہم وہاں کیمپ کر سکتے ہیں؟"

"وہاں تو ہوا بہت ہو گی صاحب... آپ دیکھ لو چل کر..."

دونوں پورٹرز نے اپنے اپنے بوجھ اٹھائے اور چلنے لگے۔

ہم نے وہی راستہ اختیار کیا جس پر ہم نیچے سے چلتے آئے تھے لیکن علی ہم سے کچھ فاصلے پر ایک ڈھلوان پر اگی ہوئی پگڈنڈی پر چلتا جا رہا تھا اور ہم سے پرے ہوتا

جا رہا تھا...

ہم اس "ہبک" سے ذرا دور ہوئے تو ہمارے سامنے ذرا آہستگی سے دیوسائی کا منظر کھلنے لگا... گھاس کے وسیع میدانوں کے آخر میں کناروں پر نیلے رنگ کے چھوٹے چھوٹے پہاڑ تھے جن پر برفیں تھیں اور ان پر وہی عجیب شکل کے غیر قدرتی بادل تھے... علی ہم سے بہت دور ہمیں اشارے کر رہا تھا کہ ادھر آؤ ادھر آؤ... ادھر ہم جا رہے تھے سر جھکائے' سانس کھینچتے کہ وہ بہت کم آ رہا تھا... مجھ میں ایک سستی اور غنودگی اور بے چینی اتری تھی اور ایک قدم بھی آگے جانے کو جی نہیں چاہتا تھا...

اور یہاں سے دیوسائی کے پھولوں کا آغاز ہوا... ہم جس گھاس پر چل رہے تھے وہ اس میں تھے اور زمین کی سطح کے ساتھ ساتھ تھے... اور دیوسائی کے بادلوں کی طرح ان کی شکل اور رنگ بھی عجیب تھے... اور تب ہم نے دیوسائی کی اس وسعت کو ایک مختلف نظر سے دیکھا جو ہمارے سامنے دور تک سبز تھی' ہموار جگہوں پر اور ٹیلوں پر اور پہاڑیوں پر جہاں جہاں سبزہ تھا وہاں صرف سبزہ نہ تھا بلکہ اس میں پھول ہی پھول تھے اور سو رنگ کے تھے اور وہ زمین کے ساتھ تھے اور جہاں ہم تھے وہاں سے نظر نہیں آتے تھے اس لئے دور سے صرف گھاس دکھائی دیتی تھی لیکن وہ ساری وسعت پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھی... میں ہر قدم پر بیٹھ جاتا اور ان کے وہ چہرے دیکھتا جو میں نے اس سے پیشتر کبھی نہ دیکھے تھے... پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر جو پھول ہوں گے وہ صرف اس نے دیکھے ہوں گے جو اتنی بلندی پر گیا ہو... اور صرف بلندی پر نہیں کیونکہ یوں تو درہ تنجراب سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے لیکن وہاں بھی پھولوں کی یہ قسمیں دکھائی نہیں دیتیں... یہ پھول نہ صرف یہ کہ پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر ہوتے ہیں بلکہ صرف سطح مرتفع دیوسائی پر ہی ہوتے ہیں چنانچہ میں ان کی شکلیں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ کہیں یہ جھاڑیوں میں تھے... اور جھاڑیاں بھی گھاس جتنی ہی تھیں چھوٹی چھوٹی اور گھاس کے ساتھ پھیلی ہوئیں... کہیں یہ گچھوں میں تھے اور کہیں مختلف رنگوں کے لامبے ڈنٹھل جو ہوا کے زور سے دوہرے ہوتے تھے... میں نے زمین پر لیٹ کر ان کی جو تصاویر اتاریں انہیں دیکھ کر اکثر لوگوں نے کہا کہ یہ تو کسی جاپانی باغ کی طرح منصوبہ بندی کے ساتھ لگائے گئے ہیں... ان میں سے ایک سرخ پھول تھا جو مخمل کی طرح تھا اور زمین پر ڈھیر پڑا ملتا تھا...

ہم ذرا جھجک کر چلتے تھے اور ہمارے قدم بے ربط ہوتے تھے کیونکہ ہم پھولوں کو پاؤں تلے مسلنا نہیں چاہتے تھے... لیکن ایسا ناممکن تھا... ہمیں پھولوں پر ہی چلنا

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

تھا...

ہم پانچوں ایک قطار میں چل رہے تھے۔

"ابو---" سمیر نے پیچھے سے میرا بازو پکڑ لیا... میں نے مڑ کر اسے دیکھا تو اس کی آنکھیں سرخ تھیں... "ابو میری طبیعت ٹھیک نہیں..."

میں نے اس کا ماتھا اور گال چھوئے تو وہ گرم تھے... یکدم مجھ میں خوف اتر گیا... "کیا بات ہے؟"

"بس چلنے کو جی نہیں چاہتا اور سر میں درد ہو رہا ہے... مجھے جیکٹ نکال دیں---"

میں نے حسین کو بلایا اور رک سیک کھول کر سویٹر اور ایک افغانی جیکٹ سمیر کو پہنا دی... اور ایک سفید اونی ٹوپی بھی... جو سیاچین جانے والے سپاہی پہنتے ہیں...

ہم سب نے گرم کپڑے پہن لئے... سردی زیادہ ہو رہی تھی۔

ہم پھر چلنے لگے... لیکن میرے اندر سمیر کی بیماری کا خوف تھا... دیوسائی کا خوف تھا... عباسی اوپر پہنچ چکا تھا... اس نے ہاتھ ہلایا۔

اور پھر ہم سب اس علاقے کے بلند ترین ٹیلے کی چوٹی پر تھے...

ہمارے سامنے پورا دیوسائی تھا... یہاں سے وہاں تک... اس کے دریا بھی اور نالے بھی اور وہ جیپ ٹریک بھی جو دور دور تک جاتا تھا اور گم ہوتا تھا۔ اور وہ ٹیلے پہاڑ اور ان پر جھکے ہوئے عجیب بادل بھی--- اور یہاں بھی لامبے اور مخمل ایسے پھول تھے اور یہاں ایک تصویر اتاری تو اس میں یوں لگتا ہے جیسے سمیر اور سلجوق ایک کیاری میں کھڑے ہیں اور ان کے پیچھے ایک پردہ ہے جس پر ایک بل کھاتا دریا ہے اور دیوسائی کی سرسبز وسعت ہے جس پر کہیں دھوپ ہے اور کہیں سایہ ہے اور--- کہیں بھی ایک درخت نہیں' جھاڑی نہیں' پتھر نہیں--- صرف سبز ٹیلے اور میدان ہیں--- اور اس وسعت میں ہمارے علاوہ اور کوئی نہیں--- اور تیز سرد ہوا ہے جس میں ہم جیبوں میں ہاتھ ڈالے ذرا جھکے ہوئے کھڑے ہیں اور ہوا کی تیزی سے ہماری آنکھوں میں پانی تیرتا ہے... ہم اکیلے ہیں۔

"واہ واہ---" سلجوق نے چٹخارہ لے کر کہا اور پھر اپنے تھیلے میں سے ریڈیو نکالا اس کا ایریل کھینچ کر لمبا کیا اور سوئی گھمانے لگا... "یہاں اس بلندی پر دنیا کے سب سٹیشن لاؤڈ اور کلیر آئیں گے---" وہ سوئی گھماتا رہا لیکن سوائے ایک چینی ریڈیو سٹیشن کے اور کوئی آواز ہاتھ نہ آئی اور سلجوق جو ریڈیو کے شارٹ ویو کا بہت

شیدائی ہے یہ ریڈیو صرف اس لئے یہاں تک اٹھا کر لایا تھا کہ وہاں بلندی پر--- اور یہاں وہ کچھ بھی نہ پکڑ سکا... "فٹے منہ بجی---" اس نے ایریل کو دھپ مار کر سمیٹا اور ریڈیو بند کر کے تھیلے میں ڈال دیا۔

"ابو--- میری طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے---" سمیر نے کچھ مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھیں بہت سرخ تھیں اور آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

ہمارے پاس پانی بھی تھا اور گلوکوز بھی--- ایک بڑا مگ سمیر کو تیار کر کے پلایا لیکن اس کی صحت بحال نہ ہوئی۔

"بھائی کو خیمہ لگا کر اس میں ڈال دو---" پورٹر علی نے سمیر کو فکرمندی سے دیکھا۔

"یہاں خیمہ لگائیں؟"

"نہیں صاحب ہوا ہو گی اور پانی ادھر سے دور ہو گا..."

"پانی کدھر ہے؟"

"وہ نیچے---" اس نے آگے بڑھ کر بتایا۔ ٹیلے سے نیچے۔ کافی دور ایک چھوٹی سی جھیل تھی اور اس کے ساتھ ایک بلند گھاس میں پوشیدہ رواں پانی تھا جو یہاں سے دکھائی نہیں دیتا تھا "وہ اچھی جگہ ہے---"

تم جلدی سے نیچے پہنچو اور خیمہ لگاؤ--- ہم آتے ہیں--- سمیر تمہیں سہارے کی ضرورت ہے؟

"اوہ نہیں ابو---" وہ لاپرواہی سے اترنے لگا۔ وہ یقیناً ایک بہادر بچہ تھا...

اس بلندی پر کچھ پتھر تھے اور کسی آماجگاہ کے آثار تھے... شنید ہے کہ اے۹ کی جنگ کے دوران انڈیا دیوسائی میدان پر اپنی پیرا فوج اتارنا چاہتا تھا اور انہیں روکنے کے لئے پاک فوج نے یہاں عارضی مورچے قائم کئے تھے... اور ظاہر ہے ایک ایسی جگہ قائم کئے تھے جہاں سے پورا دیوسائی نظر آتا تھا...

"سر ہم یہاں دوبارہ آئیں گے---" عباسی پر بھی دیوسائی کے اس منظر کا گہرا اثر تھا۔

"ٹھیک ہے کل صبح پھر آئیں گے---"

ہم نیچے اترنے لگے۔ سمیر آگے آگے چل رہا تھا لیکن اس کی چال میں مکمل توازن نہیں تھا۔ ہم نیچے پہنچے تو علی پہلا خیمہ استادہ کر چکا تھا... سمیر ڈھلکے ہوئے پھندنے والی سفید ٹوپی میں سر جھکائے ایک رک سیک پر بیٹھا تھا' اس کی آنکھیں

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

بدستور سرخی میں تھیں اور وہ منہ کھول کر سانس لے رہا تھا۔

سامان مکمل طور پر کھلا تو معلوم ہوا کہ ہم سب کچھ لائے ہیں خوراک لائے ہیں لیکن اس خوراک کو پکانے کے لئے برتن نہیں لائے اور نہ ہی ہمارے پاس مٹی کے تیل کا چولہا ہے۔۔۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم دیوسائی کے میدان سے لکڑی چن لیں گے اور اسے جلا کر کھانا پکائیں گے اور یہاں سے قریب ترین درخت ادھر نیچے صدپارہ میں ہو گا اور ادھر چلم چوکی کے آس پاس ہو گا تو لکڑی کہاں سے آئے گی۔۔۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے دونوں پورٹر علی اور حسین سر جھکائے گھاس کو دیکھتے تھے اور ادھر ادھر گھومتے تھے۔۔۔ حالانکہ ہم دیکھ سکتے تھے کہ وہاں نہ تو لکڑی ہے اور نہ ہی کھانا پکانے کے برتن بکھرے ہوئے ہیں۔۔۔

ہم جھیل کے کنارے خیمہ زن تھے لیکن یہ دراصل ایک بڑا تالاب تھا اور اس کے کیچڑ آلود کناروں پر مویشیوں کی آمدورفت کے نشان تھے۔۔۔

علی اور حسین اپنی تلاش میں دور چلے گئے تھے۔۔۔

"سر جی یہ پورٹر بالکل پاغل خانے ہیں' لکڑی اور برتن تلاش کر رہے ہیں۔۔۔" عباسی کہنے لگا اور وہ بے حد تھکا ہوا نظر آتا تھا۔ "ویسے سر جی آپ مائنڈ نہ کرنا۔۔۔ مجھے بالکل امید نہ تھی کہ آپ ٹاپ تک پہنچ جائیں گے۔۔۔"

علی اور حسین لدے پھندے واپس آ رہے تھے۔

"صاحب ہم کو یہ کچھ گوبر ملا ہے اس کا آگ بنائے گا۔۔۔" علی نے اپنے کمبل کو زمین پر الٹا دیا۔۔۔

"اور صاحب یہ برتن ہے۔ ابھی صاف کریں گے تو ٹھیک ہو جائے گا۔" حسین کے پاس تین خالی زنگ آلود ٹین تھے جو وہ ٹیلے کی اس چوٹی سے لایا تھا جہاں کسی زمانے میں فوج نے قیام کیا تھا۔۔۔"

اس دوران میں نے اور عباسی نے ایک خیمے کے اندر سلیپنگ بیگ بچھا کر سمیر کو اس میں بالکل پیک کر دیا تھا۔۔۔ وہ بار بار پکارتا "ابو میں بھی باہر آ جاؤں۔۔۔" کیونکہ دیوسائی میں ہونا اور دیوسائی کو نہ دیکھنا اس کے لئے بے حد اذیت ناک تھا۔۔۔

گوبر دھواں دینے لگا۔۔۔ اور اس پر صاف کیا ہوا ایک پرانا ٹین جتنی دیر میں تھوڑا سا گرم ہوتا تھا اس سے بہت جلدی پھر ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔۔۔ ہم اس کے گرد سر جھکائے بیٹھے تھے اور شام کی یخ بستگی جو آنے کو تھی اسے ابھی سے اپنے بدنوں میں اترتے محسوس کرتے تھے۔ چائے بالآخر تیار ہوئی اور ہم نے سمیر کو ڈسپرین کی دو

گولیاں کھلائیں اور اس پر سے گرم چائے کا ایک مگ اسے اندر انڈیلنے کو کہا کیونکہ وہ چائے کا شوقین نہ تھا۔

ہم دھواں دیتے گوبر پر ہتھیلیاں پھیلائے بیٹھے رہے۔۔۔

اس بلندی پر سانس کی بے چینی بھی بہت تھی اور اس میں سمیر کی بیماری کی بے چینی گھلتی تھی اور اسے تقریباً ناقابل برداشت بناتی تھی۔۔۔ ابھی سورج تھا' شام ہونی تھی اور پھر رات اور دیوسائی کی رات۔۔۔ اور اگر اس رات ہمیں کوئی ایمرجنسی ہو گئی تو ہم کیا کریں گے؟۔۔۔ اس کا کسی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔۔۔ ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے سوائے انتظار کے۔۔۔ صبح کا انتظار اور روشنی کا انتظار۔۔۔ میں ہر پانچ منٹ بعد خیمے کا پردہ اٹھا کر اندر جھانکتا۔۔۔ وہ بھی سوجھی ہوئی آنکھوں کو کھول کر بمشکل مسکرانے کی کوشش کرتا اور کبھی اس کی آنکھیں بند ہوتیں اور وہ کھلے منہ سے سانس لے رہا ہوتا۔۔۔ اس کا رنگ بہت سرخ ہو رہا تھا۔

ہم نے ملک پاؤڈر سے دودھ بنایا اور اسے گرم کر کے سمیر کو پلایا۔۔۔ اسے نیند آنے لگی۔

ہم دھواں دیتے گوبر پر ہتھیلیاں پھیلائے بیٹھے ہوئے تھے۔۔۔ اور ایک دم ایک سیاہ دھند کی طرح ایک چھوٹے سے بادل کی طرح ہمارے آس پاس مچھر ہی مچھر تھے اور ان کا سائز تقریباً مکھی جتنا تھا۔۔۔ وہ ایک ٹڈی دل کی طرح ہم پر بیٹھنے لگے اور ہم نے فوراً اپنے چہروں کو ٹوپیوں اور رومالوں سے ڈھانپا اور گردنیں نیچی کر کے اپنے آپ کو بچانے لگے۔۔۔ ہم نہ ایک دوسرے کی جانب دیکھ سکتے تھے اور نہ کچھ کر سکتے تھے۔

"علی۔۔۔ یہ کیا مصیبت ہے بھئی؟" عباسی ہوا میں ہاتھ کی تلواریں چلا رہا تھا اور بے حد غصے میں تھا۔

"یہ صاحب زیادہ دیر نہیں رہے گا۔۔۔ ابھی ہوا بند ہوا ہے اس لئے آیا ہے۔۔۔ ابھی ہوا چلے گا تو یہ چلا جائے گا' انتظار کرو"

شاید دس منٹ تک ہم یوں سر جھکائے بیٹھے رہے اور پھر ہوا آ گئی اور وہ سب کے سب چلے گئے ان میں سے ایک بھی باقی نہ رہا اور ہم نے رومال اور ٹوپیاں وغیرہ اتار کر لمبے لمبے سانس لئے۔۔۔ اور یہ جو ہوا تھی پہلے کی نسبت زیادہ سرد تھی کیونکہ سورج ڈھل رہا تھا۔۔۔ اور سردی نہ در نہ صاف آسمان سے نیچے آ رہی تھی۔۔۔

ہماری خیمہ گاہ کے ایک جانب جھیل تھی اور دوسری جانب ایک کچا راستہ دور

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

تک جاتا تھا... اس پر جیپ بھی چل سکتی تھی اور اس راستے کے دونوں جانب بلند ٹیلے تھے... خیموں سے کچھ دور گھاس میں ایک چھوٹی سی ندی رواں تھی... اور یہ پتہ نہیں کہاں سے آ رہی تھی اور کہاں جا رہی تھی... میں نے ایک مرتبہ پھر خیمے میں جھانکا... سمیر نیند میں تھا... "اس کا خیال رکھنا..." میں نے علی سے کہا... "آؤ سلجوق ذرا دیوسائی کی سیر کرتے ہیں..."

"سر جی ہم بھی آ جائیں؟" عباسی نے ہاتھ اٹھا کر چھوٹے بچوں کی طرح اجازت طلب کی...

ہم تینوں اس کچے راستے پر چلنے لگے... اس کے دونوں جانب گھاس تھی اور زمین بوس جھاڑیاں اور یہاں صرف زرد اور سفید پھول تھے... اور یا پھر ان پھولوں کے خالی ڈنٹھل جو ایک ماہ پیشتر کھل کر خزاں رسیدہ ہو چکے تھے' یہ لمبے ڈنٹھلوں والے پھول بیج سے نہیں بلکہ بلب سے پیدا ہونے والے تھے... میری خواہش تھی کہ میں ایسے چند بلب یا پیاز اپنے ساتھ کھود کر لے جاؤں اور لاہور کاشت کروں...

میں بار بار مڑ کر اپنی خیمہ گاہ کو تکتا تھا اور بائیں ہاتھ جو نیلا خیمہ تھا اس میں سمیر تھا... علی اور حسین اس دھوئیں پر جھکے دکھائی دیتے رہے جو گوبر میں سے اٹھتا تھا... اور بہت دیر تک دکھائی دیتے رہے...

عباسی اور سلجوق مجھ سے آگے نکل گئے... اور میں نے ایک بار پھر دیوسائی کی اس تنہائی کو محسوس کیا جو کائنات کی تخلیق کے اور "کن فیکون" کے لمحے میں وجود میں آئی تھی اور ابھی تک قائم تھی... سورج نیچے جا چکا تھا... لیکن ابھی دھوپ تھی... کیونکہ وہ اس ٹیلے کے پیچھے گیا تھا جس کی چوٹی سے ہم نے دیوسائی کا نظارہ کیا تھا... اور سورج جب بھی دیوسائی سے ڈھلتا تھا اور یہاں تاریکی ہوتی تھی تو اس لمحے نیچے سکردو یا استور میں وہ ابھی روشنی دیتا تھا... عباسی اور سلجوق مجھ سے بہت آگے جا چکے تھے اور کم روشنی کی وجہ سے وہ کبھی دکھائی دے جاتے اور کبھی دھندلکے میں گم ہو جاتے...

دیوسائی ایک غیر دوستانہ رویہ رکھنے والا میدان مشہور تھا... اس کی بلندی' وسعت اور موسموں کی بے اعتباری نے اسے آج تک تنہا رکھا ہے۔ گرمیوں کے دو ماہ میں اس کے کناروں پر لوگ اپنے مویشیوں کو چرانے آتے ہیں لیکن اس کے اندر نہیں جاتے... یا پھر آزاد کشمیر کی جانب سے بکروال اور گوجر لوگ آتے ہیں اور اسے عبور کر کے سکردو جاتے ہیں... باقی سارا سال یہ ویران اور بے آباد رہتا ہے...

یہ ابتدائے آفرینش سے ویران اور بے آباد ہے... تو پھر اسے کس لئے بنایا گیا ہے؟ چند چرواہوں کے لئے؟... مچھروں کے لئے... ریچھوں کے لئے... یا پھر پھولوں کے لئے... شاید ان چند آوارہ گردوں کے لئے جو جان جوکھم میں ڈال کر یہاں تک پہنچ جاتے ہیں... میرا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں چند مقامات ایسے دشت نوردوں کے لئے سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں جن کے بارے میں غالب نے کہا تھا'۔

اللہ رے ذوق دشت نوردی کہ بعد مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے' اندر کفن کے پاؤں

دشت نورد اگرچہ معاشرے کے لئے بے کار لوگ ہوتے ہیں۔ وہ قیام تو اسی مکان میں کیا کرتے ہیں لیکن وہ دیکھتے ہمہ وقت کہیں اور ہیں۔ یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے جلال و جمال سے آگہی رکھتے ہیں' صرف وہی اس کی عظمت سے واقف ہوتے ہیں کیونکہ صرف انہوں نے ہی اس کی عظمتوں کو دیکھا ہوتا ہے... ایک بڑے کاروباری مرکز میں بند ایک کاروباری کو یا ایک دفتر میں قید ایک بڑے افسر کو کیا پتہ کہ رب نے کیا بنایا ہے اور کیسا کیسا بنایا ہے... اور اگر وہ ان جگہوں پر پہنچ بھی جاتا ہے تو وہ انہیں دیکھتا نہیں کہ اس کی آنکھیں وہیں رہ جاتی ہیں اس کے کاروبار میں اس کی ملازمت اور پیشے میں... اور یہ صرف آوارہ گرد ہوتا ہے جو اس کی کسی نعمت کو نہیں جھٹلاتا...

اس شام جب دیوسائی میدان میں چلتے ہوئے سانس پھولتا تھا اور بہت آگے سلجوق اور عباسی تھے اور کہیں پیچھے جھیل کے کنارے خیمے میں سمیر بخار آلود حالت میں اونگھتا تھا میں نے اس مکمل تنہائی اور ویرانی کو محسوس کیا جو اتنی ہی بڑی تھی جتنی بڑی وہ تنہائی اور ویرانی تھی جو عمر کے ساتھ ساتھ میرے اندر آکٹوپس کی طرح پھیلتی جا رہی تھی... شاید آخر میں یہی ہوتا ہے کہ باہر اور اندر کی تنہائی اور ویرانی ایک ہو جاتی ہے... شاید آخر میں یہی ہوتا ہے...

ہمیں واپس جانا چاہئے تھا' سمیر کا پتہ نہیں کیا حال تھا۔

سلجوق رکا ہوا تھا اور عباسی میرا منتظر تھا۔

"ابو ذرا سونگھیں... ادھر ایسے بُو آ رہی ہے جیسے لاہور کے چڑیا گھر میں ریچھوں کے پنجرے کے قریب سے آتی ہے... شاید یہ ریچھوں کی باس کی بو ہے..."

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

ہوا میں یقیناً وہ بُو تھی... اور یہ بُو ریچھ کی تھی۔

"سر ہمیں واپس جانا چاہیے..." عباسی نے فوراً کہا "سلجوق درست کہتا ہے... آس پاس کہیں ریچھ ہیں"

"میں نے علی سے ریچھوں کے بارے میں پوچھا تھا اور وہ کہتا تھا کہ ان دنوں ریچھ ادھر برف کے پہاڑوں کے دامن میں ہوتے ہیں ادھر نہیں آتے..."

"وہاں سے یہاں تک کا فاصلہ کتنا ہے سر؟ تین یا چار کلومیٹر... کیا پتہ رات کو آ جاتے ہوں..."

ہم ہانپتے ہوئے تیز چلنے لگے... ہم نے اس وارننگ کو سنجیدگی سے لیا کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی ریچھ کے تذکرے پر "چاچا ریچھ" کہہ کر مسکرایا نہیں اور نہ ہی دوسرے کو بزدلی کا طعنہ دیا... بلکہ ہم خاصے خوفزدہ تھے۔ صرف تین روز بعد میجر عباسی سرکاری ڈیوٹی پر دیوسائی کے اوپر ایک ہیلی کاپٹر میں پرواز کر رہے تھے جب انہوں نے اس جھیل سے صرف ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ایک مادہ ریچھ اور اس کے دو بچوں کو دیکھا جو ہیلی کاپٹر سے خوفزدہ ہو کر اس کے آگے آگے بھاگ رہے تھے... یہ وہی سپاٹ تھا جہاں سے ہم اپنے کیمپ کو واپس ہوئے تھے۔

کیمپ واپس پہنچنے پر میں نے خیمے کے اندر جھانکا... لالٹین کی روشنی میں سمیر ایک سفید سلیپنگ بیگ میں سو رہا تھا... "اب کیسی طبیعت ہے بیٹے؟" میں نے سرگوشی کی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں "بس ٹھیک ہوں"۔

میں جھک کر اندر چلا گیا اور اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا... بخار اتر چکا تھا... اور اس کے ساتھ ہی میرے تمام بوجھ اتر گئے۔ "کچھ کھاؤ گے بیٹے؟"

"نہیں جی نہیں چاہتا"۔

اور کھانے کو کس کا جی چاہ رہا تھا... بس وہی بے چینی اور ویرانی۔

"کہاں گئے تھے؟"

میں نے اسے ریچھ کی بُو کے بارے میں بتایا۔

"اچھا..." سمیر کے سوکھے ہوئے لب نیم مسکراہٹ میں کھلے "اگر وہ رات کے وقت آ گئے تو؟"

"میں تمہارے ساتھ ہوں گا..." میں نے اس کی پیشانی سے بالوں کو ہٹایا۔

"صاحب کھانا کیا کھائے گا؟" علی نے خیمے میں جھانکا۔

"میں باہر آتا ہوں..."

باہر دیوسائی کی رات کے ساتھ ایک برفیلی موجودگی اترتی تھی اور ہر شے کو برف کرتی تھی۔ حسین اور عباسی اپلوں کی مدھم آگ پر جھکے ہوئے تھے۔

"میں تو کچھ نہیں کھاؤں گا... ایک مگ کافی اور کچھ بسکٹ..."

"سر جی... دو چار پراٹھے نہ ہو جائیں؟... ابھی تو بیس کے قریب باقی ہیں"

"جی نہیں چاہتا..." میں نے عباسی کی جانب دیکھا۔ اس کا چہرہ اور آنکھیں سرخ اور بہت شدت سے سرخ ہو رہی تھیں۔ میں نے آگے ہو کر اس کی پیشانی پر ہتھیلی رکھی... وہ بخار کی حالت میں تھا۔ اس پر بھی بلندی کا اثر ہو چکا تھا لیکن وہ ایک سپاہی کی حیثیت سے اسے خاطر میں نہیں لا رہا تھا "چلیے میجر صاحب اپنے خیمے میں... ابھی کافی کے ساتھ دو گولیاں ڈسپرین..."

"نہیں سر... کچھ نہیں ہوتا"

"اچھے فوجی ہو لیڈر کا اور سینیئر کا حکم نہیں مانتے؟"

"سر..." وہ اٹھا اٹن شن ہوا اور پھر اپنے خیمے میں چلا گیا جہاں سلجوق اپنے ریڈیو پر کوئی سٹیشن کیچ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اب مغربی موسیقی کی ایک دھن خیمے میں سے چھن کر دیوسائی کی سرد ہوا میں آتی تھی اور ٹھنڈی ہوتی تھی۔

"علی... ادھر جو ریچھ ہوتا ہے وہ خیمے کی طرف بھی آ جاتا ہے؟"

"ہاں صاحب آ جاتا ہے"

"تو کیا بندوبست ہونا چاہیے؟"

"آپ فکر نہ کریں صاحب... ایک دو پتھر ملا ہے اور پھر ہم نے یہ ٹین اور کچھ برتن وغیرہ باہر رکھا ہے اسے بجانے سے بھاگ جائے گا..."

"بچے ساتھ ہیں تو ذرا رات کو خیال رکھنا..."

"کونسے بچے صاحب؟..." علی ذرا حیران ہوا۔

"سلجوق اور سمیر..."

"صاحب آپ کیا بولتے ہو - وہ تو جوان ہیں شادی بنانے کے لائق ہیں..." علی ہنسا...

"علی... سمیر کا بخار اتر گیا ہے لیکن اس کی طبیعت ابھی ٹھیک نہیں - سر درد

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

بھی ہے۔ تو کیا بلندی پر ایسا ہی ہوتا ہے؟"

"ہاں صاحب۔ رات کو بخار کم ہو جاتا ہے' کل ہم نیچے جائیں گے تو صاحب بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔۔"

"خطرے کا بات تو نہیں ۔۔؟"

علی تھوڑی دیر کے لئے چپ ہوا اور پھر بولا "صاحب ادھر ہائٹ پر کچھ پتہ نہیں ہوتا ۔۔ لیکن آپ فکر نہ کرو کچھ نہیں ہوگا۔۔"

سلجوق اور عباسی کے خیمے میں سے موسیقی اور قہقہوں کی آواز آ رہی تھی۔

گوبر کی آگ تھوڑی ہی دیر میں بالکل ٹھنڈی ہو گئی۔۔ لیکن کافی تیار ہو چکی تھی۔۔ اس سے پیشتر سمیر کو ایک مگ گرم دودھ پلایا گیا تھا۔

باہر کھلی فضا میں بیٹھنا ناممکن ہو رہا تھا۔۔ علی اور حسین اپنے کمبلوں میں لپٹ کر رک سیکوں سے ٹیک لگائے چپ بیٹھے تھے۔ میں نے بلتی پورٹروں میں ایک عجیب وصف دیکھا تھا' وہ ایک دوسرے کے قریب بیٹھے رہیں گے اور پہروں چپ رہیں گے۔ میں نے خیمے کے اندر جانے سے پیشتر ایک مرتبہ پھر علی کو رات کے وقت چوکنا رہنے کی تلقین کی۔۔

رات اندھیری تھی۔ اگر دیوسائی پر پورا چاند ہوتا تو وہ بھی ایک منظر ہوتا۔۔ یا شائد وہ چاندنی بھی خوف سے بوجھل ہوتی۔۔

میں خیمے کے اندر چلا گیا۔ سلیپنگ بیگ میں داخل ہو کر میں نے اپنے آپ کو زپیں چڑھا کر اچھی طرح پیک کر لیا۔

"سوری ابو۔۔ میں بیمار ہو گیا اور آپ کو پریشانی ہوئی۔۔"

"اوئے نہیں ۔۔" میں نے اس کے رخساروں کو تھپکا اس کے ماتھے کو چوما۔

تھوڑی دیر بعد احساس ہوا کہ سلیپنگ بیگ جو مکمل طور پر ایئر ٹائٹ ہے اور میں جو افغانی جیکٹ اور گرم جرابوں سمیت اس میں مقیم ہوں تو اتنے ملبوسات ضروری نہیں۔ چنانچہ میں نے بمشکل اپنے آپ کو باہر نکالا' جیکٹ اور جرابیں اتار کر ایک جانب رکھیں اور اپنے آپ کو پھر سے سلیپنگ بیگ میں پیک کر لیا۔

سردی حسب توقع ایسی تھی کہ پورے بدن میں سے صرف چہرہ سلیپنگ بیگ کے باہر تھا اور کانوں تک اونی ٹوپی تھی لیکن آنکھیں ناک اور ہونٹ باقاعدہ کپکپا رہے تھے۔۔ ایسے لگتا تھا کہ صرف چہرے کو کسی ڈیپ فریزر میں رکھا گیا ہے۔

چند لمحوں کے بعد احساس ہوا کہ بلندی کا کچھ اثر مجھ پر بھی ہو رہا ہے اور سر میں درد کی ایک لہر ہے جو کبھی شدت سے آتی ہے اور کبھی پیچھے ہٹ جاتی ہے۔۔۔ سانس لینے میں بھی مزید دشواری پیش آ رہی تھی اور طبیعت میں بے چینی تو تھی۔۔۔ میں ایک مرتبہ پھر بمشکل اٹھا اپنے آپ کو بیگ میں سے نکالا۔ دیا سلائی جلا کر ڈسپرین کی گولیاں تلاش کیں اور یخ بستہ پانی سے انہیں حلق میں اتار کر پھر سے لیٹ گیا۔

باہر جو ہلکی ہوا تھی اس میں کسی چڑیا جانور کی آواز آئی ۔۔۔ اور اس کے ساتھ ہی برابر کے خیمے سے عباسی کی آواز آئی "سر جی یہ کیا بولا ہے؟"

"پتہ نہیں ۔۔"

"آپ نے کبھی ریچھ کو سنا ہے کہ وہ کیسے بولتا ہے؟"

"نہیں ۔۔"

"تو پھر پورٹرز کو کہیں کہ وہ ذرا دھیان رکھیں ۔۔ کچھ بولا ضرور ہے"

وہ ایک بے چین اور بے آرام رات تھی جو دیوسائی پر گزری۔۔۔ سانس لینے میں ہمہ وقت دقت ہوتی رہی ۔۔۔ ایک بہت بڑی مشکل تب پیش آتی جب میں کروٹ بدل کر چہرہ دوسری جانب کرتا ۔۔۔ صرف کروٹ بدلنے کے عمل کے نتیجے میں سانس پھول جاتا اور خاصی دیر کے بعد درست ہوتا۔ یوں کروٹ بدلنے سے پیشتر میں اپنے آپ کو تیار کرتا ۔۔۔ سر درد میں کمی تو ہو گئی لیکن بے چینی بدستور تھی اور ۔۔۔ بلندی کا ایک اور کرشمہ بھی تھا کہ بے خوابی تھی۔ نیند نہیں آتی تھی۔۔

تو وہ ایک بے چین اور بے آرام رات تھی جو دیوسائی پر گزری۔

رات کے پچھلے پہر چند لمحوں کے لئے تھکاوٹ نے غلبہ پایا اور میری آنکھ لگ گئی۔۔ صرف چند لمحوں کے لئے اور پھر میں نے آنکھ کھولی تو باہر روشنی تھی اور پورٹرز اپنی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ ذرا دھیمی آواز میں تا کہ ہماری نیند میں خلل نہ آئے۔

میں اپنے بیگ میں سے کھسک کر باہر آ گیا۔۔ رات سمیر گہری نیند سویا تھا اور وہ اب بھی خواب میں تھا۔

باہر دیوسائی کے کناروں پر صبح کی دھوپ تھی۔

"کافی صاحب۔۔؟" علی نے پوچھا۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"ہاں — تم دونوں باہر ہی سوئے رہے۔ نیند آ گئی تھی؟"

"ہاں صاحب —" حسین بولا "اتنی سردی نہ تھی —"

"اور کتنی سردی چاہئے تمہیں؟"

"صاحب یہ پندرہ ہزار ہے اور ہم بیس ہزار پر بھی باہر سو سکتے ہیں۔ ادھر صرف یہ بہت زیادہ ہے —" کیا بہت زیادہ ہے، حسین نے اپنا کمبل باقاعدہ نچوڑ کر بتایا کہ ادھر اوس بہت زیادہ ہے۔

"گڈ مارننگ سر —" عباسی اپنے خیمے میں سے باہر آیا "تو کیا خوبصورت صبح ہے..." اس نے ایک نیم انگڑائی لی "تارڑ صاحب کیا اس وقت صرف ہم اس پورے دیوسائی میدان پر صرف ہم یہ صبح دیکھ رہے ہیں — کوئی اور تو نہیں؟"

"اگر اس وقت یہاں کوئی اور ہے تو وہ صرف ریچھ ہو سکتے ہیں..."

"آپ یقین نہیں کریں گے —" عباسی میرے قریب آ کر آنکھیں جھپکتے ہوئے بولا "رات کو ادھر ریچھ آیا تھا — میری آنکھ کھلی تو وہ خالی ٹینوں کو سونگھ رہا تھا۔ یقین کیجئے —"

"وہ میں تھا صاحب..." حسین ذرا شرمندہ سا ہوا "رات کو مجھے خیال آیا کہ جن ٹینوں میں ہم چائے وغیرہ بناتے ہیں وہ خیمے کے بالکل ساتھ پڑے ہوئے ہیں اور اگر آپ کروٹ بدلو گے تو شائد وہ آپ کے نیچے آ جائیں اس لئے میں نے بہت آرام سے انہیں اٹھا لیا —"

"حسین —" عباسی ہنسنے لگا "تمہارا کیا بگڑتا اگر میں ساری عمر اس یقین میں گزار دیتا کہ دیوسائی کی ایک رات میں ایک ریچھ میرے خیمے کے پاس سیر کرتا تھا —"

کافی کے مگ گرم تھے اور ہم انہیں تھام کر ان کی گرمی محسوس کرتے اپلوں کے دھوئیں کے پاس بیٹھ گئے۔

دیوسائی کے کناروں پر بادلوں کے ٹکڑے تھے اور ہلکی ہوا تھی۔

"صاحب کس ٹائم اترنا ہے؟" علی پوچھنے لگا۔

"دوپہر کے کھانے کے بعد —"

"تارڑ صاحب کچھ موڈ ہے دیوسائی میں سیر کرنے کا —؟"

کل جب ہم اس جھیل کنارے پہنچے تھے تو میں نے اس پہاڑی کو دیکھا تھا جو

دھیرے دھیرے بلند ہوتی تھی اور اس کے عقب میں دیوسائی کا کوئی اور منظر تھا...

"ہم اوپر جا رہے ہیں، بچوں کا خیال رکھنا —" حسین نے سنا اور مسکرا کر سر ہلا دیا۔

ہم اپنی چھڑیاں ٹیکتے چلنے لگے۔ چھوٹی ندی کو پھلانگنے سے پیشتر میں نے اس کے پانی سے منہ ہاتھ دھونے کی ایک نیم دلانہ کوشش کی... اور فوراً ترک کر دی۔

ہم اپنی خیمہ گاہ سے ذرا دور ہوئے تو پھر وہی لمبے ڈنٹھل والے پھول، ننھے منے پھولوں سے ڈھکی ہوئی گول جھاڑیاں۔ مختلف رنگوں کی گھاس اور اس میں کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے پتھر جیسے سجائے گئے ہوں اور یہاں بھی ہمارے قدم بھٹکنے لگے کیونکہ ہم پھولوں کو روندنا نہیں چاہتے تھے لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا اور ہم پھولوں کے مجرم محسوس کرتے ہوئے چلتے رہے... میں تھک جاتا تو کسی پتھر پر بیٹھ کر آس پاس دیکھنے لگتا کیونکہ یہاں ہر لمحہ آس پاس بدل جاتا تھا۔

ہماری جھیل نیچے رہ گئی اور اس کے کنارے ہمارے خیمے دو چھوٹی چھوٹی نیلی ٹکونوں کی صورت میں دکھائی دیتے تھے۔

آج صورت حال بہت بہتر تھی۔ میرا بدن آہستہ آہستہ دیوسائی کی بلندی کا عادی ہو رہا تھا... بے چینی بہت کم ہو چکی تھی اور سانس لینا اگرچہ اب بھی دشوار تھا لیکن مشکل نہ تھا... عباسی آگے جا رہا تھا۔

ایک نہایت ہی دل کش رنگوں کے پھولوں کا فرش میرے قدموں تلے آیا، میں وہیں ڈھلوان زمین پر لیٹ گیا اور کیمرہ آنکھ سے لگا کر ان پھولوں کو فوکس میں لینے کی کوشش کرنے لگا اور اسی لمحے عباسی نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مجھے زمین پر دیکھا تو بھاگتا ہوا واپس آیا "کیا ہوا سر جی خیریت تو ہے" اس نے مجھے اٹھانے کے لئے ہاتھ آگے کیا اور پھر فوراً ہی اسے احساس ہوا کہ میں تصویر اتار رہا ہوں "کمال ہے تارڑ صاحب — بتا کر لیٹنا تھا مجھے خواہ مخواہ نروس کر دیا"

اب میں جہاں کہیں ذرا مختلف پھول دیکھتا وہیں زمین پر لیٹ کر ان کی تصویر بنانے کی کوشش کرتا۔

پورے دیوسائی پر دھوپ اگرچہ مکمل تھی لیکن ہم گرم کپڑوں میں ملبوس تھے اور اپنی اونی ٹوپیوں کو کانوں تک کھینچے ہوئے تھے۔

اور جب ہم بلند ترین سطح پر پہنچے تو دیوسائی کا منظر مزید وسیع ہوا اور یہ منظر

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

مختلف حیرتوں کا مجموعہ تھا' ایک حیرت تو یہ تھی کہ ہم تقریباً بلند ترین مقام پر تھے اور دور جو پہاڑیاں تھیں بلکہ پہاڑیوں کا ایک تسلسل تھا جس پر برف کی لکیریں تھی اور ان پر عجیب شکلوں کے بادل تھے اور یہ سب بہت دور تھے لیکن اس سے ادھر تو وہی گھاس بلکہ پھولوں اور جھاڑیوں سے ڈھکے سبز میدان تھے جن پر کہیں دھوپ تھی اور کہیں سایہ تھا اور ان میں دو ندیاں تھیں دور تک دکھائی دیتی اور ان کے کچھ حصے دھوپ میں اور کچھ سائے میں تھے جیسے دھوپ سائے کا ایک ست اژدھا ہے جو آرام سے ہے۔۔ اس بلندی سے پرے وہ منظر تھا جو جھیل سے دکھائی نہ دیتا تھا' پوشیدہ تھا اور یہ منظر بہت ہی ویران تھا۔ ایک اور جہان تھا خاموشی کا اور خاموش پتھروں اور میدانوں کا اور وہاں سے بھی ایک ندی اترتی تھی۔۔۔ اور سب سے بڑی حیرت تنہائی کی تھی' اس عظیم وسعت میں کوئی نہ تھا۔۔۔ سوائے اس کے جو ہر جگہ ہے۔۔ اس کے سوا کوئی نہ تھا۔۔ پرندے بھی نہ تھے ۔۔ شائد اتنی بلندی پر کوئی پرندہ اڑان نہیں کر سکتا اس لئے۔۔۔

نیچے جھیل پانی کا ایک قطرہ تھی گھاس کے سمندر میں۔۔۔ اور ہمارے خیمے دکھائی نہیں دیتے تھے۔

"تارڑ صاحب آپ زیادہ سے زیادہ کتنی بلندی پر گئے ہو؟"

"تقریباً انتیس ہزار فٹ تک گیا ہوں۔۔"

"ہائیں۔۔" عباسی کا منہ حیرت سے کھلا "سر جی آپ کیا کہہ رہے ہیں۔۔۔ آپ ماؤنٹ ایورسٹ سے بھی بلند کسی چوٹی پر چلے گئے ہیں؟"

"میں ہر ہفتے جب لاہور سے اسلام آباد پرواز کرتا ہوں تو جیٹ ہوائی جہاز تقریباً اسی بلندی پر پرواز کرتا ہے۔۔"

"ایک تو آپ کی مخول کی عادت نہیں جاتی۔۔ چاہے آپ دیو سائی میں ہی کیوں نہ ہوں۔۔۔ جناب بلند ترین مقام پر ذاتی طور پر کہاں تک گئے ہیں؟"

"شائد میں اب اپنے بلند ترین مقام پر ہوں۔۔ شائد نیلم وادی کی رتی گلی چوٹی اس سے ذرا کم ہو یا زیادہ ہو۔۔"

پھر عباسی کچھ کہہ رہا تھا لیکن میں سن نہیں رہا تھا' میں اس کی طرف دیکھتا تھا اس کے لب مسلسل ہل رہے تھے اور میں کبھی کبھی سر بھی ہلاتا تھا لیکن میں کچھ سن نہیں رہا تھا کیونکہ وہاں اس آسمانی تخت پر اس بلندی پر میں دھوپ میں اور سرد ہوا

میں براجمان تھا اور مجھے چاروں جانب سے سندیسے آتے تھے' مجھے پیغام آتے تھے کہ میں دیوسائی کی گھاس ہوں جس پر آج تک کوئی نہیں چلا' تم آؤ اور مجھ پر چلو۔ اور میں دیوسائی کی ایک ایسی ندی ہوں جس کے پانیوں سے کسی انسان نے اپنا چہرہ نہیں دھویا۔۔۔ تم آؤ اور اپنے چہرے کو تر کرو۔۔۔ اور میں جھیل ہوں ۔۔۔ برف ہوں ۔۔۔ راستہ ہوں ۔۔۔ آؤ چلو۔۔۔ اور میں تنہائی ہوں' میرے اندر تک آؤ۔۔ وہ راستہ دکھائی دیتا تھا جو چلم چوکی کو جاتا تھا۔۔۔ ادھر دو دن کی مسافت ہے۔۔۔ ہاں کوئی ایسا دن ہو گا جب میں دیو سائی کے کناروں پر خیمہ لگا کر اگلے روز واپس لوٹ جانے کی بجائے آگے اس کے اندر تک جاؤں گا۔ اسے عبور کروں گا اور پھر دوسری جانب اتر جاؤں گا۔۔ اور پیدل جاؤں گا۔۔۔ کیا یہ ممکن ہے کہ انسان تنہا ہو' اپنا سامان خود اٹھائے اور دیو سائی میں اکیلا سفر کرے؟۔۔۔ ایک تنہا شخص تنہائی میں اتر جائے؟۔۔۔

"سر جی واپس نہ چلیں؟" میں نے بہت دیر بعد عباسی کی آواز سنی۔۔

ہم بڑے آرام سے نیچے اترنے لگے ۔۔۔ دھوپ میں اور پھولوں پر قدم رکھتے۔۔۔

ہم آسمان سے اترنے لگے۔۔۔

ہم اپنی کیمپ سائٹ سے قریب ہوئے تو وہاں دونوں خیموں کے آس پاس دور دور تک مویشی دکھائی دے رہے تھے۔۔۔ جھیل کنارے خیموں تک پہنچے تو سمیر ایک لمبی ٹوپی سر پر رکھے دھوپ میں لیٹا تھا اور سلجوق اس کے سینے پر سر رکھے اپنے ریڈیو کے بٹن گھما رہا تھا۔۔۔

"کیا حال ہے؟" میں نے سمیر کا ماتھا چھوا ۔۔ اسے بخار تھا "یہ کیا بات ہے سمیر؟"

"بس ابو۔۔" اس نے مسکرا کر سر ہلایا۔۔۔ لیکن اس کی شکل اب بیماروں ایسی نہ تھی "تھوڑا سا بخار اور کچھ سر درد"

"یہ مویشی کہاں سے آ گئے؟"

"یہ صد پارہ والوں کی بھک کے ہیں۔۔" سمیر نے بتایا "آپ تو اوپر چلے گئے اور میں سویا ہوا تھا تو ایک یاک آ گیا۔۔"

"سچ مچ کا یاک؟"

"ہاں ابو وہ دیکھئے"

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

اور وہاں زدہ تھے اور ان میں ایک شاندار سفید یاک تھا اور بڑی شان سے کھڑا تھا۔

"تو یاک نے آکر میرے خیمے کے پاس ایک زور کی "پھوہ" کی اپنے نتھنوں کے ساتھ اور پھر ایک لمبی "ہاؤ" کی۔ تو ابو میں سمجھا کہ ریچھ آگیا ہے۔ تب میں نے بھائی جان کو آوازیں دیں کہ بھائی جان ریچھ ..... اور ادھر سے بھائی جان اپنے خیمے سے جواب دیتے ہیں کہ چپ کر کے لیٹے رہو میرے خیمے کو بھی ایک ریچھ سونگھ رہا ہے..." سمیر ہنس ہنس کر دوہرا ہو رہا تھا "پھر میں نے پورٹر علی کو پکارا تو وہ آگیا اور کہنے لگا صاحب باہر آکر دیکھو باہر نکلا تو یہی سفید والا یاک میرے خیمے سے تھوتھنی لگائے کھڑا تھا۔"

"سر جی یاک کی تصویر اتارنی چاہئے۔ ہو سکتا ہے اس یاک کی آج تک کسی نے تصویر نہ اتاری ہو" عباسی نے صلاح دی۔

ہم دونوں سفید یاک کے قریب چلے گئے۔ میں نے کیمرہ آنکھ سے لگایا اور فوکس کرنے لگا تو عباسی کہنے لگا "سر جی ذرا قریب ہو کر یاک کا پورٹریٹ بنا لیں ---"

"نہیں ---" میں نے سر ہلایا "میں یہ رسک نہیں لوں گا... یہ یاک میری طرف ایسے دیکھتا ہے جیسے وہ مجھے پسند نہیں کرتا..."

علی اور حسین حسب معمول گوبر کی آگ جلائے بیٹھے تھے اور ان کے ساتھ ایک اجنبی براجمان تھا..... یہ ان تمام مویشیوں کا رکھوالا تھا جو ہماری خیمہ گاہ کے گرد پھیلے ہوئے تھے...

"صاحب یہ ادھر صد پارہ کی بنک سے آیا ہے اور کہتا ہے کہ رات کو ایک یا دو ریچھ آئے اور ایک بھیڑ اٹھا کر لے گئے---" علی نے بتایا۔

"یہاں کے ریچھ گوشت خور ہیں؟"

"نہیں صاحب..." وہ شخص کہنے لگا "یہ لے جاتا ہے اٹھا کر اور مار دیتا ہے.... ادھر تین روز پہلے اس نے ہمارا ایک گھوڑا مار دیا تھا ابھی تک ادھر میدان میں رکھا ہے"

اور ہم نے اس گھوڑے کا ڈھانچہ دیکھا تھا اور اس کے سڑتے ماس کی بو سونگھی تھی....

"سر جی یہ بہت اچھی بات ہے کہ ہم دوپہر تک دیوسائی چھوڑ دیں گے---" عباسی نے سر ہلایا اور ذرا شرارت سے کہا "یہ علاقہ کچھ خطرناک ہوتا جا رہا ہے"

جہاں حد نظر تھی جہاں چھوٹے اور نیلے پہاڑوں کا سلسلہ تھا وہاں جو بادل تھے وہ بتدریج آسمان کو ڈھانپتے جھیل کی طرف آ رہے تھے اور تب دوپہر کے بعد ہم نے اپنے خیمے سمیٹے اور ابھی ہم دیوسائی میدان کے پھولوں پر چلتے تھے کہ چند بوندیں گریں جو پانی نہیں تھیں برف تھیں اور ان کی برفیلی سردی ہماری جھکی ہوئی گردنوں پر گیلی ہوتی گئی۔

بادل جیسے کسی جادو کے زور سے اڈتے چلے آ رہے تھے... حسین اور علی ہمارے آگے تھے اور ہم تینوں ان کے پیچھے اور ہم ایک جدا راستے سے واپس ہو رہے تھے اور یہ راستہ بھی اِس دنیا سے جدا تھا کیونکہ اِس پر جو پتے اور گل بوٹے تھے وہ اُس دنیا کے نہیں تھے لیکن ہم کیا کرتے ہم تو اِس دنیا کے تھے اور ہم اِس دنیا کو چھوڑ رہے تھے جس میں یہ پتے گل بوٹے تھے... جس میں ہم نے اگرچہ صرف ایک شب گزاری لیکن دراصل ایک عمر گزاری ... اور جب ہم نے کل دیوسائی پر قدم رکھا تھا تو بدن میں بے چینی اور ویرانی سرایت کرتی تھی بلندی کی وجہ سے اور اب بھی بے چینی تھی اور ویرانی تھی بدن میں۔ لیکن جدائی کی وجہ سے... ہم ایک دنیا سے جدا ہوتے تھے' اک جہان سے رخصت ہوتے تھے... ہمارے قدم بے ربط ہوتے تھے اور ہم پھولوں کو روندنا نہیں چاہتے تھے...

سمیر اب آگے چل رہا تھا... صرف جوانی کی مستی اسے آگے لے جاتی تھی ورنہ اس کا ماتھا بخار سے تپتا تھا... وہ جھکتا تھا اور دیوسائی کے پھول چنتا تھا...

"یہ پھول نیچے سکردو میں زندہ نہیں رہتے صاحب---" علی بھی جھکا اور اس نے ایک چھوٹی پلیٹ جتنا پھول نما پودا توڑا اور سمیر کو دے دیا۔

بارش کی چند بوندیں اور گریں۔

میرے راستے میں پھولوں کی زرد کٹوریاں تھیں' میں نے جھک کر انہیں سمیٹا اور سمیر کے حوالے کر دیں۔

اب یہ ایک کھیل تھا' ہم جھک جھک کر ایسے پھول تلاش کرتے تھے جو سمیر کے پاس نہ تھے... ہاں یہ میرے پاس نہیں ہے... نہیں نہیں یہ تو ہے... سرخ مخمل پھول اس کے تپتے رخساروں کی طرح تھے...

ہمارے اوپر بادلوں کا کھیل ہو رہا تھا' وہ اڈتے چلے آتے تھے' گہرے اور پانیوں سے بوجھل ہوتے جیسے ہمارا پیچھا کر رہے ہوں۔ ہم خوش قسمت تھے کہ ہمیں دیوسائی پر صاف موسم ملے۔

www.urdufans.com or www.allurdu.com [rfi]

"بارش آئے گی صاحب ـــ" علی بار بار اوپر دیکھتا تھا۔

جب پھول اور پتے اور بوٹے جو میر جمع کرتا تھا زیادہ ہو جاتے تو وہ انہیں سلجوق کے رک سیک کی پچھلی جیب میں ڈال دیتا۔

میرے آگے آگے سلجوق چلتا تھا اور دیوسائی کے رنگ اور پودے اس کے رک سیک کی پچھلی جیب میں سے لٹکتے تھے جیسے پرندے ہوں جو وہیں رہ جانا چاہتے ہوں جہاں سے ان کو لے جایا جا رہا تھا۔ اور وہ جانتے تھے کہ وہ وہاں زندہ نہیں رہیں گے جہاں ان کو لے جایا جا رہا تھا۔۔۔

دیوسائی کا کنارا آگیا۔۔ اس جادوئی سمندر کا کنارا جس میں ہم خیموں کی بادبانی کشتیوں کے ساتھ اترے تھے۔

ہمارے سروں پر بادل جھک رہے تھے اور عجیب بات ہے کہ بالکل چپ تھے ان میں گرج یا چمک نہ تھی۔۔۔ وہ خاموشی سے پیچھے چلے آتے تھے۔

ہم دیوسائی کے کنارے پر کھڑے ہو گئے ـــ جیپ روڈ نیچے صد پارہ کو اتر رہی تھی جیسے ایک زینہ اتر رہا ہو۔۔۔ ہم نے اس زینے پر قدم رکھا اور دیوسائی سے الگ ہو گئے۔

ہم کے ٹو ہوٹل سکردو کے اس کمرے میں داخل ہوئے جس میں عینی اور میمونہ ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔

انہوں نے بولنا شروع کر دیا۔۔۔ لیکن ہمارے کانوں میں ایک ایسا سناٹا تھا جس میں ہم ابھی تک گم تھے اور ہم سن نہیں سکتے تھے۔۔۔ میر کا بخار اتر چکا تھا اور وہ مسکرا رہا تھا۔۔۔ دور کہیں میمونہ کی آواز آئی "ــــــ تم سب بولتے کیوں نہیں"

اور ہمارے کانوں میں سناٹے کی گونج تھی جو ہم ساتھ لے کر آ گئے تھے۔

سلجوق نے رک سیک کی جیب میں سے دیوسائی کے مرتے ہوئے پھولوں کو نکالا اور ایک گلدان میں ڈال دیا۔۔۔ وہ مرجھا چکے تھے۔

"ہائے ـــ" میمونہ کی ہتھیلی اس کے سینے پر گئی "یہ رنگ کیسے ہیں؟؟" اس کے چہرے پر ایک ناقابل یقین حیرت تھی۔

ہم تینوں مسکراتے رہے۔۔۔ ہم وہیں تھے جہاں سے یہ رنگ آئے تھے۔